

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ
جنوری 2015



گلشن
میں

WWW.PAKSOCIETY.COM



آپ کے ہاتھوں ہی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

محفل شعرو سخن

قارئین 164

منافق کی منکر میں گھسنے والوں کی عجیب منطوقوں کا اظہار

شکبہ

سلیم انور 167

ایک چوکئی روپ کھی چھاؤں کھی دھوپ محبت کی عزتوں یافتوں اور رقابتوں کا ایک دل بہا سلسلہ

ماوی

محی الدین نواب 176

وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف عاشق کا اگلا سفر

پہلے آئیے

منظر امام 221

راہ حق کی حسرتوں اور کرامتوں کا قصہ

امام ابو العباس

ضیاء تنسیم بلگرامی 225

ایک مضبوط معاشرے کے منظم اصول و اس کے اثرات و ثمرات کا احوال

نافا بل معانی

ڈاکٹر شیر شاہ سید 237

حسین علیہ السلام کی تلاش اور چھان بین میں جیون تمام کرنے والی ایک دلہیزو کی سلف رسانی

چھان بین

تنویر ریاض 241

منچلی چپاتی، ادھوری رفاقتوں اور مکمل رشتہ اتوں کی لہو لہو داستان

بے شرمستا

سلیم فاروقی 250



انشائیہ

اپنی کوٹھیوں اور محسوسوں پر ایک صاحب نظر کا نوحہ

جون ایلیا 7

آپ کے خط

سپنس کی مجلس مشاورت و استائن کی تشریحیں باتیں اگے لکھنے اور پر حلوں مشورے

مدیر اعلیٰ 8

عشق نامہ

ماہی کا آئینہ۔ باختیار لہجے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

الیاس سیٹا پوری 16

عفریت

ایک خونی بلا کا احوال جو تدرت کا خوفناک اظہار ہے

کاشف زبیر 59

سوانح جنو

اجلی گوشت و لالہ چہرے والی شہیدہ عالی قوتوں کی برہنہ کارندہ فتح معجزی

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی 76

جدا انظرآ

گم شدہ محبت کے ملاں میں مبتلا ایک حسینہ کا مہسرا

طاہر جاوید مغل 117

کہنہ مشق

جس لوں کے حملوں سے استمرار حیرم کی انوکھی داستان

مرزا امجد بیگ 124

راہ عشق

محبت کا بھسرا رکھنے والے ایک دلبر کی بہادری کا دلچسپ کارنامہ

سید احتشام 153

پبلشر و پراڈیو: نیشنل رسالہ، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور، 63 فیزا ایکس نیشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: دابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جلد 45 • شماره 01 جنوری 2015 • زر سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 • فیکس: (021) 35802551 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، نرس کوالٹی، کمپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ آر ایف کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

انشائیہ
جون ایلیا

بے دولتی

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے ہنس و ہنسی، چپ و راست اور پست و بلند کی صورت گری کرنے، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر ہچھکتا نا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے پونے دیکھنے لگے ہیں۔

اب ہم سب سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا مجرہ بنا دیا ہے، ہنر کا مجرہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دوران بستیوں میں آکر جو ہمارے بنائی ہیں، وہ سر بلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزر گاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی انگی ہی رو میں ادھرنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جاسکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفتر داری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفاتر کے کام نہ آئے۔ تمہارے شہروں کے باہر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو لپٹائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سزا اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

”میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تنکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہل ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے۔ میرے اہل دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت کا قور اور پائنتہ گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمانے گا اور یہ ذلت، ندامت اور کجبت کی کمانی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دست بردار ہو جائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور چھٹی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر کر لائیں۔“

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملے کھانا کھائیں اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو بھی کہتی ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں ہمیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ کسی توکل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں، وہ بھی فضول ہیں اور جوان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لونگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھانے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ پھر کران دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آگئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ..... اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جو بردار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گدا گر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کھلووں کی بھیک اپنے ملک میں بیچ دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ عمران محنت کشوں کی بیٹی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دوستی ہے۔ ہاں، اسے مجبور بار برداری کی قوم! یہ تیری بے دوستی ہے۔

سپنس ڈائجسٹ جنوری 2015ء

محرم قارئین
السلام علیکم!



جنوری 2015ء کا شمارہ سے سال کی نوید اور تمام اہلیان وطن کے لیے امن و سلامتی کی بے شمار دعاؤں کے ساتھ حاضر خدمت ہے۔ گزشتہ سال کے آخر میں اگرچہ کچھ اقدامات مثالی کیے گئے جن میں معذرتوں کی نیتوں میں دو بار نمایاں کی بھی شامل تھی مگر ساتھ ہی انہوں نے اس بات کا کہہ کر اس کی کٹھنوں کو اب تک نابل سا..... ہنوز دینی دوراست کے مصداق اور دور دورہ اشیا خوردوش کی قسمیں اب تک آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ حکومتی اداروں کو اس طرف توجہ دینے کی اشد ضرورت تو ہے مگر صاحب اقتدار کے پاس اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ ان باتوں پر بھی کچھ وقت صرف کر لیا جائے۔ بہر حال امید ہے کہ نیا کام ہے، جہاں اتنی تہہ ملی آئی وہاں اور بھی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اگر اردگرد کے ماحول پر ذرا سنجیدہ نگاہ ڈالیں تو کئی ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو روئے کفر سے کر دیتے ہیں، جانے ہمارا معاشرہ اتنا شہت پختہ کیوں بنا جا رہا ہے۔ گویا برداشت بالکل ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ مبر اور برداشت کرنے کا لاٹھک جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ ازود دینی رشتوں میں بھی گل و غارت گری آگئی ہے۔ وہ جوڑے جو عیاد سے گھر بساتے ہیں وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر اپنے مخصوص بچوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسے واقعات اچانک رونما نہیں ہوتے بلکہ ان جذبات کی پرورش دیر سے ہوتی ہے ہم خود اپنے خفیہ روتوں سے اور دل کی گدو گدوں کے ذریعے کر رہے ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کو طول دینے کے بجائے اگر کسی وقت سمیٹ کر نظر انداز کرنے اور جارحانہ روتوں میں تہہ ملی لانے کی کوشش کریں تو شاید ایسی نوبت نہ آنے پائے۔ لیکن دولت کی زیادتی نے اور کئی معاشی طور پر نکل دیتی ہے ہماری خوش اخلاقی کو نگل لیا ہے شاید اس موضوع پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن صفحات کی کمی کی آڑ سے آتی ہے لہذا مثبت مدتوں کی خوش آمدی لیے ہم پلٹے ہیں اپنی نیک نیت کی جانب۔

تفسیر عباس با بر، اوکاڑہ سے بھر پور تہرے کے ساتھ کرسی صدارت پر برائمان ہیں "عہد حاضر کے جدید ترین تقاضوں کو اگر کچھ دیر کے لیے ملحوظ رکھا جائے تو سرورق، اس لحاظ اور معیار کے مین مطابق نہیں تھا لیکن ہمیں دوشیزہ سرورق کے ساتھ حسن کی تاب و دلکشتی نے از حد متاثر کیا۔ ماہر جاسم مرحوم و منظور جون ایلیم کے انشا نے سلامتی کی راہ سے دوپٹا کرنا خاصہ ہی اہتمام کیا۔ ملی حالات کو دیکھ کر وہاں پر غلامی ہو جاتا ہے۔ کمزور معیشت کی تحیف و تزا کر رہے جس حکمرانوں کے اغراض و مقاصد اور کمزور مفادات کا ناقابل برداشت بوجہ وطن گریز کے امن و ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ آپ کے خط میں آپ کا ادارہ یہ حسب روایت معاشرے کی کئیوں کا مجموعہ تھا۔ تحت طاؤس پر لا ہور سے انتہائی منفرد شخصیت زویا اجاز کو شاہانہ کردار کے ساتھ برائمان پایا۔ بہترین تجربے کو اعزاز و قبولیت حاصل ہونے پر تادل سے مبارکباد۔ خانہ اہل سے بہت پیارے بھائی تھے قدرت اللہ نیازی نے وزارت عملی کے فرائض نہایت احسن انداز میں سرانجام دیے۔ محمد قاسم رحمان اور یوسف سانول یقیناً اچھا اضافہ ہیں۔ سرگودھا سے اسد عباس کو تادل سے خوش آمدید۔ کراچی سے رضوان سلطان خولی بھی میلا لٹنے میں کامیاب رہے۔ دہلی میں منیر اپنے عزیز ازجان دوست سید عقیل کی خوشگوار و غیر متوقع آمد و شرکت باعث حدسرت ثابت ہوئی۔ ماہا ایمان اینڈ آسیہ چودھری کے وارانٹ جلد از جلد جاری کیے جاتے ہیں۔ ماضی کے آئینے میں خیر نہایت تادین سے مرحوم الیاس بیٹا پوری کا ایک اور گہرا پیار اور بہترین تحریر و تحقیق، معنی ناقص نے معلومات میں پیش قیمت اضافہ کیا۔ بہترین و کتبہ مشق مصنف ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شاندار کہانی سو دوائے جنوں، اسٹوری آف دی منٹھ قرار پائی۔ بے شک باطل جتنا بھی طاقت ور ہوا سے حق و صداقت کے سامنے سرخو ہونا پڑتا ہے۔ باطل ہمیشہ نیست و نابود ہو کر مثال عبرت بن جاتا ہے ملک مصدق حیات کی ڈائری سے ایک اور نظریہ واقعہ صابری کے وحشیانہ گل نے بے حد افسردہ کر دیا۔ گویا ثابت ہوا کہ محبت اندھی بھی ہوتی ہے اور بہری بھی۔ حلیو کہہ مارنے کیسے شقی اقلیمی کی انتہا کر دی۔ سچ و ترش لہجے کے منظر و مصنف مہتر امام کا آخری صفحات پر تو شہنشاہ خاص ایک مسوم و سفاک تحریر۔ سیلاب نے کیا۔ گل۔ مکافات عمل اور تو انہیں انہی کا چشم کشا و عبرت اثر ماجرا۔ بیک وہی ناظم سبیل و نہار اور مالک و مختار لوگ و قلم ہے برکھا کا حسن پر فسون اور کالو ماجھی کی لازوال محبت نے متاثر کیا کالو کا انجام یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ قاسم ڈاکو نے کفادہ ادا کر کے راہ آخرت کو ہموار کر لیا۔ منظر و اسلوب کے بہترین مصنف طاہر جاوید نے گل کی دل نگاہ تحریر وہ ڈائریوں کی آگھوں سے پڑھی۔ انسان زندگی کے تعاقب و جستجو میں اتنا سطر کرتا ہے کہ مر جاتا ہے۔ انہیں بھی سینے کا خرابی مند اور خوشیوں کا طلب گار تھا کہ ابھی جام ہر بھرانہ تھا تک دست ساقی چمکتی پڑا۔ پسندیدہ مصنف کاشف زبیر کی نہایت دلچسپ و مستحق تیز نظریں و تحریر بدنام حصول زر کے لیے چند زر پرستوں کا ہمارے عبرت نہایت اثر انگیز رہا۔ خیر اس طرح تو ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی اثر انگیز تحریر "عصر شیشہ" بھی خوب رہی۔ سلیم انور کی نرم گوشہ کے کیا کہنے۔ نئی زمانہ ایسے لوگ خال خال ہی پائے جاتے ہیں جو اوروں کے لیے اپنا سب کچھ سچ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ تجویر ریاض کی قدر سے دلچسپ کوشش پاگل عورت بھی کامیاب رہی جبکہ راز اور ملاپ نے بھی بونہیں کیا۔ شرمیل کی جتنی بھی دلچسپ تھی۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی سوانح حیات کے ایمان افروز سلسلے کی ایک اور کڑی۔ تصوف کی زبان ایک نادر و نایاب تحریر ثابت ہوئی۔ کئیوں میں رضوان خولی کی محنت قابل داد ہے۔ بزم شعرو سخن میں باذوق قارئین کا عمدہ و منفرد انتخاب۔ اپنی مثال آپ ہوتا ہے آخر میں..... آخری صفحات کے لیے ہم ادارے سے تادل سے شمس لہا ک ناصر ملک

اور مرحوم کے خان سے ضرور لکھو ایں۔" (آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

یوسف سانول، نور پور قتل، صلح خوشاب سے تشریف لائے ہیں "بہت ہی خوب صورت سرورق تھا۔ پھر لہرت کو ملاحظہ کیا اور سلامتی کے داعی ایلیم صاحب کا سلامتی کا سبق پڑھا۔ یہ ہی سچ ہے جو ایلیم صاحب کہہ رہے ہیں۔ محفل یادیں میں انٹری۔ ہمیشہ کی طرح۔ ادارہ یعنی لفظوں کی مالامالی۔ زویا اجاز لاہور سے کرسی صدارت کی حق دار تھیں۔ خدا ان کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ محمد قدرت صاحب بھائی کی محنت یا پائی کی دعا کے لیے شکر ہے۔ ویسے میرے تصور میں آپ کا خاکہ بن گیا ہے کہ آپ بہت ہی اچھے ہوں گے۔ محنتی ناقص بہت ہی اچھی تاریخی کہانی ہے۔ بارون کا کردار بہت پسند آیا۔ نرم گوشہ سلیم انور نے عمدہ لکھی۔ واپسی پولیس ڈاکو، چور سب کے جذبات ہوتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کاشف زبیر کی بدنام ریمنڈ آرٹل کی چالاکی نے کہانی کو چار چاند لگا دیے سو دوائے جنوں، ڈاکٹر صاحب میر سے نبوت رائلز ہیں۔ بہت اچھا لکھا لیکن پڑھ کر دل اداس ہوا۔ اسرائیل امریکا بھارت تینوں ایک ہی جملے کے پتے بیٹھے ہیں۔ قلم جب بھی ہوتا ہے مسلم امرہ پر ہوتا ہے کیوں؟ دو ڈائریاں طاہر جاوید نے مٹل نے میرے ذمہ تازہ کر دیے کیونکہ پچھلے دنوں C.M.H. میں عاظم نامی جوان جو کہ چنڈی کار باہمی تھا، ڈیڑھ ماہ اپنے مٹ ہونے کے بعد فوت ہو گیا۔ 31 سال کا جوان مجھ سے کافی انسیت ہو گئی تھی وہ یاد آ گیا۔ چنگاوری ملک صاحب نے ایک بار پھر کس کے اصل مجرم کو پکڑ لیا۔ ویسے ملک صاحب سفر ہمیشہ گھوڑے یا تانگے پر ہی کیوں کرتے تھے؟ (یہ اس وقت کی بہترین سواری تھی) عصر شیشہ، ڈاکٹر شیر شاہ سید نے بہت ہی بار ایک بیتی سے اس سوڈی مرض پر لکھا جس کی وجہ سے ہزاروں گھر برباد ہو رہے ہیں۔ محفل شعرو سخن میں عاصم اقبال جیساں کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ پاگل عورت بس و اجبی سے کہانی تھی کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ ماروی اپنے تیر جو میں دور کو مکمل کر چکی یعنی جوان ہو چکی ہے۔ بہت بہتر انداز میں جاری ہے۔ ضیا تنسیم بگرا کی تصوف کی زبان بہت اچھا لکھا پڑھا ایمان تازہ ہوا۔ راز باہر نیم کا واپسی راز تھا بہت اچھا لکھا۔ دبیر کے شمارے کی بیسٹ کہانی سیلاب نے لکھی، اس کہانی میں برکھا اور کالو ماجھی کی محبت ایک آفاقی محبت کا مظہر تھی اور قاسم جیسے ڈاکو کا کردار متاثر کن تھا۔ فضل داد جیسے ڈیرے ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔ کئیوں نے اچھی لکھی، C.M.H. سے ڈسپارچ ہو کر ابھی جاہل پر ہوں۔ تمام دوستوں کا شکر یہ جنہوں نے ہمارے لیے دعا کی اور اللہ کا بھی شکر ہے۔"

شاداب اینڈ ماہ تاب گل رانا، راجن پور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اپنا پیارا سسٹن اس مرتبہ ساہجہ تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے حیرت انگیز طور پر 18 نومبر کو ہی مل گیا۔ بے ناکمال کی بات..... سادہ ہی فہرست کی رونق پڑ جانے والے نام میں بھی خوشی دے گئے کہ نظر بیا سادے پسندیدہ ہر انٹر حاضر ہیں۔ انشا یہ کا ایک، ایک لفظ سوتوں میں تولے جانے کے قابل تھا۔ اگلے ہی کا ابتدا یہ اس مرتبہ امید کے دیے جاتا ہو انہوں نے ہوا اور جناب محفل کی صدارت اس مرتبہ ایک قابل اور علم دوست شخصیت زویا اجاز کے سپرد تھی۔ مبارکبادی اتبرہ واپسی بہترین تھا۔ محمد قدرت اللہ ذرہ نواری ہے جناب کی۔ اگلے ہی اس ساری سوتی، سوتی کڑیاں کہاں گم ہیں۔ محفل کی رونق پڑ جانے والے رنگ پر تھے آج کل کہاں ہیں وہ اس آگ میں کبھی۔ کہانیوں کی ابتدا اخلاقیہ معمولی محنتی ناقص ہے۔ کی۔ ایلیم صاحب کے قلم کا جاوید ہم جی جمل لکھا۔ پھر کاشف زبیر صاحب کی بدنام پڑھی اور ہمیشہ کی طرح پسند آئی۔ اب بات ہو جائے اسٹوری آف دی منٹھ جناب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کے قلم سے لکھی گئی سو دوائے جنوں کی۔ اس تحریر نے تو آقا ہی میں اپنے سحر میں جکڑ لیا اور بہت مشکل موضوع پہ اتنا اچھا لکھا اور اس کو آگے لے کر چنانہ واقعی کمال کی بات ہے اور امید ہے کہ آگے چل کر یہ کہانی مزید گھرنے والی ہے۔ دو ڈائریاں جناب طاہر جاوید صلح صاحب کی تحریر دل پہ اثر کر گئی اور ایک ماں کے خواب آگھوں میں آنسو لانے کا سبب بنے۔ بہترین تحریر تھی۔ عصر شیشہ اپنے موضوع کی حساسیت کے حساب سے چھوٹی تحریروں میں نمبروں رہی۔ شعروں میں اسد عباس اور زویا حبیب احمد ملک کے اشعار بہترین تھے۔ پاگل عورت و تجویر ریاض صاحب کا انتخاب بھی اچھا لگا۔ بارہ نیم کاراز واپسی راز و ماجوک بالکل آخر میں انشا ہوا۔ تجنیش م جمل کی زبانی پڑھ کے مزہ آیا اور کبھی بھی۔ بلاشبہ کرل کا منصوبہ بہترین تھا اور آخری صفحات پر مہتر امام صاحب کی سیلاب نے لکھی اچھی کاوش تھی۔"

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لہ سے حاضر ہیں "محفل خاص نہ ہوتے ہوئے بھی خاص تھا۔ جون ایلیم ایک بڑے بڑے معاشرتی عیب کی طرف توجہ دلو اتے نظر آئے۔ زویا اجاز اپنے منہ میں مشورتی نظر آئیں۔ بہر حال مبارکباد قبول کریں۔ ابرار وارث یار میں تو اکثر شمارہ لیٹتا ہے آپ کو نائل گمراہ موسیقیوں کی؟ اچھی خاصی تو تھی۔ طاہر جاوید مٹل کی دو ڈائریاں دل میں اتر جانے والی تحریر تھی۔ ماروی نے نیارنگ بدلا ہے اور مراد کا بیٹا اس کی گود میں ہے اور محبوب ملی چائے پکڑ لگتا ہے اکیلا ہی رہتا ہوگا۔ تصوف کی زبان میں ضیا بگرا کی صاحب آئے۔ خدا کی محبت اور عشق میں سب کو بھلا دینے والے بزرگ ابو سعید کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سیلاب نے کیا میں مہتر امام صاحب آئے اور چھا گئے۔ خدا ان آفات سے بچائے۔ اپنوں کو اپنی آگھوں کے سامنے مرے دیکھنا قیامت ہے۔ قاسم ڈاکو کی احسان دوستی نے برائی میں اچھائی کو واضح کر دیا۔ مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ برکھا واپس لوٹ گئی۔ ایک ہی ہمت کے ساتھ اور عہد کو چھوڑ گئی۔"

ابرار وارث، سندھیلوانولی سے پلے آرہے ہیں "سسٹن اس وفد بہت جلدی... مل گیا۔ رسالے کا آغاز حسب معمول آخری صفحات والی کہانی سیلاب نے کیا سے شروع کی۔ ہوس زن اور ہوس زر پر وہیوں کا استحصال کرنے والوں کی عبرت انگیز داستان پڑھنے کو ملی۔ فضل داد کا انجام اس سے بھی برا ہوتا چاہیے تھا۔ برکھا بے چاری کو بچے تول گئے لیکن شوہر۔ اسے چاہیے تھا کہ عہد کا ہاتھ تمام لیتی۔ ماروی کی یہ لفظ انتہائی فضول تھی۔ سو دوائے جنک کے جہاں نماز کا اہتمام مراد کرتا ہے۔ واپسی نمازی اسے بے حیائی اور برے کاموں سے بچا سکتی ہے۔ دوسری سلسلہ دار کہانی سو دوائے جنوں پڑھی جہاں سیدنی طاقتوں کے کمزور عزائم اور گندے چہرے دیکھنے کو ملے۔ امریکا جو خود کو پھر پاؤ اور امن کا پرستار کہنے کا دعویٰ کرتا ہے کیسی کیسی



شکار ہے۔ اب تو محبوب کی آزمائش ہی شرط اول ہے نواب صاحب۔ مرینہ کے ارادے نیک نہیں۔ دو ڈواڑیاں، بدنام اور عطرشیشہ قابل تعریف تھیں۔ محفل شعر و سخن میں قیصر اقبال، بابر عباس اور محمد صفدر معاویہ کے اشعار پسند آئے۔ کتر لوں میں رضوان کے انتخاب قابل ستائش ہیں۔

اسد عباس، سرگودھا سے حاضر ہیں۔ ڈیمبر کا سنس 17 نومبر کو ہی مل گیا۔ محفل کی حسینہ شاہ میری جدائی میں پریشان تھی۔ مخطوط کی محفل میں سب سے پہلے اپنے خط کو تلاش کیا۔ اپنا خط دیکھ کر وہ خوشی ملی جو کسی ملازمت پیشہ کو پہلی تاریخ کو تلاش ملنے پر ملتی ہے۔ زویا اعجاز کرمی صدارت پر ارجحان ہیں۔ مبارک! کہانیوں میں سب سے پہلے ملک صاحب کی چنگاری سے انصاف کیا۔ خلاف توقع یہ کیس ملک صاحب کے لیے بہت آسان ثابت ہوا۔ کاشف زبیر صاحب کی بدنام، بہت سے اتفاقات کا مجموعہ تھی۔ ریسنڈ کی خوش قسمتی کہ وہ ہر آزمائش سے بچ نکلا۔ نرم گوشہ محض مگر پڑا اثر تحریر تھی۔ دو ڈواڑیاں بلاشبہ ایک اچھی کاوش تھی۔ ایک ماں کا دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جس کا جوان بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا ہو اور اب اس شاعر کی سب سے بہترین کہانی تھی، بلاشبہ کرمل کی پانچ ٹول پر فخر تھی۔ کرمل کی بد قسمتی کہ عین وقت پر نیم پلٹ کر گئی اور اس کا منصوبہ ٹل ہو گیا۔

قیصر اعوان اینڈ عرفان جی سیال، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ سرورق نے کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا۔ انٹائیپ میں جون ایلیا کی سلامتی کی راہ نے واقعی انسان کو سلامتی کی راہ دکھائی مگر انفس ہم سب ہی اپنی ذات کے غول میں قید ہیں۔ انٹائیپ کے بعد حاضر ہوئے جگر گوشوں کی محفل میں۔ کرمی صدارت پر یہاں تو دیا اعجاز کو براہیمان پایا۔ یہاں مبارکباد قبول فرمائیں۔ مسلسل بیک لسٹ کی منت نے دل توڑ دیا اس لیے بس خاموش قاری تک محدود ہو گئے۔ یہاں ہم تو دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہم قیدیوں کو دعاؤں میں یاد رکھا۔ نام آپ کی پرائیویسی کی وجہ سے نہیں لکھ رہے مگر امید کرتے ہیں آپ ضرور سمجھ جائیں گی اور آپ کا بتا یا ہوا وظیفہ ہم لوگ کر رہے ہیں۔ آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ محمد قاسم آپ کے عقین کو داد دینی پڑے گی۔ محمد یوسف آپ پریشان مت ہوں۔ بیٹھیں محفل سے کہیں غائب نہیں ہوتیں بس ذرا دیر سویر ہو جاتی ہے۔ سید جمیل بیٹی کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آقا فرید یہ محفل نوک جھوک کے بغیر بھی چمکی نہیں بس ذرا ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ محفل صاحب کے دیوانوں کی کمی نہیں۔ اشعار میں بختاور بلوچ صفدر معاویہ کے اشعار پسند آئے۔

محمد قاسم رحمان، ابرار کالونی ہری پور سے شرکت کر رہے ہیں۔ محفل اس مرتبہ کچھ خاص نہ تھا۔ سب سے پہلے اپنے خط کو تلاش کیا جو فوراً مل گیا۔ تھینکس آپ میرے خط شائع کر کے میرا حوصلہ اور بلند کر رہے ہیں۔ کرمی صدارت زویا اعجاز آئی کوئی۔ تبصرہ بہت زبردست اور جامع تھا۔ وزارت کا عہدہ قدرت اللہ نیازی کو ملا۔ علی رحمان آپ بارہ سال کے بچے ہیں۔ آپ کو رسالے پڑھنے چاہئیں مگر پہلے اسٹڈی پڑھنا دینا چاہیے۔ میری عمر سو سال ہے مگر گھر والوں سے چھپا کر بہت مشکل سے رسالے پڑھتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لوگ ماروی بہت تنقید کر رہے ہیں مگر یہ سنواری میری نیورت ہے۔ اس مرتبہ کی قسط نے بھی بہت متاثر کیا۔ ماروی مراد سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ چنگاری نام مجیب صاحب کا قلم ہے۔ بہت اترنٹ۔ رائٹری بات پڑھیں ہی متفق ہوں آج کل یہ ہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ خدا کی پناہ ایک چودہ سال کے بچے کا بھی کسی سے فیئر چل رہا ہے اور ہم اس کو ماڈرن ماحول کا نام دیتے ہیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔

طاہرہ فخرارہ پشاور سے پہلی آ رہی ہیں۔ کسی نے کیا سچ کہا ہے کہ آنکھ اور جمل پڑا او جمل۔ وقت اور انسان کسی کا نہیں ہوتا۔ مجال ہے جو کسی نے میری غیر حاضری کو سمجھا۔ میں نے تو سنسن پڑھنا بھی نہیں چھوڑا۔ دوستوں میں صرف رضوان عولی نے میری کمی محسوس کی۔ کوئی یاد کرے یا نہ کرے۔ سنسن میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ (یہ ہوئی ناہیات) پہلے انٹائیپ میں جون ایلیا سلامتی کی راہ پڑھا۔ بہت اثر انگیز اور پُر دہا انٹائیپ ہے۔ کاش ہم جون ایلیا کے کہنے کے مطابق سلامتی کی راہ پر چلیں۔ محفل اعظم بہت جلد ایک لمبا سلسلہ اور کہانی لے آ رہی ہے۔ اف طاہر جاوید محفل یہ کیا موڈی مرض کیسے کے بارے میں دو ڈواڑیاں تحریر کیں۔ 17 نومبر کی شام مجھے سنسن ملا اور جب آپ کی تحریر پر نظر گئی تو کہنے کی حالت میں آ گئی۔ اسی موڈی مرض نے تو انہیں کی طرح میرے شفیق باپ جیسے ماموں کو 12 نومبر کے دن ہم سے علیحدہ کیا۔ آپ کی ساری تحریر میں نے روتے ہوئے پڑھی۔ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ اسپتالوں میں بھی نفسا نفسی ہوتی ہے۔ نواب انکل تو اب ماروی کو کچھ اور ڈر پہ لے گئے۔ مراد جیسے گاؤں کے سید سے سادے بندے کو پہلے مجرم بنا دیا اور اب اسے بد کرداری کا جیسا بھی لگا دیا اور مرینہ کو تو عورت کم اور طوائف زیادہ دکھایا گیا۔ مظهر امام کی تحریر سیلاب لے گیا، ہمارے معاشرے کے دو حتمی دروہوں کی عکاسی کرنے والی ایک شاہکار تحریر ہے۔ ویلڈن مظهر امام صاحب۔ تصوف کی زبان ضیا نسیم بلگرامی کی تحریروں کی تعریف میں کچھ لکھنا تم از کم میرے قلم میں اتنی طاقت نہیں۔ یہ سمندر کو کوڑے میں بند کرنا ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سیدی کی تحریر عطرشیشہ نے دلزلہ 2005ء کی یاد پھر تازہ کر دی۔ ملک صفدر حیات کا ایک اور کامیاب کس چنگاری جو ایک مرد کی جموئی محبت اور ہوس کا ایک تازیانہ مرد اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ کتر نہیں اور اقوال زریں بہت زبردست ہیں۔ اشعار معیاری تھے، امید کرتی ہوں کہ دل سے ویلکم کیا جائے گا۔ (ویلکم بیک)

عادل خان، ضلع صوابی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ سنسن میں ایک طویل عرصے بعد حاضر ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ جس طرح الیاس بیٹا پوری مرحوم، اختر نعمانی مرحوم، عبدالقیوم شاہ مرحوم، اقبال کاظمی مرحوم کے قلمی شہ پارے وقتاً فوقتاً دوبارہ دہیے رہے اسی طرح محفل صاحب کے قلم پارے بھی دیا کریں تاکہ نئے پڑھنے والوں کو بھی ان کے قلم کی روانی کا پتا چلے۔ الیاس صاحب کے بیٹی ہال، چنگیز و ہلا کو خان کے بارے میں لکھے گئے سلسلہ وار ناول بھی دوبارہ دیں۔ اس دفعہ تراجم میں کاشف زبیر صاحب کی بدنام اچھی تھی۔ سو داے جنوں، قسطنطنیہ اور سرائیل کے تناظر میں زبردست شروعات بڑا مزہ آیا لیکن ماروی متاثر کرنے میں ناکام۔ آخری صفحات پر مظهر امام صاحب آئے جن کا نام ہی معیار کی ضمانت ہے۔



احسان سحر، زادے خیلاوال، میانوالی سے پہلے آ رہے ہیں۔ کچھ اچھا ہونے والا ہو تو داہمیں آنکھ پھڑکتی ہے اور اس کا ثبوت بھی ہمیں مل گیا جب 16 ستمبر میں مل گیا۔ جون ایلیا مرحوم کا انٹائیپ پڑھا۔ پتا نہیں پہلے انٹائیپ اور اب کے انٹائیپ میں فرق کیوں محسوس ہوتا ہے۔ (شاہ زمانے کا فرق ہو) گلستان میں داخل ہوئے۔ زویا اعجاز ایچھے اعزاز میں خوشبو بھیرتی نظر آ گئی مبارک ہو۔ رضوان پر اور زاس دفعہ آپ کا انداز جیسا رہا۔ عشق ناقص کا پہلا حصہ کافی خوشگوار اثر چھوڑ گیا۔ ہارون اور عزیزہ کا عشق کیا گل کھلتا ہے۔ یہ تو آگے معلوم ہو گا۔ نرم گوشہ خوب صورت تحریر تھی۔ بدنام، بھی ستا کر رہی۔ ریسنڈ میں سب لوگوں کا مصنوعی کردار آخر حقیقی کردار بن ہی گیا۔ سو داے جنوں، برسوں بعد اسکی شاہکار تحریر پڑھنے کو ملی۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ دو ڈواڑیاں بہت ہی خوب صورت اور دلچسپ کہانی رہی۔ ملک صاحب بھی اس دفعہ بیک بھٹکے اور چیدگی سے بہت کرکس لے کر آئے۔ شروع سے اینڈ تک دلچسپی برقرار رہی۔ محبت کی آڑ میں لایج اور ہوس بھی تمام ہوئی۔ عطرشیشہ میں ڈاکٹر صاحب گزرے زلزلے کی یاد تازہ کر گئے۔ وہ زلزلہ جس کے آثار ہمیشہ دلوں میں قید رہیں گے۔ پاگل عورت ایک نفسیاتی عورت کی کھاری۔ ماروی میں اس دفعہ کچھ خاص نیا پن پیدا نہ ہوا سو اے جنسی اور بغاوت کے۔ ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی ہے کہانی۔

زیر حسن، اجمیر، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے کہ میں سال میں صرف ایک بار سنسن میں حاضری دیتا ہوں۔ سنسن کا پورا شمارہ تو نہیں پڑھا۔ سکاٹین سب سے پہلے اپنے محبوب مصنف محبت کے شہنشاہ طاہر جاوید محفل صاحب کی تحریر کو آنکھوں کے رستے دل میں اتارا۔ آہ..... کیا دور بھری تحریر تھی۔ پتا نہیں طاہر صاحب اتنی جذباتیت سے بھر پور لا دینے والی تحریریں کیسے لکھتے تھے ہیں۔ سبکی وجہ ہے کہ اس عجیب کے سفر کھلانے والے سے مجھے اک بے نامی عقیدت ہے۔ میں جب بھی ان کی کوئی تحریر پڑھتا ہوں اک مجب ہی لذت آسانی سے دو چار ہوتا ہوں۔ مظهر امام کی تحریر سیلاب لے گیا بہت زبردست تھی۔ سیلاب کی ہولناکیاں اور تباہ کاریوں سے ہر کوئی واقف ہے۔ وہ حقیقت سیلاب اور زلزلے اللہ کا عذاب ہیں۔ مجھے وہ رات زندگی بھر نہیں بھولے گی جب میں اپنے گاؤں حویلی بہادر شاہ میں تھا اور اچانک رات کے دو بجے شور مچا۔ گلے والے ایک دوسرے کو خبردار کر رہے تھے۔ مسجد میں اعلان ہو رہے تھے کہ بھونٹ گیا ہے۔ بہت بڑا پانی کا ریل آ رہا ہے۔ اس وقت کی کیفیت کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بظاہر تسلیاں دے رہے تھے لیکن اندر کی کیفیت سب کی ایک جیسی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔ آخر کار ہم سب گاؤں خالی کر کے اپنے اپنے رشتے داروں کے گھر چلے گئے پھر دو دن بعد شریفی کی اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا گاؤں بچ گیا ہے تو ہم واپس آئے۔ کچھ فضل داد جیسے لوگ اللہ کے عذاب کو دیکھتے ہوئے بھی تو نہیں کرتے۔ زویا اعجاز کو آخر میں مبارکباد۔ کرمی صدارت ایک مہینے کے لیے آپ کی ہوئی۔ باقی ڈاکٹمنٹ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ آپ سے سو ڈباتا اتنا س ہے کہ پلیز محبت کے شہنشاہ محفل اعظم صاحب سے محبت، ورد اور جذبات بھری داستان سنسن کے آخری صفحات پر لکھو ایں۔

گلش عروفت، انارکلی سے محفل میں شرکت کیا۔ 18 ماہ کے بعد گل مروت ایک مرتبہ میرے ہاں حاضر ہوئے۔ سب کچھ حالات وہ واقعات نے اور زندگی کی مصروفیات نے حاضر ہونے کا وقت نہیں دیا۔ زویا اعجاز کو بہترین تبصرے پر مبارک۔ قدرت اللہ، قاسم اللہ، یوسف اللہ، اسد اللہ، صفدر اللہ کے تبصرے بہترین تھے۔ سید جمیل کو ایک مرتبہ پھر گڑیا کی مبارک۔ آغا لالہ کو ایک بار پھر محفل میں ویلکم۔ شوکت شہریار آپ کہاں غائب ہیں۔ پلیز واپس آئیں۔ کہانیاں سب کی سب اچھی لیکن نرم گوشہ سو داے جنوں، ماروی، دراز اور آخری اسٹوری سیلاب لے گیا بہترین تھی۔ محفل شعر و سخن میں بابر عباس، انجم، قدرت اللہ کے شعر عمدہ انتخاب تھے۔ میری طرف سے آپ سب کو ویلکم سلام۔

شوکت شہریار، ادا کاڑہ سے 3 ماہ کی طویل قیصر حاضری کے بعد پھر سے محفل میں حاضر خدمت ہیں۔ سب سے پہلے تو اپنی پیاری دوست اور سنسن کی تبصرہ نگار گل مروت کو شادی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے (آمین) محفل گرل اس مرتبہ کچھ خاص تھی محفل میں داخل ہوئے تو زویا اعجاز کو پورے مطراق کے ساتھ بڑی شان سے کرمی صدارت پر براہیمان دیکھا۔ زویا بیٹی آپ کو مبارک ہو۔ آخری بھائی تصدیدی خط لکھنے سے پہلے آپ پوری کہانی تو پڑھ لیتے یار۔ طلحہ رحمان محفل صاحب کے دیوانے تو ہم بھی بہت ہیں۔ پڑھ کر کیا کہتے ہیں کہ میں دل کی دل میں رکھتا ہوں۔ سب سے پہلے سنسن ناقص پڑھی بہت اچھی لگی لیکن اینڈ میں جاری ہے کا لفظ دیکھ کے اپنا سامنے لے کے رو گئے۔ نرم گوشہ میں ایک پولیس آفیسر کی سوچ بہت اچھی لگی اور ذہنی کو باعزت زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔ بدنام کاشف زبیر کی ایک بہت اچھی تحریر تھی۔ آخر میں این ریسنڈ، جنین اور ریویج میں ایک خاندان بن گئے۔ سو داے جنوں کی پہلی قسط شاندار لگی۔ سبھی جیسی محب وطن ویشیاں ہوں تو یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی۔ انشا اللہ۔ طاہر جاوید کی دو ڈواڑیاں ایک سبق آموز تحریر تھی۔ کینسر اسپتال صرف امیروں کے لیے بنا یا گیا ہے کیونکہ مجھے ذاتی طور پر بھی اس کا تجربہ ہے۔ ملک صفدر حیات نے اس مرتبہ رسبو کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ عطرشیشہ ہمارے معاشرے کی بے حسی کا مست یوں ثابت ہے۔ پاگل عورت میں ملی واقعی پاگل تھی۔ ماروی کی یہ قسط اس مرتبہ شاندار تھی۔ محفل میں کرمل کی بد قسمتی میں اس کو لے ڈوئی۔ پانچک بہت اچھی تھی۔ آخری صفحات پر سیلاب لے گیا دل کو متاثر کر گئی۔ قاسم جیسے لوگ واقعی لاکھوں شریف لوگوں سے بہتر ہیں۔ فضل داد جیسے جاہر جاگیر دار کا انجام اچھا لگا لیکن آخر میں کہانی کا انجام کچھ اچھا اور سادہ سا لگا کہ بیکھا کو زندگی گزارنے کے لیے ایک مرد کا سہارا تو ضروری تھا۔

سعدیہ بخاری، انک سے تبصرہ کر رہی ہیں۔ لیجئے جی کچھ عرصے کی غیر حاضری کے بعد کسی کا حق باقی مارنے کے لیے اپنے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ 20 نومبر کو سنسن کا دیدار ہوا۔ محفل کو کچھ کتر آنکھوں میں موٹا اثر آیا (غدا خواست) کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر انکل کی نظر اور ذوق نظر کو۔ محترم جون ایلیا ہمیں سلامتی کی راہ دکھا رہے ہیں۔ ادارے میں آپ نے جن موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس پر اتنا کہتا کافی ہو گا کہ عوام

عشق نما

الیاس سیتاپوری

اگر کتابیں لکھنے کا رجحان طاقتور نہ ہوتا تو آج کوئی تاریخ سے واقف بھی نہ ہوتا... اوراق کتاب کے ہوں اورواقعات ماضی کے... تو پڑھنے والا مستقبل کی سوجھ بوجھ بھی پالیتا ہے... تاریخ صرف بادشاہت کے اصول یا سیاست کی نیرنگی سے ہی واقف نہیں کراتی بلکہ دلوں کے بھید اور خواہوں کی تعبیر بھی بتاتی ہے... اس کی آنکھوں میں بھی کچھ خواب تھے مگر وہ رشتوں کے گرداب میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ کسی ایک سمت جانے کا فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا... کیونکہ ہررشتہ اس کے پیروں کی زنجیر تھا۔ اس کے کاندھوں پر اگرچہ ایک اہم عہدے کی ذمے داری تھی لیکن مشکلات کے باوجود وہ کسی رشتے کو چھوڑنے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ دولت کی ریل پیل نے اپنیوں کو دشمن اور دشمنوں کو اپنا تو بنا دیا تھا مگر قسمت کا یہ فیصلہ اسیے منظور نہ تھا۔ اسے تو بس اصل چہرے دیکھنے کی تمنا تھی... کیونکہ وہ ایسا نہ کرتا تو اپنے لخت جگر کو کھو دیتا جو اصل میں اس کا وارث تھا۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے میزہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال و زر اور درہم و دینار سے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اسے خوفزدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے بہنوئی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس کرتا رہتا تھا کہ وہ کسی دن بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو بھی بار بار یہی سمجھایا کہ وہ اپنے داماد سے ہوشیار رہے اور میزہ کو بھی خبردار کیا کہ اس کے بہنوئی سے چوکنار ہے لیکن میزہ جو اب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں، شادی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوگی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا۔ ”میزہ! وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔“ میزہ نے بات نہی میں اڑادی۔ ”وہ کیا بدلہ لے گا۔“

ہارون اور میزہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع شروع میں میزہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا، صاف ستھرا رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ کے کاموں میں شامل تھا۔ رات کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتی۔ عامر کسی بات پر روٹھتا تو میزہ سوچن کر کے منالیتی۔ ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔ میزہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع بنی۔ وہ مال و زر اور درہم و دینار کو اپنے ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات میزہ کو..... ناپسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے یہ بوڑھا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بنا بیٹھا ہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرح سے بے دخل کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بری طرح اپنے قبضے میں کیا ہوا تھا کہ اب وہ دادا کے پاس جاتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر



کر سکتا جو نیزہ کی محبت کے پیچھے کارفرما ہے لیکن تو ذرا اور بڑا ہوئے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔"

نیزہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھا تو بیٹی کو سمجھایا۔ "نیزہ! تو ہوشیار رہ، یہ عیار انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا سکھا پڑھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سرکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

نیزہ نے برا مان کر جواب دیا۔ "ادا جان! میں آپ کی یہ بات بھی نہیں مانوں گی۔ میں عامر کو چاہتی ہوں، از حد، بے حد، بہت زیادہ اور یہ ناممکن ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے دے۔"

باپ نے افسوس سے کہا۔ "میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سوچتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے۔ تو اس کے ساتھ کچھ بھی کر لے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہوگی تو تو اس پر پوری طرح اعتبار کر سکتی گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی مانتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔"

لیکن باپ کی نصیحتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دیر بعد جب وذا کا بورنگا یا بنا ہوا عامر نیزہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں نیزہ کی محبت کا طوفان برپا تھا۔ آج اس وقت اس کو نیزہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح نیزہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ مصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھالیا اور بچھنے بچھنے کر پیار کرنے لگی۔ عامر بھی نیزہ کی گود میں بیہوش ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہارون خراسان چلا گیا، وہاں وہ شورشوں اور ہنگاموں میں یوں الجھا رہا کہ گھر کا ہوش ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی اپنی خیریت سے نیزہ کو مطلع کر دیا کرتا۔ دوسری طرف نیزہ کا باپ آذر بائیجان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کارنامے دکھائے کہ خلافت کی طرف سے انعام و اکرام کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ یہیں ہارون کا بہنوئی بھی تھا۔ اس نے نیزہ کے باپ سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا۔ "تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ نیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری فلفلی یا خوش نہیں ہے۔ نیزہ سب سے زیادہ آزرہ اور ناخوش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پکلی بیوی کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی لڑکے کی وجہ سے

بڑے کبھی کی راتیں۔ کوئی ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب میں تجھے تیری اہانتوں کا جواب دے سکوں۔"

نیزہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ "ادا جان! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کدورتیں زندہ رہیں گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔"

ہارون کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا۔ بولا۔ "ادا جان! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ ذرا صل سے کام لیجئے۔ اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔"

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا۔ "مجھے تیرے مشوروں کی کوئی ضرورت نہیں ہارون..... تو خاموش رہو ورنہ میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دوں گا۔"

نیزہ کو رونا آ گیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کونے میں چلی گئی اور وہاں جا کر رونے لگی۔

ہارون کے باپ نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند گجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ ہارون کے باپ نے عامر سے پوچھا۔ "بیٹے عامر! میں کیسا ہوں؟"

عامر نے فوراً جواب دیا۔ "مہمان، سب سے اچھے۔"

باپ نے سرگوشی میں دوسرا سوال کیا۔ "اور یہ دوسرا بوڑھا جو نیزہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟"

عامر نے فی الفور جواب دیا۔ "برا، آپ سے لڑتا جو ہے۔"

دادا نے پوتے کی پشت تھپتھپائی اور تیسرا سوال کیا۔ "تیری بیٹی کی ماں کیسی ہے؟"

عامر نے جواب دیا۔ "اچھی، بہت اچھی۔"

اور وہ رونے لگا، بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر۔

ہارون کے باپ کو شبہ گزرا کہ شاید نیزہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر نیزہ سے متعلق سوالات پر رونے لگا۔ اس نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "میرے بچے عامر! تو مت گھبرا، اگر نیزہ نے تجھ کو ستایا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔"

عامر نے برا مان کر جواب دیا۔ "ادا جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں۔ میں تو اس لیے رورہا ہوں کہ کتنی میری یہ ماں بھی مجھ سے روٹھ کر نہ چلی جائے۔"

دادا اس جواب پر چونک پڑا۔ اسے اپنے سارے منصوبے و درہم برہم ہوتے نظر آئے، بولا۔ "میرے مصوم بچے! تو ان چالاکیوں اور عیاروں کو ابھی نہیں محسوس

کے فضل سے تو سمجھ دار انسان ہے، بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔"

ہارون باپ کی باتوں پر کٹنا جا رہا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا۔ "ادا جان! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ نیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔"

باپ نے جواب دیا۔ "ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک بچی ہات کہہ دی ہے، یوں بھی مشہور ہے الحق بر (سچائی کڑوی ہوتی ہے۔)"

نیزہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی، بولی۔ "ادا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جائیے۔ یہ گھر مہمانوں کے لیے تنگ ہے۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا۔ "مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ بازوں کے لیے کہہ۔ نیزہ! میں تیرے باپ کے ارادوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں لاپچی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا جب تک میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کر لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔" پھر اپنے ہاتھ ایک کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولا۔ "افسوس کہ میں یہاں آ کر محبت شرمندہ ہوا۔ اگر میں انسانی مع اور خود غرضی کی خباثیوں پر ذرا سا بھی غور کر لیتا تو شاید اس شرمندگی، خجالت اور ذلت سے محفوظ رہتا۔"

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا۔ "خوب، یعنی میں خود غرض، طامع اور حریص ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی تجھ سے....."

ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ باپ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "ادا جان! ویسے یہ ہے بڑی زیادتی کی بات، آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی ہے۔ آپ کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیے۔"

باپ بیٹے پر برس پڑا۔ "تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ ایسا نہیں ہو سکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہو سکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے نیزہ سے شادی کی ہے، اس لیے یہ نیزہ کا گھر ہے۔ نیزہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ مہمان بن کر آسکتا ہے۔ اس گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔"

نیزہ کا باپ تھملا کر چیخا۔ "جی بھم کے اہانتیں کر لے، جتنا چاہے بولتا رہ لیکن یہ مت بھول، کبھی کے دن

اب تو وہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

کچھ دنوں بعد نیزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہارون کا سب کچھ اس کی بیٹی نیزہ کے قبضے میں ہوگا لیکن یہاں اپنی بیٹی کو اپنے شوہر کے باپ کا دست بگردیکھ کر افسوس ہوا اور اپنی بیٹی کی حماقت پر غصہ بھی آیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹی نے گھر کی ہر چیز اپنے قبضے میں کر لی ہوگی لیکن یہاں یہ دیکھ کر پریشان اور گھرمند ہو گیا کہ نیزہ کی حیثیت ثانوی رہ گئی تھی اور اس گھر میں جو کچھ بھی تھا، ہارون کے باپ کا تھا۔

ہارون کے باپ نے نیزہ کے باپ کو خشکیوں نظروں سے دیکھا کیونکہ اس نے نیزہ کے باپ کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں خطرات محسوس کر لیے تھے جو نیزہ کے باپ کے دل و دماغ میں پرورش پا رہے تھے۔ اس نے اپنے مہمان کا استقبال خوش دلی سے نہیں کیا۔ نیزہ کے باپ نے بھی اس کدورت کو محسوس کر لیا۔ اس نے زمانہ سازی سے کام لیا۔ بولا۔ "شاید یہ شادی پہلے ہو جاتی اگر مجھے یہ معلوم ہو گیا ہوتا کہ تو نے اپنے بیٹے کو نیزہ سے شادی کرنے کی اجازت دے دی ہے کیونکہ مجھ کو ہارون سے بھی کوئی شکایت ہی نہیں رہی۔"

ہارون کے باپ نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے یہ سوچ کر یہ رشتہ قبول کر لیا کہ میں نوجوانوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھنا ہی چاہیے۔"

نیزہ اپنے باپ کے ساتھ برتی جانے والی سرد مہری کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ رات کو ایک ہی دسترخوان پر سب ایک ساتھ بیٹھے۔ ہارون نے کھانے کے دوران نیزہ کے باپ سے کہا۔ "کچھ دنوں بعد میں خراسان واپس چلا جاؤں گا۔ میری رائے میں آپ بھی یہیں نیزہ کے پاس آجائے، دل بہلا رہے گا۔"

لیکن نیزہ کے باپ نے ابھی جواب دیا بھی نہ تھا کہ ہارون کا باپ بول اٹھا۔ "گھر تو بس اپنا ہی ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ اپنے گھر کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہ لو تو میں صاف انکار کر دوں گا۔"

نیزہ کے باپ نے اپنے گال پر طمانچہ محسوس کیا۔ ہاتھ کا نوالہ منہ تک نہ لے جا سکا، بولا۔ "اپنا گھر کے نہیں اچھا لگتا لیکن تو نے جس طرح اور جس موقع پر اپنے گھر کی تعریف کی ہے میرے لیے یہ تعریف گالی بن گئی ہے۔ اب تو ہم دونوں ایک ساتھ کہیں بھی نہیں رہ سکتے۔"

ہارون کے باپ نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "خدا

ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔“

میزہ کے باپ نے ازراہ شکایت جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی نا انصافی کی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میزہ آج تیری بیوی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ ہوتا۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیر اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رہی جائے گی۔“

میزہ کا باپ چونک کر بولا۔ ”یہ بات تجھ کو کس نے بتائی؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”مجھ کو یہ بات کون اور کیوں بتائے گا۔ مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہوئیں۔“

میزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”اچھا ذرا اس کی وضاحت کر دے کہ میزہ بے اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ میری میزہ کو لا ولد رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہوگا؟“

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”اگر تو اجازت دے تو گفتنی اور ناگفتنی کھل کر کہہ ڈالوں۔“

میزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے بہ مشکل دریافت کیا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتا دے؟“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔ ”جناب والا! ہارون اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ میزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے عامر کو ہمیشہ میزہ کی محبت حاصل رہے گی۔“

میزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا حساب لگا یا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر میزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوئی کی باتوں پر پورا پورا یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ میں جھلنے لگا، آہستہ سے بولا۔ ”تو یہ بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنا دوں گا اور دیکھوں گا میری میزہ اولاد سے کس طرح محروم رہی جاتی ہے۔“

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اشاروں کنایوں میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے؟ اس نے میزہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد محض پہنچ رہا ہے، اس لیے وہ بھی محض پہنچ جائے تاکہ چند نہایت ضروری باتیں کی

جاسکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی سازش کا پتا چلا ہے جو میزہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش کا اثر ہے کہ میزہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

میزہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہوئی۔ میزہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش محسوس کر رہی تھی لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس ہونے لگی تھی کہ عامر کو اس کا دادا بری طرح ورغلا تا رہتا تھا۔

دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا دل میزہ کی محبت سے خالی اور محروم رکھے۔ اس نے سوسو طرح سے بیٹی باور کرا دیا کہ میزہ اس کی اپنی ماں نہیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے، محض بناوٹی ہے۔ وہ اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس مال و زر اور درہم و دینار پر قبضہ کر لے جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملنے والا ہے۔ اس نے عامر کو یہ سبق بھی پڑھایا کہ عقل مند لوگ دولت اور درہم و دینار کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔

جب اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے یہی سبق دیے گئے تو عامر کے دل میں بھی ذرا سافرق آ گیا۔ اب وہ میزہ کے طرز عمل میں اس کے صنم، عیاری اور فریب کو تلاش کرتا رہتا اور نفا سازان ان میں سے کوئی نہ کوئی نئے میزہ میں پالیا کرتا تھا۔

ہارون خراسان میں رہتا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ یہاں اس کو اچانک اپنے بہنوئی کا خیال آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی ذہنی سانپ کی طرح ہے جو کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے چنانچہ اس نے میزہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطور خاص یہ ہدایت کی کہ اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو میزہ اس کے سامنے نہ جائے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی بات کرے کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا کہ اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا کٹڑا عامر کے لیے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے میزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ

خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی محبتیں نچھاور کر رہی، اس کو ہارون یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دادا کا خاص خیال رکھے کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ میزہ نے سوچا، وہ خود جس تنہائی اور اکیلے پن کے کرب سے دوچار ہے، کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟

اس نے چڑ کر ہارون کو لکھ دیا۔

”ہارون! میں چند ماہ کے لیے محض جاری ہوں کیونکہ وہاں میرا باپ آذربائیجان سے پہنچ رہا ہے۔ میں محض تنہا جاری ہوں کیونکہ عامر کا اپنے دادا کے پاس رہنا بہت ضروری ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دادا کا بہت خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔“

ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیار دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص خیال رکھے اور مجھے اکیلا پن نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظر انداز کر دیا۔ کبھی میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہر حال میں محض جاری ہوں اور وہ گنتی یہ بات کہ تیرے بہنوئی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے باتیں نہ کروں تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی کچھ کرتی۔

”ہارون! میں بہت ادا ہوں اور یہ ادا ہی اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ یا تو خود چلا آ یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک چٹا دے کیونکہ میں اب اس نیچے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے ہی کو پینا کہہ سکتی ہوں، اسی پر ناز کر سکتی ہوں اور اسی سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ ورغلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال و زر اور درہم و دینار کو جبراً تقسیم کرائے گا جس پر تیرا باپ سانپ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک چٹا ہے جس کو میں حاصل کر کے رہوں گی۔ آ، جلد آتا کہ میں تجھ سے ایک چٹا، کم از کم ایک چٹا حاصل کر سکوں۔“

خراسان میں جب یہ خط ہارون کو ملا تو اس کو شبہ گزرا کہ میزہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی سازش سے کسی نے مطلع ضرور کر دیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ

عشقی نامہ

کرتی۔ وہ اپنے بہنوئی سے بہت زیادہ خوف زدہ تھا اور اس کو یقین تھا کہ میزہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے بہنوئی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود دمشق نہ پہنچ جائے میزہ دمشق نہ چھوڑے۔ وہ اسے محض خود پہنچانا چاہتا تھا اور میزہ کے ساتھ محض میں وہ خود بھی رہتا چاہتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی اس کی عدم موجودگی میں محض پہنچے اور میزہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیں۔ اس نے بجلت میزہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر محض جانا ہی چاہتی ہے تو عامر کو اپنے ساتھ لیتی جائے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ میزہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ عامر میزہ کی لائق اور بے پروا کی سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ میزہ سے باتیں کرے لیکن میزہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا۔ اس زبردست تہدلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتا نہ تھا کہ میزہ کہاں جاری ہے۔ میزہ نے بستر اور ضروری سامان ہاندھ کر ایک طرف رکھ دیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر کئی کا اظہار کرنے لگی۔ عامر دور کھڑا بہ حسرت دیکھتا یہ منظر دیکھ رہا تھا لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر ہوسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پاتا تھا۔

شام کو مغرب کی نماز کے بعد میزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑ رہی۔ عامر بڑی دیر تک اپنے بستر پر پڑا کر وہیں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی نئی ماں کہاں جاری ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جائے گی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خوش تھا کہ اس کے گھر سے واپس جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں عامر چپکے سے اٹھا اور میزہ کے دروازے پر دہلیز سے لگ کر بیٹھ رہا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور عامر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھلوا لیتا۔ اس رات میزہ کو بھی عامر کی یاد بہت ستا رہی تھی، اس کو وہ نچھاننا عامر بری طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں جڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر آئیں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان دونوں کے درمیان ایک خطی حائل کر دی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارٹ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویڈیو متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



اسی وقت غمایدہ حالت میں عامر کا ادا کرے میں داخل ہوا اور جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "عامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔" عامر نے جواب دیا۔ "دادا جان! آپ جانیے اور آرام کیجیے۔ میں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔" دادا نے انگریزی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔ "عامر! تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے دو ہی غم خوار ہیں، ایک تیرا باپ ہارون اور دوسرا میں خود۔ ان دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔" عامر نے کہا۔ "آپ سب کا ارشاد دیکھوں پر۔" دادا نے پوچھا۔ "میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھا دیا ہے، اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوگی کہ تو، تو نیزہ کے پاس رہنے اور اس کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا ہے لیکن نیزہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیٹے! جتنی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔" نیزہ دل محسوس کر رہی تھی، یوں۔ "باوا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجیے جس سے عامر کا مستقبل ہی تباہ ہو جائے۔ آپ عامر کو جو کچھ محسوس کرانا چاہتے ہیں، اس سے کئی آدمی تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ میں عامر کی کسی غلطی پر غور نہیں کرتا۔ آپ اس مصحوم کو یہی باور کر رہے ہیں۔" ہارون کے باپ نے توجہ دیا۔ "میں کچھ بھی باور نہیں کر رہا، عامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرز عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حریص ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و دینار دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو عامر کو نظر انداز کرے گی اور عامر کے اصرار کے باوجود محسوس کیلی ہی چلی جائے گی تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ اس سے میں یا عامر کس نتیجے پر پہنچوں گے؟ یہی نا کہ تجھ کو عامر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلام ہے۔" نیزہ رونے لگی، ہات کاٹ کر یوں۔ "بس بس، اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں عامر کو اپنے ساتھ اس لیے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روایتی کے وقت اس ندامت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو عامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔" ہارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی میں نہ رہا۔ اس نے عامر کو نیزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ "عامر! ادھر

عامر دلہیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ ہارون کا باپ خرائے لے رہا تھا۔ رات کے سنانے میں نیزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر خود بھی گر گئی۔ نیزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کون؟" جواب میں عامر کی آواز سنائی دی۔ "ماں! میں ہوں عامر۔" نیزہ نے حیرت سے پوچھا۔ "عامر! مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے؟" عامر نے جواب دیا۔ "ماں، میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دلہیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔" نیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ "یہاں دلہیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی؟ آواز نہیں دی تو دستک دے لیتا۔" نیزہ اس کو کمرے میں لیے چلی گئی۔ اس نے صبح کی روشنی میں عامر کے چہرے پر خشک آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شوخی سے پوچھا۔ "کیا تو رورہا تھا؟" عامر کی آنکھیں ایک بار پھر چمکنے لگیں بولا۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟" نیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے باپ کے پاس محسوس کیوں؟ تو نے یہ سوال کیوں کیا؟" عامر نے پوچھا۔ "کیا آپ تباہ جا رہی ہیں؟" اس نے جواب دیا۔ "ہاں کیونکہ میں محسوس سے اکیلی ہی آئی تھی۔" عامر نے دیکھا نیزہ یہ جواب دیتے ہوئے کپکپاتی تھی اور اس کی نظریں غلامی میں گڑ کر رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ "میں کس کے پاس رہوں گا؟" نیزہ نے جواب دیا۔ "اپنے دادا کے پاس کیونکہ میں بہر حال تیرے لیے غیر ہوں۔" عامر نے خوشامدی۔ "آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا، میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔" نیزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی بات رو نہیں کر سکتی تھی مگر ہارون کے باپ کی باتیں سنتے سنتے اس کا دل پک گیا تھا، یوں۔ "عامر! تو ضد نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گی۔" عامر اس سے چٹ گیا۔ "میں آپ کے ساتھ ہی جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر ذرا بھی اچھا نہیں لگے گا۔"

آ، میرے ساتھ چل۔ میں تجھ کو اور زیادہ ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔“ پھر میزہ کو بطور خاص حکم دیا۔ ”لڑکی! تو محض اس طرح جا رہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے محض جانے کی اجازت تک نہیں لی۔ تو اپنی مرضی سے جا رہی ہے اس لیے تو اس وقت تک محض میں رہ جب تک ہارون خراسان سے واپس نہ آ جائے۔“

میزہ نے رقت سے جواب دیا۔ ”آپ تو واپسی کی بات کر رہی رہے ہیں لیکن ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ میں اب واپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں، میں دوبارہ نہیں واپس آؤں گی۔“

عامر کا دادا اٹھلا کر رہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد میزہ اس طرح محض روانہ ہو گئی کہ اس کا ایک پڑوسی دوران سفر اس کا سر پرست تھا اور وہ غم زدہ اور افسردہ میزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیت ایزدی کے مطابق ہے۔ اس لیے میزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

محض میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی۔ یہاں اس کے چند رشتے داروں نے خوش آمدید کہا۔ اس کے باپ کی رشتے کی ایک بہن اور اس کے شوہر نے میزہ کو محبت اور عزت سے اتارا اور اس کی خاطر وہ آرامت میں لگ گئے۔ میزہ کو رہ کر دمشق، عامر اور ہارون کی یاد ستاتی رہتی۔ دمشق جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر، جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ تھا اور ہارون جو اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ محض کی فضا میں چھائے ہوئے بادلوں کو بڑی حسرت سے دیکھتی رہتی۔ ان کالے کالے اور بھورے یا سرخی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن میزہ کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروازے یا چھت سے موسیقیوں کے گلے آبادی میں داخل ہوتے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے لگتی کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہارون بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصباح اس کا باپ بھی آڈر بائیمان سے آ گیا۔ باپ کے ساتھ ہارون کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظریں میزہ پر جو پڑیں تو وہ مسکرانے لگا اور اشاروں اشاروں میں مانی الغنمیر سمجھانے لگا۔ اس نے میزہ کو پُرشوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال کیا۔ ”میزہ! کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہارون کے باپ نے تجھ کو

نکال دیا؟“

میزہ نے ضبط غم کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے گوشے پھینکنے لگے۔ ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی۔ ہارون کا باپ مجھ کو نکالنا کیوں؟“

بہنوئی نے طنز اُپوچھا۔ ”عامر کہاں ہے؟“

میزہ نے چور کی طرح جواب دیا۔ ”دمشق میں اپنے دادا کے پاس۔“

بہنوئی نے شرارت اُپوچھا۔ ”وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دادا تنہائی سے اکتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی محبت کرتا ہے۔“

بہنوئی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا۔ ”میزہ! تو جو چاہے کہہ لے لیکن میں تیری باتوں پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہارون کا باپ بڑا ہی موذی ہے۔ حرمس وضع کا بچکر، اگر تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے سن لے۔“

میزہ دم بخود کسی مصحوم تماشائی کی طرح تندوئی کی صورت دیکھتی اور باتیں ممتھی رہی۔

ہارون کا بہنوئی کہتا رہا۔ ”میزہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! بخدا جب بھی میں تجھ کو دیکھتا ہوں یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تیرے کوئی چیز ہے، تو تیرے کوئی کئی شے ہے۔“

لیکن اسی وقت میزہ کا باپ بھی آ گیا۔ اس نے ہارون کے بہنوئی سے پوچھا۔ ”کہیں تو میری بیٹی کو درغلا تو نہیں رہا؟“ پھر میزہ سے پوچھا۔ ”بیٹی! کیا بات ہے؟ تو ملول کیوں ہے؟“

میزہ نے جواب دیا۔ ”پدر بزرگوار! کوئی ایک سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں۔ میں ہارون سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔“

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

ہارون کا بہنوئی بول اٹھا۔ ”مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم دونوں ہی واقف ہیں۔ اس گھر میں اگر ہارون کا باپ نہ ہوتا تو گھر میں تاجت ہوتا لیکن اب وہ گھر.....“

میزہ رونے لگی، بولی۔ ”میں اس بوڑھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی ہے۔“

میزہ کے باپ نے اصرار کیا۔ ”پھر بھی ہوا کیا؟ کچھ تو بتا؟ میں اس ذلیل انسان کو ٹھیک کر سکتا ہوں۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”اب میں دمشق واپس نہیں

جاؤں گی۔“

ہارون کے بہنوئی نے میزہ کے باپ سے کہا۔ ”میزہ کے اس جواب میں کہ اب میں دمشق واپس نہیں جاؤں گی، اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔“

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”اچھا، اب تو واقعی دمشق واپس نہیں جائے گی۔ تو محض ہی میں رہے گی، ہارون بھی یہیں آئے گا اور یہیں رہے گا۔“

میزہ نے اشک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا۔ ”اور عامر؟ عامر کہاں رہے گا؟“

میزہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا کہ عامر کہاں رہے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ یا تیرے پاس نہیں رہے گا۔“ پھر ہارون کے بہنوئی سے کہا۔ ”تو کچھ دیر کے لیے باہر چلا جا، میں میزہ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ باہر چلا گیا، میزہ کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تو بار بار عامر کا نام کیوں لیتی ہے؟ یاد رکھو وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کر تیرے خلاف تیار کر رہا ہے۔ افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ اور روشن رکھے گی، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے سے بٹھانے کی اختیار کر سکتے ہو۔“

میزہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنی اولاد کی شدید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آپ و تاب کی گرمی سے اس کے سینے اور پورے وجود کو پھلانی دے رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے دے دے لہجے اور اشاروں کنایوں میں پوچھا۔ ”میزہ! تجھے تو تیری اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کار فرما نظر آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہوگا اور ہارون کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔“

میزہ کوئی جواب دے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ کر اس نے ہارون کی غلطیوں کا بڑی دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو پکڑ لیا جہاں ہارون نے چالاکیوں سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف مواقع پر خود کو بے غلت میزہ سے الگ کر لیا تھا اور یہی وہ قیمتی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے اولاد مل سکتی تھی۔ پہلے وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی

لیکن اب وہ ماضی کے اس عمل میں تو اتر اور پابندی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال کی شکل اختیار کر لی اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور اولاد حاصل کرے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور میزہ میں اختلافات پیدا کرادے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ میزہ سے تھپتھپے میں چند باتیں کرے۔

میزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا۔ وہ اس بلاوے کو نال دینا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی نقل سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر بدرجہ مجبوری اس کو اپنی بیٹی کو سمجھانا پڑا، کہا۔ ”میزہ! میری بیٹی! میں چند دنوں کے لیے دمشق جا رہا ہوں۔ ہارون کا بہنوئی یہیں رہے گا۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔“

میزہ خاموش رہی، اس کا باپ کچھ توقف کے بعد مزید بولا۔ ”لیکن میں اس کو ساتھ چلنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا مخلص ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عدم موجودگی میں یہیں رہے ہاں۔ تو میں اسے معصوم بھی نہیں کر سکتا۔“

میزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا رہا۔ ”لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ہارون اپنے بہنوئی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اگر ہارون ذرا تاخیر سے پہنچتا تو، تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی کی بیوی ہوتی۔ بس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔“

میزہ نے کہا۔ ”باوا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجیے۔ گھما پھرا کر گھبنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

باپ نے جواب دیا۔ ”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی بیوی ہے، ہارون کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے ارد گرد دیکھ کر خستقل ہو جائے۔ تو محتاط رہ بالکل اس طرح جیسے ہارون بھی یہیں کہیں موجود ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔“

میزہ نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔“

میزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے اس نے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ ابھی تک میزہ کی طرف سے مایوس نہیں ہوا تھا لیکن اب مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ میزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ کئی ایسے مواقع ملے جب وہ میزہ کو اور غلا سکتا تھا لیکن میزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

میزہ علی الصباح اٹھ کر نماز پڑھتی، اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگتی پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آ گیا۔ نزلے نے کئی دن سے پریشان کر رکھا تھا، وہ اس کو نال دیتی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گر گئی۔ بخار بھی ہو گیا۔ رات بھر نیم بدموشی میں مفلوم نہیں کیا بڑ بڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی کو اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ بہنوئی اس کے سر ہانے جا کھڑا ہوا، پوچھا۔ "میزہ! اب کسی طبیعت ہے؟"

میزہ نے آنکھیں میاڑ میاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اسے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی، پوچھا۔ "آپ یہاں کب آئے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میزہ! میں تیری مجبور یوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ تو اتنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبور بنا کر رہتی ہے۔ اب تجھ کو خول سے باہر آ جانا چاہیے۔"

میزہ نے جواب دیا۔ "بھائی! تمہیں غلط نہیں ہوتی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے اس پاس کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس سے باہر آ جاؤں۔"

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شوخی سے بولا۔ "تجھے تو جموٹ بول کر دھوکا دینے میں مزہ آنے لگا ہے۔"

میزہ نے مختصر کہا۔ "یہ آپ کی سوچ کا کرشمہ ہے ورنہ میں بالکل بشاش اور مطمئن ہوں۔"

بہنوئی نے کہا۔ "میزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میزہ نے جواب دیا۔ "بھائی! پھر کبھی باتیں کر لیتا، مجھے اچھا ہو جانے دو۔"

بہنوئی نے منہ بنا کر کہا۔ "ان باتوں کے لیے اس سے بھر موقع نہیں ملے گا۔"

میزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی۔ "جو بات کرنی ہو، مختصر آ جلدی کر لیں کیونکہ

طبیعت ہاتھ کرنے یا سننے پر راض نہیں ہو رہی۔"

بہنوئی نے پوچھا۔ "میزہ! تو سچ بتا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور مطمئن ہے؟"

میزہ نے جواب دیا۔ "اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن بھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی۔"

بہنوئی تھملا گیا بولا۔ "تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے قریب سے جانتا ہے، خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے۔ اور اگر ہارون تیرے پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی۔"

میزہ نے کہا۔ "بس یہی بات کہنا چاہتی تھی؟"

بہنوئی سخت مایوس تھا، بولا۔ "پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب میں جو کچھ کہا، وہ غلط ہے، جموٹ ہے۔ اس کے بعد میں چند اہم کام کی باتیں کروں گا۔"

میزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "بھائی! میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جموٹ کیوں بولوں گی؟ ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو یہ چیز کہلوانے پر مختصر ہو تو میں تمہیں خوش کرنے کے لیے کہہ دیتی ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب آگے کیسے کہو۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اگر ہارون اور تیرے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود نہ ہوتے تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ تم دونوں بہت خوش و خرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں۔ اس لیے میں....."

میزہ نے جواب دیا۔ "بہر حال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ جو تھوڑی بہت ریشمیں آ بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل و دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساتھ ہی دھل جائیں گی۔"

بہنوئی نے کہا۔ "لیکن میں اسے ناممکن سمجھتا ہوں۔ میزہ! اگر تو نے اپنے باپ کی ہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور شہادت کی زندگی گزار رہی ہوتی۔"

میزہ نے جواب دیا۔ "اے بھائی! یہ شہادت کی زندگی کیا شے ہوتی ہے؟ مجھے کیسے معلوم ہو؟"

بہنوئی نے ہنس کر کہا۔ "تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے، پھر تجھے خود بخود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔"

میزہ غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ طیش میں بولی۔ "بھائی! یہ تم کیسی باتیں کرنے لگے۔ اگر تم سے شادی کرنا

ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے محبت کرتی ہوں۔"

بہنوئی نے طنز کیا۔ "محبت کرتی ہے ہارون سے! خوب۔ میزہ یا تو، تو مجھ کو بے وقوف بنا رہی ہے یا پھر تو بہت سیدھی سادی لڑکی ہے۔"

میزہ چڑ کر بیٹھ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی۔ "میرا سر درد کر رہا ہے۔ خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو بھائی! ورنہ میں دیوار سے سر ٹکرا لوں گی۔"

اسنے میں میزہ کی پھوپھی بھی آگئی۔ اس نے میزہ کو بستر پر بیٹھے جو دیکھا تو دور ہی سے پوچھا۔ "کیا بات ہے میزہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

بچ میں بہنوئی بول پڑا۔ "میزہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے اس کو یہ رائے دے رہا ہوں کہ کسی طبیعت سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ ہی نہیں ہوتی۔"

پھوپھی نے کہا۔ "یہ ٹھیک تو کہتا ہے۔ تجھ کو اس کا کہنا مان لیتا چاہیے میزہ! نزلے کا زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا خطرناک بات ہے۔"

میزہ نے فحشلا کر کہا۔ "پھوپھی جان! آپ بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے چلی جا رہی ہیں۔"

پھوپھی نے سختی سے کہا۔ "تو طبیعت کو بلا لاء، میں دیکھوں گی یہ عیارت کس طرح غصے کھائے گی۔"

بہنوئی طبیعت کے پاس چلا گیا اور میزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہارون کے بہنوئی کو اتنا غیبت نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہارون واپس آ جائے تو اس کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر دہل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔

کافی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو طبیعت تو اس کے ساتھ آئی نہیں، ہاں چند دوائیں الیٹہ اس کے ہاتھ میں تھیں۔ انہیں میزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا۔ "میزہ! میں نے تیرا حال کہہ کر طبیعت سے یہ دوائیں لے لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟"

میزہ نے بیزاری سے جواب دیا۔ "بھائی! تم نے بلا وجہ حسرت کی، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ پھوپھی کا کہنا سچا نہیں ہے۔ بولا۔ "میزہ! میں تجھ سے جواب چاہتا ہوں، یہ تو تو اچھی طرح یقین کر لے کہ ہارون کا باپ ہمیشہ دیر سے بنا رہے گا۔ رہی یہ بات کہ تو خود صاحبہ اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہارون ایسا بھی نہیں ہوئے دے گا

اور اگر یہ لغزش ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدائش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ بہر حال تیری آغوش تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔" پھر وہ اور زیادہ بے شری پر اتر آیا پوچھا۔ "میزہ تیرا بچہ کیوں نہیں ہوا؟"

میزہ پھر کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رسید کر دیے، بولی۔ "بے شرم انسان! تو اسی وقت دور ہو جا میری نظروں سے ورنہ کوئی بدترین حادثہ رونما ہو جائے گا۔"

لیکن بہنوئی بھی آسانی سے زیر ہو جانے والا شخص نہیں تھا سگراتے ہوئے بولا۔ "میزہ! میں غرض مند ہوں اسی لیے یہ ذلت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوص سے تجھ کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ تو ہارون اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔"

میزہ نے بچ میں کھڑے بہنوئی کو دھکا دے کر راہ سے ہٹا دیا، بولی۔ "میرا راستہ چھوڑ دے اوصیبت انسان! تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ مزید کہے گا، میں نہیں سنوں گی اور ہارون کو تیری باتوں سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا سچ جواب۔ افسوس کہ تو انتہائی غلط انسان نکلا۔"

میزہ بھاگ کر پھوپھی کے پاس چلی گئی۔ بہنوئی کچھ دیر کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی مایوس ہو کر باہر چلا گیا۔ اب اس کو ایک اور نکتہ بھی لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ میزہ نے یہ سب کچھ ہارون کو بتا دیا تو کیا ہوگا؟

اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار ناممکن ہو تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو شکست دینے کی کوشش کرے گا۔

دوسری طرف میزہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ خدایا یا تو باپ کو دمشق سے واپس بلاو دے ورنہ ہارون ہی کو واپس بلا لیا جائے۔

یہ دعا اس طرح مقبول بارگاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آ گیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا اور اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ باپ نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔ "بھئی میزہ! کیا ہوا؟ یہ تو رو کیوں رہی ہے؟ خیریت تو ہے؟"

میزہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاوا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد کر کے رو رہی ہوں جو آپ دمشق جانے سے پہلے کر رہے تھے۔ اس عمر میں اب میں نے یہ سمجھا ہے کہ بزرگوں کو شاید آنے والے واقعات کا قائل

ہارون نے کہا۔ ”مجھ کو باتوں میں نہ بہلائیے! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے کہیں زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھنا چاہتا تھا۔“

میزہ کو قصہ تو بہت آیا تھا مگر بات کو ختم کرنے کے لیے وہ وہ ہارون کے سامنے سے ہٹ گئی، بولی۔ ”ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اس وقت تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت جی بھر کے باتیں کر لوں گی۔“

ہارون دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میزہ اپنی پھوپھی کے پاس چلی گئی۔ دوسرے کمرے تک جاتے ہوئے ایک جگہ ہارون کا بہنوئی نظر آ گیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ میزہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ”میزہ! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے اس اجڑا انسان نے تیرا دل بھی دکھا دیا۔“

میزہ نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ ”تو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کر کیونکہ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو ہے۔ ہارون تجھ پر اعتبار نہیں کرتا اسی لیے وہ اکٹھی اکٹھی باتیں کر رہا ہے۔“

ہارون کا بہنوئی خاموش ہو گیا۔ سہ پہر کو میزہ کے باپ سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس نے اپنے داماد کو بڑی خوش دلی اور خلوص سے خوش آمدید کہا مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میزہ کے باپ نے کہا۔ ”میں تو تیرا بڑا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تو آ گیا۔“ ہارون نے بد مزگی سے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم بہن کے شوہر کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔“

میزہ کے باپ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”ہارون بیٹے! تیرا بہنوئی کتنا ہی برا کسی لیکن یہ میدان جنگ کے اس دستے میں تھا جس میں، میں خود شامل تھا۔“ پھر ذرا دم لے کر بولا۔ ”میں نے یا میزہ نے تیرے بہنوئی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اس کی جتنی بھی قدر و منزلت ہے، اس کا بنیادی سبب وہی ہے جو میں نے بیان کر دیا۔“

ہارون نے کہا۔ ”اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بہن کے شوہر کو میرے تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا ہوں کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا جائے۔“

باپ کہاں چلا گیا؟“ میزہ نے ناگواری سے کہا۔ ”میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ بازار گیا ہوا ہے۔“

ہارون نے بڑی عجیبی نظروں سے میزہ کو گھورتا شروع کر دیا۔ میزہ نے ایک بار اس کو اس طرح گھورتے دیکھ لیا اور سہم گئی۔ میزہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھالیا اور اس سے گھر کی خیریت معلوم کرتی رہا۔ ہارون نے غی سے کہا۔ ”میزہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی کہ میرے جاتے ہی تو اتنی بدل جائے گی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”میں ذرا بھی نہیں بدلی۔ تجھ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں بدل گئی ہوں؟“

ہارون نے کہا۔ ”میں جانتا چاہتا ہوں کہ میرے بہنوئی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہ یہاں کیوں رہتا ہے؟“ میزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آ کر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ساتھ رکھنا پسند کریں گے۔“

ہارون دانت پیستا ہوا بولا۔ ”اگر یہ بات تھی تو تجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتا دینا چاہیے تھا کہ میں اپنے بہنوئی کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔“

میزہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میرے باپ کا گھر ہے پھیرنے کی۔“

ہارون نے کہا۔ ”افسوس کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید کرتا تھا کہ تو مجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن تو نے عامر تک کا خیال نہیں رکھا۔ اسے چھوڑ کر اکیلی محسوس چلی آئی۔“

میزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں محسوس چلی آئی۔“

ہارون نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا، اب تو میری بات بھی سن لے۔ میں دُشمن سے یہ فیصلہ کر کے چلا ہوں کہ یا تو، تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا پھر میں تجھے طلاق دے دوں گا۔“

اس سچ ترین اعلان نے میزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا۔ ”فرماں برداری؟ کس قسم کی فرماں برداری؟ کس کی فرماں برداری؟“

باپ نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بجانب ہے۔ میں نے بھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر میزہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی مرضی سے محسوس چلی گئی۔ تمہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خودسری محسوس کی۔“

ہارون نے تامل کر پوچھا۔ ”بادا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟ یعنی اس میں اتنی خودسری آگئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ معاف نہیں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔“

باپ نے پچھرا پچھرا۔ ”نہیں، بہو سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔“ لیکن اس سے ہارون کا پارا چڑھ چکا تھا۔ وہ میزہ سے سخت ناراض تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ میزہ کو بھانے گا، اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو گئی تو کوئی بات نہیں ورنہ وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

میزہ کی سرکشی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح میزہ کو ورغلا یا ہوا اور میزہ کا محسوس جانا بھی کہیں اسی سلسلے کی کوئی کڑی تو نہیں۔ وہ ان الجھنوں کو اپنے دل و دماغ میں بسائے ہوئے عامر کو لے کر محسوس روانہ ہو گیا۔ میزہ ان دونوں کو اپنا ایک اپنے سامنے دیکھ کر گھبر گئی۔ اس وقت ہارون کا بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔

بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہارون کو سلام کر کے عامر کی طرف بڑھا۔ ہارون نے سلام کا جواب نہیں دیا، جیسے لہجے میں پوچھا۔ ”تو، تو یہاں موجود ہے، گویا میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔“

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھانا چاہا مگر ہارون نے عامر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا۔ ”بہن مرگئی میرا تیرا رشتہ ختم ہو گیا۔ اس لیے اب بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”تو معلوم نہیں کیسی اکٹھی اکٹھی باتیں کر رہا ہے۔“

اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہارون نے سختی سے منع کر دیا۔ ”کیا میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی؟ میرا تیرا رشتہ ہی کیا، اب ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔“

بہنوئی شرمندہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہارون نے میزہ سے پوچھا۔ ”میزہ! تیرا

از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔“

باپ نے پوچھا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟“ میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ابھی تک تو نہیں۔“

باپ نے شوخی سے میزہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور بزرگوں کو آنے والے واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ گھبرا، میں آ گیا ہوں۔“ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”میزہ! سچ سچ بتا اس نے تجھ کو سنا یا تو نہیں؟“

میزہ رونے لگی۔ ”بادا جان! یہ شخص قابل اعتبار ہرگز نہیں۔“

باپ نے چونک کر پوچھا۔ ”تو رو کیوں رہی ہے؟ اس نے کیا کیا؟ مجھے تو بتا کچھ۔“

میزہ نے پرجوش آواز میں کہا۔ ”یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا برا حشر کر دیتی۔“

باپ نے بار بار اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے میزہ کو رلا دیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا۔ آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا جہاں وہ چوروں کی طرح چھپا کھڑا تھا۔ میزہ کے باپ نے طنز پوچھا۔ ”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

بہنوئی کی جان میں جان آ گئی، بولا۔ ”جناب والا! آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟ میں تو بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

میزہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل اس سے صاف نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے بھی منہ بنا کر پشت پھیری اور دل ہی دل میں کچھ کہنے میں مشغول ہو گیا۔

☆ ☆ ☆ ہارون خراسان سے چلا تو پہلے دُشمن پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے عامر کو سینے سے لگالیا۔ عامر باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور میزہ کی شکایت کر دی، ہنکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تمہا محسوس چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خوشامد کی تھی۔“

باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوئی۔ ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا باپ بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“ ہارون نے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔“

نیزہ کے باپ نے افسوس سے کہا۔ "مگر کس طرح؟ اس سے تیری دشمنی کا تعلق، سبب، وجہ؟" ہارون نے جواب دیا۔ "میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر عمل ہونا چاہیے۔" نیزہ کے باپ نے ذہن پر زور دے کر کچھ مجھے کی کوشش کی اور جب کچھ مجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے مارا۔ "افسوس کہ تو میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے گویا میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ تجھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو نیزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دے۔ میں کسی کے حکم پر نہیں چل سکتا۔"

شاید ہارون کو بھی اپنی تلخ کلامی کا احساس ہو گیا۔ ذرا نرمی سے بولا۔ "پدر بزرگوار! میں جب بھی اپنے بہنوئی کی شکل دیکھتا ہوں، مجھے بہنوئی کی عیاریاں اور بہن یاد آنے لگتی ہے۔ اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "تو بلا کا جذباتی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہہ میں تجھ سے۔"

لیکن ہارون نے بات کاٹ دی، بولا۔ "آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتبار کر۔" اس کے بعد وہ ہارون کو باہر لے گیا، بولا۔ "میرے ساتھ چل، ہم دونوں ٹھیکے میں کچھ باتیں کریں گے۔"

نیزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگور کی بیلیوں کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے اور انجیر اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ نیزہ کا باپ اس کو تانستان کے سائے میں لے کر بیٹھ گیا اور گفتگو کا آغاز کیا۔ "ہارون! تو سوچ رہا ہوگا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتوں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پسند کیا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر حیران ہرگز نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بہت سی باتوں کے لیے گھر کی چار دیواری موزوں نہیں ہوتی۔"

نیزہ کا باپ ہنس دیا۔ "بالکل میرے دل کی بات کہہ دی۔ واقعی میں جو بات کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہ تانستان کی خلوت بہترین جگہ ہے۔"

ہارون نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آپ لوگ سنسنی خیز باتوں کے عادی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ

میرے بہنوئی کا جادو کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں نیزہ سے قطع تعلق کر لوں اور آپ نیزہ کو میرے بہنوئی کے حوالے کر دیں۔"

نیزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گہرا کر کہنے لگا۔ "بھڑا ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی تو لاؤ لڈ کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "یہ سوال تو خدا سے کیجیے۔ اولاد دینا یا نہ دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔"

نیزہ کے باپ نے ایک دم جھنجھلا کر کہا۔ "میں خدا سے جو مانگتا ہوں، وہ اس سے تعلق رکھتا ہے لیکن اب جو میں پوچھوں گا، اس کا تعلق تجھ سے اور نیزہ سے ہوگا اور تجھ کو ان کے جوابات دینا پڑیں گے۔"

ہارون نے کہا۔ "جو کچھ بھی پوچھتا ہے جلد از جلد پوچھیں، ورنہ شاید اس کا بھی موقع نہ آئے اور میں واپس چلا جاؤں۔"

نیزہ کے باپ نے کہا۔ "نیزہ کب تک تیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی؟ وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرتی رہے گی۔ جس دن یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کر لے گی۔"

نیزہ کے باپ نے ذرا زور دے کر پوچھا۔ "وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ ماں کب بنے گی؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "جب خدا چاہے گا۔"

نیزہ کے باپ نے کہا۔ "اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے ہوئے ہے؟"

ہارون ذرا جھجکا کیونکہ اس کا چور پکڑا گیا تھا۔ نرمی سے بولا۔ "یہ جھوٹ ہے۔ یہ بات کس نے بتائی آپ کو؟"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر درمیان میں عامر نہ ہوتا تو آج میری بیٹی کی گود میں بچہ ضرور ہوتا۔"

ہارون نے غصہ ظاہر کیا۔ "یہ ساری شرارتیں میرے بہنوئی کی طرف سے ہو رہی ہیں اور میں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

نیزہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا۔ "ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیے تھے۔ میں نے اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی

عشقی نامحرم

بیٹی کو عین اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اور کے لیے دہن بنی بیٹی تھی۔ اب تجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو اولاد سے محروم رکھے۔ میں زیادہ بے شری نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔"

ہارون نے پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا کھل کر کہیے۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تجھ کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تو نیزہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو نیزہ کو واقعی چاہتا ہے تو، تو اس کو اولاد دے، ورنہ دمشق واپس چلا جا اور عامر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔"

ہارون نے کہا۔ "یہ فضول سی شرط ہے، میں نیزہ کو لینے آیا ہوں۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "نیزہ تیرے ساتھ جائے گی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی گود میں اس کا اپنا بھی بچہ ہوگا۔ تو اس وقت تک محسوس ہی میں رہے گا جب تک کہ عامر کے علاوہ ایک اور بچے کا باپ نہیں بن جاتا۔"

ہارون نے کہا۔ "یہ تو بڑا بڑا بہری شرط ہے۔ میں نیزہ کو جویرا لے جاؤں گا۔"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "اگر جویرا لے جاسکتے ہو تو ضرور لے جاؤ ورنہ یہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔"

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔ "تو آپ اتنی سی بات کے لیے یہاں لائے تھے مجھے؟"

نیزہ کے باپ نے جواب دیا۔ "تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہوا کرے، میں تو اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔"

ہارون نے کہا۔ "نیزہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے۔ میں اس سلسلے میں پہلے نیزہ سے بات کروں گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

نیزہ کے باپ نے کہا۔ "تو نیزہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔"

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

نیزہ کے باپ کو اس وقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ نیزہ اور ہارون کا بہنوئی دونوں کمرے

میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں۔ عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ نیزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر ہارون نے اس کو پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا۔ "اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں کیونکہ میں اپنے شہادت کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہے ہیں تو مجھ کو کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔"

نیزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا۔ "لیکن رسول اللہ نے کسی کی جستجو کرنے سے منع کیا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "لیکن میں کسی کی جستجو کر ہی کب رہا ہوں، میں تو اپنی بیوی کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

نیزہ کے باپ نے کہا۔ "ہارون! اگر تیرا شہ یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا۔ کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ نیزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔"

ہارون نے اپنے سر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خاموش رہیے، ہماری سرگوشی کی آواز کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔"

وہ دونوں دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن نیزہ کے باپ کی حالت خیر ہو رہی تھی۔

اندر آہٹنا آہٹنا ہوتے ہوئے ہارون نے کہا۔ "ہارون کا بہنوئی کہہ رہا تھا۔ "نیزہ! بات بگڑنا نہیں چاہیے۔ میں ہارون کا بہنوئی رہ چکا ہوں اس لیے میں ہارون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک سازش کے زیر اثر تجھ کو اولاد سے محروم کر رکھا ہے۔"

نیزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، میں اس پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں ہارون کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر عامر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے۔"

باہر نیزہ کے باپ کا دھڑکتا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا۔ وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ چور اب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے کان سننا نہیں چاہتے۔ نیزہ کے باپ نے ہارون کو فاتحانہ انداز میں دیکھا، بولا۔ "سن لیں دونوں کی باتیں، ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ پھٹ جائے۔"

ہارون نے کہا۔ "ذرا توقف سے کام لیجیے۔ ابھی دھک نہ دیتیے گا۔"

لیکن اندر والوں کو ان کی آہٹ مل چکی تھی۔ اندر سے

دلائل اور براہین کی جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا۔ اس نے بے دلی سے پوچھا۔
 ”تو یہ تیرا تھی اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کر لے گی؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کر دوں گی۔“
 ہارون نے کہا۔ ”لیکن میں بھی تجھے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تجھ کو کسی بچے کی ماں بنا کر عامر کی بد نصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں رہوں جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جائے، میں کسی دوسرے بچے کا باپ نہیں بنوں گا۔“
 میزہ نے فوراً جذبات میں آنکھیں بند کر لیں، بولی۔ ”تب پھر تو اسی وقت چلا جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ۔ اگر اس عرصے میں تو ندامت محسوس کرنے لگے اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں تیری واپسی پر خوش آمدید کہوں گی اور اگر دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو ازراہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد ہو جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں۔“
 ہارون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ دو سال بعد والے فیصلے کا ابھی اسی وقت اعلان کر دے لیکن وہ میزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ جب وہ یہ سوچتا کہ اس کی میزہ کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف اس کا باپ اور بکیر دونوں ہی خیالوں میں اس کو منح کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں سے اس کو روک رہے تھے کہ خبردار جو تو نے میزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا عامر کی بد نصیبی کا آغاز ہو جائے گا۔
 تیسری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مشورہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر کر۔ ممکن ہے اس عرصے میں خود میزہ کو اپنی بے جا ضد پر افسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے دوبارہ رجوع ہو جائے۔
 میزہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے امید و بیم کی اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون کو متامل دیکھ کر پُر امید ہوئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان ہارون سے جو کچھ سننا چاہتے تھے، دل وہ مقبوم پا چکا تھا۔ ہارون کی کچھ دیر کی خاموشی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوئی۔ بے چینی سے بولی۔
 ”ہارون! مجھے پریشان نہ کر اور اپنے فیصلے سے فوراً

تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عامر کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور چونکہ یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو دور کر دوں گی۔“
 ہارون نے حیرت سے رک رک کر کہا۔ ”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔“
 ”ہاں، میں عامر کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں عامر کی جدائی گوارا کر لوں گی۔“
 ہارون نے کہا۔ ”میزہ! تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کے کر کہ اگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو تو آسانی سے بھگت لے۔“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھ سے دور رہوں گی جب تک کہ میں تیرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے ایک ماہ دوں گی۔ اس کے بعد تو چلا جائے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہیں آئے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔“
 ہارون نے پوچھا۔ ”اگر میں تجھ کو مایوس کر کے چلا جاؤں تو؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کروں گی کہ شاید تو اپنا فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے اندر ہم میں عامر کو ایک بھائی یا بہن عطا کر دے۔“
 ہارون نے پوچھا۔ ”اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟“
 میزہ نے ایک سرد آہ بھری، بولی۔ ”تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گی اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔“
 ہارون نے افسوس سے کہا۔ ”میزہ! افسوس کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں رہا کہ ہم دونوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم دونوں کی روحیں محبت کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ کسی اور کو بھی دے سکتی ہے۔“
 میزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”افسوس کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش فہمی میں تھی لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تیری نظر میں عامر مجھ سے زیادہ اہم ہے تو میری ادل نوت گیا اور میں مایوسیوں کے گہرے سمندر میں چھینٹی چلی گئی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑا جس کا ابھی ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔“
 ہارون اپنے مقدمے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب

دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہیں گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو ازراہ ہمدردی بس یہ کیا ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی، اس سے مطلع کر دیا اور اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کر کے تادیران پر قائم نہیں رہنے دیتے۔“
 ہارون نے کہا۔ ”اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو دوسرے کے لیے سود مند ثابت ہوتی ہے۔“
 میزہ نے کہا۔ ”اب کام کی بات کرتے کیا فیصلہ کیا ہے؟“
 ہارون نے پوچھا۔ ”کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”سبھی لوگ معترض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی میں اولاد سے محروم کیوں ہوں۔“
 ہارون کو چاروں طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بولکھلا گیا۔ ”پھر تو نے اس کا کیا جواب دیا؟“
 میزہ نے کہا۔ ”میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔“
 ہارون نے کہا۔ ”لیکن جب تو نے عامر کو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پر اتنا اصرار کیوں؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”اپنی اولاد کی بات ہی کہہ اور ہے۔ میں اپنا بچہ چاہتی ہوں، اپنی اولاد۔“
 ہارون نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میزہ! لوگوں کے ورغلانے میں نہیں آنا چاہیے ورنہ یہ طے ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات میں خوشگواہی اسی وقت تک ہے جب تک کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“
 میزہ نے اٹل لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں بچہ چاہتی ہوں، اپنا بچہ..... جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔“
 ہارون نے کہا۔ ”اگر میں انکار کروں تو؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”تب پھر میں عامر کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔“
 ہارون ایک دم چمک پڑا۔ ”تو عامر کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”سچائی سچ ہوتی ہے۔ میں اور

دروازہ کھل گیا اور دونوں ہارون اور میزہ کے باپ کو سامنے کھڑا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
 میزہ نے پوچھا۔ ”یہ آپ دونوں یہاں چوروں کی طرح کیوں کھڑے ہوئے ہیں؟“
 ہارون نے جواب دیا۔ ”یہی سوال میں تجھ سے کر سکتا ہوں کہ میزہ یہ تم دونوں چوروں کی طرح اندر بند ہو کر کسی باتیں کر رہے تھے؟“
 دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے بہنوئی نے کہا۔ ”ہم دونوں تجھے میں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تجھے کی نہیں ہو رہی تھیں۔“
 میزہ البتہ شرمندہ تھی، باپ سے بولی۔ ”آپ دونوں اتنی جلدی واپس آ گئے؟“
 ہارون نے طنزاً کہا۔ ”ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہوگی کہ ہم دونوں آدھا دن گزار کر واپس آ گئے۔“
 میزہ کھسپائی ہوئی تھی، بولی۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔“
 ہارون نے اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ سے کہا۔ ”آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ میں میزہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لینا چاہتا ہوں۔“
 میزہ کے باپ نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا خیال رہے کہ میری بیٹی نے تیرے بہنوئی سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو طعنہ دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں، وہ تجھے میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے۔“
 میزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کو لے کر چلا گیا۔ راستے میں کہا۔ ”تو نے یہ ابھی بات نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلاؤ چٹک و شجے میں ڈال دیا۔“
 اندر ہارون نے جب دروازہ بند کرنا چاہا تو میزہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”دروازہ بند نہ کرو۔ کیا کھلے کمرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟“
 ہارون نے میزہ کی خواہش پر کمرے کو بند نہیں کیا، بولا۔ ”تو مجھ سے خوفزدہ ہے؟“
 میزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں تو۔“
 ہارون نے کہا۔ ”نہیں تو مجھ سے خوفزدہ ہے کیونکہ تو کمرے کو اندر سے بند کرنے میں خوف محسوس کر رہی ہے۔“
 میزہ نے موضوع بدل دینا چاہا۔ ”ہارون! تجھے جو باتیں کرتا ہیں وہ کر، بے کار باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔“
 ہارون نے جواب دیا۔ ”میزہ! بات دراصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تجھار ہیں اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل

رہا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ سال باہر گزار سکا۔ اس کے بعد وہ سیدھا محض پہنچا اور میزہ کے سامنے وہ مال وزر ڈھیر کر دیا جو اس نے مختلف جنگوں میں انعام و کرام اور مال قیمت سے حاصل کیا تھا۔ میزہ اس کا انتظار تو کر رہی تھی لیکن اتنی... بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون کو ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب میزہ کے سامنے مال وزر کا ڈھیر لگ گیا تو اس کے باپ کی رال ٹپک پڑی اور اس نے بیٹی کو گم دیا۔

ہارون تھکا ہوا ہوگا اس کے لیے غسل اور آرام کا انتظام کر دے۔

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا۔ "عامر تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا۔"

عامر نے بھجکتے ہوئے نہایت تکلف سے میزہ کو سلام کیا۔ میزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "تو ٹھیک خاکا تو ہے؟" عامر نے گردن ہلا کر جواب دیا۔ "بالکل ٹھیک ہوں ماں۔" ہارون نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ "میزہ، میرا بہنوئی کہاں چلا گیا؟"

میزہ نے جواب دیا۔ "اس نے دوسری شادی کر لی۔"

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا۔ "میزہ! تو نے بہت بڑی خوش خبری سنا لی ورنہ میں اس کی طرف سے بہت فخر مند رہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوئیں ان میں میرے بہنوئی کا بڑا ہاتھ تھا۔" میزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔" ہارون نے پوچھا۔ "وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟" میزہ نے جواب دیا۔ "نہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی۔"

ہارون نے کہا۔ "خوب... تو اس نے ابھی پچھا نہیں چھوڑا؟"

میزہ نے پوچھا۔ "تو دمشق کیا تھا؟" ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا۔ سیدھا تیرے پاس آیا ہوں۔ اب یہاں سے تجھ کو لے کر دمشق جاؤں گا۔"

میزہ نے کہا۔ "ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھ کو

ہارون دمشق واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتادی۔ باپ ساری روداد توجہ سے سن رہا، آخر میں پوچھا۔ "پھر اب کیا ہوگا؟ میں تو یہ جانتا چاہتا ہوں۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟" باپ نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جائے گا عامر کی دیکھ بھال کون کرے گا؟" ہارون نے کہا۔ "میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔"

باپ نے کہا۔ "تو نے میزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے ارادوں پر قائم رہوں گا اس لیے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کر لے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "باوا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں، میں اس فیصلے کو نہیں مانتی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اس وقتی ہنگامی اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔" باپ نے کہا۔ "تب پھر تو میزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں دوسری شادی کیوں کر لوں؟ اس کا قاعدہ؟"

باپ نے جواب دیا۔ "اس کا قاعدہ یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشت اچھی طرح ہو جائے گی۔"

ہارون نے کہا۔ "اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے گی تو اس وقت میں کیا کروں گا؟"

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا۔ "عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی یا عورت سے تیری اولاد نہ ہو۔"

ہارون نے کہا۔ "افسوس کہ میں خراسان واپس جاؤں گا، عامر کس کے پاس رہے گا؟ اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟" باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔

ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ میزہ کو طلاق پر آمادہ کر لے لیکن وہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ دمشق میں اپنے شوہر ہارون کے پاس چلی جائے گی۔

ہارون نے خراسان جاتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلسلے میں باپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خراسان کے چتے چتے میں گھومتا پھرتا

اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا۔ "آؤ بیٹے، دمشق چلیں اپنے دادا کے پاس۔"

عامر نے مصحوبیت سے پوچھا۔ "اور میری تھی ماں..... کیا وہ نہیں چلیں گی؟"

ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبایا، بولا۔ "ہاں بیٹے! میزہ نہیں آئے گی۔ وہ یہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی یہیں رہے اور ہماری پھر بھی اس سے ملاقات ہی نہ ہو۔"

میزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا۔ "ہارون! میں تیرا انتظار کروں گا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "بہر حال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس جدائی کو عارضی سمجھ رہا ہوں۔ میزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہر حال یہ جو کچھ ہوا، اس میں ہاتھ تیرا ہی کارفرما ہے۔"

بہنوئی نے کہا۔ "اگر یہ شک تیرے دل میں بیٹھ گیا ہے کہ اس اختلاف اور انتشار میں میرا ہاتھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ میری طرف سے میزہ اور تجھ کو ایک پیشکش ہے۔"

ہارون نے پوچھا۔ "کون سی پیشکش ہے؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "میرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے۔ اگر تو چاہے تو عامر کو میرے حوالے کر دے۔ میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا۔ اس طرح تو میزہ کی خواہش بھی پوری کر سکے گا۔"

ہارون نے پوچھا۔ "پھر؟ یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "اس سے یہ سہارا ملے گا کہ عامر کی طرف سے بے نیاز ہو کر میزہ کو خوش رکھ سکے گا۔"

ہارون کے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے بہنوئی کے حوالے کر دے اور خود میزہ کے پاس چلا جائے اور فیس کر یہ خوش خبری سنا دے کہ وہ میزہ کی ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہے لیکن پھر چونکہ اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس وقت میزہ کمرے کے در پر کھڑی ہارون کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میزہ کا باپ اور ہارون کا بہنوئی دونوں ہی اس کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میزہ بستر پر دوبارہ گر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

☆☆☆

ہی آگاہ کر دے۔"

ہارون نے محبت بھری نظروں سے میزہ کو دیکھا اور مسکرایا گو کہ اس کی مسکراہٹ میں یاس اور ناکامی کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو میزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے پُرسکون اور باوقار لہجے میں کہا۔ "میزہ! افسوس کہ میں تجھ کو بے حد چاہتا ہوں اور اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانا پڑے تو میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا....."

میزہ نے اس کی بات کاٹ دی، بے اختیار بولی۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے اور اب میں اپنے بچے کی ماں بن جاؤں گی۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں۔ میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔ میں دو سال کے لیے تجھ سے جدا ہوا جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اس امید میں گزار دے کہ شاید مجھ میں تبدیلی آگئی ہو اور میں اس جبر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت کرتی ہے تو یقین ممکن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جائے اور میرے پاس چلی آئے۔"

میزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولی۔ "سب بچھڑ تو بیٹا ہے۔ اسی وقت چلا جا اور وہ سالانہ بعد مجھ سے ملاقات کر لیں میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا کہ میں اولاد سے کم پر کوئی سمجھوتا کر لوں گی تو یہ تیری بھول ہوگی۔"

ہارون ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا۔ "اچھا میزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔ میں عامر کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم کر لوں گا۔"

میزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فوراً ہی رخصت سفر باندھ لے گا، بولی۔ "لیکن اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ جب یہ فیصلہ بدلنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں۔"

میزہ نے ہونٹ بھینچ لیے، بولی۔ "تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کروں گی۔"

ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے بہنوئی اور میزہ کے باپ کے انداز سے سمجھ لیا کہ ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی نہیں پوچھا کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟

دشمن جانے کا منصوبہ بنایا۔ اب میزہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی وہ یہ کہ اس کا باپ میزہ کو دوبارہ دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔ اس نے کئی راتیں اس فکر اور تشویش میں گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو میزہ نے ہارون کو مشورہ دیا۔ "ہارون! میں کئی دن سے تجھ کو طول اور فکر مند محسوس کر رہی ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میزہ! اب میں تجھ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو امید سے دیکھے گا تو مجھ پر بہت برہم ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ میں اس کے جواز میں کیا کہوں گا۔"

میزہ کا منہ لنگ گیا، بولی۔ "تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔"

ہارون نے کہا۔ "میرے باپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یہ ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔ سردست تو یہی سوچنا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔"

میزہ نے برا سا منہ بنا یا۔ "مجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا تو نہ ہو۔ مجھ کو اس کی پروا بھی نہیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں دمشق میں زیادہ دن نہیں رہ سکوں گی۔"

ہارون نے تسلی دی۔ "بہر حال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا لوں گا اور ایک ڈر یہ بھی ہے کہ میرا باپ کہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو فوراً ہی یہ شبہ گزرے گا کہ اب عامر پر پوری توجہ نہیں دی جا رہی ہوگی۔ میں اپنے باپ کے دل سے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ امکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو اپنے پاس ہی روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کر دے۔ انہی فکروں نے مجھے ہلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔"

میزہ نے چنگی بھائی۔ "اس کا حل ہے میرے پاس۔ اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو محسوس میں رکھا جائے۔ تیرا بہنوئی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔"

ہارون نے اپنے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو میزہ کی یہ تجویز بہت اچھی لگی، بولا۔ "لیکن اس میں ایک خرابی بھی ہے۔"

میں نہیں جاؤں گی جب تک میں اولاد والی نہ ہو جاؤں۔"

ہارون نے کہا۔ "اگر میں تیری خواہش پوری کر دوں تو تو یہ بتا کہ عامر کا کیا بنے گا، وہ کہاں رہے گا؟"

میزہ نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ خدشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے بچے کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی۔ میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے اور ہمیشہ ہی محبتی رہوں گی۔ تجھ کو اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔ جب میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس بچے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ساتھ واقعی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر تیرے ہی پاس رہے گا اور یاد رکھ کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوئی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔"

یہ خبر میزہ کے باپ کو بھی مل گئی، اس نے خوشی کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر و منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ میزہ کے تعلقے اور شوخیاں پھر گورنر آئی تھیں۔ میزہ کا باپ ہارون کی ناز برداریوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا بہنوئی بھی اسے بہت مدد بخش تھا۔ ہاں اگر ان سب میں کوئی رنجیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میزہ ہارون کو دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیار و محبت سے متوجہ بھی ہوتی تو اس میں وہ شدت اور گرمی نہ ہوتی جو پہلے بھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کی کوششوں کو ہاتھ پیرا کرتا لیکن خود ہارون اس سے بے خبر تھا۔ ہارون کا بہنوئی۔ بھی عامر کے خلا کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی وہے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ "بیٹے عامر! تیرا باپ تجھ سے چھن گیا لیکن تو ذرا بھی فکر نہ کر میں جو موجود ہوں۔"

عامر کہتا۔ "لیکن پھوپھا جان، میری بی بی ماں میزہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ یہ اب اس کو کیا ہو گیا ہے؟"

پھوپھا جواب دیتا۔ "ہاں، پہلے وہ بھی سے پیار کرتی تھی مگر اب وہ اپنی محبت کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے بچے کے لیے جو ہنوز عدم میں ہے مگر آنے کے لیے بازو ہلا رہا ہے۔"

پھوپھا کی سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھوپھا کی باتیں عامر کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

بہنوئی نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے کہ تو میزہ کی دی ہوئی مدت سے پہلے ہی آ گیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "بھائی، میں میزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے نا انصافی بھی نہیں برداشت کر سکتا اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

بہنوئی نے کہا۔ "تو میزہ کی خواہش پوری کر دے کیونکہ میں نے اس دوران ہر طرح ٹھول کر یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ جو چاہتی ہے، اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔"

ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے سہلایا، پوچھا۔ "بھائی، اگر میں میزہ کی خواہش پوری کر دوں تو کیا وہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظر انداز نہیں کر دے گی؟"

بہنوئی نے ذہن پر ذرا سا زور دے کر جواب دیا۔ "اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو میں تجھے میں یہ مشورہ بھی نہ دیتا کہ تو میزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے اور میزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے۔ اب اسے زیادہ دنوں تک نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے۔ رہ گیا عامر تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے۔ میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی محسوس ہونے دوں گا۔"

ہارون نے اس قدر دیکھ کر کہہ دیا۔ "بھائی، پہلے مجھے غور کر لینے دو، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

ہارون نے اپنے بہنوئی کی تکی بیوی کو بھی دیکھا جو بظاہر ایک سیدھی سادی عورت نظر آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے میزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اس کے اعزاز میں دعوتیں ہوتی رہیں اور ہارون انہیں اڑاتا رہا۔ بہنوئی نے عامر کی دل جوئی شروع کر دی اور اس کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ عامر بھی اپنے پھوپھا میں خلوص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میزہ کو اپنی طرف سے کچھ کھنچا محسوس کیا تو پھر میزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔

میزہ نے جو تھے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا۔ "ہارون! میں مستقل بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ تو نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"

ہارون بہت خوش تھا۔ مسکراتا ہوا میزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا۔ "میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھ کو اپنے ساتھ لے کر دمشق چلا جاؤں گا اور خراسان واپس جانے کے منصوبے کو ذہن سے نکال دوں گا۔"

میزہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں دمشق اس وقت

دمشق لے کر چلا جاؤں گا۔"

میزہ نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک میں اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی۔"

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا۔ "میزہ کچھ لحاظ کر، اس موضوع پر پھر بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا بہنوئی نکل گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تجھ کو اب ضرور نہیں کرنی چاہیے۔"

میزہ نے جواب دیا۔ "یہ تو بار بار بہنوئی کا ذکر ہے میں کیوں لے آتا ہے؟ میں اس کو نہیں جانتی میرا مطالبہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔"

میزہ کا باپ جو ذرا سی دیر کے لیے ٹل گیا تھا، دوبارہ آ گیا۔ ہارون نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس کو کتنی اندر رکھ دیجیے۔"

میزہ کا باپ سامان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی آ گئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فرط جوش میں لپٹ گیا اور پوچھا۔ "ہارون تو..... کب آیا.....؟" اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا۔ "اور عامر تو کیسا ہے؟"

عامر نے بھی کچھ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "اچھا ہوں۔"

میزہ اٹھ کر جانے لگی، ہارون نے پوچھا۔ "کہاں؟"

میزہ نے جواب دیا۔ "میں ابھی آئی ہوں۔ تم لوگ باتیں کرو۔"

ہارون اپنے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا۔ "تم نے شادی کر لی؟"

بہنوئی نے جواب دیا۔ "ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور مجھے اس شادی کی اطلاع دینا چاہتا تو کہاں دیتا؟"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹیلوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارٹ کوالٹی، کپیر ایڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

عامر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور نیزہ اسے چھوڑ کر دمشق چلے جائیں گے۔ پھوپھو نے بڑی تسلیاں دیں لیکن عامر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف ہارون بھی عامر کی کمی محسوس کر رہا تھا مگر نیزہ نے تسلی دی اور سمجھایا کہ عامر کو بھی بھیجنا چھوڑ کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا موقع دو۔ ہارون کو غم کے ساتھ ہی یہ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا باپ... اس کی اس حرکت پر خوب خوب لعن طعن کرے گا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک اس کی بھوک پیاس اڑی رہی لیکن اس کا پھوپھو باہر بول جوتی کرتا رہا۔ عامر بار بار پارٹنڈی سانس بھر کر پوچھتا۔ "یہ باوا جان مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے؟ مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے؟" پھوپھو نے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا۔ "بیٹے عامر! اب تو میرا بیٹا ہے، اپنے باپ کو زیادہ نہ یاد کر۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا۔ تیرا باپ ایک اور عامر کی فکر میں ہے۔"

ایک اور عامر کی فکر کا مطلب عامر کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس سلسلے میں اس نے کوئی سوال بھی نہیں کیا۔ وہ زیادہ تر باتیں اپنے آپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کسی سے سوال کیے بغیر ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تھا۔ ہارون اور نیزہ کو عامر کے بغیر دیکھ کر ہارون کے باپ کو حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی اور ساتھ ہی ایک لاپرواہی اوجھار خوف بھی محسوس ہوا لیکن جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ عامر خیریت سے ہے اور محسوس میں اپنے پھوپھو کے ساتھ رہ رہا ہے تو ہارون کا باپ سنانے میں رہ گیا۔ اس نے ہارون کو مال و زر اور سامان کے بغیر دیکھا تو زیادہ پریشان ہو گیا۔ پوچھا۔ "کیا اس بار تو خالی ہاتھ آیا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "نہیں باوا جان! میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا، کچھ سامان لایا تھا اسے محسوس میں چھوڑ آیا۔" "محسوس میں چھوڑ آیا کیا مطلب؟ محسوس میں کس کے پاس چھوڑ آیا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "محسوس میں نیزہ کے گھر کیونکہ میں خراسان سے سیدھا محسوس گیا تھا۔" باپ نے غمی سے کہا۔ "لیکن محسوس میں تیرا اپنا گھر تو نہیں ہے۔ یہ کسی تبدیلیاں دیکھ رہا ہوں میں تجھ میں؟" ہارون نے جواب دیا۔ "ہاں باوا جان، میں نے ڈیڑھ سال تک اپنے مسائل پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں غلطی پر ہوں۔ مجھ کو اپنے مسائل کا حل خود ہی سوچنا

عامر محسوس میں رہا تو اس کے ننھے سے دل پر یہ اثر ہوگا کہ ہم دونوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے اور ہمیں سے اس میں احساس محرومی پیدا ہو جائے گا۔" نیزہ نے کہا۔ "اتنی گہرائیوں میں مت جا ہارون۔ میرا یہ کہنا مان لے۔ عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس ہی چھوڑ جا۔ میرا خیال ہے تیرا بہنوئی عامر کو اتنا خوش رکھے گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہر حال اس پر خوب اچھی طرح غور کر کے ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔" نیزہ نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ جو بھی کرنا ہے فوراً کر ڈالو۔"

ہارون نے عامر کو لے جانے یا نہ لے جانے پر خاصا غور و فکر سے کام لیا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ عامر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، نقصان ہی نقصان ہے۔ اس نے خاموشی سے نیزہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، بولا۔ "نیزہ! اب میں تیرے ہی فیصلے پر عمل کروں گا۔ ہم دونوں دمشق چلیں گے۔ عامر ہمیں بہنوئی کے پاس ہی رہے گا۔ اس طرح میرے باپ کو ورغلائے پھسلانے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ عامر کو روک نہیں سکے گا۔"

نیزہ کا چہرہ خوشی سے تھماتے لگا، بولا۔ "میں ہمیشہ تجھے وہی شورہ دوں گی جس سے تجھ کو نقصان نہ پہنچے۔ میں تیری شریک حیات ہوں، میں ہمیشہ وہی چاہوں گی جو خود اپنے لیے پسند کروں گی۔ اس لیے تجھ کو مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔" ہارون نے نیزہ کو آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔ "انسوس کہ میں نے تجھے سمجھنے میں بڑی غلطیاں کی ہیں لیکن اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔"

نیزہ نے ہارون کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو دونوں آنکھیں بند کر لیں، بولی۔ "ہارون! کوئی انسان بھی غلطی نہ کرے اگر دوسرے ورغلا کر غلطیاں کرنے پر مجبور نہ کریں۔ تو محسوس اور پاکباز انسان ہے جب کہ دوسرے چالاک اور عیار تھے۔ ان چالاکوں نے تجھے ورغلا کر گمراہ کر دیا تھا اس لیے مجھ کو تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لوگوں سے شکایت ہے جو دوسروں کے معاملات میں خواستواہ دخل دے کر انہیں تباہی اور بربادی کے کنارے پر پہنچا دیتے ہیں۔ انسوس کہ تیرا باپ بھی انہی میں سے ایک ہے۔"

ہارون شرماتا ہوا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور شرماتا آنکھیں بند کر لیں۔

پہنچا اور خارجیوں کے خوف ناک شب خون کی حکومت کو اطلاع دی۔

”میزہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا۔ شاید تیری، عامر اور ابراہیم کی وجہ سے کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام و اکرام سے نواز دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تاثر دیا ہے کہ میں نے خارجیوں کا تہا زبردست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک محاصرے سے بزور قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“

”میزہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارجیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ جبری لوگ ہیں جن کے چند افراد میکروں بلکہ ہزاروں کو کھست دے دیتے ہیں۔ بڑے بڑے تجربہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روئے زمین پر نہیں ہیں، نہ پہلے بھی تھے۔“

”مجھے تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند ریشمی کلوے بھیج رہا ہوں ان میں دو ٹیلے پارچے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو یہ رنگ بہت پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لیے رکھ لے۔ میں نے اس سے پہلے جو سلیپر روانہ کی تھی، وہ پسند آئیں یا نہیں؟ عامر کو اپنی سلیپر کسی لٹی؟“

”میزہ! میں تجھ کو خدا اور سربراہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو عامر کا خاص خیال رکھ۔ ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ تیرا بیٹا ہے اور اس کے لیے کچھ لکھوں یا نہ لکھوں تو اس کا خیال بہر حال رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے۔ میرے بہنوئی نے اس کی ذمے داریاں قبول کر کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس بے نیازی کو ناپسند کرتا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گود بھر دی۔ اب تو بھی میری خواہش پوری کر اور عامر پر وہی نوازشیں برسا دے جو بھی دمشق میں برسایا کرتی تھی۔“

”میرے خوابوں اور خیالوں کی پراسرار ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق میں میرا پاپ بیماری چھیل رہا ہے؟ افسوس کہ اس وقت میں اس کے پاس نہیں لیکن جس آتے ہی میں تجھے لے کر دمشق چلا جاؤں گا۔ اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے بیمار باپ کی خبر گیری کر سکے تو ضرور کر۔ میں تیرا عمر بھرا احسان مند رہوں گا۔“

ہارون کے بہنوئی نے اس شخص کو رخصت کر دیا پھر خط اور سامان کی پوٹلی میزہ کو پہنچا دی۔ اس نے میزہ پر یہ نہیں

ایک دن جب وہ محض کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے سے پہلے اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ یہ شخص سامان کی پوٹلی سنبھالنے میزہ کے باپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔ میزہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص کو عزت و احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کروایا۔

”میں ہارون کا بہنوئی ہوں۔ اگر ہارون کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔“

اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پوٹلی اس کے حوالے کر دی۔ ”یہ ہارون نے بھجوائی ہے، اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی۔ اس کے علاوہ کپڑے بھی ہیں۔“ اس نے پوٹلی لے لی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں میزہ کو لکھا گیا تھا۔

”صبح کی خفق کی طرح گھنار اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے والی تصویر کی طرح حسین میزہ! میں مغرب واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی خارجی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ دو دن پہلے میں ایک خارجی کی زد میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارجیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے تھے کہ رات کو خارجیوں نے ہم پر شب خون مار دیا۔ ان کے اچانک اور خوف ناک حملے نے ہمیں اتنا بدحواس کر دیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ خارجی ہمیں بے دردی سے قتل کرتے رہے۔ ہمارے خیموں کی پلٹا میں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے چاروں طرف خون کے فوارے چھوٹنے دیکھے۔ زخمیوں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی۔ جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، خارجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ہنگامہ دارو گیر میں معلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مردوں کی طرح لیٹ گیا۔ خارجیوں نے مجھے بھی مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بچلت اور جوش میں میرے پاس سے گزرتے رہے لیکن مجھ پر شبہ نہیں کیا۔ ایک خارجی نے اپنا پاؤں میرے منہ پر رکھ دیا اور پکھلتا ہوا نکل گیا۔ میں دم سادھے اذیت کی پروا کے بغیر مردے کی طرح بڑا رہا۔ میں نے اپنے آس پاس چلتے ہوئے زخمیوں کی لپٹیں محسوس کیں مگر اس وقت تک اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی جب تک کہ مجھے یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے خارجی جا چکے ہیں اور اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بچتا بچتا چھپتا چھپتا موصول

ہارون کی ولادت کی خبر جب ہارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو غصہ لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تہا کی دور ہو جائے لیکن عامر کو اس کے پھوپھانے بھیجے سے انکار کر دیا۔ ہارون کو ایک بار پھر محسوس چھوڑنا پڑا لیکن اب اسے موصول کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جزیرہ اور اس کے مضائقہ میں بھیج دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور محض کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بیوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور میزہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا مگر دونوں کی طرح عامر کے دل میں جھانک کئے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جاسکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون کے باپ کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو غصہ لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ اس کی تہا کی دور ہو جائے لیکن عامر کو اس کے پھوپھانے بھیجے سے انکار کر دیا۔

ہارون کو ایک بار پھر محسوس چھوڑنا پڑا لیکن اب اسے موصول کے آس پاس خارجیوں سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لیے جزیرہ اور اس کے مضائقہ میں بھیج دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور محض کے حاکم کی ملازمت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی کہ اس کا پھوپھا اولاد سے محروم تھا چنانچہ دونوں میاں بیوی نے عامر کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور میزہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا مگر دونوں کی طرح عامر کے دل میں جھانک کئے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے دلوں کے احساسات معلوم کیے جاسکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ موجزن دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔

ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں بھی لکھتا رہتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجودگی میں میزہ پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی اتنا ہی خیال رکھئے جتنا وہ اس کا کرتی ہوگی۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھیجتا، وہی عامر کے لیے بھیجتا لیکن میزہ اسے بھی رکھ لیتی اور عامر کو اس کی ہوا تک نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی سوچنے لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے محروم رکھا گیا۔ اس کا یہ انداز فکر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا تھا اور جب اس نے یہ دیکھا کہ ہارون، ابراہیم کا تہا ذکر بھی نہیں کرتا، اس کے ساتھ عامر کا ذکر ضرور کر دیتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اب محض میں نہیں رہنا چاہیے کیونکہ عامر جب تک محسوس میں رہے گا، ہارون اس کے بیٹے ابراہیم پر خاص توجہ نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر اس کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ ہارون کے بہنوئی کے پاس رہ رہا تھا اور ہارون کے بہنوئی کو ترک سکونت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی میزہ کے حسد کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔ میزہ، عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا بہنوئی اسی قدر خوش ہوتا اور عامر پر نوازشوں اور عنایتوں کی بارش کر دیتا۔ وہ میزہ کو جلا جلا کر ایک قسم کی لذت حاصل کر رہا تھا۔

مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔“

ہارون نے میزہ کی طرف متنی خیز نظروں سے دیکھا۔ دونوں ہی کے چہروں پر مسکراہٹ موجود تھی پھر باپ سے کہا۔ ”مطلب یہ کہ میں میزہ کو ناخوش نہیں رکھ سکتا۔ وہ جن کی عمریں ختم ہو چکیں اور عدم کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کو صحیح مشورہ کس طرح دیں گے جو بظاہر عدم کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں میزہ کو اولاد سے محروم نہیں کر سکتا۔“

باپ نے ہارون کی باتیں بڑے گل سے گل سے اور کئی قدر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی بھگتے گا۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک نہ ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے منحرف ہو جائے گا۔“

ہارون نے کہا۔ ”میں بڑوں کے فیصلے سے منحرف نہیں ہوا بلکہ فیصلوں کی غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔“

باپ نے ان دونوں میں دلچسپی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب ہارون اور میزہ کا بیشتر وقت ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ ان کی محبتیں ایک دم جوان ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی گنتائیں گھل گھل گئی تھیں اور انہیں کاپی بار محبت اور آزادی کے نشے اور لذت کا مسح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن دمشق میں رہے پھر محسوس چلے گئے۔ محسوس میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ ہارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمے داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائیں۔ ہارون جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تہا رہا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور چہل پہل سے بھر پور دنوں کو یاد کرتا رہتا جب اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی، عامر، ہارون کی بہن اور دوسرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے، انہی میں میزہ بھی یاد آ جاتی لیکن میزہ کی یاد سے وہ طویل ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز کر دیا تھا۔ میزہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے سے بدلہ لے لیا۔

ایک سال بعد میزہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے وزن پر قابو رکھنا چاہتا تھا لیکن میزہ نے اس نام کو ناپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم رکھ دیا۔ یہ بات عامر کو بھی معلوم ہوئی تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ میزہ اس سے نفرت کیوں کرنے لگی۔

ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا خط پڑھ لیا ہے۔ نیزہ
خط کو لے کر کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلے تو
اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، بہنوئی نے پوچھا۔
”کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟“
نیزہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ہارون بہت جلد آنے
والا ہے۔ وہ خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے قتل
کیا ہے۔“
اس نے پوچھا۔ ”اور کچھ؟“
نیزہ نے جواب دیا۔ ”اور یہ کہ ہارون کا باپ
دمشق میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے تو عامر کو ساتھ لے کر فوراً دمشق
چلا جا کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خواہش ہے۔“
وہ نیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا۔ پوچھا۔ ”اور کچھ؟“
نیزہ نے جھل کر جواب دیا۔ ”اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی
نہیں ہے؟“
وہ بڑی دیر تک نیزہ کے پاس ہی بیٹھا رہا کہ شاید
ریشی پارچے عامر کے حوالے کر دیے جائیں لیکن نیزہ نے
ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عامر بھی یہ خبر سن کر وہیں آ کر بیٹھ گیا تھا
کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے لیکن نیزہ نے اس کی
موجودگی کو بالکل نظر انداز کر دیا اور کن آنکھوں تک سے
دیکھتا گوارا نہ کیا۔ اس نے عامر کو جلانے کے لیے ابراہیم کو
گود میں اٹھایا اور اس کو بھینچ کر پیار کرتے ہوئے
بولی۔ ”ابراہیم! تیرے باپ نے تجھ کو پیار لکھا ہے اور
ہدایت کی ہے کہ میں تجھ کو خوب بھینچ کر تیرے باپ کی
طرف سے پیار کروں۔“
بہنوئی نے عامر کی طرف دیکھا جو کھوپا کھویا، گم صم یہ
منظر دیکھ کر دل ہی دل میں رو رہا تھا۔ بہنوئی نے پوچھا۔
”کیا ہارون نے عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا؟“
نیزہ نے چونک کر باری باری دونوں کی طرف دیکھا
اور عامر کے پھوپا کو جواب دیا۔ ”نہیں، عامر کے لیے کچھ
بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عامر کا کیا مقابلہ۔ عامر
بلوغت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی
رہا ہے۔ چنانچہ میرا شیر خوار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے،
عامر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔“
بہنوئی نے جواب دیا۔ ”نیزہ! تیرا انداز فکر درست
نہیں، ایک باپ کی نظر میں چھوٹے بڑے بچے میں کوئی
فرق نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہارون عامر سے بھی
بڑی محبت کرتا ہے اور اس نے اپنے خط میں عامر کی بابت
کچھ نہیں لکھا تو حیرت ہے۔“

نیزہ نے برامان کر کہا۔ ”میں تجھ سے ایک بات کچھ
عرصے سے نہیں کہہ پارہی ہوں لیکن اب کہہ ڈالوں گی۔“
بہنوئی نے جواب دیا۔ ”تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب
دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے تو منافقت سے بچنا چاہیے۔“
نیزہ نے پوچھا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس
گھر میں کیوں رہ رہا ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ تو
نے اور تیرے باپ نے مجھ کو یہاں روک رکھا ہے۔“
نیزہ نے کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں اگر تو اس طرح
سوچ رہا ہے تو غلط سوچ رہا ہے۔ اب تجھ کو یہاں سے چلے
جانا چاہیے۔“
اس نے جواب دیا۔ ”میں تیرے کہنے سے تو ہرگز
نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک عرصے سے شبہ تھا کہ ایک نہ ایک
دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کرے گی اس لیے میں
نے عامر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عامر میرے
ساتھ ہے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“
نیزہ نے کہا۔ ”عامر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گی۔ تو
یہاں سے چلا جا۔“
بہنوئی نے عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اس کو تو اپنے
پاس رکھو گی؟ عامر کو تو رکھنے کی؟“
گوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے نہیں اور میں خود بھی عامر کو
تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“
نیزہ نے جواب دیا۔ ”اس کا فیصلہ بھی بہت جلد
ہو جائے گا۔ ہارون کے آنے کی دیر ہے پھر میں عامر کو جبراً
اپنے پاس رکھ لوں گی۔“
بہنوئی نے اکر کر کہا۔ ”ہاں، صرف اس صورت میں
کہ خود عامر بھی تیرے پاس رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“
نیزہ نے تن کر کہا۔ ”میں عامر کو تجھ سے زیادہ محبت
دے سکتی ہوں۔ تجھ سے زیادہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔“
بہنوئی ہنس دیا، بولا۔ ”بے شک، بے شک مجھ کو یقین
ہے جو عورت عامر کی سلپریں غائب کر دے اور ریشمی
پارچے اڑا دے وہ واقعی بڑی محبت سے رکھ سکتی ہے۔“
نیزہ دنگ رہ گئی، کٹ سی گئی گرم ہو کر بولی۔
”بداخلاق انسان! اس کا یہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط
پڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور اسی لیے سلپریں
پارچوں کو دبا کر بیٹھ گئی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو میرے
خطوط پڑھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا۔“
بہنوئی نے کہا۔ ”اب فضول باتیں نہ کر جب تیری

عشقی نامہ عامر نے جواب دیا۔ ”مجھ کو ان کا یوں خیال آ گیا کہ
انہوں نے میرے باپ کو مارتے مارتے چھوڑ دیا اور
میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی تعریف
کی ہے۔“
پھوپا معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اچھل سا پڑا،
بولا۔ ”بیٹے عامر خارجیوں کی بات بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ
ایمان دار اور بہادر لوگ ہیں۔ اس روئے زمین پر اپنا ثانی
نہیں رکھتے۔“
عامر نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا یہ لوگ اچھے ہوتے
ہیں؟ آپ تو ان کی تعریفیں کر رہے ہیں۔“
پھوپا نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں ان کی تعریف کر رہا
ہوں اور اس لیے کہ وہ تعریف کے مستحق ہیں۔ تیرے
باپ نے بھی اپنے خط میں ان کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔“
عامر نے پوچھا۔ ”اگر وہ اتنے ہی اچھے ہیں تو حکومت
ان سے جنگ کیوں کرتی ہے؟ میرا باپ ان کے خلاف
تھیار کیوں اٹھاتا ہے؟“
پھوپا نے جواب دیا۔ ”ان میں کچھ برائیاں بھی
ہیں، بس ان برائیوں کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔“
عامر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ ”برائیاں کہاں
نہیں ہوتیں، کس میں نہیں ہیں پھر جنگ سب سے کیوں نہیں
لڑی جاتی؟“
پھوپا نے فاتحانہ شان سے کہا۔ ”تو ان باتوں پر
مت غور کر دمشق چلنے کی تیاری کر۔ ہم دونوں دمشق چل کر
تیرے دادا کی تیمارداری کرتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو
نیزہ بھینچ جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر
قبضہ چلا لے گی۔“
لیکن عامر کو مال و زر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بولا۔
”میں دمشق کے لیے چل تو سکتا ہوں کہ وہاں میرا دادا تیمار
داری ہے، اس کی تیمارداری کر لوں گا لیکن مال و زر کی ہوس لے کر
ہرگز نہیں جاؤں گا۔“
پھوپا نے کہا۔ ”کسی طرح چل تو سکی۔ مال و زر کی ہوس نہ
کر مگر اس مال و زر کو غلط فہم کے پاس بھی مت جانے دے۔“
پھوپا نے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لیا۔ جب یہ تینوں بالکل
تیار ہو گئے تو اس نے نیزہ کو مطلع کر دیا، بولا۔ ”نیزہ! تو خوش
ہو جا۔ تیری مرضی پوری کیے دے رہا ہوں۔“
نیزہ نے پوچھا۔ ”میری مرضی؟ کون سی مرضی پوری
کر رہا ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”نیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے

چوری پکڑی گئی تو تو اس قسم کی مٹھی مٹھی باتیں کرنے لگی۔“
نیزہ نے عامر سے پوچھا۔ ”عامر! سچ بتا تو کس
کے پاس رہنا گوارا کرے گا؟ میرے پاس یا اپنے پھوپا
کے پاس؟“
عامر نے کسی بس و پیش کے بغیر جواب دیا۔ ”پھوپا
کے پاس۔“
نیزہ نے غصے میں جھنجھلا کر پوچھا۔ ”یعنی میرے
پاس نہیں؟“
عامر نے جواب دیا۔ ”ہاں، آپ کے پاس نہیں۔“
نیزہ غصے میں کھڑی ہوئی، بولی۔ ”کوئی بھی میرا
نہیں، میں کتنی احمق تھی جواب تک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی۔“
عامر نے جواب دیا۔ ”آپ نے بھی اپنا سمجھا ہو مجھے
تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن یہ باتیں اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی
بھر یاد رہیں گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا شروع کر دیا
ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کر دیا ہے۔“
پھوپا کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔ نیزہ کو یہ
کوفت کھائے جا رہی تھی اگر عامر نہ ہوتا تو ہارون کا سب کچھ
نیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ نیزہ غصے میں
اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور ہارون کا بہنوئی اور
عامر دونوں اپنے کمرے چلے آئے۔
☆☆☆
بہنوئی نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ عامر کے ساتھ
دمشق چلا جائے گا اور وہاں ہارون کے والد کی تیمارداری
میں مشغول ہو جائے گا۔ اس کے اس منصوبے سے ہر شخص
لاطم ہی رہتا لیکن بہنوئی زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے اس نے
ہر ایک کو روک کر بتانا شروع کر دیا۔ اس نے عامر کو دادا کی
تیمارداری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند
دنوں کے لیے دمشق چلا جاتا ہے تاکہ تیرے پیار دادا کی
شاندار تیمارداری کی جاسکے۔ اس نے چپکے چپکے عامر کو نیزہ
کی وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے ہارون کے خط میں
پڑھی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا۔
”عامر! تجھ کو نیزہ اور اس کے پاس موجود مال و زر
سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اس عرصے میں عورت کے
پاس سے کچھ نکھانا بڑا مشکل کام ہے۔“
لیکن عامر اپنے باپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔
اس نے پوچھا۔ ”پھوپا جان! یہ خارجی کون ہیں؟“
پھوپا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ لکا لکا تجھ کو
خارجیوں کا کیا خیال آ گیا؟“

کتاب یہاں نہ رہوں، میں دمشق جا رہا ہوں.....“
 منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”اور عامر..... یہ
 عامر کہاں رہے گا؟ کس کے پاس رہے گا؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”اسوس کے پاس رہے گا۔“
 منیزہ نے کہا۔ ”تم دونوں نے بہت اچھا فیصلہ کیا
 ہے۔ تم لوگ چلو، چند دنوں بعد میں بھی پہنچ رہی ہوں۔“
 چنانچہ دو دن بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو
 منیزہ سے جدائی کا ذرا بھی ملال نہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن
 بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے۔ قضا ابراہیم اور
 ہلی ہلی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پر کیف ہوا میں جسم میں
 سرور کی لہریں دوڑا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو
 ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ یہ پریشان حال پر دیکھی
 کسی مقصد سے دمشق آئے ہیں۔ یہ تینوں پریچ راستوں کو
 عبور کرتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے
 ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔
 یہ تینوں اندر داخل ہوئے تو قریب المرگ بوڑھے کے آس
 پاس چند پڑوسیوں کو بیٹھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے
 پوچھا۔ ”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“
 ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں اس بوڑھے
 کا داماد ہوں۔“ پھر عامر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور یہ لڑکا اس
 بوڑھے کا پوتا ہے۔“
 پڑوسی ادھر ادھر کھسکنے لگے۔ عامر اپنے دادا پر جھک گیا
 اور بڑی محبت سے کہا۔ ”دادا جان! میں عامر آ گیا۔ اب
 آپ کیسے ہیں؟“
 دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا،
 شاید پہچان نہ سکا۔
 عامر نے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی
 ان کے سینے اور چہرے پر جھک گیا اور بولا۔ ”دادا جان!
 مجھے آپ نے بلا یا تھا۔ میں عامر آپ کا پوتا ہوں۔“
 دادا نے ہلکے ہلکے کہا۔ ”ہارون..... کیا تو ہارون ہے؟“
 عامر نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں ہارون نہیں، میں
 ہارون کا بیٹا عامر ہوں۔“
 دادا کی جاتی ہوئی سانس واپس آ گئی۔ ایک بار پھر
 آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان تینوں کی طرف دیکھا اور بہنوئی کی
 طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو تو ہے ہارون.....
 تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟“
 عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”دادا جان! یہ پھوپھا جان ہیں۔ میرا باپ اور آپ کا بیٹا
 ہارون آنے ہی والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“
 دادا کو رونا آ گیا۔ ”مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر
 میرے سینے سے لگ جاتا کہ میں برسوں کے تنہا اور اداس
 دل کو سکون پہنچا لوں۔ سب نے مجھے اکیلا چھوڑ دیا، تنہا
 چھوڑ دیا۔“
 عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے بوجھ نے
 دادا کی سانس میں فوری پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔
 عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس کے پاؤں
 دابنے لگا۔
 دادا کو کسی لمحے ہوش آ جاتا لیکن یہ ہوش بھی مدہوشی سے
 کم نہیں تھا۔ مال و زر کا اس دنیا میں جو مقام ہے بوڑھے کا
 مدہوشی میں بھی اس کی قدر و قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔
 دادا کی سانس کئی بار اکھڑا کھڑا واپس آئی اور ہر بار کئی
 شب گزرا کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن
 ثابت ہوں گے لیکن بڑے مہیاں نے تو باتوں تک سے
 توانائی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کوشش میں
 مشغول تھے کہ ان کی ناسازی طبع کا خاص اثر نہ لیا جائے
 لیکن وہ عنقریب ادھر ادھر ہو جانے والے تھے۔
 شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر سے بگڑی اور
 ہلکی ہلکی باتیں کرنے لگے۔
 عامر نے کہا۔ ”دادا جان! ہوش میں آئیے، پریشان
 مت ہوئیے۔“
 لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں۔ انہوں نے نہ تو
 کسی کی باتیں سیں اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔
 عامر اور اس کا پھوپھا بوڑھے کے پاس بیٹھے اس کے انجام
 کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدہوشی میں بار بار ہارون کا نام لے رہا
 تھا اور بار بار یہی کہہ رہا تھا۔
 ”ہارون! تو نے عامر پر ظلم کیا ہے، زیادتی کی ہے۔“
 عامر کے دل پر آ رہے چل رہے تھے۔ دادا نے پھٹی
 پھٹی آنکھوں سے خلا میں گھورا اور مرحوم بیٹی کو آوازیں دیتے
 ہوئے ڈوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز دی۔ ”دادا جان!
 ہوش میں آئیے۔“
 انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکنے والی نظروں سے
 عامر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تو کون ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟“
 عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! میں ہوں عامر
 آپ کا پوتا۔ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجیے۔“

عشقی نام تمام
 لیکن دادا نہیں پہچان سکا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو
 جاری تھے۔ اس نے نزع کے عالم میں کہا۔ ”میرے پاس
 جو کچھ ہے عامر کا ہے۔ عامر کو بلاؤ تاکہ میں یہ سب اس کے
 حوالے کر دوں۔“
 داماد نے سر کو آواز دی۔ ”جناب! یہ عامر آپ کے
 پاس ہی موجود ہے۔ پہچانے تو۔“
 لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا
 کے پانچویں پاؤں پر جھک گیا، انہیں کئی بو سے دیے اور اپنے
 پھوپھا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی کی تیاریاں کرنے لگا
 لیکن تدفین سے پہلے ہی ہارون اور منیزہ بھی پہنچ گئے۔
 ہارون باپ کی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیزہ نے سکھ کا
 سانس لیا کہ اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے
 ہٹ چکا تھا۔
 تمام رسوم سے فارغ ہونے کے بعد ہارون نے
 فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق میں نہیں رہے گا اور سامان اور مال
 و زر کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہمیشہ کے لیے محض
 چا جائے گا لیکن بہنوئی نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔
 ”ہارون! یہ مکان نہیں بیکے گا اور گھر میں جو کچھ بھی
 ہے تیرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق
 عامر کا ہے۔“
 ہارون اپنے بہنوئی کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیزہ
 بھی اس کے پاس ہی کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی
 تھی۔ ہارون نے پوچھا۔ ”میرے باپ کی آخری وصیت
 اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی عامر کا ہے، اس کا
 مطلب؟“
 بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں نے مرنے سے چند
 لمحے پہلے خود سنا ہے کہ مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا
 مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی ہر شے عامر
 کی ہے۔“
 منیزہ نے کہا۔ ”جب تک ہم میں ہارون موجود ہے
 ہارون کے مرحوم باپ کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا
 اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابراہیم بھی تو مرحوم کا پوتا ہے۔“
 لیکن ہارون نے منیزہ کو سمجھایا۔ ”منیزہ! مجھ کو نہیں
 اٹھنا چاہیے میں خود بات کر لوں گا۔“
 بہنوئی نے ہارون کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ ”ہارون!
 تو اس معاملے میں خاموشی اختیار کر۔ جیسا میں کہتا ہوں اس
 کو اسی طرح رہنے دے کیونکہ آئندہ اختلافات کی قطع و بیج
 تو ہو جائے گی مگر بچے کی نہیں، اس لیے عامر کو جو کچھ مل رہا

ہے، اس کے پاس ہی رہنے دے۔“
 لیکن ہارون نے اس کی بات نہیں مانی۔ ”بھائی! اسی
 باتیں نہ کرو۔ عامر میرا بیٹا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں
 تمام چیزیں میرے قبضے میں رہیں گی اور عامر کو ان پر یوں
 ہی تصرف حاصل رہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔“
 بہنوئی نے اسوس ناک لکھے میں پوچھا۔ ”تو کیا تو
 عامر کو ان چیزوں اور مکان سے محروم کر دے گا؟“
 ہارون نے جواب دیا۔ ”میں مکان بیچ دوں گا اور
 سارا مال و زر لے کر محض چلا جاؤں گا۔ عامر اگر تیرے پاس
 رہا تو ٹھیک ہے ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔“
 بہنوئی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں
 نفرتیں جمع ہو رہی تھیں۔ ماں کے خلاف، باپ کے خلاف
 اور دنیا کے خلاف۔
 چند دنوں بعد مکان بھی بیک گیا اور سارا سامان سیٹ
 کر ہارون محض روانہ ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا پھوپھا
 بھی تھا۔ منیزہ بہت خوش تھی۔ اب اس کی جیت ہی جیت
 تھی۔ محض میں داخل ہوتے ہی منیزہ نے ہارون کو سمجھایا۔
 ”ہارون! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ یہ مختصر سا کتبہ خوش و خرم اور نہال
 رہے تو، تو اپنے بہنوئی کو یہاں سے چلا کر دے۔“
 ہارون نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”میں ایسا نہیں
 کر سکتا۔“
 منیزہ نے پوچھا۔ ”تیری بہن بھینچی ہے۔ اس کی
 کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ اب تیرا اس شخص سے رشتہ ہی
 کہاں رہا۔“
 ہارون نے جواب دیا۔ ”منیزہ! بات اور حالات
 کو سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا بہنوئی تھا اور ہمیشہ، جب تک
 زندہ ہے میرا بہنوئی ہی رہے گا۔ اس نے میرے عامر کو
 بڑی محبت سے رکھا ہے۔“
 منیزہ نے کہا۔ ”تو اس کو یہاں سے چلا کر دے۔
 عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی کیونکہ لوگ باتیں بناتے ہیں
 اور اب میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی۔“
 ہارون نے جواب دیا۔ ”لیکن میں بہنوئی سے اس
 قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیں میرے پاس ہی رہے گا
 اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا۔“
 منیزہ لا جواب ہو کر خاموش ہو گئی لیکن اس کے تئیر
 بتا رہے تھے کہ وہ مایوس نہیں ہوئی۔
 ☆☆☆
 ہارون محض میں کئی بار آیا اور گیا لیکن ابھی تک اس

نے جس کو اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ اب باپ کی موت کے بعد جب وہ خود کو ہلکا اور آزاد محسوس کرنے لگا تو تقریحات کی سوچی۔ وہ نیزہ اور ابراہیم کو ساتھ لے کر گھومنے لگا تو عامر کا خیال آ گیا۔ نیزہ سے کہا۔

”نیزہ! میرا خیال ہے عامر کو بھی لے لیا جائے؟“

لیکن نیزہ نے مخالفت کی، بولی۔ ”عامر اب بچہ نہیں ہے۔ وہ ہمارے ساتھ کہاں جائے گا۔ ابراہیم تو بچہ ہے۔ گود میں رہے گا۔ یہ بھی اگر عامر ہی جتنا ہوتا تو میں اسے بھی اپنے ساتھ نہ لے جاتی۔“

بارون چپ ہو گیا لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آ گیا اور پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”میں بارون کو جس کا خاص خاص چیزیں دکھانا چاہتی ہوں۔“

بہنوئی نے کہا۔ ”نیزہ! میں تجھ سے کوئی بات نہیں کروں گا، ہاں بارون سے البتہ یہ کہنا ہے کہ اپنے ساتھ عامر کو بھی لیتا جا۔“

عامر بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ بارون نے عامر کو دیکھنا چاہا لیکن بہنوئی کے حائل ہونے کی وجہ سے وہ نہیں دیکھ سکا، بولا۔ ”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، عامر بھی چلے میرے ساتھ۔“

لیکن نیزہ نے ہنسے۔ ”نہیں، تم بھرتیں رکھ جاتی ہو۔ میں نہیں جاؤں گی۔ پہلے تم گھوم پھر آؤ، بعد میں، میں چلی جاؤں گی۔“

بارون کو بھی غصہ آ گیا، بولا۔ ”یہ کیا بات ہوئی نیزہ؟ کیا تو عامر سے حسد کرتی ہے؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں حسد نہیں کرتی لیکن اگر لوگوں نے چاہا تو حسد بھی کرنے لگوں گی۔“

لیکن بہنوئی نے بگڑ کر کہا۔ ”بارون! تو نے نیزہ کو بڑے اختیار دے دیے ہیں۔ میں اس عورت کے منہ پر کہتا ہوں کہ یہ عامر سے جلتی ہے، حسد کرتی ہے۔ میں خدا کا واسطہ دے کر تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ ان دونوں کے معاملے میں فریق نہ بن ورنہ بچھڑائے گا۔“

بارون نے نیزہ کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔ ”تو تیرا کیا خیال ہے نیزہ، عامر کو ساتھ کیوں نہ لے لیا جائے؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔ تو عامر کو شوق سے لے جا۔“

بارون نے نیزہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”نیزہ! تو بھی ساتھ چل ضد نہ کر، آخر عامر بھی تو میرا ہی بیٹا ہے۔“

نیزہ نے جل کر جواب دیا۔ ”میں یہ کب کہتی ہوں

کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ عامر ہی تیرا بیٹا ہے۔“ ہارون نے بیسی محسوس کرنے لگا۔

بہنوئی نے پلٹ کر عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، بولا۔ ”میرے بچے! تو صبر کر انہیں جانے دے۔ تجھے پھر کسی دن کھما پھر الاؤں گا۔“

بارون نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں، اس دن میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا تو فکر نہ کر پھر کسی دن سہی۔“ اس کے بعد ہارون، نیزہ اور ابراہیم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

بارون نیزہ کی گرہ میں تھا۔

بہنوئی عامر کو لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں داخل ہو جانے کے بعد بہنوئی نے عامر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ رو رہا تھا۔ پوچھنے پر عامر نے جواب دیا۔ ”پھوپھا جان! اس عورت نے مجھ سے میرے باوا جان کو چھین لیا ہے۔“

پھوپھا نے جواب دیا۔ ”تو فکر نہ کر عامر، میں اس عورت سے تیرے باوا کو چھین لوں گا۔“

نیزہ، ہارون کو خوب خوب گھماتی پھرتی رہی۔ اس نے شہر کے وسط میں یوحنا کے کلیسا کی سیر کروائی۔ اس کا نصف حصہ مسجد تھا اور نصف کلیسا۔ مسجد کے دروازے پر ایک پتلا کھڑا تھا۔ ایک بلند دیوار استون پر کسی آدمی کی مورتی چوٹی کے سپر پتھر پر بنی ہوئی تھی۔ ”مورتی کے قدموں میں چھو کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اس جگہ پہنچ کر نیزہ نے زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہارون! اس بت کے قدموں سے منی اٹھا کر اس کے جسم پر مل دے کیونکہ اس سے تو ہمیشہ کے لیے بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جائے گا۔“

بارون نے جواب دیا۔ ”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ یہ مورتی نہیں ایک طلسم ہے اور اس کے قدموں میں منی ڈالنے والا ہمیشہ بچھو کے زہر سے محفوظ رہتا ہے۔“

بارون اور نیزہ نے ایک ساتھ مورتی کے قدموں کی خاک اٹھا کر مورتی کے قدموں پر ڈال دی۔ اس کے بعد نیزہ نے ننھے ابراہیم کی منگی زبردستی کھول کر اس پر تھوڑی سی خاک رکھ دی اور ہارون نے یہ خاک مورتی کے پاؤں پر ڈال دی۔ اب وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ہارون کو اس موقع پر عامر یاد آ گیا، بولا۔ ”افسوس کہ عامر ہمارے ساتھ نہیں ورنہ وہ بھی مورتی کے قدموں میں خاک ڈال کر بچھو کے زہر سے محفوظ ہو جاتا۔“

نیزہ نے منگی سے کہا۔ ”ہارون! تو ہر جگہ عامر کا نام مت لیا کر۔ عامر کو اس کا پھوپھا بڑے ناز و نعم سے پال رہا

عشق نامحرم

ہے۔ اب اس پر تو نے بھی توجہ دی تو وہ بے جالا ڈیپار میں بگڑ جائے گا۔“

ابھی نیزہ کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ہارون کا بہنوئی عامر کو لے کر ان کے سامنے پہنچ گیا۔ ہارون نے جوش مسرت سے کہا۔ ”واہ تو آ گیا عامر! اس وقت تو میں جو بھی دعا مانگا پوری ہوتی۔ میں تجھ کو یاد ہی کر رہا تھا۔“

نیزہ کو ہارون کے بہنوئی پر بڑا غصہ آیا، بولی۔ ”تو بہت شری انسان نظر آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت لے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”میں کسی اور وقت کیوں لاتا، تم دونوں نے اس کو بھکا دیا تھا لیکن میں اس کا آرزوہ اور افسردہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے آیا۔ کیا تجھ کو عامر کا آنا پسند نہیں؟“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو ہارون سے یہ کہہ رہی تھی کہ دیکھ لیا تو نے۔ میں جو تجھ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری توجہ کا قطعاً بھوکا نہیں۔ اس کے پھوپھا نے اس کو وہ آرام پہنچایا ہے کہ اب عامر کو ہماری فکر ہی نہیں رہی۔“

بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابراہیم کو ذرا بڑا ہونے دو، اگر اس کو بھی اپنے قابو میں نہ کیا تو میرا نام نہیں۔“

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے مورتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھائی ہوئی مٹی مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ چل پھر رہے تھے۔ ہارون نے ازراہ مذاق کہا۔ ”بھائی، تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید مجھے پہچانے گا بھی نہیں۔“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے؟“

بارون نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا ابھی کچھ اور بھی دیکھنا باقی ہے؟“

بہنوئی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اس کو اس لائق کر دوں گا کہ یہ کوار سونت کر تیرے مقابلے میں آجائے گا۔“

ہارون نے ہنس کر کہا۔ ”تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا۔“ پھر عامر سے پوچھا۔ ”کیوں بیٹے! کیا تو کوار سونت کر میرے مقابلے پر آسکتا ہے؟“

عامر نے شرمناک جواب دیا۔ ”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔“

لیکن نیزہ نے دبی آواز میں کہا۔ ”نہیں، ایسا بھی

اب اس کا بار بار ذکر ہی کیوں؟ میں معافی چاہتا ہوں۔“
لیکن بہنوئی بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا بہنوئی اس کا اتنا شاکھی ہے کہ برسوں پرانی بات کا زخم یوں دکھا دیتا ہے گویا تازہ تازہ لگا ہوا درد دوسری طرف محبت اور التفات کا یہ عالم کہ عامر کو اپنے بیٹے کی طرح پال ڈالا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ اس کی نظر میں دونوں ہی محترم تھے۔ باپ بھی اور پھوپھا بھی چنانچہ جب عامر کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کرے تو دونوں ہی سے مشورہ لیا پڑا۔ پہلے اس نے اپنے باپ ہارون سے مشورہ لیا، پوچھا۔ ”باوا جان! اب میں عملی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیجیے کہاں سے اور کس طرح شروع کروں؟“

باپ نے جواب دیا۔ ”بیٹے! اگر تو یہ چاہتا ہے کہ کام کے ساتھ ساتھ مال بھی کمائے تو بہترین موقع ہے میں تجھے فوج میں ملازمت دلا دوں گا۔ آج کل خوارج نے بڑے ہنگامے کر رکھے ہیں۔ اگر تو خوارج سے جہاد کرے گا تو دینی فائدوں کے ساتھ ہی اخروی ثواب بھی کمائے گا۔“
لیکن عامر اپنے باپ کی رائے سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ وہ خارجیوں کی دین داری اور شہادت کی بڑی داستانیں سن چکا تھا اور اس کا پھوپھا اکثر و بیشتر خارجیوں کی بڑی تعریفیں کر چکا تھا۔

باپ سے مشورہ لینے کے بعد وہ پھوپھا کے پاس پہنچا اور اس سے بھی یہی مشورہ لیا، پوچھا۔ ”پھوپھا جان! میں عملی زندگی کا آغاز کہاں سے اور کس طرح کروں؟ باوا جان کہتے ہیں کہ میں خوارج سے جنگ کر کے دین اور دنیا کے فائدے ایک ساتھ حاصل کروں، آپ کی کیا رائے ہے؟“
پھوپھانے جواب دیا۔ ”عامر! مجھے تیرے باپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ خوارج دین دار لوگ ہیں۔ اگر مجھ کو دنیا اور آخرت کی بھلائی واقعی مقصود ہے تو تو خوارج کا ساتھ دے۔ وہ دنیا میں حق قائم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیاں آخرت کے عوض بیچ دی ہیں۔ چنانچہ اتنی عمر گزارنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خوارج حق پر ہیں اور ہر سچے اور ایمان دار آدمی کو خوارج ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔“

پھوپھا کا مشورہ کام کر گیا اور اس نے خوارج سے رابطہ قائم کر لیا۔ عزیزوں رشتے داروں کا مارا ہوا اور زمانے کے ہاتھوں ستایا ہوا عامر جب خوارج میں پہنچا اور ان کی شاندار باتیں سنی تو وہ انہی کا ہو گیا۔ اس نے اپنی شمولیت کو

دوسروں سے چھپائے رکھا لیکن پھوپھا کو اس کا علم تھا۔ اس نے عامر کو مبارک باد دی کہ اس نے دین اور دنیا کی بھلائی اور سرخ روئی کی منزل پائی ہے اور اب اس کو گمراہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہارون چاہتا تھا کہ عامر فوج میں داخل ہونے سے پہلے شادی کر لے لیکن نیزہ اس کی مخالف تھی۔ وہ بار بار زور دے کر یہی کہتی تھی کہ عامر خود کمائے اس کے بعد شادی کرے۔ لیکن ہارون کہتا۔ ”جب تک میں موجود ہوں اس کی ساری ذمے داریاں میرے سر ہیں۔ اس لیے عامر کمائے یا نہ کمائے، میں اس کی شادی ضرور کروں گا۔“

نیزہ نے جھجھکا کر رائے دی۔ ”اگر یہ بات ہے تو ابراہیم بھی جوان ہو چکا ہے، اس کی بھی شادی ہو جانا چاہیے۔“
ہارون نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہاں، اس کی شادی بھی ہوگی لیکن عامر کی شادی کے بعد۔“

دونوں میں اس موضوع پر بڑی دیر تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں برآمد ہوا۔ آخر ہارون کا بہنوئی بھی اس بحث میں شامل ہو گیا اور اس نے کھلم کھلا عامر کی طرف داری کی لیکن نیزہ کا یوزھا باپ اپنے نواسے ابراہیم کی طرف تھا۔

ہارون نے اپنے بہنوئی کو سنبھلایا۔ ”بھائی! تم اپنے عامر کو پالا پوسا ہے اس لیے یہ ذمے داری بھی میں تمہارے ہی سر ڈالتا ہوں کہ عامر کے لیے اچھی سی دلہن تلاش کرو۔“
دوسری طرف نیزہ نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے کوئی حسین سی لڑکی تلاش کرے۔ دونوں ہی حسین لڑکی کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔

آخر دو ماہ کی جدوجہد کے بعد ہارون کے بہنوئی نے ایک لڑکی تلاش کر لی اور ہارون کو مطلع کیا کہ اگر تجھ کو یہ لڑکی پسند ہو تو میں بات کروں۔

ہارون نے نیزہ سے کہا۔ ”نیزہ! میرے بہنوئی نے عامر کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔ اس کو دیکھ کر تائید کر دے کہ میں بات آگے بڑھاؤں۔“

نیزہ نے برا سامنہ بنایا اور جواب دیا۔ ”ہارون! تو میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کیا کر۔ عامر کی دلہن کو میں کیوں دیکھوں؟ یہ تیرا کام ہے۔“

ہارون نے غصے میں کہا۔ ”اوشری عورت! تو میرے بیٹے عامر سے اتنا چلتی ہے۔ افسوس کہ میں نے اس پر پہلے کبھی اتنا زیادہ غور نہیں کیا تھا۔“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”صرف میں ہی نہیں چلتی،

عامر بھی مجھ سے جلتا ہے۔ جیسے کو تیسرا۔ آخر میں اس کا جواب کس طرح دوں؟“

ہارون نے سختی سے کہا۔ ”نیزہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا لیکن اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تو میرے ساتھ چل اور عامر کی ہونے والی دلہن کو دیکھ کر دیانت داری سے بتا کہ یہ عامر کے لیے کیسی رہے گی۔“

نیزہ نے بھی بے پروائی سے جواب دیا۔ ”میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لیے تو بھاگ دوڑ کر سکتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟“

ہارون نے ایک بار پھر حکم کیا۔ ”نیزہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں اگر تو نے میرا یہ حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔“

نیزہ کے باپ نے مداخلت کی، نیزہ کو سنبھلایا۔ ”نیزہ! تجھے اپنے شوہر کا حکم ماننا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔“

نیزہ بے بس ہو گئی اور باہول ناخواستہ ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ لڑکی کے گھر پہنچ گئی۔

لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے حور گنتی تھی۔ بڑی بڑی پلکوں کے سائے میں بڑی بڑی بادام جھنسی آنکھیں اور متوازن اور اندازتہنا سب جسم پر سیدہ شہبانی رنگ۔ سر تا پا کیف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نشہ ہو جائے۔ باتوں میں سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی ٹھنک۔ نیزہ کو یہ لڑکی بہت پسند آئی۔ رابعہ کے گھر والوں نے ان سب کی بڑی تواضع کی۔

نیزہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ ”محترم خاتون! کیا تم نے عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سوئپ دینا چاہتی ہو؟“

لڑکی کی ماں نے جواب دیا۔ ”نہیں، میں نے لڑکا تو ابھی تک نہیں دیکھا لیکن بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون جیسا ہی ہوگا۔“

نیزہ نے کہا۔ ”افسوس کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہا مانو تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو بڑے سکون سے رہے گی۔“
لڑکی والوں نے بھی معاملے کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

لڑکی کی ماں نے پوچھا۔ ”کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟“
نیزہ نے جواب دیا۔ ”عامر بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی ضامن بھی نہیں ہو سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے

عشقی نا تمام

پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور دور رہا ہے۔“
رابعہ کی ماں نے پوچھا۔ ”اگر ایسی بات تھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو دیکھنے کیوں آئی تھیں؟“
نیزہ نے جواب دیا۔ ”میں لڑکی دیکھنے نہیں، لڑکی کے گھر والوں کو سب کچھ بتانے آئی تھی۔“

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور رابعہ کے بڑوں نے باہر یہ اعلان کیا کہ ”رابعہ کو ابراہیم کے لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے سے ہرگز منسوب نہیں کریں گے جو اپنے باپ سے دور پھوپھا کے گھر پلا بڑھا ہو۔ وہ یقیناً گستاخ اور سر پھرا لڑکا ہوگا۔“

اس غیر متوقع اعلان نے ہر کسی کو چوٹا دیا۔ بہنوئی نے حیرت سے کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی، یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”بھائی، میں سب کچھ سمجھ گیا۔“
وہ سب نڈھال اور افسردہ جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ پھوپھا منہ سجائے ہوئے اپنے گھر چلا گیا۔ نیزہ کسی کی پروا کیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عامر ہنگامے کو بچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ اپنی زبان سے کوئی سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون، نیزہ سے برہم تھا۔ وہ بھی نیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ نیزہ بے حد خوش تھی۔ وہ اپنا لباس بدل رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھوم گئی، بولی۔ ”ہارون! خیریت تو ہے؟“
ہارون نے ہنسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”نیزہ! یہ کیا ہو گیا؟“

نیزہ نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ تو کیا جانتا چاہتا ہے؟“

ہارون نے کہا۔ ”ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے لگے تھے۔“

نیزہ نے جواب دیا۔ ”بے شک لیکن وہ لوگ عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے۔“

ہارون نے افسوس سے کہا۔ ”وہ خود عامر کے بجائے ابراہیم کو پسند کرنے لگے بلکہ تو نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

نیزہ نے ناگن کی طرح مڑ کر جواب دیا۔ ”انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عامر کی ضامن بن رہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو بچہ میرے پاس نہ رہا ہو، جسے میں نے نہ پالا پوسا ہو اور جو اپنے ماں باپ سے دور پھوپھا کے

پاس رہا ہو، میں اس کی ضامن کس طرح بن سکتی ہوں۔“
 ہارون نے تملکا کر ٹھہلنا شروع کر دیا۔ ”تو نے فلفط
 بیانی کی ہے۔ عامر ہم سے دور کبھی نہیں رہا۔ اس کا پھوپھا بھی
 ہمارے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عامر کی ضامن نہ بن،
 میں تو ضامن بن سکتا ہوں۔“
 منیزہ نے آہستگی سے کہا۔ ”لیکن اب تو میں ابراہیم
 کی بات کر بھی آتی۔ عامر کی عمر زیادہ ہے جبکہ ابراہیم اس
 کے لیے بالکل موزوں ہے۔“
 ہارون نے سختی سے کہا۔ ”لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ
 رشتہ عامر ہی سے ہوگا ورنہ ابراہیم سے بھی نہیں۔“
 منیزہ نے تجویزیاں چڑھائیں۔ ”ہارون! میں نے
 کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں کی لیکن جب میں نے ابراہیم
 کے لیے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی ہو کر
 رہے گا۔“
 ہارون چیخ پڑا۔ ”میں ایک عرصے سے تیری
 زیادتیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو نے عامر پر جو ظلم کیے، میں
 خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان زیادتیوں
 سے باز آ جا۔ ابراہیم اور عامر میں نظرتوں کی ٹیچ نہ پیدا کر
 کیونکہ ہم دونوں کے بعد انہیں مل جل کر زندگی گزارنی
 ہیں۔ اگر ان میں نظریں پیدا ہو گئیں تو یہ زندگی بھر آہن بنی
 میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔“
 منیزہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، بولی۔ ”ہارون! تو
 میری عادت سے واقف ہے۔ میں نے ایک بار جو فیصلہ
 کر لیا، کر لیا۔ میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ
 پہلے جب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے
 لوگوں کی مخالفت کی پروا کیے بغیر پورا کیا پھر جب تم نے
 لوگوں کی سازش کے ذریعے مجھے بے اولاد رکھنا چاہا اور میں
 نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو
 میں اپنا مقصد حاصل کر کے رہی اور اب میں نے یہ قطعی
 فیصلہ کر لیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہی ہوگی تو یہ
 شادی ابراہیم سے ہی ہو کر رہے گی۔“
 ہارون نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ گزشتہ
 تینوں کو بھلا دیا جائے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے۔“
 منیزہ نے جواب دیا۔ ”تو اس کے لیے بہترین طریقہ کار
 یہ ہوگا کہ رابعہ سے ابراہیم کی شادی کر دی جائے۔“
 ہارون نے خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ منیزہ کسی
 طرح بھی اپنا فیصلہ نہیں بدلے گی تو اس نے ایک دوسری
 ترکیب پر عمل شروع کیا۔ ابراہیم کو گھر سے دور انگور کی بیلیوں

کے سائے میں لے گیا اور پوچھا۔ ”ابراہیم! یہ بتا عامر تجھے
 کیا لگتا ہے؟“
 ابراہیم نے جواب دیا۔ ”بھائی عامر بہت اچھے ہیں،
 مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔“
 ہارون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا۔ ”بیٹے!
 میں تیری ماں کی مخالفت نہیں کر رہا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ
 دانستگی یا نادانستگی میں تیری ماں نے عامر پر ظلم کیے ہیں،
 زیادتی کی ہے۔“
 ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے
 تاثرات پائے جاتے تھے، بولا۔ ”لیکن وہ میری ماں ہے،
 میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔“
 ہارون نے خوشامداندہ انداز میں کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا
 کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تو اس
 شادی سے انکار کر دے۔“
 ابراہیم نے سر جھکائے ہی جھکائے جواب دیا۔ ”میں
 نے شادی پر آمادگی ہی کب ظاہر کی تھی، مجھے بھائی عامر سے
 ہمدردی ہے۔“
 ہارون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگا لیا۔
 ”جزاک اللہ میرے بچے۔ تو کتنا نیک اور صالح ہے۔“
 عامر کا پھوپھا منیزہ کی حرکت سے اتنا بدلتا اور
 دل برداشتہ تھا کہ منیزہ کے خلاف کسی خطرناک سازش کا منصوبہ
 تیار کرنے کی فکر میں تھا۔ اس عورت کے خلاف کوئی ایسا
 شاندار مگر خطرناک منصوبہ بنایا جائے کہ منیزہ کو بس مزہ ہی
 آجائے۔ اس نے کئی راتیں یوں بے چینی میں گزار دیں کہ
 منیزہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عامر بھی کچھ کم فکر نہ
 ... نہیں تھا۔ وہ بھی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر
 سے کافی کافی دیر تک غائب رہنے لگا اور آخر یہاں تک
 نوبت پہنچ گئی کہ وہ سارا سارا دن غائب رہتا۔ ہارون اور
 اس کا بہنوئی دونوں ہی عامر کی ان حرکتوں سے پریشان
 تھے۔ عامر کے چہرے پر سرکشی کے آثار دیکھ کر دونوں ہی
 خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
 ایک دن علی الصباح عامر باہر جانے لگا تو اس کے
 پھوپھانے اس کو روک لیا، پوچھا۔ ”تو کہاں جا رہا ہے؟“
 عامر نے جواب دیا۔ ”میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔“
 پھوپھانے کہا۔ ”آج تو کہیں نہ جا کیونکہ میں منیزہ اور
 تیری چپقلش میں مستقبل کے ہنگامے دیکھ رہا ہوں۔ اس
 خاموش ماحول کی مثال اس راکھ جھسی ہے جس کے اندر
 چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل

جانے کو تیار ہوں۔“
 عامر نے جواب دیا۔ ”پھوپھا جان! میں خود کو اس
 ماحول میں اجنبی محسوس کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا
 جانا چاہتا ہوں۔“
 پھوپھانے رائے دی۔ ”میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ
 تیرے باپ کو مال و زر کی تقسیم پر آمادہ کر لوں کیونکہ میں نے
 منیزہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی عدم
 موجودگی میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کر دے گی۔“
 عامر نے جواب دیا۔ ”میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا
 ہوں اس لیے میرے باپ کا مال و زر اس کو مبارک، مجھے
 اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔“
 پھوپھانے کھڑا ہو گیا۔ ”یعنی اب تو میری بات بھی
 نہیں مانے گا۔ مال و زر مصیبت نہیں کا رآمد ہے۔ میں تجھ کو
 یوں منگی انداز نگاہ پر قائم نہیں رہنے دوں گا۔“
 لیکن عامر نہیں رکا اور چلا گیا۔ اس کا پھوپھا سارا دن
 ہارون سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی عامر کا
 حصہ الگ کر دے لیکن ہارون اس پر یوں تیار نہیں ہوتا تھا
 کہ وہ پہلے عامر کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کو
 الگ کر کے خود اس کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔
 لیکن پھوپھانے اصرار کیا۔ ”نہیں، پہلے عامر سے
 شادی اور آخر میں اس کے ساتھ رہاؤں۔“
 کسی طرح منیزہ کو بھی اس بحث و مباحثے کا علم ہو گیا۔
 اس نے دونوں کو ڈانٹ دیا، بولی۔ ”جب تک میں موجود
 ہوں ایسا نہیں ہوگا۔ مال و زر نہیں تقسیم ہوگا۔ عامر شادی
 کرے گا تو وہ ساتھ رہے گا یا الگ، میں اپنے پاس سے اسے
 کچھ بھی نہ دوں گی کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔“
 لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”ماں جس
 مال و زر کی صلح میں آپ میرا سہارا لے کر بھائی کو ان کے حق
 سے محروم کرنا چاہتی ہیں، میں اس میں آپ کا ساتھ نہیں
 دوں گا۔“
 منیزہ نے ڈانٹ دیا۔ ”تو چپ رہ نا دان لڑ کے،
 تیری بہتری کو جتنا بہتر میں سوچ سکتی ہوں کوئی اور نہیں سوچ
 سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال و زر کو بڑی کوشش اور
 محنت سے محفوظ رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر
 میں خاک اڑ رہی ہوتی اور کسی کو بھی حق ادا نہ... صے کی
 باتوں کا موقع نہ ملتا۔“
 ہارون نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا۔ ”بھائی! تم
 عامر سے کہہ دو کہ میں اس کا حصہ ابھی سے دے دینا چاہتا

نوٹ

ایک انگریز اور ایک دیہاتی کانہر کے کنارے
 آمناسامنا ہو گیا تو انگریز نے انگریزی میں دیہاتی سے
 کسی دوست کا ایڈریس پوچھا۔ دیہاتی بولا۔ ”میںوں
 تیری گل دی سمجھ نہیں او آئی خورے تو کی کیا کہنا اس؟“
 انگریز کو بھی دیہاتی کی پنجابی گفتگو کی سمجھ نہیں آئی
 تو انگریز بولا۔ ”واٹ؟“
 دیہاتی بولا۔ ”اچھا..... اچھا میں تیری گل سمجھ گیا
 واں تو ایس نہر دی واٹ (کنارا) پھڑتے سدھا لفا جا۔
 فر اللہ خیر کرسی۔“ انگریز دیہاتی کی زبان سے نکلے
 لفظوں سے مزید الجھن میں پڑ گیا اور بولا ”نوٹ۔“
 دیہاتی یہ سن کر غصے میں آ گیا اور سوچنے
 لگا۔ ”پاغل (پاگل) جیہا نہ ہووے تے۔“ ایویں ای
 کن کھادی جاندا اے۔ فوراً بولا۔ ”میں کیوں پٹاں
 اپنے وڈکیاں نوں..... تو پٹ۔“
 مرسلہ۔ بشیر احمد بھٹی، بہاولپور

ہوں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو گرنے دوں
 گا۔“ پھر منیزہ سے کہا۔ ”اور منیزہ! تو بھی اچھی طرح میری
 بات ذہن نشین کر لے کہ اگر تو نے اس معاملے میں میری
 مخالفت کی تو میں پھر بھی وہی کروں گا جس کا میں نے فیصلہ
 کر لیا ہے اور تیری ضد کے پیش نظر یہ بھی ممکن ہے کہ میں تجھ
 سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔“
 منیزہ نے بھی سختی سے جواب دیا۔ ”ہارون! میں
 اپنے مال و زر کے حصے بخرے ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔
 اگر تو اس بہانے سے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تو
 میں اس کے لیے بھی تیار ہوں کیونکہ یہ میری اتا کی بات ہے
 اور میں اپنی اور اپنے بیٹے ابراہیم کی نظر میں حقیر ہو جانا کسی
 قیمت پر بھی گوارا نہیں کروں گی۔“
 لیکن ہارون اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اپنے
 بہنوئی سے کہا۔ ”بھائی! عامر کو بلاؤ تا کہ یہ قضیہ ابھی اور اسی
 وقت چکا دیا جائے۔“
 بہنوئی نے جواب دیا۔ ”عامر گھر پر موجود نہیں ہے۔
 امید ہے کہ شام تک واپس آ جائے گا، بھی یہ قضیہ بھی چکا دیا
 جائے گا۔“
 منیزہ نے اپنے بیٹے ابراہیم کا ہاتھ پکڑا اور وہاں

سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ "مجھ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ہارون کو درغلا یا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں ہر ایک سے نمٹ لوں گی۔"

ہارون اور اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور دونوں ہی عامر کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

شام ہو گئی مگر عامر نہیں آیا۔ رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر نصف رات ہو گئی۔ پھر پانچ بجے ہارون زیادہ فکر مند ہوا۔ دوسری صبح نمودار ہوئی مگر عامر کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہارون تھملا یا تھملا یا ادھر ادھر پھرتا رہا۔ وہ عامر کی تلاش میں اپنا گھوڑا دوڑاتا رہا۔ نیزہ بہت خوش تھی کہ ایک کاٹھا جو اس کے دل میں مستحکم چبھ رہا تھا اب دور ہو چکا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے بہنوئی کی پریشانیوں سے بہت خوش ہو رہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی مہینے ہم بیٹا، دو مہینے پھر چھ ماہ گزر گئے مگر عامر کا کہیں پتا نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو تم نے نڈھال اور پڑا مردہ کر دیا۔ پھر پانچ پریشان تھا مگر نسبتاً کم۔ اب ہارون کم گو ہو گیا تھا۔ باپ کے ہم کو دیکھ کر ابراہیم، عامر کی تلاش میں نکل گیا۔ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ ابراہیم کی گمشدگی نے نیزہ کو بھی بلا ڈالا۔

اب یہ مگر مستقل بیت الحزن بن چکا تھا۔ کسی کا کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔ نیزہ کا باپ بھی خوف زدہ اور فکر مند رہنے لگا تھا۔ نیزہ کو شہ تھا کہ اس کا بیٹا ابراہیم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سازش کا بانی مہانی ہارون کا بہنوئی تھا۔ نیزہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے بہنوئی کو کچا چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے ہارون کو مردہ کر دیا۔ اب اس کا کسی کام میں دل ہی نہ لگتا۔ نیزہ بھی اکثر دیشتر روٹی ہی رہتی۔ ہارون کا بہنوئی بھی اس رہنے لگا تھا۔ نیزہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور نیزہ گاہے بگاہے آپس میں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا۔

"یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے۔ تیری خود غرضی نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔"

نیزہ کہتی۔ "ہارون! مجھے مورد الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک نہ چھڑک۔ اگر زیادہ ننگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کہیں دفعتان ہو جاؤں گی۔"

اور یہ تو تو میں میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔ ہارون نے اکتا کر بدرجہ مجبوری اپنے سابقہ پیشے سے رجوع کیا اور کوفہ روانہ کیا۔ ان دنوں کوفہ اور بصرہ میں خلافت کی نیابت حجاج بن یوسف کو مل چکی تھی اور وہ خوارج

کے خلاف مہمات میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کو سپاہیوں کی ضرورت تھی چنانچہ وہ بڑی آسانی سے فوج میں داخل کر لیا گیا۔

حجاج کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس نے خراسان میں وہاں کے عامل امیہ کا ساتھ چھوڑ کر باقی کبیر کی حمایت کی تھی تو غضب ناک ہو گیا۔ بولا۔ "اگر اس بار۔۔۔ بھی غداری کی تو یہ سمجھ لے کہ میں امیہ سے قطعی مختلف انسان ہوں۔ اگر ان دنوں خراسان میں امیہ کی جگہ میں ہوتا تو تو آج نظر نہ آتا۔ تیری خاک کا بھی پتہ نہ ہوتا کیونکہ میں غدار کو معاف نہیں کرتا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں نے کوئی غداری نہیں کی تھی۔ اگر میں غدار ہوتا تو میرا حشر بھی غداروں کے ساتھ ہو چکا ہوتا لیکن میں وقادار انسان ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی گردن تک کٹا دوں گا۔"

حجاج نے کہا۔ "تب پھر جیش میں شامل ہو جا جو دشمنانِ خدا سے مصروف پیکار ہے۔ اگر تیری جیش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے ساتھیوں کو انعام و اکرام سے نوازا دوں گا۔"

ہارون نے افسردگی سے جواب دیا۔ "امیر! میں لالچی نہیں ہوں۔ اس لیے میں اپنی خدمات کا صلہ انعام و اکرام کی صورت میں نہیں لوں گا۔ تمہیں سے چل کر یہاں آیا ہوں، چاہتا ہوں کہ جب میں انعام و اکرام کا حق ٹھہروں تو مجھے کوفے میں رہنے کی جگہ دے دی جائے۔"

حجاج نے پوچھا۔ "تجھ کو تمہیں میں کیا تکلیف ہے جو کوفے میں ٹھہرنا چاہتا ہے؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے۔ اس لیے میں اس گھر میں روحانی اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔"

حجاج نے کہا۔ "تو فکر نہ کر، خوارج کے ہتھے سے نجات مل جائے تو میں تیرا انتقال کوفے میں ہی کر دوں گا۔"

ہارون نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ حص واپس نہیں جائے گا۔ اس کو نیزہ سے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ وہ پورے لیے کا نیزہ ہی کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں کی گمشدگی نے اس میں یابوسی اور قنوطیت پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے لو لگائی تھی اور ہر وقت یہی دعا مانگتا رہتا تھا۔ "خدا یا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب اور

عشقِ نامحرم

کامران کر دے، یا پھر شہادت سے ہمکنار کر دے۔"

ہارون کو مشہور خارجی سردار شیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شیب نے اموی افواج کو شکستوں پر کھستیں دے کر تھمکے چادیا تھا۔ حجاج ان شکستوں کی وجہ سے فکر مند ہو گیا تھا اور دن رات شیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھائے جا رہا تھا۔ حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شیب اپنی فوج کے ساتھ کوفے کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ حجاج فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔ شیب فرات کے دوسرے کنارے سجد نامی قصبے میں پڑاؤ ڈال کر انتظار کرنے لگا۔ ہارون کا دست شیب کے مقابلے حجاج کے حکم کا منتظر ڈٹا ہوا تھا۔

حجاج نے محل کی چھت سے میدان جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے اس پار سجد میں مسجد کے سامنے شیب کی فوج کو پڑاؤ ڈالے دیکھا۔ شیب کے پاس فوج زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب حجاج نے فوراً ہی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دستے کو فرات کے اس پار اترا دیا اور سختی سے تاکید کر دی کہ وہ شیب سے خوفزدہ ہوئے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈٹا رہے جب تک وہ خود ان کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

محل کی چھت سے ابھی طرح جانزہ لے چکے کے بود حجاج نیچے اترا اور اپنے دو غلاموں کو ذوق برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سپاہ کو لے کر فرات کے پار اتر گیا۔ حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج سجد کی مسجد تک پہنچنے کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر خراجیوں کی اس مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ شیب اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شیب نے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔ حجاج نے ذوق برق لباس پہنے ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا۔ "اے شخص! اگر تو شیب کو ہلاک یا زخمی کر دے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔ آگے بڑھ اور شیب کو قتل کر کے آ جا۔"

غلام نہایت شان اور آن بان سے آگے بڑھا اور شیب کو لٹکا رہا۔ شیب نے غلام کو حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ غلام اور شیب میں ذرا دیر مقابلہ ہوا اور چند لمحوں بعد شیب نے غلام کو قتل کر دیا۔ وہ جوش و خروش سے گھوڑا دوڑاتا ہوا حجاج کی فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا۔

"اے مجھ سے نہرو آزما لو گوا! اگر یہ حجاج تھا جو ذوق

برق لباس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اسے قتل کر دیا اور تم سب اس کے خوف اور عذاب سے نجات پا چکے ہو۔"

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا۔ "اب تو جا اور شیب کے داؤد چھ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کو ہلاک کر دے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد بھی کر دوں گا اور کسی بلند منصب پر فائز بھی کر دوں گا۔"

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا۔ شیب نے ایک دوسرے شاندار شخص کو جھومتے ہوئے آتے جو دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو قتل ہوا بلکہ حجاج یہ ہے جو اب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ کھیلے جوش و خروش سے اس کی طرف بڑھا اور پے در پے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا۔ اس نے بھی بڑی ہوشیاری اور مہارت سے شیب کا مقابلہ کیا۔ شیب نے کہا۔

"افسوس کہ میں نے تجھ سے پہلے جس شخص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ تو نہیں کوئی اور ہی تھا۔ لیکن خیر، اب تو مقابلے پر آیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔"

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہ حجاج ہے، بولا۔

"شیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی شخص سمجھتا ہے؟ یاد رکھ کہ میں حجاج ہوں اور تیری موت میرے ہی ہاتھوں لگے گی۔"

شیب نے کہا۔ "افسوس کہ تو انسان ہو کر خدائی کا دعوے دار ہے۔ ورنہ تو یہ فضول بات کہی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں لگے گی ہے۔"

غلام نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس میں کیا ہے، ابھی پتا چلا جاتا ہے کس کی موت کس کے ہاتھ لگے گی ہے۔"

حجاج ان کی باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "مجھے میری کرسی سمیت آگے بڑھاؤ۔ یہاں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہو جاؤں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہوگی۔" اس کی کرسی ذرا آگے بڑھا دی گئی۔

حجاج کا غلام طہمان اور شیب کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر شیب نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہمان زخمی ہو کر جیسے ہی گرا، شیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔"

لیکن شیب کے کسی ساتھی نے کرسی پر بیٹھے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یا امیر المومنین!

حجاج نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ "میں زبان درازی بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ میرا علم ہے کہ تو اسی وقت طلاہے گرد دسے کو لے کر دریا کے کنارے کنارے چکر لگا تا رہے کیونکہ شیب کا کوئی بھروسہ نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

لیکن ہارون نے اہل لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میں نے کہہ جو دیا کہ میں اس وقت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں کر دیا جاتا۔"

حجاج نے کھٹکی سے پوچھا۔ "ان سے تیرا تعلق، ان سے تیری دلچسپی کا سبب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ آپ کے گوش گزار دوں پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گرفتاروں سے دلچسپی کیوں ہے؟"

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا۔ "اچھا بتا مگر مختصر اجمالاً کیونکہ میں داستان کوئی بالکل پسند نہیں کرتا۔"

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی روداد سنادی۔ حجاج بڑے اٹھماک سے سنا رہا۔ آخر میں جلدی جلدی پلٹیں جھپکا عین اور درشتی سے کہا۔ "افسوس کہ تو فوج کی سرداری کا منصب کس طرح سنبھالے گا کیونکہ تو وہ نالائق انسان ہے جو اپنے باپ، بہن، بیوی اور اولاد کی پر بھی قابو نہیں رکھ سکا۔ اب میں اپنے آپ پر بھی لعنت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو بھیننے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے طلاہے گرد دسے کی سرداری سے معزول کرتا ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کر دیا اور ہارون سے کہا۔ "اب تو یہاں سے دقتان ہو جا، میں تیرے سائے تک سے بچتا چاہتا ہوں، اپنی فوج سمیت۔"

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کی آنکھوں میں تری محسوس کر لی، بولا۔ "تو عورتوں کی طرح رو کیوں رہا ہے، ان آنسوؤں کا مطلب؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلسلے میں آپ کی نظر کرم کا خواہاں ہوں۔"

حجاج نے کہا۔ "ہاں، میں ان پر رحم کروں گا۔ ان پر بھی اور تجھ پر بھی۔"

ہارون فرط خوشی سے مسکرا اٹھا۔ "امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "کیسا شکر ہے؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں ان دونوں نالائق اولادوں سے

شیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار ہوتے دیکھ کر شامی دسے پر یلغار کر دی لیکن اتنی دیر میں حجاج شامیوں کو طاقت ور تک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو نکواریوں کی دھار پر رکھ لیا اور اس میں شیب کا بھائی مصداقل کر دیا گیا۔ خوارج نے خود کو جمع کر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شیب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

"اے اللہ کے دوستو! اپنے بہترین وقت کی توفیق میں بدترین لمحوں سے منہ موڑ لو۔ شاید آنے والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔"

خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کرسی کو آگے بڑھا تا رہا۔ یہاں تک کہ شیب اپنے ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کرسی سے اتر پڑا۔ وہ مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا۔ "اے اطاعت شعارو! اس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو میں حاصل ہوئی۔"

پھر وہ بیس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگائے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ خارجی ہمارے طرف بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی پوچھاڑ سے روک دو۔"

شیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو نابوس ہو گیا۔ وہ لڑتے پھرتے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار کر گیا۔ جب وہ سب دریا پار اتر گئے تو شیب نے پل تڑوا دیا تاکہ اسوی سپاہ اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

حجاج قیدیوں کو لے کر اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دونوں بیٹوں کی محبت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج سخت ظالم اور سفاک انسان ہے، وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے امیر خوارج کو قید خانے میں ڈلوادیا اور خود آرام کرنے کے لیے اندر جانے لگا۔ اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقت ور دستہ طلاہے گردی کے لیے چھوڑ دیا اور اس طلاہے گرد دسے کا سردار ہارون کو مقرر کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں پر داشت کر سکتا تھا۔ غضب ناک ہو کر بولا۔ "ہارون! میں تم کو ہارون کی سخت مخالف ہوں۔ تجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا، میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

تکواری کی ٹوک اس کے سینے پر رکھ دی اور حکما کہا۔ "بھانگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا رہ ورنہ ہلاک کر دیا جائے گا۔"

اس شام آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی اور اس نے بے اختیار اس نوجوان کی طرف دیکھا اور خوشی میں چلایا۔ "ارے، عامر یہ تو ہے..... مگر تو یہاں کہاں؟"

عامر کی تکواری کی ٹوک اب بھی ہارون کے سینے میں چھب رہی تھی۔ عامر نے جلدی جلدی کہا۔ "افسوس کہ میں باپ ہونے کے باوجود تجھ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو غلطی سے عبدالملک بن مروان کو مسلمانوں کا امیر المومنین سمجھتا ہے اور میں شیب کو اپنا امام سمجھتا ہوں۔"

اتنی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دونوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہارون پوری طرح ان کے قابو میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "دوستو! افسوس کہ بد قسمت امیر میرا باپ ہے اس لیے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ گرفتار کر کے امیر المومنین شیب کے حوالے کر دوں گا وہ جو سزا تجویز کریں گے، وہ دے دی جائے گی۔"

لیکن انہی میں سے ایک اور آشنا نوجوان ہارون کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہ ابراہیم، عامر کی سوتیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہارون ایک بار پھر لہجہ اٹھا۔ "ابراہیم! یہ تو ہے، واللہ میں تم کو دیکھ رہا ہوں؟"

عامر نے پھر جواب دیا۔ "ہاں، اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی اپنی دنیا، آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دلوں سے رشتوں کا احترام بھی نکل گیا۔"

حجاج دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہارون کو گھوڑے سمیت گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں گھر گیا ہے، فوراً اس کی مدد کو پہنچو۔"

شامی سپاہ کا ایک دستہ دیواندار آگے بڑھا اور آٹا ٹاٹا ہارون سمیت کئی خارجیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچ گئے اور خارجیوں کو بھانگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب پانسا پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی تکواری کی ٹوک سینے سے ہٹا کر شامیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر شامیوں نے کندیس پیچیک پیچیک کر انہیں گرفتار کر لیا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہارون نے اپنے دونوں بیٹوں کو رسیوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

آپ کو فائدہ نہیں ہوتی ہے۔ حجاج تو دور ہا جو کرسی پر حکمت سے بیٹھا ہے۔"

شیب نے دور سے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا۔ "خیر اگر حجاج ابھی زندہ ہے تو شاید اپنے انجام کو پہنچنے کے لیے اور اللہ نے چاہا تو اس دشمن فلاح و خیر سے میں ہی نجات دلاؤں گا۔"

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ "اے اطاعت شعار اور فرماں بردارو! تم ثابت قدم رہو اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہمارے اور فوج کے درمیان کوئی شے حاصل نہیں رہے گی۔"

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شیب نے ان پر بھروسہ کر دیا۔ شیب اپنے چھ سو آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی موجودگی نے اس کی سپاہ کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دونوں طرف سے تکواریں و نیزے اور تیر انسانوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے۔ شیب اور اس کے ساتھیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خارجیوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی پسا ہوتے تھے، حجاج کی کرسی سچر کی مسجد کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ شیب نے اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دلا دیا۔

"اے اللہ کے دوستو! اب گھوڑوں کی پشت پر سوار رہنے کا وقت نہیں رہا۔ نیچے آ جاؤ اور حجاج کی سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔"

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ "امیر! میں اس خارجی سردار کو موت کے گھاٹ اتار کر مارا ہونا چاہتا ہوں۔"

حجاج نے جواب دیا۔ "پھر اتنا کس بات کا ہے، آگے بڑھ اور آپ شجاعت سے اس شعلہ جوار کو سرد کر دے۔"

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی لیکن وہ جیسے ہی خارجیوں کے قریب پہنچا، خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند سپاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے گھوڑے کی ناگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگ کے کٹ جانے سے منہ کے بل گر گیا۔ ہارون گھوڑے کے سامنے ذرا قاصلے پر اس طرح جا گرا گو یا اس کو اٹھا کر پیچیک دیا گیا ہو۔ ہارون کے ہاتھ سے تکواری بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساس باقی رہا کہ خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پروا کیے بغیر فوراً اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی

تیرا پیچھا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کروادوں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں سے تیرا ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹ جائے۔“

ہارون ہلکا کر کھڑا ہو گیا۔ ”امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔“

حجاج نے سختی سے کہا۔ ”تو تمہیں واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں پر صبر کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔“

حجاج نے کہا۔ ”ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لیے رحم کی درخواست قبل از وقت ہے۔“

ہارون نے اپنے مقصد کا زیادہ شدت سے اظہار کیا۔ ”امیر! میں یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں گے۔“

حجاج نے سختی سے جواب دیا۔ ”کیسی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی۔ دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ میں ان دونوں کے ساتھ تجھے بھی بند کر دوں گا اور تو بھی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔“

ہارون کا دل بھر آیا۔ ”امیر! تو مجھے قتل کر دے لیکن میرے بیٹوں کو رہا کر دے۔“

حجاج نے کہا۔ ”تو ان بیٹوں کے لیے رحم کی درخواست کر رہا ہے جو ہمیشہ سے تیری پریشانیوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ بھرا میں ان دونوں کو ایسی مہرت ناک سزا میں دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک مخلوق کا مستحق بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم وہ سزا سے ہرگز نہیں بچ سکتا کیونکہ اس کی ذلیل اور حاسد ماں کئی آدمیوں کی اذیت اور پریشانی کا باعث بنی رہی ہے۔ اب اس کو پریشان ہونا چاہیے۔ اب اس کو اذیتیں جھیلنا چاہئیں۔“

ہارون تھر تھر کانپنے لگا۔ حجاج اس کو لرزاں وترساں چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ ہارون کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر جہاں کھڑا تھا، وہیں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

قیدی خوارج کو حجاج کے روبرو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امرا اور منصب دار حجاج کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رسیوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلاد اور درہ

بردار کھڑے تھے۔ ہارون اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے در پر در بانوں کی طرح کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ امیر خوارج کے لیے مقدمے سے پہلے ہی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور چاق و چوبند ہو گئے، ہارون اور دوسرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور عقرب نمودار ہونے والا ہے۔ کچھ دیر بعد حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ نیچے تلے قدم اٹھاتا ہوا محل سے نکل رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں دو دو قدم پیچھے چار قاضی اپنے مخصوص لباس میں سر جھکا کر چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے دائیں ہاتھ میں کاغذ کے چند روٹے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور روٹے ایک دوسرے قاضی کے بائیں ہاتھ میں تھے۔

ہارون اور اس کے پاس کھڑے ہوئے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا چاہا مگر حجاج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دور ہٹا دیا۔

حجاج کسی کی پروا کیے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت گار نے اس کے پیچھے کرسی رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مودب کھڑے رہے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری بائیں تمام خارجی اس کے روبرو لٹائے جائیں۔ یہ کل ستائیس خارجی تھے۔

جب ایک خارجی حجاج کے روبرو کھڑا کیا گیا تو حجاج نے پوچھا۔ ”او بے دین! دامن خدا اور رہن بڑا ہوتا ہے شیب کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”وہ امیر المؤمنین اور امام ہدایت ہیں۔“

حجاج نے پوچھا۔ ”اور امیر المؤمنین حضرت عبدالملک بن مروان کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟“

خارجی نے جواب دیا۔ ”خدا اس کو ذلیل اور رسوا کرے تو نے امام ہدایت کے مقابلے میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔“

حجاج نے بائیں ہاتھ کے روٹے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خارجی کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”اس میں تیری سزا لکھی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر پھر میرا جلاد یا کوئی درہ بردار اس پرزے میں لکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔“

اس کے بعد حجاج کے روبرو دوسرا قیدی پیش کیا گیا۔ حجاج نے اس سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیے جو اس کا پیش رو

دے چکا تھا۔

زخمی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حجاج کے آدمیوں نے ایک بار پھر زرد کوکب کرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹانا چاہتے تھے لیکن حجاج نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے آدمیوں کو منع کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کھڑا ہے، کھڑا رہنے دیں۔

ہارون نے سر کوٹی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا۔ ”بیٹو! خبردار جو تم نے حجاج کی مخالفت کی۔ تم دونوں خوب سوچ سمجھ کر وہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے ورنہ حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔“

عامر نے جواب دیا۔ ”لیکن باوا جان! میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا سزا سے بڑا گناہ ہے۔“

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔“

ہارون نے کہا۔ ”چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا جس سے وہ خوش ہو جائے۔“

ابراہیم نے جواب دیا۔ ”باوا جان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ، یعنی قاصدوں کے زیر اثر جھوٹ بول دینا آسان اور جان کر سمجھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان یہ ہے کہ گردن کوچ پر قربان کر دو۔“

ہارون حجاج کو رو دیا۔ ”او اپنے باپ کی دشمن اولاد میں جانتا ہوں کہ تم دونوں بے دین اور گمراہ ہو چکے ہو اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤں گا۔“

حجاج نے دور ہی سے ڈانٹا۔ ”او ذلیل اور خائماں برباد ہارون! تو کیا درغلا رہا ہے۔ ادھر میرے پاس آ جا ورنہ میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔“

ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا۔ ”بیٹو! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی کچھ کہو جو میں نے کہا ہے۔ ویسے تمہاری مرضی۔“ پھر آنکھوں سے اٹل پڑنے والے آنسوؤں کو اپنے دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا۔ ”او ظالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب دروز اپنے پاس رکھ کر خارجی بننے سے نہیں روک سکا، اب انہیں چند نصیبیوں کے ذریعے خارجیت سے محروم کس طرح کر دے گا؟“

ہارون نے جواب دیا۔ ”آپ درست کہتے ہیں،

عشق نام تمام
میں غلطی پر ہوں۔“

حجاج باری باری خارجیوں کو بلاتا اور سوال کرتا رہا اور آخر میں کسی کو بائیں ہاتھ کا کاغذ تمہا دیتا اور کسی کو دائیں ہاتھ والا۔ یہاں تک کہ عامر کی نوبت آگئی اور اس کو حجاج کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال و جواب کی اذیت سے بچنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلیف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا باتیں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد جب ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانوں میں سے انگلیاں باہر نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر اور ابراہیم سزا کی پرچیاں سنبھالے دوسرے خارجیوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا۔ ”او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے دونوں بیٹے ہی خارجی نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزائے موت نہیں دی لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا۔ میں نے ہر اس شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ تمہا دیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اس کو وہ سزا دے دی کہ وہ سرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔“

ہارون نے ڈرتے ڈرتے اجازت مانگی۔ ”یا امیر! کیا میں ان دونوں سے آخری بار مل لوں؟“

حجاج نے جواب دیا۔ ”ضرور مل لے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔“

ہارون لرزتا کا پتہ ہوا آہستہ آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا۔ ”عامر! اپنی سزا کا پرچہ مجھے تو دکھانا۔“

عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا۔ اس میں بس ایک فقرہ لکھا تھا۔ ”فقط پندرہ درے۔“

ہارون کے خوشی سے آنسو نکل آئے، سجدے میں گر گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہا۔ ”ابراہیم! اپنا پرچہ تو دکھانا ذرا۔“

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے مردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں بس ایک ہی لفظ لکھا تھا۔ ”قتل۔“

ہارون کا دل ڈوبنے لگا، آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی جان نکل گئی تھی اور پنڈلیاں بری طرح سنٹاری ہی گئیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھائی۔

ممتا چاہے انسان کی ہو یا کسی درندے کی... دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی اولاد کو کسی صورت چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی۔ کچھ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے ایک عفریت کو جنم دیا اور اس کی تمام مصیبتوں کو جھیلنے ہوئے اسے ہر حال میں زندہ رکھنا چاہتی تھی... لیکن زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر اس کی دیوانی ممتا اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھی۔

ایک خونریز بلا کا احوال جو قدرت کا خوفناک اظہار تھا

عفریت

کاشف زبیر



چیک کیا اور اپنی بیوی مارتھا سے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ بند کر لو اور میری آواز سے بغیر دروازہ مت کھولنا۔“ مارتھا نے سر ہلایا۔ وہ خوف زدہ تھی مگر اس نے وہی کیا جو شوہر نے کہا تھا۔ ایڈ کے باہر جاتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ باہر ہلکا سا طوفان آیا ہوا تھا۔

اکتوبر 1956ء
نصائح دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ ایڈ سخت مضطرب ہے۔ اس نے تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے تھے۔ اگرچہ موسم کی وجہ سے کھڑکیاں پہلے ہی بند تھیں مگر اس نے ان کی پینٹیناں بھی لگا دیں۔ پھر اس نے اپنی رائفل اٹھا کر اسے

اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے رحم کی درخواست لے کر حجاج کے پاس جاؤں۔“
ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔

اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور درتے برادر بڑی سرعت سے اس کی ٹیبل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں لکھی ہوئی سزا پڑھ کر جلا یا درتے برادر کی طرف بڑھاتا۔ جلا فوراً ہی گردن بار دیتا اور درتے برادر درتے لگانے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی باری بھی آگئی اور اس کا پرچہ پڑھ کر اسے درتے برادر کے حوالے کر دیا گیا۔ درتوں کی ضربات سے جو چیخیں نکل رہی تھیں، انہیں سن کر ہارون نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو درتوں کی شاپش اور زنجیوں کے ادھر ادھر گرنے اور بھانگنے کا منظر اور دوسرا یہ کہ جلا بڑی سفاکی سے گردنیں مارنے کا فریضہ نہایت خشوع و خضوع سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے حجاج سے درخواست کی۔ ”یا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کیجیے۔“
حجاج نے اس کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں کر دوں گا۔“
ہارون بدحواس، اٹھاں و خنجر اٹھل میں پہنچا۔ اس وقت جلا اپنی کمر فضا میں بلند کر چکا تھا اور کمر کے سامنے میں عامر سر جھکائے کھڑا تھا۔ ہلکے جھپکنے میں کمر اور پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف نکل گئی۔ ہارون حجاج مار کر گر گیا۔ وہ بس ایک ہی نظر ادا کر سکا۔

”اس کو کیوں مارتے ہو، یہ تو قتل کا مستوجب نہیں تھا۔“ ہارون بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم پندرہ درتے کھا کر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر کے بھائی کے لاشے پر بچھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتا نہ تھا کہ یہ سسکیاں درتوں کے زخم سے نکل رہی ہیں یا اپنے عظیم بھائی کے عظیم الشان ایثار پر دل کی گہرائیوں سے۔

(ختم شد)

”ابراہیم بیٹے! تم گھبراتا مت۔ میں حجاج کے پاس واپس جا رہا ہوں۔ میں اس کے قدموں میں گر کر تیرے لیے رحم کی پیگ مانگوں گا۔“

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہارون لڑکھڑاتا، ڈنگتا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی رقت سے درخواست کی۔ ”امیر رحم! میرے بیٹے ابراہیم پر رحم کر۔ اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے موت مر جائیں گے۔“ حجاج نے درشت آواز میں حکم دیا۔ ”ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ جا۔ پہلے بقیہ کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھما دوں، اس کے بعد تیری درخواست پر غور کروں گا۔“

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ فرط غم سے دونوں آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیازی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ ”جا اور جلا اور درتے والوں سے کہہ دے کہ جن جن کو سزاؤں کے پرچے چل چکے ہیں، ان پر فوراً عمل کیا جائے۔“

قاضی دے قدموں جلا اور درتہ برادر کی طرف چل گیا۔ دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ عامر نے پوچھا۔ ”ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سا نظر آتا ہے۔ کیا موت سے ڈر گیا؟“

ابراہیم واقعی رور رہا تھا، بولا۔ ”بھائی، میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری ماں تک جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔“
عامر کو اپنی سوتیلی ماں منیزہ کے ظلم و ستم یاد آئے اور ذرا سی دیر کے لیے منیزہ کے ٹکلیں چہرے سے اس نے ایک قسم کی خوشی محسوس کی۔ وہ ٹکلیں چہرہ تصور میں قتل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا۔ ”پھر تو کیا چاہتا ہے؟“
ابراہیم نے جواب دیا۔ ”بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی ماں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔“
عامر، ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم کو دے دیا۔ ”لے، اسے رکھ لے“

بلاد فلسطین و شام، جی، سی اسٹریٹج، فتوح البلدان، بلاذری، تمدن اسلام، جرجی زیدان۔ تاریخ طبری، طبری۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ تاریخ شام، فلپ کے ہستی۔

سانچا

”پلیز ایڈ.....“ مار تھانے کہا مگر ایڈ نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے دروازے کے پاس جا کر بلند آواز سے کہا۔

”سام ایہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔“

”ایڈ پلیز۔“ سام رونے لگا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتا۔ وہ میرے پیچھے ہے۔“

”میں تمہاری خاطر اپنے خاندان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“ ایڈ نے جواب دیا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خود پر بہت جبر کر رہا ہے۔ ”یہاں سے چلے جاؤ۔“

”وہ آگیا۔“ سام نے دہشت زدہ لہجے میں کہا اور چھینیں دور جا رہی تھیں۔ ایڈ دروازے سے مارتھا لکھے ہوئے تھا۔ شاید وہ بھی رو رہا تھا۔ سام اس کا بچپن کا دوست تھا۔ چیف آہستہ سے بستر سے اتر ا اور کھڑکی کی طرف آیا۔ اس نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو اسے فارم کے آخری حصے میں بڑے پتیل کے درخت کے ساتھ وہ نظر آ گیا جس نے سام کو گردن سے پکڑ کر کچے کی طرح نکار کھا تھا۔ وہ انسان جیسا ہی تھا مگر اس کا سر بہت بڑا تھا اور شانے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اس کا قد سات فٹ سے اوپر تھا۔ سام اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ اچانک اس نے سام کو کھٹک کر درخت پر دے مارا اور اسی لمحے مارتھا نے عقب سے آکر چیف کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

اکتوبر 1984ء

رک ڈرائیو کر رہا تھا اور میک اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ میک کی شاندار اسپورٹس کار تھی۔ اس سے آگے مارش کی پک اپ پر ان کی دو عدد ٹریل بائیک سوار تھیں۔ ایک اپ مارش چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کی گرل فرینڈ فیرو تھی۔ میک کی کار میں پچھلی نشست پر رون اور ایملی بیٹھی آپس میں بات کر رہی تھیں۔ رون، میک کی گرل فرینڈ تھی جبکہ ایملی اور رک کے درمیان کچھ چکر تھا مگر وہ ابھی واضح ہو کر سامنے نہیں آیا تھا۔ رک اور ایملی دونوں شرمیلی فطرت کے تھے۔ رک اور میک کا کارن شی میں گاڑیوں کا شوروم وراشت میں ملا تھا۔ سیٹ اپ اچھا تھا اور انہیں کاروبار میں زیادہ سرکھپانا نہیں پڑتا تھا۔ دونوں بھائی تفریحات اور خاص طور سے بائیک رائیڈنگ کے دیوانے تھے۔ اس وقت بھی وہ بولڈ ماؤنٹین کی طرف جا رہے تھے جہاں ٹریل

سوکھے پتے اڑ رہے تھے اور ہوا میں کاٹ دار ٹھنڈک تھی۔ چند منٹ بعد شاید موسم کی پھیلی برف باری ہو جاتی۔ بولڈ ماؤنٹین نامی یہ علاقہ نیویڈا کی ریاست میں کیلیفورنیا کی ریاست کے ساتھ صحرا اور پہاڑوں کے ملاپ پر واقع تھا۔ ایک طرف خشک جھاڑیوں اور ریت پر مشتمل صحرا تھا اور دوسری طرف بلند ہوتے پہاڑوں پر گھنے اور اونچے درختوں والے ولدی جنگل تھے۔ یہاں باقاعدہ آبادی کم تھی لیکن چھوٹے چھوٹے بے شمار فارمز تھے جو پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے تھے۔ بولڈ ماؤنٹین ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ یہاں زمین بھر اور ناہموار تھی اس لیے کاشت کاری محدود تھی اور کوئی صنعت یا کان کنی بھی نہیں تھی اس لیے علاقے میں غربت زیادہ تھی۔ ولدی زمین اور بہت گنتے جنگلات کی وجہ سے سیاح نہیں آتے تھے اور نہ ہی کوئی ایسا جانور تھا جس کے شکار کے لیے شکاری یہاں کا رخ کریں۔ باہر سے آنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی باہر آنے کے بعد ایڈ نے رائفل شانے پر لٹکانی اور سب سے پہلے اپنے پک اپ ٹرک کی چابیاں نکال کر اس کے دروازے لاک کر دیے پھر وہ باہر ریٹنگ سے بندھے گھوڑے کے پاس آیا جو بے چین سا تھا۔ اسے کھول کر وہ اندر اٹھل میں لے گیا۔ اسے پاندہ کر اس نے اٹھل کا دروازہ باہر سے بند کیا اور پھر احاطے کا ٹھکانہ بھی بند کر کے اس پر زنجیر لگا دی۔ آخر میں اس نے پورے فارم کا ایک چکر لگایا۔ اپنے موٹیو اس نے پہلے ہی بند کر دیے تھے۔ موسم شام سے خراب تھا مگر اس کی احتیاط کے بس پست صرف موسم کار فرما نہیں تھا۔ یہ کام نشتا کر وہ اندر آیا اور دروازہ بند کر کے اس پر ملی بھی لگا دی۔ مارتھا چیف کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں سے پوچھا۔

”بابا اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

”کوئی بات نہیں ہے۔“ مارتھا نے اسے تسلی دی۔

”تم سو جاؤ۔“

اسی لمحے کسی نے باہر سے زور و شور سے دروازہ بجایا اور چلایا۔ ”ایڈ! دروازہ کھولو۔“

ایڈ نے اپنی رائفل اٹھالی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ باہر موجود آدمی پھر چلایا۔ ”ایڈ یہ میں ہوں سام تمہارا دوست..... خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔“

”سام..... یہ سام ہے۔“ مارتھا نے کہا۔

”چپ رہو اور چیف کو دیکھو۔“ ایڈ نے درشت لہجے میں کہا۔ سام اٹھ کھڑا ہوا اور چیف کی طرف بھاگا۔

”تم نے بہت لفظ بات کی ہے۔“ ایملی بولی اور بچے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے کہا۔ ”ہائے، میں ایملی ہوں۔“

”ہائے، میں باب ہارلے ہوں۔“ بچے نے متانت سے کہا۔ ”یہ میرے ڈیڈ کا اسٹور ہے۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک لمبا تڑکا آدمی باہر آیا۔ اس کا چہرہ اور جسم بتا رہا تھا کہ وہ جھانکشی کی زندگی گزارتا آیا ہے بھی اس ویرانے میں کامیابی سے یہ اسٹور چلا رہا تھا۔ اس نے آواز دی۔ ”باب! یہاں سے دور مت جانا۔“

”نیس ڈیڈ۔“ بچے نے جواب دیا۔

میک اور رون اسٹور کی طرف بڑھ گئے۔ رک اور ایملی باب سے بات کر رہے تھے جبکہ مارش اور فیرو اس پاس کا جائزہ لے رہے تھے پھر مارش نے رک سے پوچھا۔ ”تمہارا کہیں یہاں سے کتنی دور ہے؟“

”زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید آدھے یا پون گھنٹے کا سفر اور ہے مگر یہ گاڑیاں کہیں تک نہیں جا سکتیں انہیں پیچھے ہی چھوڑنا ہوگا۔“

”یہ جگہ بہت خشک ہے۔“ فیرو بولی اور دور پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ ”وہاں ہریالی ہے۔“

اسی اثنا میں ایک پرانا کھارا سا لوڈنگ ٹرک ان کی طرف آیا اور اسٹور کے سامنے رک گیا۔ ڈرائیور اس کا سامنی اتر کر سامان کے تحلیے اسٹور میں پہنچانے لگے جبکہ ٹرک کے پیچھے سے کوئی نصف درجن بچے نیچے اتر آئے۔ وہ برآمدے میں رکھے سامان میں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ ایک بچہ ٹرک کی طرف آیا تو ان میں سے سب سے بڑے لڑکے نے اسے پکڑ لیا۔ ”ہے جوں..... یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

بچے نے چھپانے کی کوشش کی مگر لڑکے کے ساتھ بڑی عمر کی لڑکی نے زبردستی بچے کا ہاتھ آگے کر کے اس میں موجود سیب نکال لیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”تم نے چوری کی ہے۔“

”اب کدو کے سرو والا تمہارے لیے آئے گا۔“

بچے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ جوں کے گرد دائرے میں گھومتے ہوئے نظم کے انداز میں گانے گئے۔ ”کدو کے سرو والا آئے گا..... تم پر نشان لگائے گا..... پھر تمہارے لیے آئے گا..... تمہارا سر اتار کر لے جائے گا۔“

”چپ کرو۔“ ایملی نے انہیں ڈانٹا کیونکہ بچہ انتہائی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ”یہ سب بکواس ہے۔“

کدو کے سرو والا مغرب میں ایک روایتی سا کردار ہے جس کے سر کی جگہ گول بڑا کدو ہوتا ہے جس میں آنکھیں

بائیک چلانے کے لیے بہت سی شاندار جگہیں تھیں۔ پہاڑوں میں میک اور رک کا ہینٹنگ کہیں بھی تھا۔ کارن شی یہاں سے سو کلو میٹر زور شمال مشرق میں تھا۔

ہائی وے سے اترنے کے بعد انہیں سڑک ذرا تنگ ملی تھی مگر یہ برا راستہ نہیں تھا۔ دوپہر کے قریب وہ بولڈ ماؤنٹین کے پاس پہنچ گئے تھے اور اب انہیں سامان لینا تھا۔ وہ پانچ دن کے لیے یہاں آئے تھے۔ وہ کسی گروسری اسٹور کی تلاش میں تھے۔ اچانک ایملی نے عقب سے کہا۔ ”میں نے سنا ہے کہ ان پہاڑوں میں بسنے والے لوگ کچھ پر اسرار سے ہیں۔ وہ باہر سے آنے والوں سے گلٹا ملنا پسند نہیں کرتے۔“

”یہ مرض امریکا میں ہر جگہ ہے۔“ میک نے کہا۔ ”لوگ باہر سے آنے والوں کو خوش آمدید نہیں کہتے۔“

”ان کا طرز زندگی بھی پرانا ہے۔“ ایملی پھر بولی۔ وہ ایک اسکول میں پتھر تھی۔

”میں نے بھی سنا ہے لیکن وہ دور جدید کی سہولتیں استعمال کرتے ہیں جیسے ان کے گھروں میں بجلی ہے اور وہ گاڑیاں بھی رکھتے ہیں۔“ رک نے کہا۔ ”ہاں، یہ ہے کہ وہ باہر سے آنے والوں سے گلٹا ملنا پسند نہیں کرتے۔“

”وہ دیکھو پورڈ۔“ میک نے کہا مگر مارش نے اس سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس نے پک اپ اس سڑک پر موڑ دی جس طرف پورڈ اشارہ کر رہا تھا۔ یہ ہارلے گروسری کا پورڈ تھا۔ وہ خوش تھے کہ انہیں گروسری مل گئی تھی۔ وہ بچنے بھر کے لیے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر جانا چاہتے تھے۔ ہینٹنگ کہیں میں کچھ نہیں تھا۔ چند منٹ بعد وہ اس چھوٹے سے اور لکڑی کے کہن میں بنے گروسری اسٹور کے سامنے تھے جس میں پھل بھری سے لے کر نارنجز اور موم جیاں تک سب دستیاب تھا۔ وہ نیچے اتر آئے۔ اسٹور کے سامنے بیڑھیوں پر ایک سات آٹھ سال کا بچہ بیٹھا ہوا اپنے کتے سے کھیل رہا تھا۔ وہ بال ڈراور پھینکتا اور کتا بھاگ کر بال لے آتا۔ ان کی گاڑیاں رکیں تو کتا جارحانہ انداز میں ان پر بھونکنے لگا۔ بچہ اسے روک رہا تھا۔ بال آٹھ روکے کتے کو پکڑ کر واپس لے گیا۔ بچے کی آنکھوں پر دبیز شیشے والی عینک تھی۔ میک نے اسے دیکھ کر مسخرانہ انداز میں کہا۔

”کیا تم نے کوک کی بوتل کا شیشہ فریم میں لگوا دیا ہے؟“

”میک! یہ بچہ ہے۔“ رک نے اسے خبردار کیا۔ ”اس سے اس قسم کی بات کرنا مناسب نہیں ہے۔“

”میں نے کیا کہا ہے؟“ میک کا لہجہ بگڑ گیا۔

اور منہ تراشا ہوتا ہے اور اس کے اندر آگ جلتی ہے۔ ہولووین کے موقع پر اس کردار کا ماسک پہن کر لوگ گلیوں میں گھومتے ہیں۔ لڑکے نے آگے آ کر ایملی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ بکواس نہیں ہے۔“

”بیچھے ہٹو۔“ رک نے کہا تو لڑکے نے سبب والا ہاتھ یوں بلند کیا جیسے ایملی یا رک پر دسے مارے گا مگر پھر اس نے آگے بڑھ کر سبب باب کے حوالے کر دیا۔ لڑکا، لڑکی اور باقی بچے ٹرک پر سوار ہو گئے اور اندر سے نکلنے والے دونوں افراد ڈراؤنا بیونگ کیا رٹ میں جا بیٹھے۔ ٹرک وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ”بچے ڈرا رہے تھے۔“

”نہیں، لڑکا سنجیدہ تھا۔“ ایملی نے تردید کی۔ اتنے میں میک اور رون اندر سے سامان کے قبیلے اٹھائے نکلے اور پک اپ کی پچھلی نشست پر رکھ دیے۔ پھر میک پک اپ پر چڑھ کر اپنی بائیک کھولنے لگا۔ رک اس کی طرف آیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میں ڈرا ان پہاڑیوں کا ایک چکر لگا لوں۔“ میک نے کہا۔ ”تم آ رہے ہو؟“

رک ہنسی بکھاری۔ ”میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔“

جواب میں میک نے بائیک نیچے اتار کر اشارت کی، ہینسٹ پہنا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ گروہری کے پاس ہی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گڑھے تھے۔ میک ان سے بائیک کو جھپ کرانے لگا۔ ایملی رک کے پاس آئی۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی ہمیں آگے نہیں جانا ہے؟“

”جانا تو ہے لیکن اگر یہاں کچھ رائیڈنگ کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟“ رک نے کہا اور اپنی بائیک اتارنے لگا۔ پھر اس نے بھی ہیلٹ پہنا اور میک کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ مارش اور فیروہ ایک طرف بیٹھے بیڑ کے شن سے شغل کر رہے تھے۔ اتنے میں گروہری اسٹور کا مالک اندر سے نکلا اور اس نے باب سے کہا۔

”تم اور پیڈی اندر جاؤ اور جب تک میں نہ آؤں اندر ہی رہنا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے؟“

”ییس ڈیڈ۔“ باب نے کہا اور کتے کو آواز دی۔ ”پیڈی! کم آن یوائے۔“

باب اور کتا اندر چلے گئے۔ آدی نے اسٹور کے ساتھ کھڑا پنا پرانا پک اپ ٹرک اشارت کیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مارش، رون، ایملی اور فیروہ بائیک جمپنگ دیکھ رہے تھے۔ اچانک اسٹور کا دروازہ کھلا اور پیڈی بھونکتا ہوا باہر آیا۔ غالباً اسے اپنے سکون میں ٹریل بائیکس کا شور

ناگوار گزر رہا تھا اور وہ بھونکتا ہوا ان کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے باب تھا۔ پہلے تو ان چاروں نے باب اور کتے کو دیکھا نہیں کیونکہ اس جگہ کئی فٹ اونچی جھاڑیاں اور گھاس تھی پھر ایملی کی نظر پڑی اور وہ ان کے پیچھے بھاگی۔ وہ چلا چلا کر باب سے روکنے کو کہہ رہی تھی کیونکہ وہ جمپنگ زون میں جا رہا تھا اور یہ بہت خطرناک تھا۔ مگر بائیکس کے انجن کے شور میں باب نے سنا نہیں۔ پیڈی اب ٹیلوں کے درمیان تھا۔ باب اس کے پیچھے بھاگتا ہوا ٹیلوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ایملی کے بعد رون اور فیروہ نے بھی دیکھ لیا تھا اور وہ بھی بھاگے آ رہے تھے۔

باب ایک ٹیلے تک پہنچ گیا۔ بائیک اس کے پیچھے تھیں۔ اچانک ٹیلے سے ایک بائیک اچھل کر آئی اور سوار نے باب کو بچانے کی کوشش کی۔ باب بچ گیا مگر بائیک سلب ہو گئی۔ باب خوف سے اپنی جگہ ٹنجد ہو گیا تھا پھر دوسری بائیک ٹیلے سے اچھل کر نیچے آئی اور اس کا ٹائر باب کے سینے سے ٹکرایا۔ وہ اچھل کر دور جا گیا۔ دوسری بائیک بھی سلب ہوئی۔ یہ میک کی بائیک تھی۔ رک اپنا جیٹ اتار کر زمین پر سناکت پڑے باب کی طرف بھاگا۔ رون، ایملی اور فیروہ بھی وہاں آ گئے تھے۔ مارش جھک کر باب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”فیئر، چل رہی ہے۔ اسے فوری ہی ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہے۔“

”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“ میک نے کہا اور بائیک اٹھا کر پک اپ کی طرف چل دیا۔ رک اس کے پیچھے لپکا۔

”کیا مطلب ہے؟ بچے کو مدد کی ضرورت ہے۔“

”اگر ہم یہاں رکے تو مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

میک بولا اور بائیک پک اپ پر چڑھا کر اسے باندھنے لگا۔

”تمہارا دماغ درست ہے؟ یہ مر گیا تو تمہارے خلاف کیس بنے گا۔“

”اب بھی میرے خلاف کیس بنے گا اور میرا لائننس منسوخ ہو جائے گا۔“ میک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

اس دوران میں مارش ایملی کے لیے کال کرنے اسٹور کی طرف بھاگا تھا مگر جب اس نے اسٹور میں دیکھا تو اسے کہیں بھی فون نظر نہیں آیا۔ اس نے باہر آ کر اطلاع دی۔

”یہاں کہیں فون نہیں ہے۔“

”کہیں میں ہے۔“ رک نے کہا۔ ”ہمیں وہاں جانا ہوگا۔“

اس دوران میں میک اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھ گیا اور اس نے چلا کر کہا۔ ”سب آؤ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

رک نے ان سب سے کہا۔ ”تم لوگ جاؤ۔“

رون بھاگ کر میک کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا اور وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رک نے مارش سے کہا۔ ”تم جا کر کہیں سے ایملی کے لیے کال کرو۔“

”ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ ایملی بولی۔ ”بچے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم جا کر ایملی کے لیے کال کرو۔“

مارش نے سر ہلایا اور پک اپ کی طرف بھاگا۔ فیروہ اس کے ساتھ تھی۔ رک نے ایملی سے کہا۔ ”تم بھی جاؤ، میں یہاں رکا ہوا ہوں۔“

”میں تمہارے ساتھ رکوں گی۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، تم جاؤ۔“

ایملی رک کے مجبور کرنے پر چلی گئی۔ پک اپ کے جانے کے بعد رک نے سنجے کو دیکھا۔ اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیٹ اتار کر اس پر ڈال دی۔ چند منٹ بعد سڑک پر دھول کے ساتھ گروہری کے مالک کا ٹرک نمودار ہوا اور وہ اسٹور کے ایک طرف رک گیا۔ وہ اندر گیا اور باب اور کتے کو نہ پا کر باہر آیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ رک ہاتھ ہلا رہا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا اور نزدیک آنے پر اسے جیٹ تلے باب کے سنہری بال دکھائی دیے تو وہ بھاگا اور نزدیک آ کر اس نے جیٹ اتاری باب کو دیکھ کر اس کا چہرہ پتھر جیسا منت ہو گیا۔ اس نے فری سے باب کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔ رک نے اس کی گر جانے والی جیٹ اٹھا کر آگے کی تو اس نے لے کر باب کی آنکھوں پر لگا دی۔ وہ اسے سینے سے لگا لے کر آگے بڑھا تو رک نے عقب سے کہا۔

”مسٹر ہارلے! یہ ایک حادثہ تھا۔“

وہ رک اور اس نے مڑ کر دیکھا تو رک کو اس کی آنکھوں میں شعلے سے دکھائی دیے۔ اس نے وحشی آواز میں کہا۔ ”اگر میرے بیٹے کو کچھ ہوا تو میں تم میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ باب کو لے کر اپنے ٹرک تک آیا اور اسے اس میں لٹا کر روانہ ہو گیا۔ رک اپنی بائیک کی طرف آیا، اسے اشارت کیا اور اپنے کہیں کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

مارش، فیروہ اور ایملی پک اپ پیچھے چھوڑ کر دلہل کے اوپر بنے نگرانی کے چھوٹے سے پل سے ہوتے ہوئے کہیں تک آئے تھے۔ یہ نگرانی کا لیکن بہت نفاست سے بنا ہوا خوب صورت کہیں تھا۔ اس میں بجلی، پانی اور فون کی سہولت تھی۔ کہیں بندری پر تھا اس لیے یہاں سے آس پاس کا منظر

صاف دکھائی دیتا تھا۔ مارش اندر آتے ہی فون کی طرف لپکا اور اس نے ریسیور اٹھایا لیکن اس سے فون نہیں آ رہی تھی۔ تب اس نے دیکھا، میک کے ہاتھ میں فون کا ٹوٹا ہوا تار تھا۔ اس نے سمجھ کر تار توڑ دیا تھا۔ مارش اس کی طرف جھپٹا۔ ”یہ کیا کیا تم نے۔۔۔۔۔ ہمیں ایملی کو کال کرنی ہے۔“

”کوئی کال نہیں کرنی ہے۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا تو مارش نے غصے سے بے قابو ہو کر اسے گھونسا مارا اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گیا۔ مارش نے پلٹ کر ایملی سے کہا۔ ”آؤ، ہمیں کہیں فون تلاش کرنا چاہیے۔“

مگر اسی لمحے میک نے عقب سے اٹھ کر اس کے سر پر پتھر دھت سے ضرب لگائی اور وہ فرش پر گر سکتا ہو گیا۔ چند منٹ بعد رک اندر آ پاتا تو اس نے دیکھا کہ رون اور ایملی ایک طرف صوفے پر بیٹھی ہیں اور میک کھڑکی سے لٹکا ہوا تھا۔ رک نے پوچھا۔ ”مارش اور فیروہ کہاں ہیں؟“

اسٹور کا دروازہ اندر سے بندھے لگا اور فیروہ کے چلانے کی آواز آئی۔ ”رک! اس نے ہمیں بند کر دیا ہے۔“

رک اسٹور کی طرف بڑھا تو میک راستے میں آ گیا۔ رک نے کہا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”یہاں سے کوئی باہر نہیں جائے گا۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا۔

رک چہرہ دیر تا مدیش رہا۔ ”بچے کو اس کا باپ لے گیا ہے مگر اس نے جاتے ہوئے مجھے دھمکی دی ہے کہ اس کے بچے کو کچھ ہوا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔“

”وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ میک نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اب بات ختم ہو گئی ہے۔“

”تب ان لوگوں کو باہر آنے دو۔“ رک نے التجا کی۔ وہ میک سے دیتا تھا۔ وہ بڑا بھی تھا اور مزاج کا سخت بھی۔ میک نے دروازہ کھولا۔ مارش اور فیروہ باہر آئے۔ انہوں نے سب سن لیا تھا۔ میک نے کہا۔

”بات ختم ہو گئی ہے اس لیے ہمیں اپنی پٹنگ اٹھائے کرنی چاہیے۔“

مارش نے ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔ ”یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

☆☆☆

ہارلے ٹرک چلا رہا تھا۔ وہ اپنے گھر تک آیا۔ اس کا گھر سادہ سا تھا مگر ان باب بننے کے لیے کافی تھا۔ اس کی بیوی کافی عرصے پہلے بیمار ہو کر مر گئی تھی تب سے وہ باب کی پرورش کر رہا تھا۔ اس کا دنیا میں بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں

تھا۔ وہ اسے اٹھائے گھر کے اندر آیا اور بستر پر لٹا کر فون کی طرف جانے لگا تھا کہ رک گیا۔ باب جو راستے میں تھوڑا بہت مل رہا تھا، اب بالکل ساکت تھا۔ اس نے باب کی نبض اور پھر دل کی دھڑکن چیک کی۔ انہیں ساکت پا کر وہ غم سے نڈھال ہو کر فرش پر بیٹھ گیا اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور اپنی سسکیاں روکنے لگا۔ بہت دیر رونے کے بعد اس کے آنسو رک گئے تھے۔ مگر اس کے دل میں اب آگ جل رہی تھی۔ اس نے باب کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں انہیں معاف نہیں کروں گا۔ میرے بچے میں تمہارا انتقام لے کر رہوں گا۔“

کچھ دیر بعد اس نے باب کی لاش ایک چادر میں لپیٹ کر ٹرک میں ڈالی اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ بولڈ ماؤنٹین کی اس پرانی بستی کی طرف تھا جہاں لوگ آج کے دور میں بھی خاصی قدامت پرستی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے اور ان کا رہن سہن بہت سادہ تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب سورج ڈھل چکا تھا، وہ بستی میں داخل ہوا اور اس نے رابرٹ کے مکان کے سامنے ٹرک روکا۔ انجن کی آواز سن کر وہ باہر آیا اور ٹرک کے عقب میں آنے کے قہقہے دیکھ کر اس نے اپنے پوتے کو آواز دی۔ ”بریڈ! آکر یہ قہقہے اندر لے جاؤ۔“

بریڈ وہی لڑکا تھا جس نے اپنی اور رک کو کدو کے سر والے کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ آ کر ٹرک کے عقب سے قہقہے اتارنے لگا۔ ہارلے نے آگے آگیا۔ اس نے رابرٹ سے کہا۔ ”مجھے اس عورت کا پتا چاہیے۔“

”کس عورت کا؟“ رابرٹ نے پوچھا۔

”جس کا تعلق کدو کے سر والے سے ہے۔“

”ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔“

”وہ ہے اور میں نے اسے خود دیکھا ہے۔“ جیف ہارلے نے یقین سے کہا۔ اسے وہ منظر یاد آیا جو اس نے بچپن میں دیکھا تھا جب اس کے باپ نے اپنے بچپن کے دوست سام کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا اور وہ اس مخلوق کا شکار بن گیا تھا۔ جیف نے اپنی جیب سے رقم کی ایک چھوٹی گڈی نکال کر رابرٹ کی طرف بڑھائی۔ ”مجھے صرف اس کا پتا چاہیے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ رابرٹ نے غصے سے کہا۔ ”تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟“

تب جیف نے باب کی لاش سے کپڑا ہٹایا۔ ”یہ میرا چکا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے مارا ہے۔“

رابرٹ نے جھک کر دیکھا اور اس کا چہرہ نرم پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بچے کا افسوس ہے۔ اسے سزا دینا کر دین کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

بریڈ رک کر ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا مگر جب رابرٹ نے اسے گھورا تو وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور آنے کی بوریاں اٹھا کر لے جانے لگا۔ دس منٹ بعد جیف واپس جا رہا تھا کہ ایک تنگ گلی سے گزرتے ہوئے اچانک بریڈ سامنے سے نمودار ہوا۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اس کے اشارے پر جیف نے ٹرک روک لیا۔ اس نے کھڑکی سے لنگ کر کہا۔ ”مسٹر ہارلے! میں نے تمہاری اور گریڈ پا کی بات سنی ہے۔ میں اس عورت کو جانوں ہوں۔ اس کا نام میگاٹ ہے۔“

جیف منتظر تھا کہ وہ مزید کچھ بتائے گا مگر جب وہ خاموش رہا تو جیف نے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے لے کر جیب میں رکھ لی۔ جیف نے اسے کار سے پکڑ کر کھینچا۔ ”مجھے صرف نام نہیں پتا بھی چاہیے۔“

”میں دکھا سکتا ہوں۔“ بریڈ نے کہا اور اچھل کر ٹرک کے پیچھے سوار ہو گیا۔ اس نے جھک کر جیف سے کہا۔ ”بولڈ ماؤنٹین کے اوپری حصے کی طرف چلو جہاں پرانی دلدل ہے۔“

جیف نے ٹرک آگے بڑھا دیا۔ پرانی دلدل پر اس نے آباد علاقہ تھا اور یہاں کے لوگ بھی وہاں جانے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہاں اکثر دلدل سے نہ ہرلی کیس خارج ہوتی تھی۔ کئی جان لیوا حادثات کے بعد لوگوں نے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جب جیف اس کے اوپر حصے کے پاس پہنچا تو بریڈ نے چھت پر ہاتھ مار کر اسے گھبراہٹ کا اشارہ کیا اور ٹرک رکے ہی وہ نیچے اتر آیا۔ اس نے جیف سے کہا۔ ”یہاں سے آگے تم خود جاؤ۔ یہ راستہ سیدھا میگاٹ کے گھر تک جاتا ہے۔“

”اوکے تم جاسکتے ہو لیکن وہ نہ ملی تو میں سیدھا تمہارے گھر آؤں گا۔“

”اگر وہ زندہ ہے تو یہیں ہے۔“ بریڈ نے کہا اور پلٹ گیا۔ جیف نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ دلدلی علاقہ تھا جہاں زمین بہت نرم تھی اور راستے سے بچنے کی صورت میں ٹرک کے تائر زمین میں دھنس سکتے تھے۔ بالآخر ایک جگہ راستہ ختم ہو گیا اور اسے نیچے اترنا پڑا۔ وہ پیدل آگے بڑھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی ہوئی تھی مگر اب چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ دلدل سے بخارات کے ساتھ گیس اور بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔

جام حالات میں جیف یہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن باب کا انتقام لینے کے لیے اس وقت وہ جہنم جانے کو بھی تیار تھا۔ اسے کچھ دور ایک ٹیلے پر لکڑی کا بنا ہوا جمونپڑا دکھائی دیا جس کی چمپنی سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی اور دلدل تھی اور جانے کا واحد راستہ لکڑی کا بنا ہوا تختہ حال مل تھا۔ وہ اس سے ہوتا ہوا جمونپڑے تک آیا اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

جمونپڑے کے اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسے کسی جاو گرنی کے ٹھکانے کا ہو سکتا ہے۔ جگہ جگہ مردہ جانوروں کے ڈھانچے اور حنوط کیے جانور موجود تھے۔ ایک طرف ریک پر زندہ الو بیٹھا تھا جس نے جیف کے اندر آتے ہی بڑی کر بے بسی آواز نکالی۔ اس کے سامنے والے ریک پر چوہے کچھ کھا رہے تھے اور وہ الو کی موجودگی سے بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ آتش دان کے سامنے سفید بکھرے بالوں والی میگاٹ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں آئے ہو؟“

جیف آگے آیا اور اس نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور اس میں موجود سونے کے سکے کرسی کے ساتھ رکھی میز پر موجود بلوری گولک میں ڈال دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ”مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا ہے۔ یہ اس کا معاوضہ ہے۔“

تب میگاٹ نے سر کھٹا کر اس کی طرف دیکھا تو جیف کا تب انٹھا۔ اس کے سامنے جمبولوں اور دانوں سے بھرا ہوا ایک انسانی چہرہ تھا جس کا اس نے بھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس کی ایک آنکھ میں سفید جالا تھا اور دوسری ٹھیک تھی۔ میگاٹ اس علاقے کا ایسا کردار تھی جس کے بارے لوگ بہت کم جانتے تھے اور اس سے بھی کم لوگوں نے اسے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ البتہ ایک بات پر سب متفق تھے کہ وہ چڑیل تھی اور کم سے کم ایک صدی سے یہاں موجود تھی۔ اسے دیکھ کر جیف کو لگا کہ اس کی عمر ایک صدی سے بھی زیادہ تھی۔ کدو کے سر والے اصل میں میگاٹ کا ممبر تھا، وہی اسے زندہ کرتی تھی اور جن لوگوں کے لیے وہ زندہ ہوتا تھا انہیں ختم کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ ساری کہانیاں تھیں جو اس علاقے میں ایک صدی سے سینہ بہ سینہ چلتی آرہی تھیں۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کدو کے سر والے میرے بچے کا انتقام لے۔“

عورت ہنسنے لگی۔ ”سوچ لو، بعد میں بچھتا ہمت۔“

”میرے پاس اب کھونے کو کچھ نہیں رہا ہے۔“

جیف ہنسنے لگا۔ ”میرا بچہ میری کل کائنات تھا اور وہ مر

چکا ہے۔“

عورت نے سر ہلایا۔ ”بچے کو یہاں لے آؤ۔“

جیف جا کر باب کی لاش لے آیا۔ عورت نے اسے ایک طرف رکھی کرسی پر ڈالنے کو کہا اور بولی۔ ”اب تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے۔ تم دلدل کے اوپری حصے میں جاؤ گے۔ وہاں ایک بڑے درخت کا کٹنا ہوتا ہے۔ اس حصے کے اوپری حصے میں ایک لاش دفن ہے، تم وہ نکال کر لاؤ گے۔“

جیف ہنسنے لگا اور عورت نے اسے تیلچے تھما دیا تھا۔ وہ باہر نکلا اور دلدل کے اوپری حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے کٹنا ہوتا تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ بہت بڑا تھا اور اس کا قطر کم سے کم بھی دس فٹ تھا۔ وہ اس کے کھردرے حصے کو پکڑ کر اوپر آیا۔ کٹنا ہوتا تھا اور پر سے ہموار نہیں تھا اور اس کے وسط میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ جیف نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ تیلچے چلانا شروع کیا اور مٹی ہٹانے لگا۔ اس نے ابھی مشکل سے ایک فٹ مٹی ہٹائی ہوگی کہ تیلچے کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے تیلچہ رکھا اور ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگا۔ جلد ایک سگڑا سٹنا ہوا ہاتھ سامنے آیا جس میں لمبی انگلیاں اور ان پر لمبے ناخن تھے۔ جیف مٹی ہٹانے لگا۔ جلد اس کے سامنے ایک عجیب الخلق انسان کی لاش آگئی۔ اس کا سر غیر معمولی بڑا اور جسم چھوٹا سا تھا۔ بالکل کسی آٹھ نو سال کے بچے جتنا مگر سر کسی بھی انسانی سر سے کئی بڑا تھا۔ اس سے بدبو کے بجائے اٹھ رہے تھے۔ لاش تقریباً ڈھانچا ہو گئی تھی مگر اس کی ساخت واضح تھی۔ جیف نے ابکائیاں روکتے ہوئے اسے باہر نکالا اور اٹھا کر میگاٹ کے جمونپڑے میں لے آیا جو باب کی لاش پر چھٹی کچھ کر رہی تھی۔ اس نے جیف سے کہا۔

”اسے میز پر ڈال دو۔“

میز صاف تھی۔ میگاٹ نے اس سے تمام چیزیں اٹھا لی تھیں۔ جیف نے بڑے سروالے کی لاش میز پر ڈال دی۔ میگاٹ مڑی تو اس کے ہاتھ میں شیشے کا ایک پھیلے کناروں والا جام تھا اور اس میں کوئی سرخ سی چیز تھی۔ وہ جیف کے پاس آئی اور مطالبہ کیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

جیف نے ہاتھ آگے کیا تھا کہ اس نے نہایت بھرتی سے اس پر اپنا ناخن مارا۔ جیف کی تھیلی پر کٹ نمودار ہوا اور اس سے خون بہنے لگا جو میگاٹ جام میں جمع کرنے لگی۔ اب جام نصف کے قریب بھر گیا تھا۔ وہ گھومی اور اس نے بہت محبت سے جام لاش کے منہ سے لگا دیا اور اس کا سر اٹھاتے ہوئے جام اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ جیسے ہی خون اس

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ ندامت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کستوری، عنبر زعفران، سہ ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگولیں۔

المسلم دار احکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-652606 1
0301-6690383
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

کرتی ہوگی۔“ پولیس کیا کر لے گی؟“ میک بولا۔ ”ہمیں خود تلاش کرنا ہوگا۔“

اچانک انہیں کیمین کی طرف سے لڑکیوں کے چلانے کی آواز آئی تو وہ پلٹ کر بھاگے اور جب وہ کیمین کے سامنے پہنچے تو انہوں نے مارش کو بری طرح اڑھوا ہوا پڑا پایا۔ فیرو رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”مارش مر گیا ہے۔“

رک نے اس کی نبض دیکھی۔ مارش دائمی مر چکا تھا۔ اس نے تجھے ہونے انداز میں کہا۔ ”اسے اندر لے چلو۔“

میک اور رک مارش کی لاش اٹھا کر اندر لے جا رہے تھے کہ اچانک فیرو کی چیخ سنائی دی۔ اس کا سراپی بڑے سے ہاتھ نے پکڑا ہوا تھا جو مارش کو لے گیا تھا اور پھر وہ فیرو کو بھی مارش کی طرح اچک کر چھت پر لے گیا۔ رک اور میک لاش چھوڑ کر بھاگے اور کیمین کے چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگے کہ فیرو کہاں ہے۔ رون اور ایملی ان کے ساتھ تھیں۔ اچانک ایملی چلائی۔ ”وہ دیکھو۔“

کیمین کے ساتھ بنے ایک بہت بلند درخت کے اوپری حصے میں بڑے سرد والا فیرو سمیت موجود تھا۔ اس کا چہرہ سیاہی تھا اور وہ بھیا تک انداز میں ہنس رہا تھا۔ اچانک اس نے فیرو کو چھوڑ دیا اور وہ ایک طویل چیخ کے ساتھ نیچے موجود پتھر پر آگری اور فوراً مر گئی کیونکہ اس کی ریزہ کی ڈی نوٹ تھی تھی۔ وہ اس کی طرف بھاگے۔ لڑکیاں رو رہی تھیں اور وہ دونوں غصے میں تھے۔ میک نے جب رائفل اوپر کی تو بڑے سرد والا درخت سے غائب تھا۔ رک کی حالت بری تھی۔ اس نے میک سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے لگنا ہوگا۔ یہ وہی بلا ہے۔ ہم سب کو مار دے گی۔“

وہ فیرو کی لاش بھی اٹھا کر اندر لے آئے اور اسے مارش کی لاش کے ساتھ رکھ کر ایک ہی چادر سے ڈھانپ دیا۔ چند منٹ میں وہ اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہو گئے تھے۔ انہوں نے کیمین کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ ان کے پاس ایک رائفل اور ایک پستول تھا۔ پستول رک نے لے لیا۔ میک نے کہا۔ ”ہمیں گاڑیوں تک پہنچنا ہوگا۔ ایک بار ہم وہاں پہنچ گئے تو پھر یہاں سے نکل سکیں گے۔“

”تو انتظار کس کا ہے، ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔“ رون بولی۔ وہ زیادہ گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ چاروں حفاظ انداز میں باہر آئے۔ اچانک رون نے کہا۔ ”میرا ہلک اندر ہے۔“

”میرا ہلک اندر ہے۔“ میک نے دھوکے سے مجھ پر قابو پایا مگر اب تم میرے پاس نہیں آ سکتے۔“

مارش باہر جانے لگا تو رک اس کی طرف لپکا۔ ”ابھی مت جاؤ، دیکھو موسم خراب ہو رہا ہے۔“

”میرا ٹرک ہر موسم میں سفر کر سکتا ہے۔“ مارش نے فخر سے کہا اور باہر نکل آیا۔ فیرو اس کے ساتھ تھی۔ وہ سب بھی باہر آ گئے۔ ہوا میں کاٹ تھی اور سوکھے پتے اڑ رہے تھے۔ رک اور ایملی انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میک کے ساتھ رون لاطعتی سے ایک طرف کھڑی تھی۔ مارش انکار کرتا ہوا برآمدے سے اتر کر بیٹھے آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں نہیں رک سکتا۔۔۔۔۔“

ابھی اس کا جملہ منہ میں تھا کہ چھت سے ایک بڑا سا ہاتھ آیا اور اس نے مارش کا سر پکڑ کر اسے کسی کھلونے کی طرح اوپر اٹھنے لیا۔ ایملی، فیرو اور رون کی چیخیں نکل گئیں۔ میک اور رک بھاگے مگر جب انہوں نے ڈھلان والی چھت پر دیکھا تو انہیں ایک سایہ دوسری طرف غائب ہوتا نظر آیا۔ وہ پیچھے کی طرف بھاگے تھے مگر اتنی دیر میں وہ نامعلوم جانور مارش کو کسی نیچے کی طرح اچک کر لے جانے والا غائب ہو گیا تھا۔ کم سے کم انہیں لگا یہی تھا کہ وہ کوئی جانور ہے۔ رک نے کہا۔ ”کیا تھا۔۔۔۔۔ کوئی بچہ؟“

”جانتی نہیں۔۔۔۔۔ مگر بچہ یہاں کیمین پایا جاتا۔“ میک نے کہا اور اندر کی طرف بھاگا۔ ”میں رائفل لینے جا رہا ہوں۔ تم تلاش کرو۔“

رک پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ مکان کی طرف سے لڑکیوں کے چیخنے اور رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اب آسمان پر بجلی چمکنے لگی تھی۔ ایک بار بجلی چلائی تو رک نے دیکھا دور ڈھلان پر ایک عجیب اقلقت ظہور نے مارش کو ٹانگ سے پکڑ کر الٹا لٹکایا ہوا تھا اور وہ بے حواس بے حرکت تھا۔ اس کا سر بہت بڑا تھا۔ رک کو کدو کے سر والے کا خیال آیا۔ دوسری بار بجلی چمکی تو وہ غائب تھا۔ ان دوران میں میک اندر سے رائفل لے آیا اور وہ اس طرف بھاگے جہاں رک کو مارش اور وہ چہر نظر آئی تھی۔ رک، میک کو بتا رہا تھا کہ اس نے کیا دیکھا ہے مگر میک نے ماتھے سے انکار کر دیا۔ ”وہ کوئی بڑے سرد والا آدمی ہوگا۔ کدو کے سر والا صرف ایک ماورائی کردار ہے۔“

رک اسے یقین دلانے لگا کہ اس نے خود دیکھا تھا۔ انہوں نے آس پاس ہر جگہ دیکھ لیا مگر انہیں مارش یا کدو کے سرد والا نظر نہیں آیا تھا۔ رک نے کہا۔ ”ہمیں پولیس کو بلا دیا۔“

کے منہ میں گیا، اس کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی اور اسی لمحے چیف کو لگا کہ اس کا سر چکر رہا ہے۔ وہ سر ہٹا کر پیچھے گیا اور پھر اس نے دھندلاتی آنکھوں سے دیکھا کہ لاش میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ صرف حرکت نہیں بلکہ وہ بڑھ رہی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قد آور عفریت میں بدل گئی۔ چیف اسے بھولا نہیں تھا حالانکہ اسے دیکھے ہوئے اٹھائیس سال گزر چکے تھے۔ پھر وہ چکر کر نیچے گرا تو اسے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں کب اسے ہوش آیا تو کرسی پر بیٹھی میگاٹ نے کہا۔

”تمہارا کام ہو گیا ہے۔ اپنے بچے کو لے جا کر دفن دو اور دیکھو، اس کے قاتل کیسے مارے جاتے ہیں۔“

بڑے سرد والا غائب تھا۔ وہ یہاں سے جا چکا تھا۔ چیف نے اٹھ کر باب کی لاش اٹھائی اور پ مشکل اپنی گاڑی تک آیا۔ اس کا سر اب بھی چکر رہا تھا۔ اس نے باب کی لاش ٹرک کی نشست پر ڈالی اور روانہ ہو گیا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ رہی تھی کیونکہ پہاڑوں کی طرف سے تیز ہوا چلتی شروع ہو گئی تھی۔ اچانک اس کا سر زور سے چکرایا اور اس نے بریک لگائے۔ گاڑی رکی تو جھٹکے سے اسے ہوش آیا اور تب اس نے دیکھا کہ باب برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے اپنا خون آلود سر گھما کر چیف کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”ڈیڑی! ہم کیوں رک گئے؟“

وہ چونکا اور پھر اس نے دیکھا تو باب کی لاش بدستور کپڑے میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بولڈ ماؤنٹین کے قبرستان میں باب کے لیے قبر کھود رہا تھا۔ موسم کو دیکھتے ہوئے اسے اٹھائیس سال پہلے والی رات یاد آگئی، تب بھی موسم ایسا ہی طوفانی ہو رہا تھا۔ باب کی لاش دفناتے ہوئے وہ خود سے سوال کر رہا تھا کہ یہ میں نے کیا کیا؟

☆☆☆

رک غم زدہ تھا۔ اس نے میک سے کہا۔ ”تم نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔“

”اپنا منہ بند رکھو۔“ میک کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”یہ حادثہ تھا۔“

”لیکن اس کے بعد تم نے جو کیا وہ حادثہ نہیں تھا۔“ مارش بھی بولا۔ ”میرا خیال ہے اب اس پنگک کا کوئی جواز نہیں ہے اور ہمیں واپس جانا چاہیے۔“

”کوئی نہیں جائے گا۔“ میک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم کل فیصلہ کریں گے۔“

”تم فیصلہ کرتے رہنا۔“ مارش کا لہجہ بھی بدل

”جلدی لے آؤ۔“ زک نے کہا۔ رون اندر چلی گئی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ میں آجانا چاہیے تھا مگر اس سے اوپر دقت ہو گیا اور اس کی واپسی نہیں ہوئی تو زک اندر گیا۔ لاؤنج میں سناٹا تھا اور وہاں صرف مارش اور فیرو کی لاشیں چادر تلے پڑی تھیں۔ اچانک ایک بیڈروم کا دروازہ کھلا اور رون اس سے دھرام سے آکر باہر گری۔ اس نے زک کو دیکھا اور چلائی۔ ”مجھے بچاؤ۔“

تب زک نے اس کے پیچھے اسی بڑے سروالے عفریت کو دیکھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے اندر آیا تھا اور اس نے رون کو دیوچ لیا تھا۔ اس نے جھک کر رون کی ٹانگیں پکڑیں اور اسے صحت کر لے گیا۔ اس کی جھج و پکار سن کر میک اور ایملی دوڑے ہوئے آئے تھے۔ میک نے سکتے میں کھڑے زک کو گھنچوڑا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ..... وہ رون کو لے گیا۔“ زک نے بہ مشکل کہا۔ بیڈروم کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ ایملی نے اندر آتے ہوئے کہیں کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا اور اب انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چھت پر کوئی چیز چل رہی ہو۔ پھر عفریت رون سمیت چن والی طرف سے نیچے کودا۔ اس نے رون کا سر پکڑ رکھا تھا اور اس کا چہرہ چکن کی کھڑکی کے شیشے سے دھار ہا تھا۔ وہ کرب سے چلا رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ میک چلا گیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے؟“ اچانک عفریت نے رون کو پیچھے کیا اور پھر زور سے کھڑکی پر مارا تو وہ کھڑکی توڑتی ہوئی اندر آگری۔ میک کے منہ سے جھج نکلی، وہ رون کی طرف بھاگا۔ اس نے خون میں ڈوبی رون کو سیدھا کیا مگر وہ مر چکی تھی۔ شیشوں نے اسے بری طرح کاٹ دیا تھا۔ میک دھاڑیں مار کر رونے لگا تو باہر سے عفریت نے حیوانی قبہہ لگا یا۔ ایملی رو رہی تھی اور زک ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اچانک وہ چونکا۔ ”ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک اس درندے کو مار نہیں دوں گا۔“ میک نے کہا اور رون کی لاش فرش پر ڈال کر اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ زک نے اس کا بازو پکڑ کر گھنچوڑا۔

”وہ درندہ نہیں ہے، وہ کدو کے سروالا ہے۔ ہم یا کوئی انسان اسے مار نہیں سکتا۔“

”صرف وہی انسان اسے مار سکتا ہے جس کا خون اسے زندہ کرتا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”میں نے اس کے بارے میں پڑھا ہوا ہے۔ زک شیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں اپنی جان بچا کر یہاں سے لگھنا چاہیے۔“

”چلو۔“ زک نے میک کو پکڑ کر کھینچا اور وہ تینوں کچھن سے باہر نکل آئے اور پھر تیزی سے اس جگہ کی طرف بھاگے جہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں مگر جب وہ گاڑیوں کے پاس آئے تو ٹھنک گئے۔ دونوں گاڑیوں کی حالت بری تھی۔ ان کی باڈی ہچک گئی تھی اور سارے ٹائر تباہ ہو گئے تھے۔ شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ زک کی پانچ جیسے وہ یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کی حالت زیادہ خراب تھی وہ تڑپ کر گریہ کی صورت میں ہو گئی تھی۔ میک نے پک اپ پر کھڑی اپنی ہائیک اتاری اور زک کے سر سے اسٹارٹ کیا تو وہ اسٹارٹ ہو گئی مگر جب اس نے ایکسپلر پڑ دیا تو ہائیک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکی۔ جب انہیں وہی حیوانی ہنسی سنائی دی اور انہوں نے ایک طرف کھڑے عفریت کو دیکھا۔ ہائیک کی چینن اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایملی ہڈ پانی انداز میں چلانے لگی۔ عفریت نے ہاتھ میں موجود زنجیر کھما کر میک ماری۔ وہ ہائیک سے الٹ کر دوڑ جا کر۔ اسے شدید ضرب آئی تھی مگر وہ ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے رائفل اٹھاتے ہوئے عفریت کا نشانہ لیا اور گولی چلائی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا۔ میک نے دوبارہ گولی چلائی۔ اس بار بھی عفریت پیچھے گیا۔ مگر پھر وہ ان کی طرف بڑھنے لگا۔ ایملی کی چیخیں ایک بار پھر تیز ہو گئیں۔

جیف نے قبر ہموار کی اور بچلے ایک طرف پھینک کر ہاتھوں سے تمام لیا۔ ”یہ میں کیا کر رہا ہوں؟“

جب تک وہ باب کی قبر کھود کر اسے دفن کرتا، اسے وہ کمر پکڑنے کے دورے پڑتے رہے۔ اس وقت اسے لگتا جیسے اس کا تعلق آس پاس کے ماحول سے کٹ کر ہے۔ چند منٹ میں وہ شیک ہو جاتا۔ اس دورے میں اسے لگتا کہ وہ کچھ کر رہا ہے اور جیسے کسی کو مار رہا ہے لیکن اسے کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک اسے چلانے کی آواز آئی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے مرد اور عورتیں چلا رہے ہوں۔ اس کے بعد قاتل کی آواز آنے لگی۔ جیف تیزی سے اس طرف بڑھا۔ اس نے اپنے ٹرک میں موجود شاٹ گن نکالی اور درختوں میں گھس گیا جہاں سے آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں نزدیک آگئی تھیں اور ان میں ایک عورت کی چیخوں کی آواز نمایاں تھی۔

☆ ☆ ☆

”اس پر گولی کا اثر نہیں ہو رہا۔“ زک بولا۔

”نکلو۔“

مگر عفریت اس دوران میں ان کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے میک کا گلا دیوچ لیا۔ پھر وہ جھٹکے سے پیچھے گیا۔ قاتل کی آواز آئی تو انہوں نے دیکھا کہ کچھ دور کھڑا جیف شاٹ گن سے عفریت پر فائر کر رہا تھا۔ شاٹ گن کی گولی زیادہ طاقت ور تھی اور عفریت کے پیچھے سے میک کا گلا چھوٹ گیا۔ دوسرے فائر پر وہ مزید پیچھے گیا اور تیسرے فائر پر وہ دھرام سے نیچے گر اور ساکت ہو گیا۔ جیف نے شاٹ گن میں خالی ہونے والے کارتوس کی جگہ نئے کارتوس ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”اس درندے نے ہمارے تین ساتھی مار دیے ہیں۔“ زک بولا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”مسٹر ہارلے! چینن کرو تمہارے بچے کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ اپنے بچے کے پیچھے بھاگتا ہوا ریمینڈنگ ریج میں آ گیا تھا اور ہمیں ہائل پتہ نہیں چلا۔“

جیف کا چہرہ ست گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونے کے چند سکے دے کر ایک ایسا عفریت حاصل کر لے گا جو اس کے بچے کے قاتلوں سے اتنا بھیانک انتقام لے رہا تھا۔ میک نے زک کی طرف دیکھا اور مرد لہجے میں بولا۔ ”آئی وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے؟“

”مسٹر ہارلے۔“ ایملی بولی۔ ”یہ کدو کے سروالا ایک ماورائی کردار ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے آتا ہے جن پر نشان لگا یا جائے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں آیا ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ جیف نے آہستہ سے کہا۔ ”اب یہ مر چکا ہے۔“

”یہ نہیں مر رہا ہے۔“ ایملی بولی۔ ”یہ زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس کا مشن پورا نہیں ہو جاتا یا اس کا مسٹر نہیں مر جاتا۔“

جیف چونکا۔ اسے خیال آیا کہ کیا اس عفریت کا ماسٹر وہ تھا؟ اس نے ایملی سے کہا۔ ”لگتا ہے تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ اس کا ماسٹر کون ہو سکتا ہے؟“

”وہ جس کا خون اسے زندگی بخشتا ہے۔“ ایملی بولی۔

اس دوران میں میک عفریت کے پاس چلا گیا تھا۔ زک نے اس سے کہا۔

”آگے مت جاؤ۔“

”میک! او! پس آؤ۔“ ایملی بولی۔ ”یہ مر نہیں ہے۔“

میک نے رائفل کی نال کا رخ عفریت کے بڑے سے سر کی طرف کر کے گولی چلا دی اور ان کی طرف دیکھا۔ ”اب یہ مر چکا ہے۔“

مگر اسی لمحے عفریت نے اس کی ٹانگ پکڑ کر جھکا دیا تو وہ الٹ کر گر اور اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا عفریت نے اٹھے ہوئے اس سے رائفل چھین لی۔ زک اور ایملی چلا رہے تھے۔ جیف نے دوبارہ شاٹ گن عفریت کی طرف سیدھی کی تھی کہ اسے جھٹکا سا لگا اور ماحول اس کی آنکھوں کے سامنے ڈولنے لگا۔ عفریت نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے رائفل میک کے سینے کی طرف کی لیکن گولی چلانے کے بجائے اچانک رائفل کی نال بہت قوت سے اس کے سینے میں اتار دی اور پھر اسے نال میں پرو کر اوپر اٹھا لیا۔ زک چلا یا اور میک کی طرف جانے کی کوشش کی مگر ایملی اس سے چھٹ گئی تھی۔ وہ چلا چلا کر اس سے وہاں سے بھاگ جانے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت دم توڑتے میک کو اوپر کے ہوئے اپنی مخصوص شیطانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ جیف چلا کر گرا تو عفریت نے میک کو رائفل سمیت ایک طرف پھینک دیا۔

ایملی اور زک ایک طرف بھاگ نکلے تھے۔ وہ درختوں کے درمیان اندھا دھند دوڑ رہے تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ایملی کے منہ سے سسکیاں نکلتی رہی تھیں اور زک بھی بھائی کا سوگ منا رہا تھا مگر وہ زک نہیں دیکھتے تھے۔ موت ان کے پیچھے تھی اور انہیں ہر صورت عفریت سے دور جانا تھا۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ شاٹ گن کی مہلک گولیاں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔ ایسے میں اس کے سامنے رکنا حماقت اور خودکشی ہی ہوتی۔ اچانک انہیں کچھ دور روشنیاں نظر آئیں۔ ایملی نے کہا۔ ”وہ..... اس طرف آبادی ہے۔“

وہ بھاگتے ہوئے اس قبضے تک پہنچے جو تہ ڈھلان پر آباد تھا۔ یہاں مکان قدیم طرز کے تھے اور خامے خستہ حال تھے۔ گاڑیاں بھی پرانی کھڑی تھیں۔ ایملی نے راستے میں آنے والا پہلا دروازہ بجایا اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ مگر اندر سے کوئی جواب ملنے کے بجائے مکان کی روشنیاں بھی بند ہو گئیں۔ زک اور ایملی دوسرے مکانوں کی طرف بڑھے۔ وہ باری باری دروازے بجا رہے تھے اور اپنے اوپر گزرنے والی روادوستاے ہوئے پناہ مانگ رہے تھے مگر کسی مکان سے نہ تو کوئی نکلا اور نہ ہی کسی نے جواب دیا۔ وہ رابرٹ کے مکان کے سامنے پہنچے تو اندر پیچھے کے کمرے میں موجود بریڈ نے اپنی بہن ماریا سے کہا۔ ”میں انہیں جانتا ہوں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں ہارلے کے اسٹور پر ملے تھے۔“

”ان کے پیچھے کون ہے؟“
 بریڈ نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”کدو کے سروال۔“
 ماریا بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ بریڈ نے اسے
 نہیں بتایا کہ اسی نے چیف کی میگاٹ کے ٹھکانے تک
 راہنمائی کی تھی اور اس کے بدلے رقم لی تھی۔ اب وہ بچپتار ہا
 تھا اور پھر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے گا۔
 اس نے اپنا اور آل اور جوتے پہنے۔ ماریا بے چین ہو
 گئی۔ ”تم کہاں جا رہے ہو؟“
 ”باہر لیکن تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔“ اس نے کہا اور
 چھوٹی سی کھڑکی کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ محوم کر مکان کے
 سامنے والے حصے میں آیا اور ہلکی سی آواز نکال کر رک اور
 ابھلی کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اسے دیکھا تو لپک کر آئے۔
 رک نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔
 ”یہاں کیسے لگتی لوگ رہتے ہیں جو کسی کی مدد بھی نہیں
 کر سکتے۔“
 ”کوئی اس وقت باہر نہیں نکلے گا۔“ بریڈ نے
 کہا۔ ”لیکن میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔“
 ”کوئی کیوں ہماری مدد کے لیے باہر نہیں آ رہا؟“
 ”کیونکہ وہ سب بڑے سروالے سے ڈرتے
 ہیں۔“ بریڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جو اس کے اور اس کے
 شکار کے درمیان میں آتا ہے، وہ اسے بھی ختم کر دیتا ہے۔
 جو اپنے گھر میں رہتا ہے وہ اسے کچھ نہیں کہتا۔ اس لیے کوئی
 اس وقت باہر نہیں آئے گا۔“
 ”تب تم کیوں آئے ہو؟“
 ”شاید میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔“ اس نے کہا اور
 مڑ گیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“
 ”لیکن کہاں؟“
 ”تم دیکھ لو گے، وقت کم ہے جلدی آؤ۔“
 ”اس کے پیچھے چلو۔“ ابھلی نے کہا تو رک مجبور ہو
 گیا۔ وہ اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ بریڈ بھاگتے ہوئے
 آگے جا رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ قصبے سے نکل کر اوپری جنگل
 کی طرف آیا۔ وہ دونوں ٹکڑے ہو گئے۔ رک نے کہا۔
 ”یہ کہاں لے جا رہا ہے؟ کہیں ہمیں پھنسانہ دے۔“
 اسی لمحے انہیں لکڑی کا بنا ہوا غیر آباد ہو جانے والا
 چرچ دکھائی دیا۔ اس کی دیواروں اور چھت کی بیشتر لکڑی گر
 گئی تھی اور چاروں طرف خلا تھے۔ سامنے کا دروازہ سرے
 سے قاصر تھا۔ بریڈ اس کے دروازے پر رکا اور مڑ کر
 بولا۔ ”آؤ، جلدی آؤ۔“

وہ اس کے پاس آ کر ہانپتے ہوئے بولے۔
 ”تمہارے خیال میں یہ محفوظ جگہ ہے؟“
 ”ہاں، وہ یہاں نہیں آسکتا۔“ بریڈ نے یقین سے کہا
 اور چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ رک کو ہرگز یقین نہیں تھا کہ
 یہ کھنڈر جو انہیں ہوا بارش اور سردی سے نہیں بچا سکتا تھا، وہ
 اس خون آشام عفریت سے بچائے گا۔ مگر ان کے پاس بریڈ
 پر اعتماد کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اندر آئے اور ایک
 سلامت بیچ پر بندھ گئے۔ ابھلی نے پوچھا۔
 ”یہ کیا چکر ہے؟ وہ ہمارے پیچھے کیوں ہے؟“
 ”تم لوگ نشان زدہ ہو۔“ بریڈ بولا۔
 ”نشان زدہ کیا مطلب؟“
 ”میں نہیں جانتا لیکن سنا ہے کہ میگاٹ جن لوگوں
 کے لیے بڑے سروالے کو زندہ کرتی ہے، وہ نشان زدہ
 ہوتے ہیں۔ وہ ان سب کو ختم کر دیتا ہے۔“
 ”میگاٹ کون ہے؟“
 ”ایک بوڑھی عورت ہے جس کو سو سال سے اوپر
 ہو گئے پر زندہ ہے۔“ بریڈ نے اکتشاف کیا۔ ”بڑے سروالے
 اصل میں اس کا بیٹا ہے۔“
 ”ابھلی چونکی۔ ”کیا مطلب... وہ کچھ عجیب کا انسان ہے؟“
 ”تھا۔“ بریڈ نے کہا۔ ”میں نے اسے کئی سال پہلے
 بات ہے۔ میگاٹ کا شوہر یورپ جنگ لڑنے گیا تھا، تب
 اس کے ہاں بڑے سروالے عجیب اقلقت بیچے کی پیدائش
 ہوئی۔ مقامی لوگوں نے اسے کدو کے سروالے قرار دیا
 انہوں نے میگاٹ سے مطالبہ کیا کہ وہ قصبہ چھوڑ کر چلی
 جائے۔ وہ بیچے کو لے کر دلہل کے علاقے میں چلی گئی
 اس پر بھی لوگوں کو چین نہیں آیا۔ تب ایک دن انہوں نے
 رات کو اس کے جھونپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی۔
 اتفاق سے میگاٹ بیمار بیچے کی دوا لینے پاس موجود ایک
 انڈین ویج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ وہ واپس آئی تو جھونپڑا
 اور اس میں موجود اس کا بیٹا جل چکا تھا۔ میگاٹ نے بیچے کو
 وہیں کہیں دفن کر دیا اور اس کے بعد وہ انڈین ڈاکٹر سے
 جا دو گری سیکھنے لگی۔ جب اس کا شوہر جنگ سے واپس آیا
 اور اسے پتا چلا کہ اس کے خاندان پر کیا گزری ہے تو وہ
 پاگل ہو گیا اور اس نے ان لوگوں کو مارنے کی کوشش کی
 جنہوں نے اس کے گھر پر حملہ کر کے اسے جلا دیا تھا۔ قاتلوں
 کو مارنے کی کوشش میں میگاٹ کا شوہر اپنی جان سے گیا اور
 اس کا قاتل وہاں سے بھاگ گیا۔
 ”پھر ایک طوفانی رات بولڈ ماؤنٹین کے لوگوں نے

بڑے سروالے کو دیکھا۔ وہ جن جن کران لوگوں کو مار رہا تھا
 جنہوں نے میگاٹ کے جھونپڑے پر حملہ کر کے اسے آگ
 لگا دی تھی۔ اس رات بولڈ ماؤنٹین میں بارہ افراد مارے گئے
 تھے۔ مگر مقامی لوگوں نے کسی ایک کی بھی پولیس رپورٹ
 نہیں کرائی اور ان کو خاموشی سے دفن دیا گیا۔ پھر برسوں گزر
 گئے اور کدو کے سروالے کا نام سننے میں نہیں آیا۔ میگاٹ
 کے شوہر کا قاتل جو یہاں سے بھاگ گیا تھا، وہ برسوں بعد
 آیا۔ اس نے شادی کر لی تھی اور اس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے
 آنے کے کچھ عرصے بعد لوگوں نے پھر بڑے سروالے کو
 دیکھا اور اس نے قاتل کو مار دیا۔ البتہ اس کا بیٹا اور بیوی
 علاقے سے باہر ہونے کی وجہ سے بچ گئے۔ پھر قاتل کا بیٹا
 سام واپس آیا اور یہاں رہنے لگا مگر جب وہ چالیس سال کا
 تھا، تب اس نے میگاٹ کو مارنے کی کوشش کی۔ وہ اسے
 اپنے باپ کا قاتل سمجھتا تھا۔ سام ناکام رہا اور پھر بڑے سر
 والا آیا اور اس نے سام کو مار دیا۔ اس بات کو اٹھائیس برس
 گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ اب آیا ہے۔“
 ”مگر کیوں؟ وہ ہمارا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟ ہم نے
 کیا کیا ہے؟“ رک بولا۔ ”اس نے میک، مارش، فیرو اور
 دون کو مار دیا۔ ہمارے سامنے انہیں لے گیا اور پھر نکل کر
 دیا۔ اس پر توئی اور نہیں آ رہا۔“
 ”ابھلی نے رک کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے میں
 سمجھتی ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟“
 ”رک نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اسے بھی اس
 ”مضموم بیچے کا خیال آیا۔ اس نے بے یقینی سے کہا۔ ”لیکن
 وہ صرف حادثہ تھا۔“
 ”ہاں لیکن اس شخص کا سوچو جس کی کُل کائنات یہی
 ایک بیچہ تھا۔“ ابھلی بولی۔ ”آخر اسے کیسے پتا چلا کہ ہمارے
 ساتھ کیا گز رہی ہے اور وہ مدد کے لیے آ گیا تھا۔“
 ”اگر یہ اس نے کیا ہے تو وہ مدد کے لیے کیوں آیا؟“
 ”شاید وہ بچپتار ہا ہے۔“ ابھلی بولی۔ اسی لمحے بادل
 زور سے گرجے اور آسمان روشن ہو گیا۔ تب انہوں نے
 دیکھا کہ عفریت چرچ کے سامنے کھڑا ہے۔



چیف پر مشکل چل رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس
 کے جسم میں کوئی چیز ہے جو رہ کر اسے اندر سے ٹیس کر رہی
 ہے۔ تکلیف اور سر پھرانے کی وجہ سے اس کے لیے چلنا
 محال ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پک اب نہیں لی تھی۔ وہ پیدل
 ہی دلہل کے درمیانی راستوں سے گزر رہا تھا۔ درحقیقت

بولڈ ماؤنٹین کا سارا علاقہ پاس پاس ہی ہے، صرف گاڑی
 سے سفر کے لیے طویل راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے کیونکہ
 دلہل میں ہر جگہ گاڑی گزرنے کا راستہ نہیں بن
 سکتا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا اور اگر بجلی رہ رہ کر نہ
 چمک رہی ہوتی تو اسے راستہ نظر نہ آتا۔ اس کا رخ دلہل
 کے اوپری حصے کی طرف تھا۔ بالآخر وہ میگاٹ کے
 جھونپڑے تک پہنچ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر کی
 طرف گیا۔ اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ میگاٹ بدستور اپنی
 کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے دیکھے بغیر پوچھا۔
 ”اب کیوں آئے ہو؟“
 ”میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔“ چیف نے اپنا
 پیٹ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اسے روکو۔“
 ”اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔“ میگاٹ نے
 جواب دیا۔ ”جب وہ ایک بار زندہ ہو جائے تو اپنا کام مکمل
 کرنے تک نہ مرتا ہے، نہ واپس جاتا ہے۔“
 ”میں کیا کروں؟“
 ”تم گھر جاؤ اور آرام کرو۔“
 چیف نے شاٹ گن کا رخ میگاٹ کے سر کی طرف کر
 دیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ”اس کا کوئی قاعدہ
 نہیں ہے۔“ اچانک میگاٹ نے کہا۔ ”تم مجھے مار سکتے ہو
 لیکن اسے نہیں روک سکتے۔“
 چیف نے گہری سانس لی اور شاٹ گن شانے پر
 لٹکاتے ہوئے جھونپڑے سے نکل گیا۔ اس کا رخ اب اپنے
 گھر کی طرف تھا۔ اس بار بھی وہ دلہل کے درمیان موجود
 شارٹ کٹ راستوں سے گزر رہا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد
 وہ اپنے گھر کے سامنے تھا۔ کسی زمانے میں یہاں اس کے
 باپ کا قلم ہوتا تھا مگر پھر دلہل نے زمین خراب کر دی اور
 اسے قلم ختم کرنا پڑا تھا۔ اس نے ہائی وے پر گھر دوسری
 اسٹور کھول لیا۔ اس کے بعد چیف یہ اسٹور چلانے لگا تھا مگر
 اس کے بعد اسے چلانے والا کوئی نہیں تھا۔ شاید اسے بھی
 اب چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ باپ کے لیے ہی تو
 سب کرتا تھا۔ چیف گھر کے بجائے اصطبل کی طرف بڑھا۔
 اب اصطبل کی جگہ چیف کی ورکشاپ تھی جہاں وہ مختلف کام
 کرتا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا اور ایک کونے میں رکھے
 فائر سیلنڈر کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی مدد سے اپنے گھر اور
 قلم کے آس پاس آگ آنے والی قاتلوں جھاڑیاں جلا دیتا
 تھا۔ ڈبل سیلنڈر اٹھا کر اس نے چیک کیا۔ آئینہ والا
 سیلنڈر خالی تھا۔ وہ اس کے نٹ بولٹ کھولنے لگا۔ اس کی جگہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہائرس کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈ قمری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویڈیو متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

EBP-02-14



قدم رکھا، وہ تینوں دوسری سمت سے نکل بھاگے۔ رک آگے تھا اور وہ ایسلی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ بریڈ ان کے پیچھے تھا۔ وہ اب نیچے کی طرف جارہے تھے۔ تیز ہوا کی وجہ سے مٹی اڑ رہی تھی اور انہیں آنکھیں کھولے رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا مگر وہ نہ تو رک سکتے تھے اور نہ آنکھیں بند کر سکتے تھے۔ اس لیے تکلیف برداشت کرتے اور گرتے پڑتے بھاگے جارہے تھے۔ جیسے جیسے وہ نیچے آ رہے تھے، دلہلی زمین کم ہوتی جا رہی تھی اور درختوں کے بجائے خشک صحرائی جھاڑیاں زیادہ نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں لاکڑ کا درخت بھی لگے ہوئے تھے۔ ایسلی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ہمیں کسی سڑک تک یا ایسی جگہ پہنچنا چاہیے جہاں سے ہم پولیس کو کال کر سکیں۔“ رک نے جواب دیا اور مڑ کر دیکھا۔ بریڈ ان سے کچھ دور تھا۔ کیونکہ عفریت نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے انہوں نے رفتار ڈرام کر لی۔ ورنہ اس سے پہلے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ بریڈ ان کے پاس آ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”رک، سائٹ بھاگتے رہو۔ ان سے بچنا اور نکل سکتے ہو نکل جاؤ۔“

”مگر کیسے؟ ہم مسلسل نہیں بھاگ سکتے اور یہاں کوئی گاڑی نہیں ہے۔“

”وہ رہی گاڑی۔“ بریڈ نے دور سڑک پر کھڑے چیف کے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس کی طرف بھاگے۔ ان کا خیال تھا کہ چیف بھی ٹرک میں ہوگا مگر ٹرک خالی تھا۔ وہ تینوں ٹرک کے کبین میں گھسے۔ انیشن میں چابی نہیں تھی۔ انہوں نے تلاشی لی تو ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک اضافی چابی نکل آئی۔ رک نے جلدی سے اسے انیشن میں لگایا اور گھبرا کر انجن اشارت کیا تھا کہ اس کی طرف کا شیشہ ٹوٹا اور عفریت کا ہاتھ اندر آیا۔ اس نے رک کا سر پکڑا اور اسے کسی کھلونے کی طرح باہر کھینچ لیا۔ ایسلی چلانے لگی۔ وہ دوسری طرف سے اترنے لگی مگر بریڈ نے اسے پکڑ لیا۔

”نہیں، وہ اسے لے گیا ہے۔ تم بھی ماری جاؤ گی۔ ٹرک اشارت ہے۔ یہاں سے نکلو۔“

ایسلی کی حالت بری تھی مگر بریڈ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ انہیں یہاں سے نکلنا تھا۔ وہ رک کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ

اسے دوسرا سیٹار لگانا تھا۔ اچانک اس کا سر ڈولنے لگا اور آنکھوں کے آگے ماحول سرخ سا ہو گیا۔

☆☆☆

بوڑھی میگاٹ آنکھیں بند کیے زیر لب کہہ رہی تھی۔

”میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔ تم ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لو گے۔ بس دو شکار اور ہیں۔ اس کے بعد تمہیں پھر کوئی نہیں مار سکے گا اور اس علاقے پر تمہاری حکومت ہوگی۔ یہاں کا ہر شخص تمہارا غلام ہوگا۔“

یہ کہہ کر میگاٹ کچھ پڑھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر عفریت کی راہنمائی کر رہی ہے۔

☆☆☆

ایسلی کی چیخ نکل گئی۔ وہ ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا تھا۔ اس نے رک سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

رک اس سے متفق تھا۔ اس نے بریڈ سے کہا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ یہ یہاں تک نہیں آسکے گا مگر یہ آ گیا ہے۔“

”یہ شاید اندر نہ آسکے۔“ بریڈ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر۔ ”میں خود اس کے بارے میں نہیں جانتا، صرف دوسروں سے سنا ہے۔“

عفریت چرچ کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے عقب میں مسلسل بجلی چمکنے سے ماحول نیلگوں روشنی میں نہایا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسلی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اشارہ کیا۔ ”اس کا چہرہ دیکھو، پہلے یہ درندوں جیسا تھا مگر اب اس پر انسانوں جیسے نقوش آگئے ہیں۔“

رک نے غور کیا تو واقعی اس کا چہرہ اب انسانوں جیسا ہو رہا تھا۔ اسے اس کے نقوش جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ اچانک وہ بولا۔ ”میرے خدا! اس کا چہرہ تو مسٹر ہارلے جیسا ہو رہا ہے۔“

”تب یقیناً اسے چیف ہارلے کے خون سے زندہ کیا گیا ہے۔“ بریڈ بولا۔ ”وہی اس کا ماسٹر ہے۔“

”یعنی وہ اسے قابو کر رہا ہے۔“

”نہیں، ماسٹر سے مراد یہ ہے کہ اس کی زندگی چیف کی وجہ سے ہے۔ جب تک چیف زندہ ہے، وہ بھی زندہ رہے گا اور چیف مر جائے گا تو وہ بھی مر جائے گا۔“ بریڈ نے کہا۔

”وہ آ رہا ہے۔“ رک چلا یا کیونکہ عفریت آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلے وہ چمکیا رہا تھا مگر اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جیسے ہی اس نے چرچ کی حد میں

سنجالی اور گیزرنگ کرٹک آگے بڑھا دیا۔ بریڈ مڑ کر دیکھ رہا تھا اور اس نے دیکھا کہ عفریت رک کو سر سے پکڑ کر کھینچتا ہوا ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "جلدی کرو، وہ پیچھے آ رہا ہے۔"

یہ راستہ جیف کے قارم کی طرف جا رہا تھا اور چند منٹ بعد وہ قارم تک پہنچ گئے۔ بریڈ نے اہلی کو بتایا۔ "یہ جیف کا قارم ہے۔"

"شاید وہ ہمیں ہے۔" اہلی نے ٹرک روک دیا۔ "وہی اس عفریت کو زندہ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اب جیف کو ہی اسے روکنا ہوگا۔"

وہ دونوں نیچے آئے اور پھر اصطبل کا کھلا دروازہ دیکھ کر آگے بڑھے۔ اندر معمولی سی روشنی تھی اور کہیں کہیں اندھیرا تھا۔ بریڈ نے آواز دی۔ "مسٹر ہارلے..... کیا تم یہاں ہو؟"

مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اہلی آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ جیف ایک کونے میں کھڑا ہوا کچھ کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "جیف....."

"تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔" جیف مڑے بغیر بولا۔ وہ آواز اسی طرح دے رہا تھا۔ اس کی آواز عجیب سی ہو رہی تھی۔

"ہم کہاں جائیں؟ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔" اہلی بولی۔ "وہ ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔ اس نے رک کو بھی پکڑ لیا ہے۔"

جیف اس کی طرف مڑا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

"صرف تمہارے افسوس سے کام نہیں چلے گا۔" اہلی نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم نے اسے زندہ کیا ہے اور اب تم ہی اسے مار سکتے ہو۔"

"میں اسی کی تیاری کر رہا ہوں۔" جیف نے سیلنڈر کا آخری نٹ بھی لگا لیا اور اس کا نوزل پائپ اٹھا کر اسے تیلی سے آگ دکھائی۔ فوراً ہی سرسراتا ہوا تیز شعلہ نوزل سے نکلنے لگا۔ "میں اسے جلا کر ختم کر دوں گا۔"

"شاید آگ اسے ختم کر دے۔" اہلی بولی۔ "اس کی اصل موت بھی جلنے سے واقع ہوئی تھی۔"

جیف نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے بریڈ نے بتایا ہے۔" اہلی نے کہا اور مڑ کر دیکھا۔ "وہ میرے ساتھ ہے۔"

مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ بریڈ شاید بھاگ نکلا۔

تھا۔ باہر اب بجلی بہت تیزی سے چمکنے لگی تھی۔ جیف نے باہر کی طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ آ گیا ہے۔"

اس نے سیلنڈر اٹھا کر شانے پر ٹانگا اور باہر کی طرف بڑھا تھا کہ اچانک اسے چکر آنا شروع ہو گئے اور وہ خود کو گرنے سے بچانے کے لیے میز کا سہارا لے کر اس پر جھک گیا۔

بریڈ نے عفریت کو آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاموشی سے اصطبل سے نکلا اور اس کے برابر میں موجود اسٹور روم میں گھس گیا۔ عفریت نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ زخمی اور نیم بے ہوش تھا۔ اسٹور کا دروازہ بجا تو عفریت نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اسٹور کی طرف بڑھا۔ بریڈ اندر گھس کر ایک الماری میں چھپ گیا۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ کوئی آواز نہ نکلے۔ اسٹور کا دروازہ آواز سے کھلا اور الماری کے دروازے کے رشتوں سے بریڈ نے عفریت کا بڑا سا سرا اندر آتے دیکھا۔ اس پر انسانی خدو خال بہت نمایاں ہو گئے تھے اور یہ تقریباً جیف جیسے تھے۔ فرق صرف سگری سٹی سرخ کھال اور سائز کا تھا۔ اس کا سر کسی بھی انسانی سر سے دو گنا بڑا تھا۔ اس کی آنکھیں گہرے سیاہ یا سیاہ جیسی تھیں۔ عفریت نے اندر کا جائزہ لیا اور کہا۔ اچانک باہر سے اہلی کے چلانے کی آواز آئی تو عفریت نے سر جھکا کر دیکھا۔ اہلی نے رک کو دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف بھاگ رہی تھی۔ عفریت غرایا اور اس نے اچانک الماری کا دروازہ کھول کر بریڈ کو باہر کھینچ لیا۔ وہ خوف سے چیخ اٹھا مگر عفریت نے اسے کچھ کہا نہیں۔ صرف کھینچتا ہوا باہر لایا اور میدان کی طرف پھینک دیا۔ اہلی نیم بے ہوش رک کو اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بریڈ اٹھ کر ایک طرف بھاگا مگر عفریت نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اہلی اور رک کی طرف بڑھا۔ اہلی چلا رہی تھی اور رک سے ہوش میں آنے کو کہہ رہی تھی۔ عفریت کو نزدیک آتے دیکھ کر اہلی نے رک کو چھوڑ دیا۔ وہ پیچھے گرا۔ عفریت نے اسے سر سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ اہلی اصطبل کی طرف بھاگی جہاں جیف ابھی تک میز پر جھکا ہوا تھا۔ اہلی نے چلا کر کہا۔ "خدا کے لیے وہ رک کو مار دے گا۔"

مگر جیف میز پر جھکا ہوا عجیب سی آواز میں نکال رہا تھا۔ اہلی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھی۔ "جیف! تم سن رہے ہو؟"

"ہاں۔" جیف نے عجیب سی آواز میں کہا اور اچانک سمجھا تو اہلی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ جیف کی آنکھیں بالکل عفریت جیسی ہو رہی تھیں اور چہرے کے تاثرات حیوانی تھے۔ "اب بس تم بیٹی ہو۔"

اہلی باہر کی طرف بھاگی۔ جیف اس کے پیچھے نکل آیا تھا۔ اس نے سیلنڈر اٹھا کر کھاتا ہوا عفریت کی طرف بڑھا مگر وہ عفریت کے لیے نہیں جا رہا تھا۔ اس نے نوزل کا شعلہ تیز کیا اور آگے بڑھا تھا کہ اس کا ہاتھ وہاں دستے کے بل زمین میں گڑے کانٹے سے ٹکرایا اور کانٹا اس کی کلائی میں گھس گیا۔۔۔۔۔ یہ گندم اور ریشے الگ کرنے کے کام آتا تھا۔ جیسے ہی کانٹا جیف کی کلائی میں گھسا، عفریت نے دھاڑ ماری اور اپنا ہاتھ دیکھا۔ اسی ہاتھ سے اس نے رک کا سر تھاما ہوا تھا۔ اس سے سر چھوٹا تو رک نیچے گرا اور رینگ کر اس سے دور جانے لگا۔ جیف کو درد کا احساس ہوا تو اس نے اپنی کلائی دیکھی اور پھر اسے آزاد کرانے کے لیے کوشش کرنے لگا۔ جیسے جیسے وہ بازو ہلا رہا تھا، عفریت کا بازو بھی ویسے ہی مل رہا تھا۔ کوشش میں ناکامی کے بعد جیف نے سیلنڈر اتار پھینکا اور پھر دوسرے ہاتھ سے زور لگا کر اپنا پھنسا ہوا ہاتھ کانٹے سے نکال لیا۔

اہلی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوڑ کر سیلنڈر اٹھا لیا اور شعلے کا رخ عفریت کی جانب کر دیا۔ جب اب اہلی کے پاس آ رہا تھا۔ شعلے اس سے ٹکرائے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جیف ہاتھ تھام کر لڑکھڑاتا ہوا اصطبل کی طرف چلا گیا۔ اہلی پیچھے ہوتے ہوئے عفریت پر شعلے پر سارا ہی مٹی اور یہ آگ اس کا کچھ بگاڑنے سے بچا رہی تھی۔ اس کی صورت بالکل جیف جیسی ہو گئی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ مارا اور اہلی کے ہاتھ سے پائپ نکل گیا۔ اس نے گردن سے دیوچ کر اہلی کو آگے کیا اور اس کے شانے سے سیلنڈر اتار لیا۔ پھر اس نے پائپ اٹھا یا جس سے بدستور شعلہ نکل رہا تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اہلی کو دیکھا تو وہ اس کے ہاتھ بھانپ کر لڑا تھی۔

جیف لڑکھڑاتا اور کراہتا ہوا اندر آیا۔ اس نے آوازوں والی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا چھوٹا سا ریو اور نکال لیا۔ اس نے باہر کی طرف دیکھا اور ریو اور سر سے لگا کر فائر کر دیا۔ فائر کی آواز باہر تک آئی اور عفریت جس نے اہلی کا گلا دیوچا ہوا تھا اور شعلہ اس کے چہرے کی طرف لا رہا تھا، اس نے عجیب سی آواز نکالی اور نیچے گر

کر سکت ہو گیا۔ اہلی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور اپنی سانس بحال کرنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ عفریت اچانک کیوں گرا اور اندر سے فائر کس نے کیا تھا۔ گولی عفریت کو نہیں لگی تھی اور لگتی بھی تو بیکار تھی کیونکہ اس پر گولی کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی اثنا میں اندر سے جیف لڑکھڑاتے قدموں سے باہر آیا اور اہلی کے سامنے زمین پر بالکل اسی انداز میں ڈھیر ہو گیا جیسے عفریت گرا ہوا تھا۔ اہلی نے دیکھا اس کا چہرہ بھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ اس کی کپٹی میں گولی کا سوراخ تھا مگر وہ ابھی زندہ تھا۔

اب اہلی کی سمجھ میں آیا کہ عفریت کیوں گرا تھا۔ یہ بات درست ثابت ہو رہی تھی کہ وہ اپنے ماسٹر کی موت تک زندہ رہتا تھا اور اب اس کا ماسٹر مرنے والا تھا اس لیے وہ بھی مر رہا تھا۔ اہلی نے ہمت کر کے اس کے ہاتھ سے ریو اور نکال لیا اور اس کا رخ جیف کی طرف کر دیا۔ وہ ہمت کر رہی تھی کہ اس پر گولی چلائے۔ اچانک جیف نے حرکت کی۔ اس نے سر اٹھا کر اہلی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اسے مار دو۔"

جیف کا ہاتھ عفریت کی طرف اٹھا ہوا تھا مگر جب عفریت اچانک اٹھا تو اہلی کی سمجھ میں آیا۔ جیف عفریت سے کہہ رہا تھا کہ اسے مارو۔ عفریت اس کی طرف بڑھا تھا کہ اہلی نے جیف پر فائر کیا اور پھر جنونی ہو کر اس وقت تک فائر کرتی رہی جب تک ریو اور خالی نہیں ہو گیا۔ اس بار جیف یقینی موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ وہ گر کر سکت ہو گیا اور عفریت بھی اسی کی طرح گر کر سکت ہو گیا۔ اہلی نے دوڑ کر رک کو اٹھا لیا۔ وہ زخمی تھا مگر اس کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی۔ بریڈ بھی آ گیا۔ اہلی رک کے زخم دیکھ رہی تھی کہ جھک کر آواز کے ساتھ عفریت کی لاش سے شعلے اٹھنے لگے اور چند منٹ بعد شعلے بجھے تو لاش کی جگہ ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ اہلی اور بریڈ نے سہارا دے کر رک کو ٹرک میں سوار کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد درختوں سے میگاٹ نمودار ہوئی۔ اس نے عفریت کی لاش دیکھی اور بولی۔

"مجھے معاف کرنا میرے بچے لیکن میں تمہیں زندہ کرنے سے پہلے نہیں مروں گی۔"

میگاٹ نے عفریت کی سکر جانے والی لاش اٹھالی اور کچھ دیر بعد وہ اسے اسی بڑے تنے والے درخت میں دفن کر رہی تھی۔

سودائے جنوں

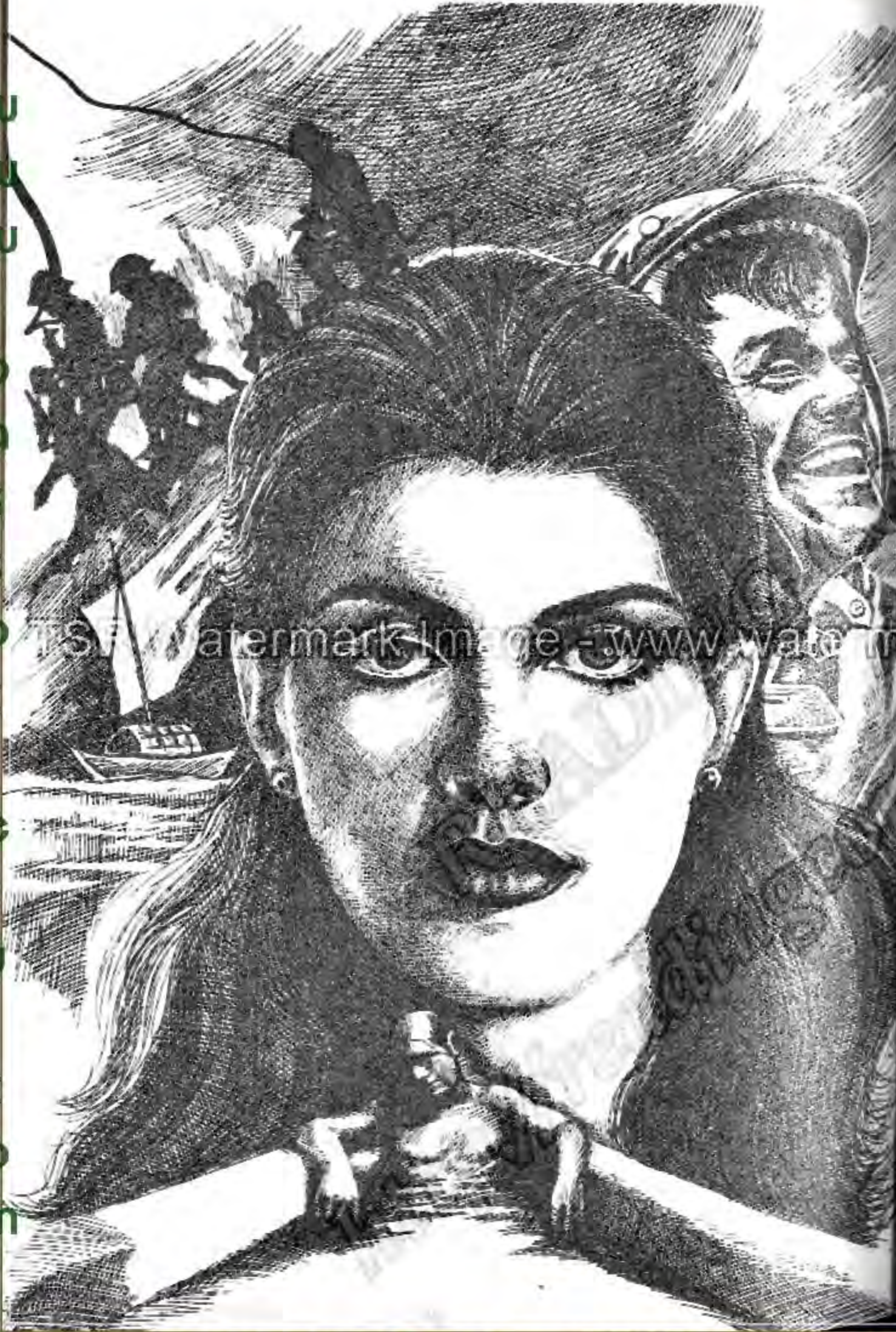
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصہ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروف عمل ہیں۔ اس رپے کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور پروردگار موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظر نامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالم اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارض مقدس میں صیہونی یلغار ان کی چہرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذر آتش کر کے پیکل سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادر اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی جنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی بولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر

درمیانہ



”کیا مطلب..... کیا اس میں ہمارا قصور ہے؟“ اس بار نامہ نے فیجر رمضان کی طرف دیکھتے ہوئے ترقی سے کہا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ فیجر خود اسرائیلی خفیہ اہلی جنس موساد کا ہی جاسوس تھا، ابھی ان کے درمیان یہ بحث ہو رہی تھی کہ ایک ٹھکانے قد کا مگر چوڑے اور مضبوط شانے والا شخص چار اسرائیلی پولیس اہلکاروں کے ساتھ وہاں آن پہنچا۔ یہ اسرائیلی پولیس چیف تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کھنڈی ہوئی تھی اور چندی چندی آنکھوں میں مکاری دکھائی دے رہی تھی۔ جب نامہ اور عابد نے بھی اس سے بحث میں الجھنا چاہا تو اس نے مہمیر اور کرخ آواز میں ان سے فقط اتنا کہا۔

”ہم آپ کو مجرم کی حیثیت سے ہتھیاریاں ڈال کر نہیں لے جا رہے ہیں..... ضابطے کی ایک معمولی کارروائی کے بعد آپ کو اسی طرح باعزت طریقے سے یہاں دوبارہ چھوڑ دیا جائے گا۔“

ناچار دونوں کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس دوران جب عابد اور نامہ پولیس چیف کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے، فیجر رمضان نے معنی خیز نظروں سے اسرائیلی پولیس چیف کی طرف دیکھا۔ پولیس چیف کے بدہیت ہونٹوں پہ بڑی خمیہ مسکراہٹ تھی۔

رمضان پلٹاؤ فرما رہا۔ اپنے کمرے میں آ کر ایک نظریہ فرما کر سسٹم پر..... موساد کے کسی ذمہ دار اہلکار سے رابطہ کر کے اسے نامہ اور عابد سے متعلق تازہ ترین رپورٹ دینے لگا۔ اس رپورٹ کے اختتام کے چند منٹوں بعد موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ فوراً حرکت میں آ گئے، ان میں دو ایجنٹ وہ بھی شامل تھے جنہوں نے قبرس میں سیماسول کی بندرگاہ میں دو جلاوطن فلسطینی آفیسروں احسن الزہرودی اور ابو جواد العزیز کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔

منصوبہ یہ تھا کہ یہ پانچوں اسرائیلی ٹاپ ایجنٹ فلسطینی حریت پسندوں کے ہمیں بھر کے پولیس کی اس جیب پر حملہ آور ہوں گے اور نامہ اور عابد کو ان کی کسٹڈی سے چھڑا کر... فی الفور موساد کے ہیڈ کوارٹر کا رخ کریں گے اور مشہور کر دیا جائے گا کہ یہ کارروائی حریت پسند تنظیم پی فرنٹ کے کمانڈوز کی تھی جبکہ اس ”ڈرامے“ کا پہلے سے ہی مذکورہ اسرائیلی پولیس چیف کو بھی پتا تھا اور محض ٹکرور ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے وہ ان کا جعلی مقابلہ بھی کریں گے۔ مقصد یہی تھا کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ نامہ اور عابد کو ایک سازش کے تحت درحقیقت موساد کی قید میں ڈالا گیا ہے۔ بہر طور دونوں اس کریہہ حقیقت سے بے خبر تھے، سفر اپنے

ہونے کے نصف گھنٹے بعد شمال جنوب کے ”ریڈ زون“ میں داخل ہو چکے تھے، جمال ٹرک ڈرائیو کر رہا تھا اور باقر اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ان کے جسموں پر ان دونوں جنم واصل اسرائیلی فوجیوں کی وردی تھی اور ایک بڑا امتحان ان کے سر پہ تھا۔ اب کسی بھی وقت وہ اس مورچا نما چوکی تک پہنچنے والے تھے، جسے ابو نصر نے ”پوائنٹ تھرنی“ کا نام دیا تھا۔

☆☆☆

سیماسول بندرگاہ کے قریب واقع ہوٹل پورٹ لینڈ کے گیٹ کے قریب جو بھاری گاڑیاں پینگی تھیں، وہ اسرائیلی پولیس کی تھیں..... خنصر کی پریشانی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے دونوں عرب مہمانوں نامہ اور عابد مشہور کتب ہاؤس کی انتظامیہ پولیس کسٹڈی میں ویسے کا فیصلہ کر چکی تھی اور خنصر جانتا تھا کہ ان کے دونوں مہمانوں کا نام اسرائیلی پولیس کے چھپنے تلے جانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اس لیے خنصر نے اپنے دونوں ساتھیوں سعید اور حارث کی مدد سے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ جیسے ہی پولیس نامہ اور عابد کو لے کر روانہ ہوگی، ان پر راستے ہی میں حملہ کر کے انہیں چھڑا لیا جائے گا۔ وہ اپنے اس منصوبے کی شگلی رپورٹ اپنے سینڈان کمانڈر خالد حسین کو دے چکا تھا۔

نامہ کی طبیعت اب تک کافی سنبھل چکی تھی، پوری طرح ہوٹل میں آنے کے بعد وہ خاصی ہراساں رہی پھر عابد مشہور کتب کو ساتھ دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی، مگر عابد خاصا پریشان اور متشکر نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ یہ معاملہ پولیس کا بن چکا تھا اور انہیں دائرہ تفتیش میں لانے کے لیے اسرائیلی پولیس کا سامنا کرنا پڑتا..... اور پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں کو ساتھ لے جانے کے لیے پولیس کی دو گاڑیاں آچکی ہیں تو عابد نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ ہوٹل کا فیجر رمضان اپنے چہرے پر پیشہ دارانہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے عابد سے بولا۔

”آپ دونوں ہمارے معزز مہمان ہیں لیکن سر! آپ کو قانون کے مطابق اس کارروائی سے تو گزرنا پڑے گا۔ آپ دیکھیں یہاں آپ دونوں ہی کی وجہ سے کس قدر ہنگامہ اور خون ریزی ہو چکی ہے۔“

”کرو.....“ برابر کی سیٹ پر بیٹھے اس کے ساتھی نے بھی یہ سب کچھ تقریباً دیکھ لیا تھا اور ابھی اس نے یہ سرعت اپنی گن سیدھی ہی کی تھی کہ سماعت شکن دھماکا ہوا۔ ٹرک کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ بدست ہاتھی کی طرح ڈولنے لگا۔ دونوں فوجی بری طرح بولکھلا گئے مگر جلد ہی اپنے حواسوں پر قابو پالیا اور ٹرک کو اٹلنے سے بچانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے بریک لگا دیے۔ گردوغبار کا عقب سے طوفانی گولا نمودار ہوا جس نے چند ثانیوں کے لیے دونوں کو اندھا کر دیا۔ اس اثنا میں ڈرائیو فوجی نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنا ہسٹول نکال لیا تھا۔ پھر دفعتاً ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ڈرائیو فوجی کی پچھلی پچھلی آنکھوں نے پہلے اپنے برابر میں بیٹھے اپنے ساتھی کا عبرت ناک انجام ہوتے دیکھا۔ اسے خاموش ہسٹول کی گولی سے کسی نے نشانہ بنایا اس کا بھیجا کھو پڑی سمیت حج گیا تھا۔ اس نے ہسٹول سیدھا کیا تو دوسری طرف سے باقر نے اپنے خاموش ریوالور کی گولی سے اس کی گردن پر فائر کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

فضا ایک لمحے کو یکدم ساکت ہوئی محسوس ہونے لگی، جیسے کوئی بڑا طوفان گزر گیا ہو..... یہ پانچوں ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔

”صورت حال خراب ہوتے ہوتے ہی ہے..... لیکن..... نائزیر سٹ ہونے کا دھماکا بھی کم نہیں تھا..... لیکن پانچویں ہوئی آواز میں کہا۔ باقریولا.....“

”عزیزم لیلی! یہ عمومی دھماکا سمجھا جا سکتا ہے۔ شکر ہے کہ گولی کی آواز نہیں ابھری۔“

”دور تک پھیلے تاریک ویرانے میں معمولی دھماکا بھی..... کسی قریبی اسرائیلی چوکی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”ہمیں جلد ہی اپنا کام نثانا ہوگا۔ جو ہوا کم سے کم ہی ہوا، مزید تاخیر..... منصوبے کے لیے نقصان دہ ہوگی۔“ الجاہد کے قاسم عمر نے بحث کو سمیٹنے کی غرض سے کہا اور پھر سب حرکت میں آ گئے، حسب توقع ٹرک میں فاضل نائزیر موجود تھا۔ لیلی اور باقر چاروں اطراف میں نظر رکھے ہوئے تھے، دو ساتھی نائزیر بدلنے میں مصروف ہو گئے جبکہ باقی دو نے اسرائیلی فوجیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھالیا۔

یہ سارے کام بہت کلیل وقت میں مشترکہ طور پر نثانے گئے اس کے بعد منصوبے کے مطابق جمال اور باقر نے اسرائیلی فوجیوں کی وردی پہن کر ٹرک کا ڈرائیو تک کھین سنبھال لیا، باقی چار ساتھی ٹرک کے عقبی حصے میں کھانے پینے کے اسباب کی آڑ تلے چائپچے۔ ڈرائیو میں ٹرک روانہ ہو گیا۔ یہ لوگ طے شدہ منصوبے ”ہلیک پوائنٹ“ سے روانہ

ان کی خوفزدہ نظروں نے دیکھا، ٹرک کی رفتار بجائے کم ہونے کے یکثرت تیز ہو گئی تھی۔ یہ ایک خطرناک سچویشن تھی، جوان کی توقع کے بالکل خلاف بھی تھی، اس طرح ان کے ساتھی کی جان خطرے میں تو تھی ہی، مگر ان کا یہ خفیہ مشن بھی متاثر ہو سکتا تھا جبکہ حالات کا تقاضا تھا کہ..... اس اہم مشن کو انتہائی رازداری کے ساتھ نثانایا جائے لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس ہو گئی تھی۔ اس اعصاب شکن خطرے کی طرف بڑھتی ہوئی صورت حال پر فوری طور پر قابو پانے کے لیے گروپ لی کمانڈوز کو ”لیڈ“ کرنے والی دلیر مجاہدہ..... لیلی آٹھدی نے ہل کے ہل میں ہی ایک جارحانہ فیصلہ کر لیا اور بجلی کی ہی سرعت کے ساتھ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی..... اور چلائی۔

”سائنلر ہسٹولوں سے نائزیر کا ایک نائزیر برست گزراؤ اور ڈرائیو تک کھین پر نوٹ پڑو۔“

ٹرک دھو دھراتا ہوا تیزی کے ساتھ سچ راستے پر لپٹے ان کے ساتھی کی طرف بڑھ رہا تھا، صورت حال کی سفاکی کا احساس اس وقت زیادہ ہوا جب ٹرک دھاڑتا ہوا اس کے عین سر پہ آن پہنچا۔ یہ صرف ایک ہل کے لیے ہوا اور دوسرے ہل سے اسے ہل لگا جیسے کسی نے اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر پوری قوت کے ساتھ راستے سے کھینچ لیا ہو اور دھاڑتے ہوئے ٹرک کے چوڑے موٹے نائزیر کے بالکل سر کے قریب سے گزرتے چلے گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ٹرک جیسے ایک طرف جھک کر زمیں بوس ہو گیا پھر نامہوار کچے راستے پر دور تک گھسٹا چلا گیا۔ گردوغبار کا دیو قامت مرفولہ اٹھا، لیلی کی ہدایت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے ٹرک کے ایک نائزیر کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹرک کے رکستے ہی ان سب نے بیک وقت ٹرک کے ڈرائیو تک کھین پر پلا بول دیا۔

اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کو رسد سپلائی کرنے والے ٹرک ڈرائیو ز بھی عام آدمی نہیں تھے، دونوں تربیت یافتہ فوجی ہی تھے، اول خطرے کو بھانپتے ہی انہوں نے ٹرک کی رفتار آہستہ کرنے کے بجائے مزید بڑھادی تھی، ساتھ ہی اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ساتھی کو گن الٹ ہونے کا بھی اشارہ کیا تھا، ابھی اس کا دوسرا ساتھی سنبھل ہی پایا تھا کہ ڈرائیو نے ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں کسی کو راستے پر رینگتے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا، اس نے لیلی کو بڑی پھرتی کے ساتھ راستے کے پیچھے سچ بھرتے اور پھر لپٹے ہوئے اپنے ساتھی کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دیکھا تو چلا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ ”فائر

الجمہاد کے ساتھیوں اور دو بی ایل ایس او کے محسن اور زہیر کے ساتھ تیونائی کی طرف گامزن ہو چکی تھی۔ تیونائی اپنی مخصوص جغرافیائی ساخت اور بناوٹ کے باعث پہاڑیوں اور گھنے جنگلات پر مشتمل تھا۔ اس کے وسط میں ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر تھا اور وہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آنرک فرناش اور اس کے نائب میجر ایبودشاہب کی پرورش رہائش گاہیں بھی تھیں۔ ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر ایک قلعہ نما عمارت پر مشتمل تھا۔ موساد کے ہیڈ کوارٹر کی طرح یہاں بھی ایک بڑا منظم فائلنگ کمپلکس سمجھنا موجود تھا۔ جہاں دنیا بھر کے ممالک کے اہم خفیہ رازوں پر مشتمل کاغذات ہم فائلوں کی صورت میں موجود تھے، جہاں سے ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی اڑانا ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا۔ یہاں کی سیکورٹی کو دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس عمارت کو خالص جتنی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ یہاں بیلی پیڈ، رن وے، طیارے، ایئر ڈولف نامی جدید ہتھیار میزائل سے لیس بیلی کا پٹر بھی تھے، پوری بریگیڈ اپنی بیٹلین سمیت یہاں تعینات تھی اور چوبیس گھنٹے چوک رہتی تھی۔

الجمہاد کے معنی بھرپور فروش جانناڑوں کا شب خون مارنا تو یہ ظاہر ایک بڑے بولے کا خواب ہی نظر آتا تھا لیکن اپنی سرزمین فلسطین کو ان خاصہ یہودیوں کے ناپاک وجود سے خالی کروانے کے آہی عزم اور سودا کے جنوں جیسے بلند حوصلوں کے حامل مجاہدوں نے اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کو قوت ایمانی اور اللہ واحد کی مدد کے سہارے شکست دینے کا عزم محکم کر رکھا تھا۔ سودیا کی کوئی طاقت انہیں ان کے نیک مقاصد سے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

زہیرہ کو ڈیوڈ اسٹار کی قوت کا اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے گروپ بی کے مشن کو سب سے زیادہ اہم کام سوچا تھا کہ وہ صحرائے نجد میں ڈیمون ایٹمی بجلی گھر (ریسرچ پلانٹ) کو اڑانے کی کامیاب کوشش کر ڈالے تو یکنخت پورا... یروشلم اور تل ابیب نہ صرف گھناؤپ تاریکی کی زد میں آجاتے بلکہ گریٹر اسرائیل کے پلان کا اہم ترین جزو کا بھی خاتمہ ہو جاتا اور لمبے عرصے تک اسرائیل کی کمرٹوت کر رہ جاتی۔ جیسا کہ مذکورہ ایٹمی بجلی گھر کی آڑ میں ایک ان ڈائریکٹ خفیہ معاہدے کے تحت فرانس کی مدد سے اسرائیل یہاں بجلی گھر کی آڑ میں یورینیم افزودگی کا پلانٹ قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح وہ ایٹمی ہتھیاروں کے سلسلے میں طویل عرصے تک خود قبیل ہو جاتا۔ اس کی کامیابی کے بعد اگلا مرحلہ کیمنائی اور جراثیمی ہتھیار بنانے کا تھا۔

تھا کہ جام شہادت نوش کرنے والے وہ تینوں مجاہد انہی کی وجہ سے اسرائیلی پولیس ٹیم سے ٹکرائے تھے۔ وہ یقیناً انہیں اسرائیلی پولیس کے چنگل سے چھڑانا چاہتے تھے، ان سب باتوں کے باوجود عابد شیکھری کو یکنخت ہی کسی گہری سازش کی بھوسوں ہونے لگی، اس کی چھٹی حس بار بار کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی، کچھ ہونے والا تھا۔

مطلوبہ مقام پر گاڑی پہنچنے ہی موساد کے پانچوں ٹاپ ایجنٹ حرکت میں آئے۔ وہ ایک ہندوین میں تھے جس کا رنگ سیاہ تھا، ایک دوسری ذیلی سڑک سے اچانک ہی یہ سیاہ فاکس وین نمودار ہوئی اور سڑک کے پیچوں سے اس طرح کھڑی ہوئی کہ آنے والی پولیس گاڑی کا راستہ بلاک ہو چکا تھا۔ پانچوں ایجنٹ جنہوں نے سروں پر عربی صاف پاندھ رکھا تھا اور ہاتھوں میں جدید گھنٹیں تھیں۔ فائرنگ کر کے پہلے پولیس گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیے اس کے بعد سب کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ دکھاوے کی خاطر اسرائیلی پولیس اور ان کے چیف نے برائے نام مزاحمت بھی کی تھی مگر پھر انہوں نے نادمہ اور عابد شیکھری کو ان کے حوالے کرنے کا درشت حکم دیا۔

یہ سارا ڈراما دانستہ طور پر شہر کے معروف اور معروف چوراہے پر انجام دیا گیا تھا اور اس دوران موساد کے ایجنٹوں نے ہوائی فائرنگ بھی کی تھی، جس سے وہاں اطراف میں خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی، نیر انہوں نے بہ آواز بند مخصوص قسم کے ٹی اور اسلامی نعرے بھی بلند کیے تاکہ ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر دیا جائے۔

اگلے چند منٹوں کے بعد یہ پانچوں ٹاپ ایجنٹ نادمہ اور... کو اپنی گاڑی میں ڈالنے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔ نادمہ خوش تھی کہ مجاہدوں کے دوسرے گروپ کو کامیابی ہوئی تھی لیکن عابد شیکھری کا معاملہ اور تھا۔ وہ پہلے ہی خطرے کی بوسونگھ چکا تھا اور پھر بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ ان سے کوئی سوال کرتے، ان کے چہروں پہ ایک مخصوص نقول کا اسپرے کر دیا گیا۔ دونوں بے سدھ ہو کر لڑخت گئے، دونوں کو وین کی عقبی سیٹوں پر لٹا دیا گیا۔

☆☆☆

”الجمہاد“ کی لیڈر زہیرہ قیسری کا ”گریڈ پلان“ کے عمل کا دار و مدار اگرچہ گروپ بی کی کامیاب کارروائی پر منحصر تھا لیکن ایک مقررہ وقت تک اس کے بعد زہیرہ نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دینا تھا۔ وہ اپنے پانچ

کے بیک وقت چار برسٹ ان کی کار پر پڑے۔ حارث کی گردن میں دو گولیاں بیوست ہو گئیں وہ موقع پر ہی جام شہادت نوش کر گیا۔ کار کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے لڑھک جانے کے باعث کار نے لہرانا شروع کر دیا۔ خضر کے شانے میں تین گولیاں لگی تھیں جبکہ معید غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے جھک گیا تھا۔ اس وقت کار کا ٹائر بلاسٹ ہو گیا۔ عام ٹریفک رواں تھا۔ کار ڈول رہی تھی، معید چونکہ حارث کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اس لیے اس نے فوراً اسٹیرنگ پر مقدور بھر گرفت جمانے کی کوشش چاہی مگر کار کا ایک ٹائر برسٹ ہونے کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ سنبھلنے نہیں پاری تھی، معید کو اپنا مشن ناکام ہوتا محسوس ہوا تو اسے اور تو کچھ نہ سوچا۔ اس نے فوراً اسٹیرنگ بائیں جانب موڑ دیا۔ نتیجتاً اس کی ڈولتی ہوئی کار ایک دھماکے سے پولیس گاڑی سے ٹکرائی، عقب میں کئی گاڑیوں کے ہارن کی پر شور آوازیں ابھرنے لگیں جبکہ دونوں گاڑیاں سچ سڑک پر پھری کی طرح گھومنے لگیں اور سڑک کے کنارے کی سیمڈ منڈیر توڑتی ہوئی گھاس کے میدان میں جا کیں۔ معید نے اپنی گن سنبھال لیتے ہی فائرنگ کی جبکہ عقب کی سیٹ میں موجود خضر ذمی حالت میں پڑا تھا۔ وہ انہم خضرے کو سر پہ بھانپتے ہی وہ اپنی گن سنبھالنے لگا۔

پولیس گاڑی میں موجود نادمہ اور عابد شیکھری بری طرح پریشان اور متوحش تھے جبکہ اسرائیلی پولیس نے پھرتی کے ساتھ اتر کر معید کی کار کو فائرنگ کر کے چھتا بنا ڈالا۔ خضر اور معید موقع پر ہی دم توڑ گئے، تھوڑی دیر بعد یہودی پولیس چیف وائرلیس سیٹ پر ہیڈ کوارٹر میں رابطہ کر رہا تھا۔ اس کے ذرا دیر بعد گاڑی روانہ ہوئی، ٹکرانے کے باعث گاڑی کی ایک سائڈ پر خاصا بڑا ڈینٹ پڑ گیا تھا۔ تاہم کار کے مقابلے میں یہ گاڑی بڑی اور مضبوط تھی، اس لیے اس پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا، اندر موجود پریشان حال نادمہ اور عابد پولیس چیف سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے لیکن وہ ان کے جوابات آنا کافی سے دے رہا تھا، وہ جلد سے جلد اس مقام کے قریب پہنچنا چاہتا تھا جہر ایسا ہی ایک جعلی ڈراما ”پلے“ کیا جانے والا تھا، اندر سے یہ مکار یہودی نژاد پولیس چیف مسرور تھا کہ کار والے ان تینوں حریت پسند مجاہدوں کے ناکام حملے کے باعث ان کے اگلے ڈرامے میں حقیقی رنگ بھر جائے گا۔

جبکہ یہاں تک تو نادمہ اور عابد کو بھی اندازہ ہو ہی چکا

اندرونی طوفان بلائیں چھپائے بہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔ ادھر خضر اپنے دونوں مجاہد ساتھیوں معید اور حارث کے ساتھ ایک کار میں ان دونوں پولیس گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی تعاقب میں لگ گیا۔ ان کے شاید سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ عین ایسا ہی ایک خطرناک منصوبہ موساد کے پانچ ٹاپ ایجنٹ بھی... فلسطینی حریت پسندوں کے جھجس میں بنا چکے تھے چونکہ ان کا منصوبہ طے شدہ تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ دونوں گاڑیاں کس وقت اور کہاں سے کس راستے سے گزریں گی، اس لیے اس Fake Action کے لیے وہ پہلے ہی سے گھات لگائے موجود تھے۔

سفر جاری تھا۔ پورٹ روڈ پر گاڑیوں کا رش تھا، تاہم پولیس کی دونوں گاڑیاں تیزی سے سائرن بجاتی ہوئی دوڑی جا رہی تھیں، اور ان کے لیے راستہ صاف اور آسان تھا۔ ان کے تعاقب میں ذرا فاصلے سے پی فرنٹ کے تینوں مجاہدوں کی کار رواں دواں تھی، ایک برج پارکر کے نسبتاً کھلی اور کم رش والی جگہ پر سڑک نوے ڈگری کے قوس نما موڑ پر تھی۔ حارث نے کار کا اسٹیرنگ سنبھالا ہوا تھا یکدم روڈ لائن تبدیل کی اور اسی وقت عقبی سیٹ پر براجمان خضر کے کانڈے پر رکھ لائے لائے نظر آنے لگا۔ اس کا نشانہ پولیس کی پچھلی گاڑی تھی، نشانہ لیتے ہی اس نے ٹریڈرین پش کیا۔ دھوکے کی لکیر چھوڑتا ہوا راکٹ فائر ہوا اور سنسناتی ہوئی لہر کے ساتھ پولیس گاڑی کے درمیان جا کے لگا۔ ایک دھماکے سے گاڑی کے پر نیچے اڑ گئے، آگے والی گاڑی کی رفتار یکدم تیز ہوئی مگر اس میں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس گاڑی میں پولیس چیف اور نادمہ اور عابد شیکھری موجود تھے، نیز ڈرائیور سمیت چار پولیس اہلکار بھی سوار تھے، دھماکے کی آواز اور دست کا انہیں ٹوری اندازہ ہو گیا تھا، پہلے تو یہ لوگ یہی سمجھے کہ شاید ان کے ”اپنوں“ نے یہ دھماکا کیا ہوگا لیکن اپنے ساتھی اہلکاروں کی گاڑی کا حشر دیکھ کر انہیں ”خطرے“ کا احساس ہوا تھا۔ پھر یہ ان کے ”اپنوں“ کا ”حملہ“ کرنے کا اصل مقام بھی نہ تھا۔ جو ظاہر ہے پہلے سے طے شدہ تھا۔ تاہم یہ ان کی غیر معمولی چابک دستی اور بیدار مغزی کا نتیجہ تھا کہ ان کی عقلی مگر متلاشی نظروں نے جلد ہی اس جگہ نیلے رنگ کی کار کو دیکھ لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اب ان تین کارسواروں میں سے دو کو نہیں بھی کھڑکی سے باہر سیدھی کرتے دیکھ لیا تھا۔ پھرتی کا مظاہرہ پولیس گاڑی سے پہلے کیا گیا اور ایک ساتھ چار نہیں گرجی تھیں۔ خضر اور اس کے ساتھی سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ گولیوں

ایک برسٹ فائر ہوتا۔ لیلیٰ کا تیسرا ساتھی بھی اس کی زد میں آ گیا۔ اس کے سینے پر نارنجی لکیر پڑی تو اسے حرکت کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری چیخ بڑی تھرا دینے والی تھی۔

”بنگر کے اندر ریڈ گریڈ گریڈ پھینکو..... جلدی..... ورنہ چشم زدن میں سب مارے جاؤ گے۔“ لیلیٰ پھر چلائی۔ سب سے پہلے اس نے ہی اپنی کمانڈ وکٹ سے ایک دستی بم نکال کر بنگر کی طرف اچھالا تھا۔ جمال اور باقر نے بھی چشم زدن میں اس کی تقلید کی مگر جمال نے جیسے ہی دستی بم پھینکنے کے لیے لینے لینے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا۔ موت کا رقص کرتی تھرکتی قاتل ریز کی رینج میں اس کا وہ ہاتھ آ گیا۔ اسے بم اچھالنے کا بھی موقع نہ ملا۔ ایک قاتل برسٹ فائر ہوا جمال کا ہاتھ کبھی کی طرف سے اڑ گیا اور وہاں سے خون آلود گنڈ منڈ بازو کی پٹی جھانکنے لگی۔ جمال درد کی اذیت سے تڑپ اٹھا، اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر باقر پر جیسے جنون سوار ہو گیا۔ اس نے بے دردی مزید دو تین بم بنگر کی طرف اچھال دیے۔ وہاں کئی دھماکے ہونے لگے۔ سسٹم میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی۔ موت کا رقص کرتی ہوئی قاتل ریز زبھنے لگیں اور پھر رفتہ رفتہ غائب ہو گئیں۔

یہ موقع کسی زخمی ساتھی کو سنبھالنے کا نہیں تھا مگر باقر اپنے ساتھی جمال کو اس حال میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف دوڑا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ جمال جانتا تھا کہ اس وقت کیا صورت حال ہے۔ اپنے ساتھی پر بوجھ بننا مشن کو کھٹائی میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ابھی اس کا دایاں ہاتھ باقی تھا۔ اس نے اس ہاتھ میں گن پکڑ لی۔ بائیں بازو کے درد کو.... دانتوں تلے بھینچ کر پی گیا اور باقر سے بچی بچھی آواز میں بولا۔ ”نہیں دوست! میں ٹھیک ہوں۔ آگے بڑھو۔ مجھے نہیں..... مشن سنبھالو۔“

لیلیٰ نے اپنے بہادر مجاہد کی یہ درد و جوش میں ڈوبی آواز سن لی تھی، حالانکہ وہ مضبوط دل گردے اور آہنی اعصاب کی مالک تھی مگر جمال کی بات پر اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

خطرناک بنگر تباہ ہو چکا تھا۔ پوائنٹ تھرنٹی کی چوکی سر ہو چکی تھی مگر گروپ کے تین مجاہد بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے تھے، جبکہ لیلیٰ... جمال، باقر اپنے ساتھیوں کی قربانی ضائع نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔

تینوں آگے بڑھے اور فائرنگ کرتے پلانٹ کے گیٹ تک جا پہنچے۔ وہاں سے بھاری بوٹوں اور وردی پوش

ساتھ چوکی پر جدھر سرچ لائٹ ان کے ٹرک پر پڑ رہی تھی ایک مچان تھی، وہاں موجود چار فوجیوں نے خطرے کا احساس ہوتے ہی گنوں کے من کھول دیے مگر اس سے پہلے ہی جمال ٹرک کا ایکسلسر پٹر پوری قوت سے دبا چکا تھا۔ ٹرک دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور مچان سے جا کرایا مگر اس سے پہلے جمال اور باقر بجلی سی پھرنی کے ساتھ اپنی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے گر چکے تھے اور سنبھلتے ہی انہوں نے پوزیشنز سنبھالیں۔ ٹرک مچان کے دو ستونوں سے ٹکرایا اور مچان بری طرح لرز کر رہ گئی، تاریک فضا میں گولیوں کی دل خراش تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری مگر توازن بگڑنے کے باعث اوپر موجود چاروں فوجیوں کا نشانہ خطا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ دو فوجی جو شہید بالکل مچان کی دیوار کے کنارے نکلے کھڑے تھے مچان کے بری طرح لرزنے پر نیچے آ گئے۔ جماد اور باقر کی گنوں نے انہیں بھون ڈالا۔ اوپر موجود دو باقی فوجیوں کو ٹرک کے عقبی حصے میں چھپے ہوئے مجاہدوں نے جہنم واصل کر دیا۔ مچان خاصی مضبوط تھی تاہم ٹرک کے ٹکرانے سے تھوڑا جھک ضرور گئی تھی۔

لیلیٰ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت ٹرک سے اتر آئی تھی۔ قاضا اب فوری پیش قدمی کا تھا۔ جنگ فیصلہ کن سر سے میں داخل ہو چکی تھی۔ پوائنٹ تھرنٹی کو کاسا کر کے یہ اندر داخل ہونے۔ وہاں چند فوجیوں سے ان کا ساہنا ہوا مگر ان کی گولیوں نے انہیں بھی بھون کے رکھ دیا۔ یہ لوگ مزید آگے بڑھے۔ ٹھیک اس وقت انہیں نارنجی لکیریں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ لیلیٰ کا دل اچھل کر حلق میں آن لگا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل چینی۔ ”خبردار! ان لکیروں کی زد میں مت آنا۔“

پوائنٹ تھرنٹی کے خفیہ بنگر میں نصب آٹومیٹک سرچنگ اینڈ اارم سسٹم کا لیزر گائیڈڈ فائرنگ میگزین آن ہو چکا تھا، بد قسمی سے لیلیٰ کے دو ساتھی اس کی زد میں آ گئے۔ اگلے ہی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری..... اور مذکورہ دونوں ساتھی کرب ناک چیخوں کے ساتھ زمیں بوس ہو گئے۔ یہ سسٹم اتنا فاسٹ اور خطرناک تھا کہ باقیوں کے لیے ان قاتل نارنجی شعاعوں کی ہلاکت خیزی سے بچنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ آگے دوڑتے سارن بھی چیخنے لگا تھا۔ صورت حال بگڑ گئی تھی مگر اب اس بگڑی ہوئی خطرناک صورت حال میں انہیں کفن بہ دوں کی حالت میں ہر صورت اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔

یہ لوگ زمین پر لیٹ کر لڑھکنیاں کھانے لگے۔ قاتل ریز کی چیخیں خاموش تھیں، مگر جیسے ہی کوئی ان کی زد میں آتا

بھڑ جانے کی صورت میں یہ مشن ناممکن حد تک مشکل بھی ہو سکتا تھا۔

ٹرک رکستے ہی دو گن بردار وردی پوش اسرائیلی دونوں طرف سے ان کی کھڑکیوں کی طرف بڑی مستعدی کے ساتھ بڑھے تھے۔ جمال اور باقر نے اپنے آئی ڈی کارڈز والے ہاتھ کھڑکی سے باہر کر دیے۔ یہ ظاہر دونوں ساکت تھے مگر اندر سے ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے گویا کسی بھی وقت کچھ بھی ہو جانے جیسی خطرناک چیلنج کو فیس کرنے کے لیے الرٹ تھے۔

دونوں فوجیوں نے ایک سردی نگاہ ان کے نصف ٹوپی سے ڈھکے بشروں پر اور پھر ان کے آئی ڈی کارڈز پر ڈالی۔ باقر کی کھڑکی کی طرف والے فوجی نے تو کسی حد تک مطمئن ہو کے دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دی تھی مگر جمال کی طرف والے فوجی کو جانے کس بات کا شبہ ہوا تھا کہ اس نے اپنی گن کی نال سے جمال کے چہرے سے بچی ہوئی ٹوپی کو ڈرا دھیرے دھیرے اوپر کیا۔ جمال کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش یکنگت تیز ہو گئی۔ چہرہ قدرے واضح ہوا تو اس فوجی نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔ ”اس کارڈ میں تمہاری تصویر کیوں بدلی ہوئی ہے؟“

جمال کو اس خندے سے اور ایسے سوال کی توقع تھی کہ بلا تامل بولا۔ ”سراختی تصویر مجھے لگانی چاہیے تھی مگر نہیں لگا سکا تھا۔ سوری! اگلی بار ایسی نقلی نہیں ہوگی۔“

”تصویر تو اس کی بھی بدلی ہوئی ہے۔“ معاذ دوسرے فوجی کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا جس نے باقر کا آئی ڈی کارڈ دیکھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلا دیا تھا لیکن پھر مختصر ٹکڑ پر وہ چونک کر دوبارہ باقر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے نہ صرف آئی ڈی کارڈ کی تصویر چیک کی بلکہ اپنی گن کی نال سے اس کی ٹوپی کو بھی اوپر اٹھا دیا تھا۔

دونوں فوجی یکدم دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ان پر گنیں تان لیں اور پھر انہیں مزید چیکنگ کے لیے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ جمال اور باقر کے دل یکنگت ساکت ساکت کرتی کنپٹیوں سے دھڑکنے لگے۔ ہر قسم کی متوجہ وغیر متوجہ خطرناک چیلنج پر انہیں فوری طور پر کیا قدم اٹھانا تھا، یہ طے شدہ تھا لہذا جمال اور باقر نے ان دونوں فوجیوں کی کنپٹیوں سے بیک وقت خون کے چھینٹے اچھلتے دیکھے اور دونوں ہی تیور کر گئے۔

ٹرک کے عقبی حصے میں موجود ان کے ساتھیوں نے خاموش پستول کے ذریعے دونوں کو جہنم واصل کر ڈالا تھا۔

تیونائی کی طرف ان کا سفر رات کو شروع ہوا تھا اور یہ دو تیز رفتار گاڑیوں میں ایک مقررہ مقام پر پہنچ کر اتر گئے تھے، دونوں گاڑیاں انہیں ایک گھنٹے جنگل اور پہاڑیوں کے سرے میں اتار کر واپس پلٹ چکی تھیں... یہ گوریلا مشن تھا اور بہت اہم ترین بھی۔ یہ سب ایک دوسرے کو فالو کرتے ہوئے تاریک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔ انہوں نے چست کمانڈو ڈریسنگ کر رکھی تھی اور ہتھیاروں کے زیور سجا کر جانیں ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھیں خود کو سر سے پاؤں تک کیونلا ج کر رکھا تھا۔ اس طرح وہ رات کی سیاہی کا ہی ایک جزو نظر آتے تھے، اس گروپ کی کمانڈو بیہیہ ہی کے ہاتھ میں تھی جبکہ گروپ میں اپنا نائب اس نے محسن کو ہی بتایا ہوا تھا اور اسے کچھ صوابدیدی اختیار دے رکھے تھے، یہی سبب تھا کہ پیدل تھوڑا سفر کرنے کے بعد جب یہ لوگ ایک مقام پر رک کر آگے پیش قدمی کی پلاننگ کرنے لگے تو محسن نے زبیدہ کو مشورہ دیا کہ انہیں دو مختلف حصوں میں بٹ کر مشن کو آگے بڑھانا چاہیے۔ زبیدہ کو اس کی تجویز اچھی لگی۔ وہ پہلے ہی انہیں ڈیوڈ اشار کے ہیڈ کوارٹر کے محل وقوع سے اچھی طرح آگاہ کر چکی تھی۔ چنانچہ محسن اور زبیدہ کے ساتھ المجاہد کے دو ساتھی شامل ہوئے اور دونوں گروپس نے ایک ”میشنگ پوائنٹ“ طے کرنے کے بعد اپنی راہ لی۔ ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ان کے پاس ٹرانسمیٹر موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد یہ دونوں الگ گروپس میں بٹ کر آگے بڑھنے لگے۔ ان دونوں گروپس کو ایک مقررہ وقت میں ہیڈ کوارٹر کے قریب پہنچنا تھا اور بجلی کے شٹ ڈاؤن ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ بالآخر یہ دونوں تھوڑی دیر کی کامیاب گوریلا پیش قدمی کے بعد ہیڈ کوارٹر کے قریب ایک مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

☆ ☆ ☆
چیکنگ معمول کی تھی، اب انصاری معلومات کے مطابق یہ ڈیون ریسیرچ پلانٹ کی سب سے اہم چوکی پوائنٹ تھرنٹی تھی، جو ایک طرح کا اہم مورچہ بھی تھی، ظاہر ہے یہاں کی چیکنگ بھی سخت تھی، اب یہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انہیں مطمئن ہو کر آگے جانے دیا جاتا یا پھر کسی مزید تفتیش کے لیے کسی شہیہ کی بنا پر روکا بھی جا سکتا تھا اور یہ دوسری صورت خطرناک بھی ہو سکتی تھی جبکہ سرائے کے مالک ہمدرد اب انصاری نے انہیں اسرائیلی ایٹمی بجلی گھر کا نقشہ سمجھاتے ہوئے تاکید کی تھی، ”پوائنٹ تھرنٹی“ سے بہ خیر وعافیت گزر جانے کے بعد ان کا یہ خطرناک مشن نصف حد تک آسان ہو جاتا جبکہ

مسلم اسرائیلی فوجی برآمد ہوئے مگر انہوں نے تابڑ توڑ فائرنگ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ ان کے پاس اسلحے کی کمی نہ تھی مگر لیلیٰ وغیرہ کے پاس محدود اسلحہ تھا۔ سات آٹھ فوجیوں پر مشتمل اس دستے نے گویا ان مجاہدوں کی لب بام فتح کو ناکامی کے قریب کر دیا تھا۔ لیلیٰ اور باقر اس صورت حال پر پریشان اور شکر نظر آنے لگے۔ اسلحے کی کمی کے ساتھ یہ خدشہ بھی تھا کہ کسی بھی وقت یہاں دشمنوں کی مزید کمک پہنچ سکتی تھی۔ جو موقع تھا ابھی تھا مگر لیلیٰ اور باقر کو کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ جمال کی صفائی اور سوچتی ہوئی زیرک نظروں نے اس مشکل پھینک کے "ڈیڈ لاک" کو فوراً بھانپ لیا۔ لیلیٰ کے بل اس نے فوراً کیا۔ گیس کی بیرونی دیوار کو مورچا بنائے، اسرائیلی دستہ ان کی پیش قدمی کو "جام" کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ اس کی دوسری سمت خالی تھی۔ اگر وہ کسی طرح اس سمت دوڑ کر ان پر بے تحاشا فائرنگ کر ڈالتا تو نہ صرف دستے کی طاقت کمزور پڑ جاتی بلکہ ان کے ساتھیوں کو بھی آگے بڑھ کر باقی ماندہ فوجیوں پر حملہ کرنے کا خاطر خواہ اور کامیاب موقع مل سکتا تھا۔ نیز اس کے دونوں ساتھیوں کے پاس دستی بم بھی ختم ہو چکے تھے، جبکہ اس کے پاس ابھی ایک دستی بم بچا تھا۔ لیلیٰ کے بل اس نے ایک فوجی فریڈمانہ ٹیولڈ کر لیا اور پینے کے پانی، ٹیولڈ اور آگیا بازہ کی کینی کی مدد سے مذکورہ سمت دھیرے دھیرے سرکنا شروع کر دیا۔ باقر کی نظر اس کی حرکت پر پڑی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا سامنی دانستہ موت کے دبانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اسے روکنے کے لیے ابھی اپنا منہ کھولا چاہا تھا کہ اسی وقت اس کی نظر ذرا فاصلے پر زمین پر لیٹی فائرنگ کرنی لگی کے چہرے پر پڑی۔ اس کا بھی چہرہ مغموم تھا۔ اس نے باقر کو مخصوص اشارہ کر دیا اور باقر نے کرب کی شدت سے اپنے ہونٹ دانتوں سے دبالیے۔

ادھر جمال نے اپنے مظاہرہ مقام پر آنے پہلے دستی بم کی سٹیجی پن چینی اسے جیب میں رکھا اور یہ وقت تمام اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔ دانتیں ہاتھ میں گن سیدھی کی اور ایک سرفروشانہ جوش تلے خمرہ کھجیر بلند کیا پھر جیتی تیز دوڑ سکتا تھا فائرنگ کرتے کھلی جگہ سے دیوار کی اندرونی سمت دوڑ پڑا۔ چونکہ اس طرف سے کسی کے اس طرح مردانہ اور داخل ہونے کا اسرائیلی فوجی دستے کے سامن وگمان میں بھی نہ تھا۔ لہذا وہ بری طرح بکھلا گئے۔ بیک وقت ان سب کی تنوں کا رخ جمال کی طرف ہو گیا۔ چند فوجی اس کی گولیوں کی زد

میں بھی آئے مگر انہوں نے جمال پر فائر کھول ڈالے۔ جمال تب تک ایک سرفروشانہ حوصلے، قوت ارادی اور ایک مردانہ وار جوش تلے ان کی صفوں میں کھس آیا۔ تب تک اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا اور پھر اس کی جیب میں اس کا دستی بم ساعت شکن دھماکے سے پھٹا۔ کئی اسرائیلی فوجی کریمہ انگیز جنوں کے ساتھ لقمہ اجل بن گئے۔ اور لیلیٰ اور باقر کو جیسے ہی پیش قدمی کا موقع ملا وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے دوڑے اور باقی ماندہ اسرائیلی فوجیوں کو جہنم واصل کرتے ہوئے گیس سے اندر داخل ہو گئے۔ یہاں بھی ان کا چند مسلح فوجیوں سے واسطہ پڑا تھا مگر اب یہ دونوں جیلے رخ کے عین قریب پہنچ کر کے موقع دیتے؟ پھر اپنے ساتھی جمال کی دیوانہ وار قربانی اور جرأت نے ان کے حوصلوں کو بھی سوا کر دیا تھا۔ پلانٹ کے مرکز میں پہنچ کر لیلیٰ نے خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم فٹ کرنا شروع کر دیے جو اس نے اپنے ہی پاس رکھے ہوئے تھے، باقر اسے گور کر رہا تھا۔ اسے جو فوجی نظر آتا، وہ اسے اپنی گن سے بھون کر رکھ دیتا۔ اس عرصے میں لیلیٰ نے تیزی کے ساتھ اپنا کام نمٹایا۔ وہ چار عدد خطرناک تباہی پھیلانے والے ٹائم بم پلانٹ کے مختلف حساس مقامات پر فٹ کر چکی تھی اور ان کی پلانٹنگ نامتناہی ہو گیا تھا۔ لیلیٰ نے اپنے ہاتھ کی گور دونوں یہ کام نمٹا کر دوبارہ بیرونی گیس کی طرف دوڑنے اور باہر نکلے۔ ابھی یہ پلانٹ کی گول گنبد نما عمارت کے وسیع وعریش تارک ایک احاطے میں تھے کہ انہیں آسمان پر گوزراہت کی آواز سنائی دی۔ دونوں دھک سے رہ گئے۔ دو اسرائیلی جتنی بجلی کا پٹر تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔

موساد کے میجر باریق شمعون کو اپنے ہیڈ کوارٹر سے جو کال موصول ہوئی تھی اور جسے سن کر وہ کتے کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا، اس نے اس کی خوشی کے رنگ میں ہینگ ڈال دیا تھا۔ اسے ابھی بجلی گھر کے خفیہ ریسرچ پلانٹ سے ایمر صہبی کال موصول ہوئی تھی، جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ حریت پسندوں کے ایک ٹولے نے پلانٹ کی اہم چوکی پوراہت ختمی پر دھاوا بول دیا ہے۔ یہ ابھی ابتدائی اطلاع تھی لہذا باریق شمعون نے فوراً اسرائیلی آرمی ہیڈ کوارٹر سے کمک کی درخواست کر ڈالی اور دو جتنی بجلی کا پٹر سگوروات کر دیا گیا۔ وہ سخت پریشان اور بھلا رہا تھا۔ جب اس نے یہ خبر اپنے ساتھی جتنی اشحاق شامیر کو سنائی تو ایک لمحے

کے لیے وہ بھی ہکا بکا رہ گیا۔ "ہمیں فوراً جزل فرناش کو اس کی اطلاع کرنا ہوگی۔ آؤ....." اشحاق شامیر نے کہا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔ لیٹل بورڈ کے عقب میں چھپی بیٹھی یہودی کشنر بیریز ناون کی لاڈلی بیٹی بازغہ باہر نکل آئی۔ اسے بھی احساس تھا کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ وہ بھی نکل کر دوبارہ اس ہال کمرے میں آگئی جہر طوفان بد تیزی پورے جو بن پر تھا، اس نے دیکھا۔ میجر باریق شمعون اور اشحاق شامیر، ڈیوڈ اسار کے سربراہ جزل فرناش سے کچھ کہہ رہے تھے، جسے سنتے ہی جزل فرناش کا چہرہ پہلے تو ایک لمحے کو تاریک ہوا پھر جیسے غیظ و غضب کے مارے لال بھوکا ہو گیا۔ اسے جھنجھلاہٹ میں اور تو کچھ نہ سوچا اس نے قریب موجود جام لہڑھاتے کشنر بیریز کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ کشنر کا تو جیسے سارا نشہ ہی ہرن ہو گیا۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا اور حیرت اور احساس تزلزل کے طے طے احساس تلے اپنی آنکھیں پھاڑے جزل فرناش کا سرخ پڑتا چہرہ نکلتا رہا۔ "تم کیا گھاس کاٹ رہے ہو اب تک..... عرب حریت پسند زندہ تاتے ہوئے ہماری سرزمین میں داخل ہو گئے، تم دیکھتے رہے۔ قبرص سے ساڑھے سات سو جلاوطن فلسطینیوں کو بڑے آرام سے ان کی سرزمین میں دوبارہ بسا دیا گیا اور تم تماشائی بنے رہے۔ یہاں تک کہ حریت پسندوں کا ٹولہ، صحرائے نجف میں زندہ تاتا ہوا داخل ہو گیا۔ تمہیں خبر تک نہیں۔ کیوں؟ کشنر ناون.....! کیوں جواب دو مجھے....." کشنر بیریز ناون سے کوئی جواب ہی نہیں بن پارہا تھا مگر ذرا دور کھڑی اس کی بیٹی بازغہ اپنے باپ کے ساتھ زیادتی پر چپ نہ رہ سکی، کیونکہ حالات حاضرہ کی اسے بھی اچھی طرح سوجھ بوجھ تھی، فوراً آگے بڑھ کر جزل فرناش سے تیز سبھ میں لولی۔

"اس میں میرے چا کا کیا قصور ہے؟ یہ معاملہ تو وزارت داخلہ اور انٹیلی جنس کا ہے جسے ہائر اتھارٹیز کی جانب سے خصوصی صوابدیدی اختیارات ملے ہوئے ہیں۔ کمال ہے آپ لوگوں کی اس قدر پاور فل انٹیلی جنس ہونے کے باوجود یہ بھی بھر حریت پسند یہاں تک آن پہنچے اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ یہ تم لوگوں کی نااہلی ہے، میرے چا کی نہیں، وہ تو صرف شہری انتظامیہ تک محدود ہیں۔" جزل فرناش ایک نوجوان لڑکی کے منہ سے ایسے ترقی بہ ترقی الفاظ سن کر مزید بچھ گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ کشنر بیریز ناون نے جو اپنی لاڈلی

بیٹی کو ایک سفاک اور سخت گیر انسان کے نشانے پر دیکھا تو فوراً اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑا ہو گیا اور جزل فرناش سے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ "اسے معاف کر دیں سر!..... یہ نا سمجھ ہے۔" مگر جزل فرناش کا آتش غیظ کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس کے پچھرے ہوئے تیور بتا رہے تھے۔ وہ کسی بھی وقت دونوں باپ بیٹی کو ہی شوٹ کر ڈالے گا کہ اچانک بلیک آؤٹ ہو گیا۔ بجلی چلی گئی، سارا ہیڈ کوارٹر اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

دونوں کو ایک ساتھ ہی ہوش آیا تھا۔ ان کے چہرے اور جسم ٹھنڈے پانی سے شراور ہو رہے تھے۔ ناغمہ بے چاری کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی، اس کے کپڑے گیلے ہو کر جسم کے ساتھ چپک گئے تھے اور جسمانی نشیب و فراز ابھرنے لگے تھے، اس کے خوف پر شرمندگی غالب آ رہی تھی، تیز ٹھنڈے پانی کی وجہ سے وہ ہولے ہولے کپکپا رہی تھی جبکہ عابد شیکھری کی کیفیات مختلف تھیں ہوش میں آتے ہی اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے دوران اپنے نیم غنودہ حواسوں کو جگانے کی کوشش کی۔

دونوں ایک قدرے کشادہ کمرے کے کونے میں فرٹن پر بے پردہ پڑے تھے اور ان کے سامنے منہ انہیں چہرے موجود تھے، جن کے بدبیت ہونٹوں پر کمرہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ان کے جسموں پر مخصوص وردیاں نظر آرہی تھیں، جسے دیکھ کر عابد کو پھر تشویش لاحق ہونے لگی تھی، اسے سب یاد آچکا تھا کہ ان پر دوبارہ حملہ کیا گیا تھا جبکہ دوسرے حملے میں جس آسانی کے ساتھ اسرائیلی پولیس نے انہیں جن نام نہاد فلسطینی حریت پسندوں کے حوالے کر دیا تھا وہ درحقیقت ایک ڈراما تھا۔ وہ اب یقیناً اسرائیلی انٹیلی جنس کی قید میں ڈالے جا چکے تھے، دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے، تاہم اب انہیں رات ہوتی محسوس ہو رہی تھی، کمرے میں بلب روشن تھا۔

"ہاں، مسٹر شیکھری! ہم تم دونوں کو یہاں خوش آمدید کہتے ہیں۔" تینوں میں سے ایک نے استہزائیہ مسکراہٹ سے عابد کی طرف دیکھ کر کہا۔ یہ وہی موساد کا ٹاپ ایجنٹ لیٹل بیوڈ تھا جس نے اپنے ایک کمانڈو ساتھی ڈیوڈ کے ساتھ مل کر قبرص میں دو فلسطینی جلاوطن آفسیروں کو قتل کیا تھا۔ ڈیوڈ بھی وہیں موجود تھا۔ یہ لوگ یروشلم میں موساد کے ایک فائزر کمانڈو گروپ کے ہیڈ کوارٹر میں موجود تھے۔

”مجھے حیرت ہوئی اس طرح دھوکے سے اپنے یہاں آنے کی۔“ جو ابابا عابد شیکھری نے شیطیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تمہاری پولیس کے قبضے میں تو ہم آ ہی چکے تھے۔۔۔۔۔ پھر یہ سارا گھبراہٹ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ خاصے چالاک ہو لیکن تمہاری غرضی دور کرنے کے لیے مجھے بتانا پڑے گا کہ ہم نے تم پر کس طرح محفوظ طریقے سے ہاتھ ڈالا کہ لاٹھی بھی نہ لٹوے اور سانپ بھی مر جائے۔“ شیطیل بولا۔ پھر اس نے اسے اس ڈرائے کے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ اگرچہ عابد کو بھی کافی حد تک اس قصے کا اندازہ ہو ہی گیا تھا، تاہم ان کے منہ سے بھی حقیقت سننا چاہتا تھا۔ کم از کم عابد نے اپنی ذہنی فراست سے اتنا اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ یہ لوگ انہیں زندہ چھوڑنے کے سوڈ میں ہرگز نہیں تھے۔

شیطیل ایک کٹر یہودی تھا۔ وہ اپنی مکاری، سفاکی اور ظلم کی داستانیں کسی عرب کو بتا کر جانے اپنے کون سے جذبے کی تسکین چاہتا تھا۔ اس نے اس بات کا بھی عابد اور ناعمہ کے سامنے اعتراف کر لیا کہ سیماسول کی بندرگاہ میں جن دو جلاوطن فلسطینیوں کی نارگت کلنگ کی تھی ان میں وہ اور اس کا ساتھی ڈیوڈ شامل تھے۔

”ہم سے اسے کیا پتا ہے، وہ تم؟“

بالآخر عابد شیکھری نے دانستہ اپنی آواز اور اپنے لہجے کو شکست خوردہ بناتے ہوئے اس سے پوچھا تو اس کا دوسرا ساتھی ڈیوڈ آنکھیں نکال کر اس سے بولا۔ ”تم دونوں کی موت۔“

”کس جرم میں۔۔۔۔۔ ہمارا تو کسی فلسطینی حریت پسند سے کوئی تعلق نہیں۔“ عابد نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا۔

اس کا ذہن اب تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔

”جرم۔۔۔۔۔!“ شیطیل اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ ”تمہارا یہ جرم کافی نہیں کہ تم نے ہمارا قبرس آپریشن بری طرح ناکام کر ڈالا۔ ان دونوں جلاوطن فلسطینیوں کی ہمارے ہاتھوں ہلاکت کے باوجود تم نے ان کے اہم مشن کو پورا کرنے کے بعد جو بیڑا اٹھایا، اس پر عمل بھی کر ڈالا اور ساڑھے سات سو فیوجیز فلسطینیوں کو اپنی کمپنی کے دو بحری جہازوں میں لاکر دوبارہ انہیں ان کی سرزمین میں آباد کرانے کا سبب بنے۔ یہ ناقابل معافی جرم ہے تمہارا۔“

عابد بولا۔ ”یہ میرا کاروبار ہے۔ اگر کوئی مجھے زیادہ

رقم دینے کا لالچ دیتا تو میں فلسطینی مہاجرین سے بھرے اپنے ان دونوں جہازوں کو خود ہی ڈبو بھی دیتا۔“ اس کی بات پر پہلی بار شیطیل اور اس کے ساتھی کمانڈو ایجنٹ کے چہروں پر درشتی کی جگہ الجھن سی تیر گئی۔ عابد نے دانستہ خود کو لاپٹا اور کاروباری ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان یہودی کتوں کے ذہنوں میں یہ بات تشکیل کا شکار ہو جائے کہ اس نیک مقصد میں عابد کا اپنے مظلوم بھائیوں کی ہمدردی اور مدد کا جو ازلی جذبہ کارفرما تھا وہ آشکار نہ ہو سکے۔

”کیا مطلب؟“ اس بار ڈیوڈ نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا تو عابد معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”میں ایک عرصے سے اپنی ”الجھڑ“ جہازوں کی کمپنی کی آڑ میں خطیر معاوضے کر انسانوں کی اسفلٹنگ کا کاروبار کر رہا ہوں۔ اب تم لوگوں نے خود کو ظاہر کر ہی دیا ہے تو میں کیوں خود کو چھپاؤں؟ یہ میرے کاروباری اصولوں کے معافی ہوگا کیونکہ کاروباری ڈیل تو کسی بھی وقت اور کسی بھی حالت میں ممکن ہے۔“

”تو پھر ان ساڑھے سات سو مہاجر فلسطینیوں کو دوبارہ یہاں حیلہ پہنچانے کے لیے تمہیں کس نے ناسک دیا تھا؟“ شیطیل نے برماتی نظروں سے عابد کے چہرے کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

”وہ کس مزیت پسند حیلہ کا لیبہ تھا۔ کبھی میرے سامنے نہیں آیا۔ صرف فون پر مجھ سے کام کی ڈیلنگ کرتا تھا اور میرا سانس اکاؤنٹ بھرتا تھا۔“ عابد نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ مستحکم اور اعتماد سے پر تھا۔

”لیکن ان فلسطینی آزاد پسند گروپوں کے پاس اتنا سارا روپیہ کبھی نہیں آیا تو وہ تمہیں اتنی خطیر رقم کہاں سے ادا کرتے ہوں گے؟“ شیطیل نے تشکیل بھرے لہجے میں پوچھا تو عابد ہلکا سا ہنسنے لگتا ہوا ہوا۔

”تم لوگوں کی عقل شاید صرف آگ و خون کا کھیل کھیلنے میں ہی کام کرتی ہے۔ تم ان خفیہ کاروباری معاملات کو کیا جانو۔ کیا تم لوگوں کی ناچ میں اتنا بھی نہیں کہ بعض غیر فلسطینی یا آسودہ حال عرب مسلم جذبہ ہمدردی کے تحت ان لوگوں کی درپردہ مالی امداد کرتے رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دولت مند عرب خاندان آزادی فلسطین کے دو بڑے گروپوں پی فرنٹ اور المجاہد کی خفیہ مالی مدد کرنے میں مصروف ہے۔“

اس کی بات پر شیطیل اور ڈیوڈ نے پرسوج نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عابد وزدیدہ نظروں

سے ان کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ قائم کرتا رہا کہ اس کا اندھیرے میں پھینکا ہوا تیرھک ٹٹا نے پر لگا تھا۔ یہی سب تھا کہ شیطیل یہود نے حبیبانہ مسکراہٹ سے عابد شیکھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر ہم تم سے یہ کہیں کہ تم اس دولت مند خاندان کی بی بی کر دو جو خفیہ طور پر ان حریت پسند تنظیموں کو مالی سپورٹ کر رہا ہے اور اس کے صلے میں ہم منہ مانگی رقم دیں گے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟“

”میرا جواب یقیناً اثبات میں ہی ہونا چاہیے۔“ عابد شیکھری نے یکلفت اپنے چہرے پہ خوشی اور حریمت نہ تاثرات سموتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور پھر اپنے جیسے ناعمہ پر ایک دورہ سا پڑا وہ پھری ہوئی شیرینی کی طرح اپنے ہی ساتھی عابد شیکھری پر چھینی اور اپنے لائے بے تاخیر سے اس کے خوب رو چہرے پر چند کھرو پچھے ڈال دیے۔

”ذلیل۔۔۔۔۔ کتے، لاپٹی انسان۔۔۔۔۔ خدا مسلم۔۔۔۔۔ تو تمہارا یہ تھا اصل روپ۔۔۔۔۔ تم چند لوگوں کے لالچ میں۔۔۔۔۔ اپنے مسلم بھائیوں کے خلاف اپنا ضمیر ان یہودی کتوں کے ہاتھوں بیچ دو گے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں نہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

عابد شیکھری نے ناعمہ کے اس اچانک حملے پر کمال بخلاہٹ اور خوف زدہ ہونے کی اداکاری کی اور قنات لزور مزاحمت کرتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ خود پر حملہ آور ہونے کے لیے اکسایا اور پھر اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ شیطیل اور ڈیوڈ۔۔۔۔۔ ناعمہ کو سنبھالنے اور عابد شیکھری کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے غیر ارادی طور پر آگے بڑھے تو۔۔۔۔۔

عابد شیکھری نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ڈیوڈ کے ہولسنر سے پستول کھینچ لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کے بغیر ٹرگر دبا دیا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور ڈیوڈ کریمہ انگیز چیخ کے ساتھ اسی جگہ شیطیل کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے پھرتی سے پستول نکالا مگر عابد کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ جو اس کے چہرے پر بڑی جبکہ اس کے پستول کی دوسری گولی اس کے تیرے ساتھی کو چاٹ گئی، جو اس پر اسلحہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیطیل لات کھا کے دیوار سے جا گرا، پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ عابد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ نرینہ و خنوب کے مارے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے شیطیل کے چہرے سے شیطیل کو اپنے رحم و کرم پر دیکھتے ہوئے بار بار ”اے اے“ کے پشیم تصور میں وہ دونوں جلاوطن فلسطینی آفسرز کے چہرے تھماں ہو گئے جن کو ان سفاک لوگوں نے بے دردی

کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے شہید کیا تھا پھر دوسرے ہی لمحے عابد نے شیطیل کی پیشانی کی طرف نال کر کے ٹرگر دبا دیا۔ گولی چلی اور شیطیل کا سر چھن گیا۔

”آج میں نے ان دونوں بے گناہ فلسطینی آفسروں کے خون کا بدلہ لے لیا۔“ وہ جوش غیظ سے بڑبڑایا۔ ناعمہ جو ہکا بکا سی رہ گئی تھی، یکدم اٹھ کر عابد شیکھری کی طرف بڑھی اور اس سے بے اختیار لپٹ گئی پھر اس کے تیز کیلے ہاتھوں نے عابد کے چہرے کو جہاں جہاں سے زخمی کیا تھا وہاں وہاں وہ دیوانہ وار اپنے نرم و نازک لبوں کے مرہم رکھنے لگی۔ عابد شیکھری کے جلتے سلگتے وجود میں جیسے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ پھر وہ سنبھلا۔

”ناعمہ! جس طرح انہوں نے ہمارے ساتھ ڈراما کیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی ان کے ساتھ وہی کیا، یہ سب ضروری تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیں یہاں موت کے گھاٹ ہی اتارنے آئے تھے، چلو وقت کم ہے۔“

ناعمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تاہم وہ سنبھلی۔ پھر مردہ اسرائیلی ایجنٹوں کی لاشوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

”ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔“ عابد اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ جتنی جلدی لاشوں سے ہتھیار اٹھا سکتے تھے، وہ اٹھا لیے۔

”تمہارے ازلک ہاتھوں میں قلم کی جگہ ہتھیار؟“

عابد نے محبت کی حلاوت آمیز مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پر جوش لہجے میں بولی۔ ”مجھے ہتھیار چلانے آتے ہیں۔ میں ایک کرائم رپورٹر بھی ہوں اور یہ سب میری تربیت کا حصہ رہا ہے۔“

دفعاً دوڑتے ہوئے ہماری قدموں کی دھبک ابھری۔ عابد نے رائفل سیدھی کر لی تھی، ناعمہ کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ سردست یہ لوگ یہی اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھولا تو باریک جھری بنا کر عابد نے دیکھا، سامنے چکنے فرش والے کوریڈور میں وردی پوش چار پانچ مسلح افراد دوڑتے ہوئے اس طرف آتے دکھائی دیے۔ عابد کے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے پل کے پل ایک خطرناک اور جارحانہ فیصلہ کیا۔ اس وقت یہ سب اس کے نشانے پر تھے، اس نے سوچا۔ اگر وہ قریب آگئے تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا اور خطرناک بھی۔۔۔۔۔ چنانچہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ دروازے کو تھوڑا مزید کھول دیا اور گن کارخ ان کی طرف کر کے ٹرگر دبا دیا۔ وہ پانچوں اسرائیلی رقص اچل کرتے زمیں بوس ہونے

گئے۔ وقتاً تیز سائرن بجنے کی آواز ابھری۔ عابد نے ماتھے کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ پار کر کے وہ دائیں جانب کی راہداری کی طرف دوڑ پڑا..... ایک ساتھ کئی بھاری بوٹوں کی دھمک ابھری۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ اسرائیلی کمانڈوز کے گھیرے میں آنے والے ہوں اور عابد کو اس سفاک حقیقت کا یہ خوبی احساس تھا کہ اگر اس بار وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے تو یقینی سنگین موت سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ انہیں اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ فرار کی کوئی راہ سردست سمجھائی نہیں دے رہی تھی، تب اچانک ہی سامنے سے انہیں مسخ دشمنوں کا پورا دستہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ انہوں نے فوراً راستہ بدلا اور نسبتاً ایک دوسری چھوٹی راہداری میں آ گئے، جو ان کے پاؤں یا زو کے رخ پر تھی مگر وہاں پہلے ہی سے تین چار کے قریب مسخ دشمن ان پر نہیں سیدھی گئے اور پوزیشنیں سنبھالے ہوئے تھے، اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ان پر دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ کی جانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆
اپنے مطلوبہ مقامات پر پہنچنے کے بعد زبیدہ اور محسن نے ایک دوسرے سے رابطہ کر کے اپنی موجودہ پوزیشنوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ اب انہیں جس موقع کا انتظار تھا وہ بھی فوراً پیدر ہو گیا یعنی اپنا ٹک ویوز اسٹار کی ٹکدہ نما عمارت تاریکی میں ڈوب گئی، یہی نہیں سارا علاقہ گھٹا نوپ تاریکی میں غرق ہو گیا۔ محسن کا دل زور سے دھڑکا۔ گویا..... لٹلی والا بی گروپ اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس بات نے اس کے اندر جوش بھر دیا۔
عارضی بجلی دینے والا پاور پلانٹ ان کے نشانے پر تھا جدھر خود کار نظام کے تحت اسٹیژ ہائی جیٹریٹرز دھیرے دھیرے اسٹارٹ ہونے لگے تھے لیکن محسن اور اس کے ساتھیوں نے منصوبے کے مطابق پہلے ہی اسے اپنے نشانے پر لے رکھا تھا۔ ان کے پاس فقط ایک ہی راکٹ لاچر تھا جو زبیر نے اپنے کاندھے پر ناکار کیا تھا پھر محسن کا اشارہ پاتے ہی وہ اس نے فائر کر دیا۔ دم یہ خود فضا میں "سامیں" کی آواز ابھری، عارضی پاور روم کی کنٹرول اور سینٹ سے بنی دیواریں لرز اٹھیں۔ ساعت ٹھنک دھماکے کے ساتھ ہی پاور روم میں آگ بھڑک اٹھی اور پھر یہ لوگ عمارت کے بیرونی گیٹ کی طرف دوڑے۔ جدھر برائے نام ہی سکیورٹی کا بندوبست نظر آتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی کہ اندر توڑی دیر پہلے اسرائیلی افسران صادق الخیری کی

شہادت پر جشن منانے میں مصروف تھے نیز کسی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی یہاں آنے کی جرات بھی کر سکے گا۔ عابد جب کسی قوم پر زوال لاتا ہے تو سب سے پہلے انہیں شہادت میں ڈال دیتا ہے، ادھر زبیدہ نے بھی اپنے تئیں ساتھیوں کے ساتھ ڈبو ڈبوا اسٹار کی عمارت کی طرف حرکت کی، انہوں نے ضرورت کی حد تک نارنج روشن کر رکھی تھی۔ دونوں گروپ ایک میٹنگ پوائنٹ پر پہنچ کر ملے اور گیٹ پر دھاوا بول دیا۔ کچھ دقتی بم بھی پھینکے گئی اسرائیلی دشمنوں کی کرپس انگیز تھیں ابھریں۔ گیٹ ٹوٹ گیا تھا۔ یہ سب اندر داخل ہو گئے، زبیدہ کے دل و دماغ میں جوش بھرا ہوا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کے سارے اہم شکار ادھر اکٹھے تھے، یہ شکار نہیں بلکہ ہتھیار تھے۔ ایسے قاتل شیطان جن کی گردنوں پر صادق الخیری اور قیصر اٹھیں سمیت جانے کتنے حریت پسند رہنماؤں اور مصوم بے گناہ فلسطینیوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے تھے۔

اندرو داخل ہوتے ہی یہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک پارچہ دائیں بائیں دو حصوں میں بٹ گئے اور مرکزی دروازے کی طرف دوڑے۔ اپنی ناریوں کی محض ضرورتاً ایک "جھپک" مارتے بچھڑا دیتے اور اندازے سے پیش قدمی کرتے مگر..... محسن کے قریبی ساتھی زبیر سے ایک قاتل غلطی ہو گئی۔ اسے ایک موقع پر اڑتی ہوئی ایک ضرورت محسوس ہوئی اور اسے ایک مسخ دستہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ اس نے فوراً نارنج بجھا دی مگر دشمن دستے نے روشنی کا سہارا لے کر اس جانب ایک محتاط اندازے سے اپنی گن کا منہ کھول دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ابھری اور تارک گہری سیاہ چادر میں سلگتے نچھتے بچھ گئے، زبیر کو یوں لگا جیسے ان گنت سلگتی ہوئی سلاخیں اس کے وجود میں کسی نے اتار دی ہوں۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی آخری تھنی بڑی کرب انگیز تھی، ایک دوسرا ساتھی بھی ان گولیوں کی زد میں آ گیا اور زبیر کی طرح اس نے بھی جام شہادت نوش کر لیا۔ محسن کا دل لبھو سے بھر گیا۔ اس نے زبیر کو آوازیں دیں مگر جواب نداد۔ زبیر اور اس کے ساتھی کی چیخوں پر دوبارہ قاتل دستے نے ان پر فائرنگ کی مگر تب تک انہیں بھی اپنی خطرناک پوزیشن کا ادراک ہو چکا تھا۔ بہت تیزی کے ساتھ انہوں نے گر کر اپنی جگہ بدلی اور بہتے ہی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ موجود تھے وہاں گولیوں کی پوری باڑ پڑی۔ اگر انہیں جگہ بدلنے میں چند ثانیوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو محسن سمیت سب چھلنی ہو چکے ہوتے، اندھیرے

شہیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

91

جہانگیر بکس

550/- **آخری معرکہ**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

550/- **اور تلواریٹھ گئی**
خیر سوس (تہذیبی ناول) کی داستان
جس نے محمد بن قاسم کی غیرت اور
جاہل لوگوں اور انہوں نے ان کی
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

475/- **معتز علی**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

450/- **انسان اور دیوتا**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

550/- **گشده قافلے**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

300/- **اندر جہنی رات کے مسافر**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

450/- **کلیسا اور آگ**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں

300/- **پورس کے ہاتھی**
عبدالعزیز کی مہم کی تاریخی تصویر
پاکستان کی تاریخ میں گروہوں کی
جنگوں کے بارے میں اس ناول میں



ادولت
Jagan Mohan Prasad
جمہوریہ پاکستان

- 165/- اتوالی حضرت علی المرتضیٰ
- 165/- اتوالی آیت اللہ کلام
- 195/- حکایات گلستانِ سعدی
- 140/- اتوالی شیخ سعدی
- 180/- حکایات رونق
- 170/- دلچسپ و عجیب حقائق
- 193/- حکایات بوستانِ سعدی

042-35757088 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

آئی... اور وہ دھڑا دھڑا شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ آس پاس کا ماحول دور تک سرخ نارنجی سی قرمزی روشنی میں نہا گیا تھا۔ پلانٹ عمل طور پر تباہ ہو گیا تھا اور اپنے ساتھ ان دونوں اسرائیلی جنگی جہازوں کا پتھر اور ان کے سامروں کو بھی نکل چکا تھا۔ اس عظیم فتح کی خوشی میں لیلیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ان میں اپنے ساتھیوں اور بالخصوص جمال کی یادیں آخری فیصلہ کن لمحات میں دینے والی بے دریغ قربانی کا جذبہ بھی شامل تھا۔

”اشو لیلیٰ!..... اللہ نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔“ باقر نے ہولے سے کہا اور پھر دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا دل اب یوں سرخ کی طرف تھا۔ ابونصر نے کہا تھا کہ وہ ان کی کامیاب واپسی کا خنجر ہوگا اور موقع ملا تو وہ انہیں لینے کے لیے بھی آئے گا اور وہی ہوا۔ انہوں نے ابھی چند فرلانگ کا سفر طے کیا ہوگا کہ ابونصر ایک اونٹ ریز سے میں انہیں لینے آن پہنچا تھا۔ اسے باقی ساتھیوں کی موت کا دکھ بھی تھا۔ تاہم خوشی بھی تھی کہ انہوں نے اسرائیل کی کڑواہٹ دیکھی تھی۔ ان کا مستقبل کا ایک بڑا خفیہ منصوبہ مکمل ہونے سے پہلے سبوتاژ کر ڈالا تھا بلکہ ان کا سب سے بڑا بجلی گھر بھی تباہ کر دیا تھا۔ جو اسرائیل کے چند بڑے شہروں کو بجلی سپلائی کرتا تھا۔

یہ لوگ بہ خیر و عافیت سرانے پہنچ گئے لیکن ابونصر نے انہیں رکنے نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی بھی وقت یہاں بڑے پیمانے پر تلاشی اور کھانڈ پھانڈ کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے انہیں عرب بدو کا ہمیں بھر کے آگے روانہ کر دیا۔

ان کا رخ بیت صفانہ کی پہاڑیوں کی طرف تھا، جدھر ”المجاہد“ کا خفیہ ٹھکانا تھا۔ اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے لیلیٰ کو محفوظ اور خفیہ گزرگاہوں کا بہ خوبی علم تھا۔ باقر اور لیلیٰ دونوں ایک اونٹ پر سوار تھے۔ اونٹ سدا حایا ہوا تھا جو مسافر کو چھوڑ کر خود ہی واپسی کا رخ کرتا ہے۔ خشک ویران تاریک رات دسے پاؤں سرک رہی تھی۔ اوپر تاروں بھرے آسمان پر ٹکا طباقی چاند گرد و پیش میں طلسماتی چاندنی پنچا اور کر رہا تھا۔ دونوں خاموش تھے تاہم دل ہی دل میں زبیدہ اور اپنے ساتھیوں کی ہم کی کامیابی کی دعا مانگ رہے تھے۔ باقر کے دل میں لیلیٰ کے لیے جو جذبات تھے وہ رات کی اس طلسماتی فضا میں اپنا اثر دکھانے لگے۔ باقر بھی ایک جوان مرد تھا۔ اس کے دل میں بھی جذبات تھے، پھر وہ لیلیٰ

مطالعہ کیا تھا، اب تک اسے اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب ایسا محسوس نہیں ہوا تھا جس نے سب سے انسانیت اور انسان سے محبت کا درس دیا تھا۔ ظلم، زیادتی اور نفرتوں کو فساد کی جڑ کہا تھا جبکہ بازغہ خود اپنی آنکھوں سے اپنی یہودی قوم کو نیچے فلسطینیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتا دیکھتی آئی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ بازغہ کو ایک یہودی ہونے کے ناطے خود اپنے آپ سے بھی شرم آ رہی تھی۔

جنرل فرناش کے اس اعلان کی تائید میجر ایبودشاہک اور باریق شمعون وغیرہ نے بھی کی تھی۔ جنہیں اختلاف تھا وہ اپنا اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

فائرنگ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، دتی بم بھی پھینکے جا رہے تھے، جنرل فرناش اور اس کے ہمناؤ چوکنے ہو گئے تھے اور اپنے ارد گرد غورتوں اور بچوں کو زبردستی اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا۔

☆☆☆☆

سوچنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس..... دونوں نے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور جھکے جھکے انداز میں دوڑتے ہوئے عمارت کے جنوبی حصے کی دیوار کی جانب بڑھ گئے۔ لیلیٰ نے یہاں آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو باقر نے اسے بازو سے تھام لیا اور بولا۔ ”ابھی ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ دونوں بیلی کا پتھر ہم پر لڑائیوں میں دیں گے۔“

”تم پاگل ہو گئے ہو؟“ لیلیٰ بولی۔ ”اندر میں تاہم بم فٹ کر چکی ہوں اور صرف بیس منٹ کا ٹائم بچس گیا ہے میں نے۔ یہ عمارت تباہ ہونے والی ہے۔ ہم بھی.....“

”لیلیٰ!..... صبر کرو۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے، تمہارا انتظار کرو۔“ باقر نے پر جوش لہجے میں کہا۔ لیلیٰ

الہ گئی۔ باقر کی ذہانت سے وہ واقف تھی، اس لیے وہ بھی..... گزرتے وقت کا خاموشی سے انتظار کرنے لگی۔

دونوں بیلی کا پتھر پہلے چند منٹوں تک عمارت کے اوپر منڈلاتے رہے اور نیچے سرخ لائٹ پھینکتے رہے۔ اس کے بعد وسیع و عریض احاطے میں اتر گئے۔ ادھر بم پھینٹنے میں

صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے، جیسے ہی بیلی کا پتھر نیچے ہوئے، باقر نے لیلیٰ کا بازو پکڑا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔

دونوں جتنی تیز دوڑ سکتے تھے، دوڑتے رہے، تیز..... بہت تیز اور پھر ان کے عقب میں ذرا دور کیے بعد دیکر سے دھماکے ہونے لگے۔ انہیں اپنے پیروں کے نیچے زمین تک لڑتی محسوس ہوئی۔ دونوں اندھا دھند دوڑتے دوڑتے زین بوس ہو گئے اور ایشی بیلی گھر میں آگ بھڑک

لہذا بازغہ نے چپ سادہ لی مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے اب جنرل فرناش وغیرہ سے ہی نہیں اپنی مکار، دغا باز اور منافق قوم سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔ بازغہ نے نیویارک یونیورسٹی میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے مختلف اقوام اور مذاہب سے متعلق ہسٹریکل بکس کا بھی

سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”جنرل فرناش..... کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ فوراً غورتوں اور بچوں کو دوسرے کمرے میں منتقل کرنے کا بندوبست کرو۔ ان کی جانیں خطرے میں ہیں۔“ اس وقت جنرل فرناش کے ایک ہاتھ میں پستول چپکنے لگا۔ جس کی نال کا رخ اس حکومتی افسر کی طرف تھا۔ دوسرے ہی لمحے نال سے ایک دھماکا ہوا اور گولی اس چیختے چلاتے حکومتی اہلکار کی پیشانی میں بیوست ہو کر اس کا بھیجا چاٹ گئی۔ وہ آواز نکالنے بغیر زخمی ہو گیا۔ کئی خواتین اور بچوں کی دہلی دہلی سسکیاں خارج ہوئیں۔ جنرل فرناش کے سفاکانہ اقدام پر جیسے یکنفرت سب کو سانس ہو گئی اور اس خوفناک ماحول میں جنرل آئزک فرناش کی بھیڑیے جیسی فراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔

”یہاں صرف میرا حکم چلے گا۔ جنرل آئزک فرناش کا حکم..... یہودی قوم اور گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں کسی بھی مصلحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں اور ہم یقین دلاتے ہیں کہ کسی کو کچھ بھی نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہم ان فلسطینی حریت پسندوں کی فطرت کو جانتے ہیں یہ لوگ بھی غورتوں اور بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتے ان کی موجودگی ہمیں تحفظ دے گی۔“

یہودی کشنر پیریز ناؤن کی جوان ماہی لڑائی بیلی بڑے غور سے ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش کی

بات سن رہی تھی اور اس سفاک اور منافق شخص سے سخت نفرت بھی محسوس کرنے لگی تھی، جو اپنے منہ سے حریت

پسندوں کی نیک فطرت کا خود اعتراف کر رہا تھا۔ بازغہ کا جی تو

چاہا کہ وہ جنرل فرناش سے پوچھے کہ جب فلسطینی حریت پسند غورتوں اور بچوں کا اتنا لحاظ کرتے ہیں تو پھر اسرائیلی بمبار

طیاروں نے غزہ، حیفہ اور نابلس کی فلسطینی مسلم آبادیوں میں،

حتیٰ کہ اسپتالوں میں وحشیانہ گولہ باری کیوں کی تھی، جس کے نتیجے میں ہزاروں غورتوں اور بچے ہلاک ہوئے تھے مگر بازغہ

باوجود اپنی شدید خواہش کے جنرل آئزک فرناش سے یہ کڑوا سوال نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس بھیا تک انسان کی بربریت کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے اور اس کے باپ

پیریز ناؤن کو بھی گولی مار سکتا تھا۔

لہذا بازغہ نے چپ سادہ لی مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے اب جنرل فرناش وغیرہ سے ہی نہیں اپنی مکار، دغا باز اور منافق قوم سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔ بازغہ نے نیویارک یونیورسٹی میں صرف اعلیٰ تعلیم ہی حاصل نہیں کی تھی بلکہ اس نے مختلف اقوام اور مذاہب سے متعلق ہسٹریکل بکس کا بھی

کی وجہ سے اب تاریکی کے پردے میں چپکتے شعلوں کے تبادلوں کا اندازہ کر کے موت و زندگی کا یہ ”جوا“ کھیلا جا رہا تھا۔ زبیدہ کے گروپ نے اپنا واؤ پھینکا۔ جدھر سے شعلے نکلے تھے اس طرف اس نے فائرنگ داغ دی۔ کئی دشمنوں کی کریہہ انگیز چیخیں ابھری تھیں اور اس دوران زبیدہ حلق کے بل شیرینی کی طرح گرجی۔ ”اندر داخل ہونے کی کوشش کرو..... جلدی.....“

اس وقت جانے کیوں بار بار اس کی لبورنگ آنکھوں کے سامنے ہزاروں بے گناہ فلسطینی غورتوں بچوں کی آہیں

دسکیاں گونجنے لگیں اور ان شہداء کے چہرے بھی جن جن میں صادق الخیری اور قیصر اطمینانی کے چہرے بھی شامل تھے،

صادق الخیری کو جس بیدردی اور بربریت کا ڈیوڈ اسٹار اور موساد کے مشترکہ آپریشن میں نشانہ بنایا گیا تھا،

زبیدہ آج جلد سے جلد وہ حساب بے باق کرنے کے لیے بے چین تھی۔ ادھر عمارت کے اندر بری طرح کھلیلی جگہ کئی

تھی، غورتوں اور بچوں نے رونا چلانا شروع کر دیا تھا۔ جنرل فرناش، ایبودشاہک، اشفاق شامیر، باریق شمعون اور دیگر

حکومتی افسران بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے، مگر اس کے بعد صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں

نے فوراً اندھیروں میں گرتے پڑتے واروم پانچ کر حریت پسند چھاپا ماروں کے حملے کی اطلاع..... اسرائیلی جی ایچ

کیو کو دے دی تھی کسی بھی وقت وہاں سے ملک کی آمد متوقع تھی مگر دھماکوں سے عمارت کے دروازے لڑ رہے تھے۔

اس دوران چارج لائیں اور جمنی ایمر جنسی لائیں موجود تھیں وہ روشن کر لی گئی تھیں..... بازغہ بھی فکر مند نظر آ رہی

تھی، یہودی کشنر پیریز ناؤن کو اپنی بیٹی کی بھی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ جانے کس حکومتی اہلکار نے چلا کے کہا۔

”غورتوں اور بچوں کو ایک کمرے میں لے جا کر محفوظ کر دیا جائے فوراً.....“

”نہیں۔“ دفعتاً جنرل فرناش کی تھکمانہ اور کرخت آواز گونجی۔ ”یہ غورتیں اور بچے..... ہمارے لیے تحفظ کا باعث نہیں گے۔“ جنرل فرناش کے مکروہ لہجے سے بلا کی

عیاری پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت چند اہلکاروں نے اندر آ کر بدحواسی میں اعلان کر دیا۔ ”حریت پسند چھاپا ماروں کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً ملک کی ضرورت ہے۔ وہ کسی بھی

وقت یہاں در اندازہ ہو سکتے ہیں۔“ اطلاع پر وہی حکومتی اہلکار پھر چلایا اور جنرل فرناش

میں غور سے دیکھو..... آئینہ سمجھو۔ بجلا آئینے میں دیکھنے سے کس کی صورت نظر آتی ہے؟“

باقتر نے اپنے خفیہ جذبات کی رمز یہ ترجمانی کرتے ہوئے لیلیٰ کے خوابیدہ دل کے تاروں کو جیسے پھینچتا تو لیلیٰ کے حسین چہرے پر پہلے تو حیرت کی رقت ابھری پھر یہ رقت..... ایک ہلکی سی سرتی میں بدل گئی۔

”برامت منانا لیلیٰ میں نے آج تک تم سے کبھی اپنی یکطرفہ اور خاموش محبت کا اظہار نہیں کیا اور کرتا بھی کیسے؟“

وہ بے اختیار ہو کر یولا۔ ”ہم جس منزل کی راہ کے مسافر ہیں وہاں حب الوطنی اور وطن پر جاں فدا رہنے سے بڑھ کر کچھ نہیں سوچا جاتا مگر محبت تو محبت ہوتی ہے نا..... لیلیٰ..... اس کے تو ہزار رنگ ہوتے ہیں اور یہ ہر رنگ سودائے عشق ابھارتی ہے۔ چاہے کیسے ہی حالات ہوں ہم کچھ فطری تقاضوں سے چاہتے بھی تو مت گھس موڑ سکتے۔“

”محبت کا دوسرا مفہوم قربانی بھی تو ہوتا ہے باقرا! اس کی بات پر لیلیٰ نے دھیرے سے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

باقتر یولا۔ ”ہاں لیلیٰ! میں تو اپنے وطن کی محبت میں اپنی جان تک کی قربانی دینے کو تیار رہتا ہوں کہ محبت کا درس ایسا دہرا دہرا بھی ہے۔“

”دعا ہے، میری نسبت..... تم نے اپنی محبت..... ایک عالم گھر بیٹوں کی طرح میں نے بھی اسے اپنا..... لیلیٰ نے لیلیٰ کا جیون ساتھی تسلیم کر لیا تھا۔ اس وقت تو مجھے بھی محبت کے مفہوم کا علم نہ تھا کہ یہ ہوتی کیا ہے اسی دوران وہ اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ میرا بھائی بھی مجاہدوں کے اس گروہ میں تھا جس میں وقار تھا۔ اس کے بعد میری سوچ کا دھارا بدل گیا اور پھر میں نے بھی اپنی زندگی، اپنی سانسیں آزادی وطن کے لیے وقف کر ڈائیں۔ لیلیٰ..... لیکن..... اب کاش.....“ لیلیٰ اٹکنے لگی۔ تاہم اس نے جملہ مکمل کر لیا۔ ”اب شاید تمہاری باتوں سے مجھے بھی محبت کا مفہوم سمجھ آنے لگا ہے۔“ لیلیٰ کی بات نے باقتر کے دل کو بے طرح دھوکا دیا۔ اظہار محبت نہ بھی کرو تو انتخاب راہ خود ہی راستے میں پھول بچھا دیتا ہے، جس کی خوشبو پتا دیتی ہے کہ ادھر بھی ہے آگ برار لگی ہوئی۔

”لیلیٰ! میں قسم کھاتا ہوں میں ہر قربانی کے لیے تیار رہوں گا۔“

”تو پھر وعدہ کرو۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔ اس محبت کو وطن کی محبت پر بھی ترجیح نہیں دوں گا۔“ باقتر دل کی عین گہرائیوں سے یولا اور ایک جگی محبت کا کمال دکھاتا ہے۔

سپنس ڈائجسٹ

پھر دفعتاً اسے اپنے کھردرے مگر مضبوط ہاتھوں میں کسی کی نرم و نازک ہاتھ کا پیار بھرا لمس محسوس ہوا۔ یہ لیلیٰ کا ہاتھ تھا جس سے باقتر کا دل ہی نہیں روح تک سرشار ہو گئی۔

☆☆☆☆

آگے بھی موت تھی اور پیچھے بھی۔ زندگی کی راہ مسدود ہو چکی تھی کہ اچانک ہر سوتار کی پھیل گئی۔ نامرہ پریشان اور متوحش ہوئی مگر عابد شکمہری نے اس موقع سے فوری طور پر فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور فوراً نامرہ کو جھکے جھکے انداز میں واپس پلٹنے اور عقب میں اس جگہ مرنے کی سرگوشی میں تاکید کی، جدھر سے یہ آئے تھے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ دونوں اسرائیلی مسلح دستے اندھیرے میں اندھا دھند فائرنگ کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ اس طرح اپنے آدمیوں کی جانوں کے زیاں کا بھی خدشہ تھا تاہم انہوں نے پیش قدمی کے طور پر دوڑ لگا دی۔ اندھیرے میں دونوں دستے ایک دوسرے سے ٹکرائے، ان کا خیال تھا وہ درمیان میں اپنے شکار کو دلچسپی میں گم کر بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ تو انہیں جل دے کر راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ادھر وہ دونوں تاریکی میں محض اندازوں سے دیکھ رہے تھے کہ کون سا کون سا فرار کی کوشش میں مصروف کار ہے۔ مگر ایک ہلکی گھبراہٹ..... فی آواز سنائی دی اور لائٹ آن ہوئی۔ شاید جزیئر آن کر دیے گئے تھے۔ سائزن بھی بچ اٹھے تھے۔ عابد، نامرہ دونوں دوڑتے ہوئے ایک زینے کے قریب پہنچے۔ اس عمارت کے کل وقوع کے بارے میں انہیں کوئی اندازہ نہ تھا کہ کون سا راستہ بہاں جاتا تھا؟ اور لگا سی کا راستہ کہاں تھا؟ تاہم ایک محتاط اندازے میں گرد و پیش کے جائزے کے دوران عابد کو کچھ اندازہ ہوا تھا کہ وہ گراؤنڈ فلور میں ہی تھے لیکن پھر ایک نیچے جانے والے زینے کو دیکھ کر وہ شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ اس دوران نامرہ کا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ابھی ہمارا باہر لگانا ناممکن ہی ہوگا۔ یہاں سب ہمارے سلسلے میں ہائی الرٹ ہو چکے ہوں گے جلد بازی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

”تمہارا خیال ہے، ہمیں کہیں چھپ جانا چاہیے؟“

”ہاں! ممکن ہے وہ یہ سمجھیں کہ ہم فرار ہو چکے ہیں، معاملہ کچھ خفنا پڑ جائے گا تو نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

”سوچ لو، کہیں یہ عمارت قید خانہ ہی نہ بن جائے گا۔“

سپنس ڈائجسٹ

”ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ نامرہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی اس کی زندہ دلی عابد کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

”میرا خیال ہے یہ زینہ کسی ہیمنٹ کی طرف جاتا ہے۔ ادھر ہی چھپنے کی کوئی جگہ ڈھونڈتے ہیں۔“ عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ عقب سے بھاری دوڑتے قدموں کی دھمک ابھری۔ دونوں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر زینے اترنے لگے۔ جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئے یہاں سناٹا تھا مگر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ یہاں ہر طرح کی چھوٹی بڑی گاڑیاں اور چند ٹرک بھی کھڑے تھے۔

”یہ عمارت کی پارکنگ لگتی ہے۔ آؤ اس کا گیٹ دیکھتے ہیں۔“ عابد نے جوش تیلے کہہ کر آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ یکدم زینہ بھاری قدموں کی دھمک سے گونج اٹھا۔ دونوں کی خوشی کا فور ہو گئی اور اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔

”وہ نیچے آرہے ہیں۔“ نامرہ نے مرتعش سرگوشی میں کہا۔ عابد نے تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اسے یہاں چھپنے کی کوئی معقول جگہ نظر نہیں آرہی تھی پھر وقت بھی کم تھا، مسلح دشمن کسی بھی وقت ہیمنٹ میں آسکتے تھے، ایک لمحے کو تو دونوں کو یوں لگا وہ خود ہی کسی چوہے دان میں آن پھینے ہوں۔ تب دفعتاً عابد کے ذہن میں ایک خیال، جہما کے سے ابھرا۔ وہ خیال ذرا قاصطی پر کھنڑی گاڑیوں کی قطار کے درمیان کھڑے ٹرک کو دیکھ کر ابھرا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔

اب ہیمنٹ کا فرش دوڑتے بھاری یوٹوں کے شور سے گونجنے لگا تھا۔ آنے والے دائیں بائیں پھیل رہے تھے۔ ان دونوں کے دل بری طرح دھوکا رہے تھے اور سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ تاہم مطلوبہ ٹرک کے پاس پہنچ کر یہ اس کے اوپر سوار ہونے کے بجائے نیچے سرک گئے۔ عابد ٹرک کے نیچے کا جائزہ لینے لگا اور پھر اسے ایک خلا دکھائی دے گیا۔ نامرہ سے یولا۔ ”جلدی کرو، خود کو اس خلا میں ایڈجسٹ کرو..... ہری اپ۔“

”مم..... مگر..... تہت..... تم۔“ وہ ہکلائی۔

”دیر مت کرو..... میں بھی اپنا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔“ عابد یولا پھر جیسے نامرہ نے عابد کی مدد سے خود کو ٹرک کے نچلے خلا میں پھنسا یا۔ عابد تیزی سے نکلا۔ پاس کی ایک بڑی سی جیب کے نیچے سرک گیا۔ ٹھیک اسی وقت اسے اس رو میں بھاری یوٹوں کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جیب کے نیچے خلا تلاش کیا مگر بہت تنگ خلا تھا۔ اس کے اندر خود کو

سپنس ڈائجسٹ

فرناش خارش زدہ کتے کی طرح ہلبلا کر کمشنر پیر سے بولا۔
"کمشنر پیر! اپنی لاڈلی بیٹی کو سمجھاؤ، یہ کیا کو اس کر رہی ہے۔۔۔۔۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔"
"میں تم تک گنتی گنوں گا۔ اس کے بعد تم پر فائر کھول دوں گا۔" اس درمیان میں ایبھو شاہبک نے چیخ کر کہا۔ "ایک۔۔۔۔۔"

"مجھے آج اپنی یہودی قوم کا اصل اور بھیا تک چہرہ دکھائی دے گیا ہے۔ پاپا! اور مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔" بازغہ بھی خاموش رہنے والی کہاں تھی۔ اس کا باپ پریشان ہو گیا۔ وہ بیٹی کو خاموش رہنے کی تلقین کرنے لگا مگر اس دوران محسن کی عقلمانی نظروں نے دیکھا۔ جنرل فرناش کے پستول کا رخ قریب کھڑی اس لڑکی (بازغہ) کی طرف ہونے لگا۔ محسن جنرل فرناش پر ابھی گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر اس نے فوراً ایک جرات مندانہ حرکت ضرور کر ڈالی۔ ادھر جنرل فرناش کے پستول نے دھماکے سے شعلہ اگلا۔ ادھر محسن نے بازغہ پر جست بھری اور اسے رگیدتا ہوا پکٹے فرش پر چاڑھا۔ بازغہ پر چلائی ہوئی جنرل فرناش کی گولی محسن کے ہاتھ بازو میں جا گئی۔ عورتوں بچوں کی چیخیں خارج ہو گئیں۔۔۔۔۔ مگر بازغہ فوج گئی تھی اور محسن خطرے کے دائرہ کار میں آ گیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ چپے ہی بازغہ کو سنبھال کر کھڑا ہوا۔ اس کے قریب کمشنر پیر بڑکودا انہیں نے پھرتی کے ساتھ اپنا سر دس ریوا اور نکال لیا تھا اور۔۔۔۔۔ محسن پر تان لیا۔ بازغہ نے جو اپنے باپ کی یہ حرکت دیکھی اور یہ بھی کہ اسے بچانے کی خاطر یہ دلیر مجاہد خود بھی زخمی ہو کر موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا ہے تو وہ یکدم محسن کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی اور اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ "پاپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ جس نے میری محض انسانیت کی خاطر جان بچائی۔۔۔۔۔ آپ اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔"

"یہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہماری قوم کے دشمن ہیں۔ ہمت جاؤ آگے سے بیٹی۔" کمشنر پیر نے چیخا۔ تو اس وقت جنرل فرناش نے پیر سے حکمانہ درستی سے کہا۔ "کمشنر! اڑاؤ گولی سے دونوں کو۔۔۔۔۔ شوٹ ہیمن۔۔۔۔۔" صورت حال ایسا کی جان لیوا حد تک خطرناک ہو گئی تھی، دفعتاً فائر ہوا اور ہال میں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل فرناش کے نائب میجر ایبھو شاہبک کی کریہہ انگیز چیخ ابھری۔ زبیدہ کی چلائی ہوئی گولی اس کی گردن میں بیوست ہو گئی تھی اور غالباً شہ رگ متاثر ہونے کے باعث

"نو ایڈ نیور۔۔۔۔۔ ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے۔" جنرل فرناش کی کریہہ آواز ابھری۔ الٹا وہ انہیں دھمکی دیتے ہوئے بولا۔ "تم سب زندہ نہیں بچ سکو گے۔ بہتر یہی ہے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔" اس وقت ہال کمرے میں برست چلنے کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ کئی عورتوں اور بچوں کے منہ سے مار۔۔۔۔۔ دہشت کے چیخیں نکل گئیں۔ چھت کا پلٹے اکڑ کر پھرنے لگا اور گردو غبار کا مختصر سا مرفولہ ہال میں رقص کرنے لگا۔ یہ محسن نے برست چلایا تھا۔ نشانہ ہال کی بلند چھت ہی تھا۔

زبیدہ دہاڑ کر فرناش سے بولی۔ "ہتھیار پھینک دو۔ جنرل اور نہ ہم گولیوں کی بارش کر دیں گے۔" بازغہ نے غوراً غوراً مٹی بھر جیالے جاننا زوں کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ جو اب میں ایبھو شاہبک نے کہا۔ "تم لوگ ہمارا کچھ نہیں بناؤ سکتے۔ میں صرف تم تک گنوں گا۔ کمرے سے نکل جاؤ۔ ورنہ ہم فائر کھول دیں گے۔"

اب زبیدہ سمیت محسن کے چہرے پر بھی الجھن طاری ہوئی تھی کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ یہاں عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں یہ مجاہد فائر کھولنے سے قاصر تھے، بے شک یہ یہودی تھے مگر انہیں ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ وہ بچے معصوم بچوں اور عورتوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے۔
"ان سردو دوں کا نشانہ بننے لگا فائر نکول دو۔ عزیزی زبیدہ! یہ ہمارے ساتھ مکاری کر رہے ہیں۔" ایک مجاہد نے چلا کر زبیدہ سے کہا تو وہ ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر منع کرتے ہوئے بولی۔

"نہیں گولیاں چلنے کی صورت میں یہاں موجود بچے اور عورتیں بھی زد میں آ جائیں گے اور ہمارا خمیر اور ایمان گوارا نہیں کرتا کہ۔۔۔۔۔ ہم ان معصوم بچوں اور عورتوں کو جان لیوا خطرے میں ڈالیں۔" بازغہ یہ سن کر متحیر ہو گئی۔ اس کا چہرہ کی اندرونی جوش تلے تمٹانے لگا۔ وہ چلا کر زبیدہ اور محسن کی طرف دیکھ کر عجیب دیوانگی کے عالم میں بولی۔

"یہ جنگ ہے اسے جنگ ہی رہنے دو۔ جذبات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم بھول گئے۔۔۔۔۔ اسرائیلیوں نے تمہارے گھروں پر بمیں وحیاناہہ بمباری کی تھی، کتنی عورتیں اور بچے اس میں لقمہ اجل بنے تھے، اب تم کیوں اپنے دشمنوں پر یہ زہم کر رہے ہو۔ چلاؤ۔۔۔۔۔ گولیاں۔۔۔۔۔" ایک عجیب جوش تلے بازغہ کا دم بھولنے لگا تھا۔

زبیدہ اور محسن قدرے حیرت سے اس خوب صورت کی مگر سبیدہ صورت یہودی لڑکی کو دیکھنے لگے۔ اس پر جنرل

ٹرک کی طرف جھانکا اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ آئل اور گریس میں لتھڑی ہوئی ناغمہ ٹرک کے نیچے فرش پر گری ہوئی تھی اور بری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ وہ پار پار دوبارہ ٹرک کے خلا میں اٹھنے اور اٹکنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر اب اس کا فائدہ نہ تھا۔ دشمنوں کو شبہ ہو گیا تھا۔ وہ آواز کی سمت اب تیزی کے ساتھ پلٹ رہے تھے، جیتی جیتی ہوتی بازی ہار کی طرف مڑ گئی تھی۔ ایسی ہار۔۔۔۔۔ جس میں جیتی موت کے سوا زندگی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

☆☆☆
زوردار آواز سے دروازہ کھلتے ہی وہاں موجود عورتوں اور بچوں کے حلق سے بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اس بلند چھت والے بڑے سے ہال کمرے کے دوپٹ چوڑے دروازے پر سب سے پہلے زبیدہ اور محسن جھپک جھپک اب چار تھے۔ جنرل فرناش سمیت بارق شمعوں ان چہرہ مجاہدوں کو دیکھ کر ایک لمحے کو حیرت زدہ بھی رہ گئے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جھپکا یا پار حریت پسند تعداد میں کئی ہوں گے، جنہوں نے آنا قانا پوری عمارت پر دھاوا بول کے اس پر اپنا تسلط بجالایا ہوگا مگر ان مٹی بھر چند مجاہدوں کو دیکھ کر انہیں اس بات کا سخت بچھتاوا ہونے لگا کہ انہیں بھی ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ سرفروش گنتی میں توڑے سبھی گمران کے حوصلے اور آہنی عزم اپنے سے کئی گنا زیادہ نظری رکھنے والے دشمنوں سے نکرانے کی ہمت رکھتے تھے اور ایسا ہوا تھا مگر فرناش اور شمعوں وغیرہ کو سلی بھی تھی کہ وہاں پہنچنے والی بھاری کمک کے سامنے یہ چند مجاہد زیادہ دیر نہیں ٹک سکتے۔ "ہالٹ۔۔۔۔۔ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔" زبیدہ نے پھری ہوئی شیرنی کی طرح دہاڑ کر کہا۔

زبیدہ کی عقلمانی اور برساتی ہوئی نگاہیں جنرل فرناش اور بارق شمعوں پر جمی ہوئی تھیں، نیز وہ ان کے دست راست ساتھیوں کو بھی پہچان رہی تھی جبکہ فرناش وغیرہ نے بھی اپنے پستول نکال لیے تھے۔ جنرل فرناش اور شمعوں نے اپنے گرد عورتوں اور معصوم بچوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ قریب کھڑی بازغہ کے چہرے پر نفرت کے تاثرات تھے۔ "پت دی گن ڈاؤن۔۔۔۔۔ ہری اپ۔۔۔۔۔" محسن نے گرد آواز میں فرناش وغیرہ سے کہا جبکہ زبیدہ کے چہرے پر اب جوش کے ساتھ کچھ الجھن آمیز پریشانی کے تاثرات نمودار ہونے لگے تھے، وہ شاید ان کی بزدلانہ چالاکی اور مکاری کو سمجھ رہی تھی۔

پھنسانا اسے مشکل نظر آ رہا تھا مگر اب مزید چانس لینے کا وقت بھی نہیں رہا تھا، اس کے دائیں بائیں ان گنت بھاری بوٹ نظر آنے لگے تھے اور دشمن گاڑیوں کے نیچے جھک جھک کر دکھ رہے تھے۔ اس کے نظر آ جانے کی صورت میں وہ اپنے ہتھیاروں کے منہ کھول سکتے تھے۔ عابد ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر جیب کے نچلے حصے میں نصب ایک آہنی راڈ کو پکڑ کر اوپر کواٹھ گیا۔ وہ لینے لینے پوزیشن میں اوپر کی طرف سپاٹ ہو گیا تھا مگر نکلے رہنے کی معقول صورت پھر بھی اسے نہیں ملی تھی۔ وہ محض اپنے دونوں بازو اور ٹانگوں کو جیب کے آہنی پنجر میں اٹکائے اس طرح جمول رہا تھا کہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ اس وقت کئی گردنیں جھک کر جیب کے نچلے خلا کا جائزہ لینے لگیں، عابد نے بازوؤں اور ٹانگوں کا تھوڑا اور زور لگا کر اپنے وجود کو مزید اوپر کر دیا۔ پچھے آہنی جھنگلے میں لگے آئل اور گریس سے اس کا اپنا حلیہ بھی بدل گیا تھا مگر اس پوزیشن میں اسے بڑی طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی، اس کا سارا جسم ٹپ بھر میں ٹپ ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چیخ لیے تھے، اگر وہ نیچے فرش پر گر جاتا تو دیکھ لیا جاتا۔ دشمنوں کی نظروں سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہاتھوں بیروں کی قوت سے اپنے وجود کو جیب کے نچلے مشینری، اس لیے جسے میں اسی طرح پھنسانے رکھتا اور وہ ایسا بڑی جانفشانی کے ساتھ کیے ہوئے تھا۔۔۔۔۔ لہذا ایک بھاری آواز ابھری۔ لہجہ عبرانی تھا۔

"میرا خیال ہے وہ یہاں نہیں آئے۔۔۔۔۔ اوپر ہی ہیں۔ ہمیں اوپر ہی تلاش کرنا چاہیے۔" اس آواز پر عابد شیکھری نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ اسے مزید خوشی ہوئی جب واپس جاتے قدموں کی آواز ابھری۔ مگر جلد ہی عابد کی خوشی غم ناک سکتے میں بدل گئی۔ نہ جانے ناغمہ کے ساتھ کیا ہوا تھا، یا پھر وہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکی تھی کہ عابد کو دھب سے اس کے فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بھی اتنی نہیں تھی کہ جاتے ہوئے دشمنوں کو سنائی دیتی لیکن جانے کیا ہوا تھا کہ جس ٹرک کے نچلے مشینری والے آہنی خلا میں عابد نے اسے اپنی طرح ہاتھوں بیروں کی مدد سے لینے کے انداز میں ٹکا یا تھا کہ ہستی سے کوئی آہنی راڈ نکل گئی تھی اور ناغمہ سمیت نکل کر وہ آہنی راڈ زور سے پختہ فرش پر بھی تھی۔ جاتے ہوئے دشمنوں کے بھاری قدموں کی آواز کو یکدم بریک لگ گئے۔ عابد شیکھری کا دل اچھل کر حلق میں آن لگا تھا۔ آہنی راڈ کے گرنے کی آواز پورے ہیمنٹ میں گونجی تھی۔ عابد نے تھوڑا نیچے سر کر کے

خون کا فوارہ اس کی گردن سے اٹھ پڑا۔ گولی زبیدہ نے...
 ایسود شاپک... پرتاک گرفتار کی تھی۔
 ایسود شاپک درحقیقت محسن کو خاموشی سے اپنے پستول
 کی گولی کا نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ زبیدہ کی عقابانی نگاہوں نے
 اس کی مکارانہ اور سفاکانہ حرکت کو بروقت تازلیا تھا مگر پھر تو
 جیسے جھکڑ بچ گئی۔ ایسود شاپک کی موت نے فرناش اور
 شمعون وغیرہ کو بلبلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے عورتوں بچوں کی
 پروا کیے بغیر زبیدہ اور اس کے ساتھیوں پر فائرنگ کر دی۔
 اندھا دھند فائرنگ میں زبیدہ کا ایک ساتھی شہید ہو گیا۔ زبیدہ
 نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو واپس پلٹنے کا حکم دیا اور وہ خود بھی
 پلٹی۔ محسن بھی بازو کو چھوڑ کر دوڑا۔ اس کے بازو سے ہنوز
 خون جاری تھا مگر اسے اس کی کب پروا تھی۔ یہ لوگ...
 کمرے سے باہر ایک راہداری میں کھڑے ہو گئے۔
 "ان کی کمک کسی بھی وقت پہنچنے والی ہے۔ تاخیر
 مشکل کا سبب بنے گی بلکہ ہم بھی مارے جائیں گے...
 ہمیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔" محسن نے کہا۔ اس کے بازو
 والے زخم پر کسی ساتھی نے رومال باندھ دیا تھا۔ ابھی اس
 نے اتنا ہی کہا تھا کہ دفعتاً ایک آواز پر ان کے کان کھڑے
 ہو گئے۔ یہ مخصوص قسم کی گرفتار تھی۔
 "بھئی کا پتھر..." دفعتاً زبیدہ کے ایک ساتھی کے منہ
 سے برآمد ہوا۔ "لگتا ہے ان کی کمک آئی ہے۔"
 ان سب کے چہروں پر تشویش کے آثار مزید گہرے
 ہو گئے۔ محسن نے جلدی سے کہا۔
 "زبیدہ! آپ دو ساتھیوں کے ساتھ ہال سے ملحقہ
 کسی کمرے سے جزل فرناش اور بارق شمعون کو ہٹ کرنے
 کی کوشش کریں۔ میں ایک ساتھی کے ساتھ یہاں کمک کو
 روکنے کی کوشش کرتا ہوں۔"
 "مگر..." زبیدہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن محسن اپنے
 ایک ساتھی کے ساتھ باہر کی طرف لپک چکا تھا۔ محسن ابھی
 اپنے ساتھی کے ساتھ مرکزی دروازے کے قریب پہنچا ہی
 تھا کہ خشک کر رک گیا۔ اس کے سامنے وہی یہودی لڑکی
 بازو کھڑی تھی، محسن اسے دیکھ کر چونکا۔ بازو محسن کے قریب
 آ کے بولی۔
 "تم لوگ... سخت خطرے میں ہو۔ باہر کمک پہنچ
 چکی ہے۔ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ جزل
 فرناش اور بارق شمعون پر قابو پانے کی کوشش کرو۔"
 "ان بزدلوں نے عورتوں اور بچوں کی آڑ لے رکھی
 ہے۔" محسن نے جلدی سے کہا تو وہ بولی۔

"میرے ساتھ آؤ مجھے معلوم ہے وہ تمہارے ہتھیار
 کس کمرے میں گئے ہیں۔" بازو نے انکشاف کیا۔ اس
 سرخ و سپید حسین چہرہ جوش سے لڑھکتا تھا پھر واپس پلٹی۔ محسن
 اس کا ساتھی عبید اس کے عقب میں چل پڑے۔ بازو نے
 مختلف راہداریوں سے گزارنی۔ مئی ایک ایسے کمرے کے
 سامنے والی راہداری میں لے آئے جو اوروم کہلاتا تھا۔
 "اس کمرے کے اندر وہ دونوں شیطان
 موجود ہیں۔" بازو نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ
 کرتے ہوئے کہا۔ خشک اسی وقت بھاری قدموں کی آواز
 ابھری۔ اور ساتھ ہی گولیوں کی بھیانک ترتر تھاپٹ سے
 کور پڈور گوج اٹھا اس میں محسن کے ساتھی عبید کی چیخ بھی
 شامل تھی۔ محسن نے عقب میں ٹھوم کر دیوار کی آڑ لیچے ہی
 اپنی گن کا رخ سیدھا کر کے لہلی وبادی۔ ایک گرجا
 برست فائر ہوا اور کئی وروی پوٹ اسرائیلی فوجی گر پڑے۔
 جنہیں مار کر زمین بوس ہو گئے۔ محسن ان کی نظری کا اندازہ
 سکتا تھا اور یہ بھی کہ وہ زیادہ دیر ان کے سامنے نہیں
 سکتا۔ آگے بڑھا اور بازو سے بولا۔ "تم چلی جاؤ۔ ورنہ
 میرے ساتھ تمہاری جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"
 "میں نے اپنے لوگوں اور اپنے باپ کا روپ دیکھا ہے
 ہے۔ اب میرا کوئی نہیں، تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"
 بازو بولی۔ "اس کمرے کا دروازہ توڑ دو، جلدی کرنا۔"
 محسن نے ایسا ہی کیا۔ مذکورہ دروازے پر اس نے اپنی تال
 کا رخ کر کے برست فائر کر دیا۔ دروازے کا لاک اڑ گیا۔
 محسن نے اسے لات دے ماری۔ پھر بازو سے بولا۔
 "تم کسی طرح عورتوں اور بچوں کو عمارت سے نکال
 دو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔" بازو یہ سن کر پلٹ گئی۔
 محسن اندر داخل ہوا۔ سامنے اسے مختلف پتیل کے
 پاس... جزل فرناش اور بارق شمعون نظر آ گئے۔
 برست چلنے کی آواز پر بری طرح چونک کر اٹھے تھے پھر
 یکدم ادھر ادھر چھپنے لگے۔ محسن نے ان پر اندھا دھند
 فائرنگ کر دی۔ کئی پتیل اور اسکرین تڑخ گئے۔ جزل
 فرناش جانے کس دروازے سے غائب ہو چکا تھا جبکہ بارق
 شمعون اس کے نرنے میں آ گیا۔ "خبردار...! کتے...!
 پلٹنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ ورنہ بھون کے رکھ دوں گا۔"
 بارق شمعون نے شکست خوردہ انداز میں اپنے
 دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ خشک اسی وقت کئی مسلح وروی پوٹ
 اندر در آئے۔

☆☆☆

زبیدہ نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ جدھر کا رخ کیا
 تھا وہاں اس کی زد میں اشفاق شامیر آ گیا جو ہال کمرے کے
 ایک نقلی دروازے سے عمارت کے کھلے اندرونی گوشے کی
 طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
 "رک جا... یہودی کتے...! ورنہ گولیوں سے
 بھون ڈالوں گی۔" زبیدہ کی گرجتی آواز پر اشفاق شامیر لرز
 اٹھا۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے پستول نکال لیا مگر اسے
 فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ زبیدہ نے اپنی گن کی لہلی دبا
 دی۔ گولیوں کی بو چھاڑنے اشفاق شامیر کو چھلکی کر کے رکھ
 دیا۔ وہ چٹخا ہوا فرش پر گرا۔ زبیدہ نے اپنے تینوں ساتھیوں
 کے ساتھ آگے پیش قدمی کرنا چاہی تو یکا یک عقب میں کئی
 دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ زبیدہ بری طرح خشکی۔
 اسے جزل فرناش اور بارق شمعون کی تلاش تھی... وہ جانتی
 تھی کہ یہ تینوں اسرائیل بلکہ یہودیوں کے لیے کس قدر
 اہمیت رکھتے تھے مگر پہنچنے والی کمک نے ان کے منصوبے کو
 مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں مبتلا تھی کہ
 اچانک حسب سے ہالٹ ہالٹ کی آوازیں ابھریں اور اس
 کے ساتھ ہی اندھا دھند گولیاں چلیں۔
 زبیدہ اور اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً حرکت کی۔
 وہ وہاں سے بھاگ کر آگے بڑھے۔ پہلے ہی ان کا منہ
 لعل لعل ہو گیا۔ پھر جس سمت بازو نے انہیں پیش قدمی کرنے
 کی نشان دہی کی تھی، وہ اس طرف ہی دوڑ پڑے۔
 ☆☆☆
 بیٹھے تھے وہ بیت صفائے کی پہاڑیوں میں پہنچ چکے
 تھے۔ یہ مقام پر اتر کر انہوں نے اونٹ کو واپس روانہ
 کر دیا۔ ورنہ اب نسبتاً محفوظ گزرگاہ سے پیدل جانے
 گئے۔ یہودیوں سے "انجاہڈ" کا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ وہ
 کبھی پہنچنے کی خواہش کرتے رہے بالآخر انجاہڈ کے ٹھکانے
 پر پہنچے۔ پھر جھپٹے ہارے پہنچ گئے جہاں ان کا پر جوش
 اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ انہوں نے استقبال کیا تھا اور انہیں
 مشین گنوں کی مدد سے گولیوں سے گھیرنے لگے۔ ٹھکانے پر انہیں
 اتنی ہی توجہ دی گئی اور رونی کے ساتھ سمجھوتہ کھانے کو
 بلایا گیا۔ زبیدہ کے نائب عارف حبیب سے ان کی
 بات... "میں اس اہم میں
 جا رہی ہوں۔ مگر خوشی بھی ہوئی کہ ان کی
 گرفتاری ہو گئی۔"

غاصب صیہونیوں کی لہجے عرصے تک کمر ٹوٹ جائے گی۔"
 لیلی نے کہا تو عارف حبیب کے ایک ساتھی نے کہا۔
 "انشاء اللہ وہ بھی ضرور کامیاب ہوں گے۔ ویسے تم
 لوگوں نے اسرائیل کے ایٹمی بجلی گھر کو تباہ کر کے بڑا کارنامہ
 انجام دیا ہے۔ اس سے اسرائیلی خفیہ ایٹمی پروگرام کو کافی
 دھچکا لگا۔ لیکن جانے کیوں میرا دل بے چین ہو رہا ہے۔"
 باقر نے گوگو سے لہجے میں کہا۔ "کاش ہم بھی عزیزی
 زبیدہ اور اپنے دوسرے گروپ اسے کی مدد کو جاسکتے۔"
 "اطمینان رکھو دوست! اور اللہ سے ان کی کامیابی
 کی دعا کرو۔" عارف حبیب نے کہا۔ اچانک باہر دور کہیں
 گولیوں کی ترتر تھاپٹ ابھری۔ وہ سب چونک پڑے اور
 ابھی سننے لگے بھی نہیں پائے تھے کہ انہیں جیٹ... طیاروں کی
 خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی اور اگلے ہی لمحے کیے بعد
 دیگرے کئی سماعت شکن اور لرزا دینے والے دھماکوں کی
 آوازیں ابھریں... جس گھپا میں یہ لوگ موجود تھے، وہ
 بھی انہیں لرزتی محسوس ہوئی، ایک بم شاید ان کی گھپا کے
 کہیں قریب گرا تھا۔
 "دشمنوں نے حملہ کر دیا... ہوشیار... باہر سے کسی
 ساتھی نے خبردار کیا اور یہ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیلی
 اور باقر کو اندازہ تو تھا کہ یہ سب بجلی گھر کی تباہی کا عمل ہے۔
 بہر طور وہ سب اسلحہ سنبھالنے کے باہر دوڑے۔ عارف آگے
 تھا وہ جیسے ہی گھپا سے باہر نکلا اس پر گولیوں کی بو چھاڑ پڑی۔
 وہ وہیں دم توڑ گیا۔ لیلی اور باقر کا دل دکھ اور جوش انتقام
 سے بھر گیا۔ ان کی اسلحہ کٹوں میں جس قدر ایسویٹیشن سما سکتا
 تھا وہ انہوں نے بھر لیا اور باقیوں نے عارف... کا انتقام
 دیکھتے ہوئے گھپا سے نکلنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا بلکہ گھپا
 کے سنگھار ڈھانے کے سرے پہ کھڑے ہو کر پوزیشنز
 سنبھال لیں۔ بیت صفائے کی پہاڑیاں اس وقت گولہ باری
 اور دھماکوں سے لرز رہی تھیں۔ آسمان پر کئی اسرائیلی جہازیں
 طیارے گردش کرتے نظر آئے تھے اور پہاڑیوں میں جیسے
 فلسطینی مجاہد اپنی ایئر کرافٹ اور راکٹ لانچرز سے انہیں
 گرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اسرائیلی طیاروں
 میں مشین گنیں بھی فٹ تھیں، ان کا بھی ایک ساتھی راکٹ
 لانچر کا تھوڑے پرے گرنے اور ارجوا۔ باقر اور لیلی نے بڑی
 مستعدی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیا اور انہیں احساس
 ہو گیا کہ اسرائیل کی طرف سے یہ ان پر فضائی حملہ کیا گیا
 تھا۔ یہ لوگ اسرائیل کے اس بزدلانہ جتنی انداز سے واقف
 تھے۔ یہ ان کی اولین حکمت عملی ہوتی تھی۔ وہ پہلے فضائی

ہلکے دشمن کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے تھے اس کے بعد دوسرے مرحلے میں وہ اپنے کمانڈرز روانہ کرتے تھے۔

باقر نے راکٹ لانچر سنبھال لیا اور لیلیٰ کے ساتھ باہر آگیا۔ اس وقت انہوں نے ایک اسرائیلی طیارے کی دم سے گاڑھا دھاوا لگتے دیکھا اور نعرہ گھیر بلند کر دیا۔ مجاہدین دشمن کا ایک طیارہ مار گرانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو آگے جا کر سنگناخ پہاڑیوں کے دامن میں گر کر دھماکے سے تباہ ہو گیا تھا۔

لیلیٰ اور باقر جس وقت ایک سنگناخ دڑے سے گزر رہے تھے، اچانک اس کے سامنے والی ایک نسبتاً بلند پہاڑی چوٹی سے ایک اسرائیلی طیارہ بہت نیچے پرواز کرتا ہوا کسی دیوار آہنی پرندے کی طرح نمودار ہوا جو مسلسل گولیاں برسار رہا تھا۔ باقر نے پہلے ہی سے اپنے کان دھوں پہ راکٹ لانچر اٹھا رکھا تھا مگر اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ راکٹ فائر کرنے کے لیے اپنی مخصوص پوزیشن سنبھالتا۔ تاہم اس نے ایک چٹانی دیوار کے سہارے خود کو لٹکایا اور تاک کر نیچے پرواز کرتے اسرائیلی طیارے پر راکٹ فائر کر دیا۔ یہ سہری موقع تھا جسے وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ راکٹ فائر ہوا اور سنبھالتا ہوا تیزی کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف لپک لپک ڈھلے لپکی۔ یہ سب اپنی گن سے طیارے پر گولیاں برسانا شروع کر دی تھیں۔ طیارے کے پائلٹ کو اس طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے ایک مارٹر گولہ داغ دیا مگر اس کے اگلے ہی لمحے اس کے طیارے کو زبردست جھٹکا لگا۔ باقر کا فائر کیا ہوا راکٹ طیارے کے پچھلے حصے سے جا کر آیا تھا۔ اسرائیلی پائلٹ نے فوراً ایئر اسٹیک کو اوپر کیا مگر طیارے کا عقبی حصہ تباہ ہونے کے باعث طیارہ خاطر خواہ بلندی کو نہ چھو سکا اور سامنے کی ایک بلند پہاڑی چوٹی سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ اس کا پھینکا ہوا مارٹر لیلیٰ اور باقر سے تقریباً تیس گز دور گرا تھا۔ ایک لڑخیز دھماکا ہوا اور لیلیٰ نے مارٹر گرتے ہی خود کو بڑی پھرتی کے ساتھ ایک چٹانی آڑ کے پیچھے کر لیا مگر بد قسمتی سے باقر کو چھینے کا موقع نہ مل سکا۔ تاہم دھماکا ہوتے ہی اس نے خود کو فوراً سنگناخ اور تاہوار زمین پر گر لیا تھا۔ گولہ گرتے ہی کان بھاڑ دھماکا ہوا اور کئی تباہ کن ٹیل چٹانی سنگ ریزوں کے ساتھ گر دو پیش میں پھیلے، ان کے مہلک پھیلاؤ کی زد میں باقر بھی آگیا۔ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا اور بائیں کان دھاوا ایک بارودی شیل ٹکرنے سے بری طرح متاثر ہو گیا۔ مارے اذیت کے باقر کے حلق سے کرب ناک چیخ ابھری تھی، جس

نے کچھ فاصلے پر چٹانی آڑ میں اوندھی پڑی لیلیٰ کو بری طرح دہلا کر رکھ دیا۔ وہ شدت کرب سے تقریباً چیختی ہوئی پتھر ملی زمین پر خون میں تر ہڑ بڑھ کر باقر کی طرف دوڑی اور اسے سنبھالا دیا۔

گولیوں دھماکوں کی آوازیں بہ دستور گونج رہی تھیں، تاہم گولہ باری میں کچھ کی آتی محسوس ہوئی، شاید مجاہدین دشمنوں کے کچھ طیارے مار گرانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

ادھر باقر کی حالت دیکھ کر لیلیٰ کا دل بری طرح دکھ رہا تھا۔ "باقر..... باقر!..... تہ..... تم..... زخمی ہو....." لیلیٰ کی آواز شدت غم سے لرزنے لگی۔ باقر نے کچھ گہری گہری سانس لینے کی کوشش کے بعد کراہتی ہوئی آواز میں یہ مشکل کہا۔

"م..... میں ٹھیک ہوں۔ تہ..... تم..... تم..... تم ایک کام کرو۔ کسی طرح میرے زخمی کاندھے پر میری گھنٹی لٹکائی جا۔"

"دیر..... مت کرو لیلیٰ.....! ہمیں آخری سانسوں تک دشمنوں سے لڑنا ہے۔" باقر نے جوش سے ہانپتے ہوئے کہا اور لیلیٰ نے اپنی آنکھوں کے آنسو خشک کر ڈالنے کے بالکل اسی طرح جیسے اس نے اپنے بھائی اور گھنٹی کی شہادت کے بعد خشک کر ڈالے تھے۔

حریت پسند مجاہدوں کی جنگی کٹ میں مقدور مجاہد مہم پٹی کا سامان بھی ہوتا تھا۔ اس وقت لیلیٰ کے پاس وہی ایک کٹ تھی، اس نے جلدی جلدی پہلے باقر کے زخموں کا علاج کیا پھر اس کی گھنٹی کاندھے کی طرف سے بھاڑ ڈالی۔ کٹ سے مرہم نکال کر زخم پہ اس کا پیسٹ لگائی پھر پٹی باندھ دی۔ خون کا رساؤ کچھ کم ہو گیا تھا۔ باقی زخموں پہ بھی اس نے ایٹھی سپیکل دشمن لگا کے مرہم رکھ دیا۔ مگر وہ نا کافی تھا جیسے تیسے کر کے باقر کو سنبھالا دے کر چٹانی دیوار کے سہارے اٹھا کے بٹھا دیا۔ باقر نے دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں پھر ایک طرف پڑے راکٹ لانچر کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ راکٹ اس نے داغیں کاندھے سے جھلا دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لیلیٰ نے فوراً سہارا دیا۔ باقر کے تھوڑے قدم ڈگمگائے پھر وہ اپنی مضبوط قوت ارادی سے دشمن سے ایک بار پھر تیراکیا ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

اسرائیلی طیارے اب بھی آسمان پر گردش کر رہے تھے اور مجاہدین کے لیے مسلسل پریشانی کا باعث بنے

ہئے تھے۔ باقر کو اسرائیلی طیارے مار گرانے کی زیادہ فکر تھی، مگر محض راکٹ لانچر سے وہ ان طیاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا جبکہ طیارے زیادہ تر اس علاقے میں گولہ باری کر رہے تھے جہاں پر پینڈ..... اگر چہ ایٹھی ایئر کرافٹ گنوں سے ان کا زور توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے تھے مگر لگتا تھا آج کے ایٹھی بجلی گھری کی تباہی نے اسرائیلیوں کو بری طرح تھملا دیا تھا۔ وہ اپنی اس پرہیزی پر زخم خوردہ تھے اور مجاہدوں کے ممکنہ خفیہ ٹھکانوں پر بلا بول دیا تھا۔

راکت لانچر اب لیلیٰ نے سنبھال رکھا تھا۔ دو راکٹ ابھی اس کی جنگی کٹ میں موجود تھے، باقر بھی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ وہ لیلیٰ کے سہارے کے بجائے اپنے قدموں پہ چلے۔ اس نے راکٹ اب اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی تھی۔ اس دوران چند سح مجاہدان سے آن لے۔ ایک نے انہیں پہچان کر کہا۔ "اس طرف سے پیچھے نکلنے کی کوشش کرو..... دشمن بھاری تعداد میں پیدل اس طرف آ رہے ہیں۔"

"ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہمیں دشمنوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔" لیلیٰ نے پر جوش لہجے میں کہا تو باقر نے بھی اسی انداز میں تاکید کیا۔ پولا۔

"دشمن چاہے کئی ہی تعداد میں ہوں ہم ان کے آگے ڈٹ جائیں گے۔"

وہ باقر کی حالت دیکھ کر حیران پریشان ہوئے مگر پھر انہوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ اس جگہ چٹانوں پر پوزیشن سنبھال لیں۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ انہیں سامنے تقریباً پچاس ساڑھ گز کے فاصلے پر اسرائیلی سح دست دکھائی دے گیا، جہاں چست وردیوں میں ملیوس تھے، انہیں دیکھتے ہی مجاہدوں نے اپنی رائفلیں چلا دیں۔ دوسرے ہی لمحے میں گرد و پیش کی چٹانیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھیں۔ چند اسرائیلی دشمن گولیوں کی زد میں آئے، دفعتاً باقر کی عقابلی نظروں نے دیکھا دشمن دستے کے چند سح فوجی ان کی طرف بیک وقت کئی دہائی بم اچھالنے کی تیاری کر رہے تھے، باقر نے لیلیٰ سے تقریباً چلا کر کہا۔

"لیلیٰ! ان پر راکٹ فائر کرو۔ جلدی....." باقر جانتا تھا اگر بیک وقت اتنے سارے دہائی بم ان کی طرف اچھالے گئے تو..... کچھ بھی نہیں بچے گا۔ لیلیٰ نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے راکٹ داغ دیا۔ ساعت ٹھکن دھماکے کے ساتھ ہی کئی اسرائیلی دشمن جہنم واصل ہو گئے۔

دلچسپ معلومات

- ☆ دنیا کا سب سے پہلا چیک اتلی میں قائم کیا گیا۔
- ☆ انسانی جسم میں دانت وہ ہڈی ہے جس پر گوشت نہیں ہوتا۔
- ☆ اگر سانپ کا سر کاٹ دیا جائے تو بھی وہ آدھا گھٹنے ڈسنے کے قابل رہتا ہے۔
- ☆ قرطبی نامی پرندہ ایک بار بھی پر ہلائے بغیر سارا دن اڑ سکتا ہے۔
- ☆ قطب شمالی کے آسمان سے سال کے 182 دن سورج مکمل غائب رہتا ہے۔
- ☆ چھ گورے رنگ اور پیلے بالوں والے شخص کو کاشا زیادہ پسند کرتا ہے۔
- ☆ ہاتھی 5 ٹن وزن رکھنے کے باوجود 40 کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑتا ہے۔
- ☆ اگر دنیا کی ساری مرغیاں شمار کی جائیں تو ہر شخص کے حصے میں صرف دو مرغیاں آئیں گی۔
- ☆ سورج کی روشنی زمین تک 8 منٹ پہنچتی ہے۔
- ☆ مرسلہ۔ عاطف شاہین اٹھارہ اڈہ اروقی

ٹھیک اسی وقت ایک طیارے نے اس سمت بم گرایا۔ مجاہدوں نے ادھر ادھر گر کر حملے سے بچنے کی کوشش کی۔ بم گرا اور زوردار دھماکے سے ارد گرد کی پہاڑیاں لرز اٹھیں یہ نیچا بم "بگ کلسٹر" بم تھا، جس کے گرتے ہی دھماکے کے ساتھ کئی بھڑکتے ہوئے شعلے اچھل کر دائیں بائیں خاصی دور تک گرے اور ہر شعلہ بم کی طرح دوبارہ بلاسٹ ہوا اور حریت پسندوں کو چاٹ لیا۔ ان کی جینیں کرب ناک تھیں۔

"ایک اور راکٹ فائر کرو۔" باقر چچا۔ اسے اپنے ساتھی حریت پسندوں کی موت پر طیش آگیا۔ لیلیٰ نے بھی کیے بعد دیگرے دو راکٹ چلا دیے۔ "اس طرف بڑھو....." باقر ایک طرف اشارہ کر کے بولا۔ لیلیٰ نے خالی لانچر ایک طرف پھینک کر راکٹ سنبھال لی۔ باقر مذکورہ سمت کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی چند قدم ہی دونوں نے طے کیے ہوں گے کہ بری طرح ٹھک گئے۔ مجاہدین کے ایک مورچے پر انہیں

تین عنایات

- اللہ نے اپنے بندوں پر تین عنایات کی ہیں۔
 (1) گندم، اناج میں کیڑے پیدا کر کے۔
 ورنہ انسان اسے سونے چاندی کی طرح ذخیرہ کر لیتا اور لوگ بھوکے مر جاتے۔
 (2) موت کے بعد مردے کے جسم میں بدبو پیدا کر دی۔ ورنہ کوئی اپنے پیاروں کو دفن نہ کرتا۔
 (3) مصیبت کے بعد اہل خانہ کو صبر دیا ورنہ ان کی زندگی کبھی خوشگوار نہ ہوتی، تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

کا آدی تھا اور اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ وہاں کئی سالوں سے مقیم تھا۔ عابد نے ناعمہ سے اس کا تعارف کروایا پھر اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ ان دونوں کے یہاں جگہ سے نکلنے کا کوئی بندوبست کرے۔ اس نے ان کے کھانے پینے کا بھی اچھا بندوبست کروا دیا تھا۔

..... کبھی کے کسی بحری جہاز میں انہیں عام مسافروں کی طرح یہاں سے نکلنے کی کوشش کرے گا۔

”میرا خیال ہے اس میں خطرہ ہے۔“ ناعمہ نے اعتراض کیا۔ ”بندرگاہ پر ہماری تلاش کے سلسلے میں بہت سخت پہرا ہوگا۔ بالخصوص ”البحر“ کے جہازوں کی خصوصی چیکنگ کی جائے گی۔“ عابد کے ذہن میں پہلے سے یہ بات تھی وہ خاموش رہا جبکہ طلحہ نے احساس دلایا کہ اب مزید..... اس کے حوالہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

”مجھے نہیں لگتا کہ..... میری تازہ ترین مہم جوئی کے بعد اسرائیلی کوسٹ میری کبھی کے جہازوں کو اب یہاں نظر انداز ہونے کا پرمٹ جاری کرے گی۔ تاہم یہ بعد کا مسئلہ ہے۔“ عابد پر سوچ لہجے میں بولا۔ ”ہمیں کسی اور کبھی کے بحری جہاز میں سفر کرنا ہوگا۔“

”خطرہ اس میں بھی ہے..... اور اگر چیکنگ ہوئی تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میرے ذہن میں ایک اور تجویز تو آئی ہے۔“ طلحہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا تو عابد اور ناعمہ مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ طلحہ

کے ساتھ نکاسی کے راستے کی مستلشی تھیں جو جلد ہی اسے نظر بھی آ گیا مگر اس سمت اس نے چار یا پانچ دشمنوں کو ہتھیار... بدست نمودار ہوتے بھی دیکھا۔ عابد کے بیدار مغز میں ایک خیال چمکا۔ اسے معلوم تھا وہ جب تک انہیں اپنے ٹرک تلے روکنے کے لیے ان کے قریب پہنچے گا وہ ان پر بیک وقت اپنی تینوں کا منہ کھول دیں گے۔ اس کی عقابانی نظروں نے اس گاڑی کو چھاپ لیا جو ان کے بالکل قریب پارک تھی۔ عابد نے تیزی سے موڑ کاٹا۔ دشمن ٹولے نے بہ سرعت اپنی گھنٹیں سیدھی کر لیں۔ عابد کے ٹرک نے ایک گاڑی کو سائڈ ٹھوک کر باری اور مطلوبہ گاڑی کے قریب پہنچے ہی اس نے ٹرک کو ”گرننگ“ کے انداز میں گول گھمادیا۔ ٹرک کا عقبی حصہ پوری قوت سے مطلوبہ گاڑی سے ٹکرایا اور وہ گاڑی ایک دھماکے سے لرزی اور دشمن دستے سے جا ٹکرائی، ان کی گھنٹیں گونج اٹھیں۔ ٹرک سیدھا کرتے ہی عابد نے ایک سلیپر پر پاؤں رکھ دیا۔ طاقت ور انجن والے ٹرک نے دھاڑ ماری اور سلوپی ڈھلان پر تیزی کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے پارکنگ کے آہنی دروازے کا شٹر تھا ٹرک اس سے ٹکرایا اور توڑنا ہوا ہا ہر نکل گیا۔ پھر عابد نے کچھ نہیں دیکھا اور اچانک کا بھی گیٹ توڑنا ہوا ہا ہر سڑک پر آ گیا۔

ٹرک خوفناکی رفتار سے لڑا لڑا بھاگا۔ عابد جانتا تھا کہ جلد ہی بیبیوں گاڑیاں اس کے تعاقب میں نکلیں گی۔ اس لیے اس نے دانستہ شہر کے وسط کارخ کیا اور ایک جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی ہتھیار سمیت چھوڑ کر ناعمہ کو لے کر اتر گیا۔ وہ ایک معروف بازار میں آ گئے اور ایک گارمنٹس کی بڑی سی شاہ کارخ کیا۔ یہاں دونوں نے اپنی ڈریسنگ وغیرہ تبدیل کی اور وہاں سے نکل کر ایک سیلون پارلر میں گھس گئے۔ وہاں دونوں نے اپنے چہروں کی مخصوص لیپا پوتی کروائی اور دو عدد وہیں بھی خرید لیں، ناعمہ نے اپنے سیاہ بالوں پر ”چھتر گولڈ“ وگ چڑھائی تھی۔ دونوں اب.....

یورپین لوڈر کپل کی صورت میں نظر آنے لگے تھے۔ ان چند اہم کاموں کو فوری نمٹانے کے بعد عابد شیکھری نے ایک قریبی پبلک ٹیلی فون بوتھ سے اپنے ایک ہم وطن کینیڈین بزنس ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ جس کا نام طلحہ تھا۔ وہ یہاں قریب ہی نور ای بلڈنگ اپارٹمنٹ کے ایک گزٹری کشاؤہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔ اس نے انہیں وہیں رکنے کا کہا اور تھوڑی دیر بعد وہ اپنی کار میں انہیں لینے بھی آ گیا۔ اگلے نصف گھنٹے بعد دونوں طلحہ کے فلیٹ میں تھے اور انہوں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ طلحہ ایک چالیس پینتالیس سالہ سانولی رنگت

اس بار میں یقینی موت کی سرگوشیاں بھی شامل تھیں۔ عابد نے خود کو گاڑی کے خلا سے نیچے فرش پر گر لیا اور اپنے پہلو سے بندھی گن سنہالی اور بجلی کی سی پھرنی کے ساتھ لڑھکنی لگا لیتے لیتے ناعمہ کے قریب جا پہنچا پھر تیزی سے اس کے کان میں کچھ کہا اور ناعمہ نے بھی اپنی گن پہلو سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر دونوں نے اسی طرح فرش پر لیٹے لیٹے اپنی پشت ملا دیں۔ انہیں دشمنوں کے بھاری جوتے..... اس ٹرک کے قریب آ کر رکتے ہوئے نظر آئے پھر جیسے ہی دشمنوں نے جھک کر نیچے جھانکا۔ دونوں نے فائر کھول دیا۔ دشمن ٹرک کے دائیں بائیں گھبرا ڈالنے لگے۔ تھے، گولیوں نے ان کے سروں کو پھینکی کر کے رکھ دیا۔ وہ فرش پوس ہو گئے۔ دونوں ٹرک کے نیچے سے نکلے۔ ہسٹ میں برست فائر ہوا اور گولیوں کی بوچھاڑ ٹرک کے کینٹین پر پڑی۔ ایک زوردار چمٹا کے سے اس کی ونڈا سکرین اتر گیا۔ کچھ دشمن دوسری سمت انہیں تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھے مگر اس طرف گولیاں چلنے اور اپنے ساتھیوں کی کریہ انگیز چیخیں سن کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ دونوں جھکے جھکے انداز میں گاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک طرف کو دوڑے۔ عابد کو احساس تھا کہ صورت حال خطرناک حد تک خردوڑ ہو چکی ہے۔ کیونکہ ان کی یہاں موجودگی کا پتہ پڑتا ہوتا ہے سب ادھر کا ہی رخ کریں گے اور ان سے موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔

اچانک ایک ڈبل کینٹین ٹرک کے قریب سے گزرتے ہوئے عابد شیکھری ٹھنک کر رکا۔ اسے اس کے اٹھتے ہوئے میں ایک بڑے بچے کی صورت میں چابی لگی نظر آئی۔ اس نے بجلی کی سرعت کے ساتھ ٹرک کا دروازہ کھولا اور ناعمہ پہلے سوار کر لیا۔ ٹھیک اسی وقت ایک برست فائر ہوا وہ نیچے جھک گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ ناعمہ کے فوراً بعد خود بھی سوار ہونے کی جلد بازی نہیں کی تھی، ورنہ..... چلائے ہوئے اندھے برست کی زد میں آ جاتا۔ سنہلے ہی مذکورہ سمت کی طرف پلٹا اور جو نظر آیا اس پر جوانی برست فائر کر دیا۔ ایک چیخ اسے بھی سنائی دی تھی، دشمن کا ہدف توڑنے کے فوراً ہی بعد لپک کر ٹرک میں سوار ہو گیا یہ پک اب ٹرک تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنہالتے ہی اس نے انٹینشن سوچ میں لگی چابی گھمادی..... ہسٹ میں گاڑی کے انجن کی گھر گھرائی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے ٹائروں کی آواز خراش آواز کا شور ابھرا۔ پک اب ٹرک ایک جھکنے سے آگے بڑھا۔ عابد شیکھری کی عقابانی نظرس ایک محتاط انداز سے

دشمنوں کا قبضہ ملا۔ یہاں انٹی کرافٹ گن نصب تھی، جسے دشمنوں نے تباہ کر ڈالا تھا۔ یہاں کچھ دشمنوں اور مجاہدوں کی ادھر ادھر لاشیں بھی پڑی دکھائی دی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت باقر نے دیکھا نیچام بم پھینکنے والا وہ مہلک طیارہ دوبارہ ایک طویل گول چکر کاٹ کر اس سمت آ رہا تھا اور اس بار اس کی پرواز قدرے نیچی تھی۔ اس نے لیلی کو قریب ہی ایک نسبتاً بلند ٹیکری پر چڑھنے کا کہا اور بتایا کہ اس طیارے کو تباہ کرنا ضروری ہے..... پھر دونوں مذکورہ ٹیکری پر چڑھنے لگے، طیارہ خوفناک انداز میں گزرتا ہوا عفریت نما آہنی پردے کی طرح اس طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ دونوں اپنی سی جان تو ڈکوشش کے ساتھ ٹیکری پر پہنچ گئے..... اس کی سنگلاخ ڈھلان پر پشت کے بل لیٹ گئے اور اپنی طاقتور گھنٹیں اوپر کر لیں۔ طیارہ ان کے قریب آیا اور انہوں نے ٹرگر بادل دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ طیارے کے نچلے حصے میں ایک تواتر کے ساتھ بیوست ہوتی چلی گئی اور طیارہ ان کے اوپر سے گزر گیا مگر انہوں نے جیسے ہی سرگھما کے دیکھا تو مسرت سے ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ طیارے کی دم سے دھوئیں کا سیاہ بادل اُڈ رہا تھا اور وہ تو ازن کھور ہا تھا..... پھر دور کہیں چوٹیوں میں غائب ہو گیا، ٹھیک اسی وقت ایک تباہ کن دھماکے کی آواز ابھری۔ طیارہ گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ دونوں سنہل کر اٹھے مگر قریب مورچے میں قابض دشمنوں نے انہیں تاڑ لیا اور وہ سب بیک وقت حرکت میں آ گئے۔ اس وقت لیلی اور باقر خطرناک پوزیشن میں تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ دائیں جانب لڑھکنی لگائی، اسے اٹلی دستے نے ایک راکٹ فائر کیا جو اس جگہ پر گرا جہر تھوڑی دیر پہلے لیلی اور باقر موجود تھے، دونوں نے مسرت ان سے خبر داڑنا ہونے کا ارادہ ترک کیا اور ایک سنگلاخ آڑ کے قریب آ کر تک گئے۔

ابھی وہاں تک انہیں تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ اچانک اردگرد کی پہاڑیاں نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھیں۔ لیلی اور باقر نے پر مسرت جوش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ مجاہدین کی بھی شاید ہی کمک اس طرف پہنچ چکی ہے۔

☆☆☆

دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں تیزی سے قریب آرہی تھیں اور ناعمہ کی زندگی اس وقت شدید خطرے سے دو چار تھی، اس کے لیے عابد شیکھری کا فوری حرکت میں آنا ضروری تھا۔ جیتی ہوئی بازی یکدم الٹ گئی تھی اور

ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ "دونوں اگر ساتھ رہو گے تو شہ کی پہلی نظر تم دونوں پر ہی پڑے گی، تم دونوں کو الگ الگ لگنا ہوگا۔" اس کی بات پر عابد پھر ہنسنے لگا اور ایک نظر ناعمہ کے چیلے پڑتے چہرے پر ڈال کر طلحہ سے بولا۔ "اگر تمہیں یہ طریقہ نسبتاً زیادہ محفوظ لگ رہا ہے تو پہلے تم ناعمہ کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔"

"ہرگز نہیں، میں تمہارے بغیر جہ سے نہیں نکلوں گی۔" ناعمہ نے فوراً انکار کیا۔ عابد اس کی وجہ جانتا تھا اور شاید طلحہ کو بھی کچھ اندازہ ہو چلا تھا۔ عابد نے طلحہ کی طرف دیکھا۔ "تم کوئی ایسا بندوبست نہیں کر سکتے کہ بے شک میں اور ناعمہ الگ الگ سفر کریں مگر جہ سے نکلیں ایک ساتھ.....؟" اس کی بات سن کر طلحہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ایک گہری ہرکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے پھر..... آج رات تم دونوں آرام کرو۔ اگلے دن میں تم دونوں کو یہاں سے نکالنے کا کوئی نہ کوئی محفوظ انتظام کرتا ہوں۔" عابد اور ناعمہ نے مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اس دوران وہ ٹی وی پر چلنے والی نشریات بھی دیکھ رہے تھے، جہاں چونکا دینے والی چینی چنگھاڑتی خبریں نشر ہو رہی تھیں، جس کے مطابق تل ابیب پر وہم بھلی گھرتا ہوا ہونے کے باعث تاریکی میں ڈوب گئے تھے، نیز اچار اور پی ایل ایس او کے بہادر مجاہدوں نے اسرائیلی اہل جہاز اور آرمی کو ناکوں چنے چوادیے تھے جبکہ سرکاری وی وی میں اسرائیل اپنی اس ہزیمت کو چھپانے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا اور بھلی گھری کی تباہی کے بجائے فلڈر پورنگ دے رہا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، ہاں البتہ بھلی میں کوئی فنی خرابی پیدا ہونے کے سبب ایسا ہوا بہت جلد یہ خرابی دور کر لی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ.....

عابد... ناعمہ اور طلحہ..... "الجاہد" اور فلسطینی لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے مجاہدوں کو دل ہی دل میں خراج تحسین پیش کرنے لگے۔

اگلے دن دونوں دن چڑھے تک سوتے رہے۔ جاگنے پر طلحہ کی بیوی ام خالدہ نے بتایا کہ طلحہ صبح سویرے ہی اپنے دفتر چاچکا تھا۔ نیز سختی سے تاکید بھی کی تھی، یہ دونوں اس کے آنے کا انتظار کریں اور قلیٹ سے باہر بالکل نہ نکلیں۔

بہر طور غسل وغیرہ کر کے یہ دونوں تازہ دم ہو گئے، پھر ناشتے کی میز پر آ بیٹھے۔ طلحہ اور ام خالدہ کے دونوں بچے بہت پیارے تھے۔ اس دوران عابد چائے کا گگ تھامے

کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کی طرف آ گیا اور ذرا پردہ سرکا کر یونہی باہر کا جائزہ لینے لگا۔ قلیٹ روڈ فینک تھا، ساری ٹریفک نظر آرہی تھی، سڑکوں کے کنارے واقع بازار..... میں زندگی کی مصروفیات پوری شدت سے جاری تھیں۔ آسمان صاف تھا۔ فضا میں ایک عجیب سا شور رہا تھا۔ اچانک عابد کے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے مخصوص ساخت کی دو بھاری گاڑیاں حرکت کرتی دکھائی دیں۔ دونوں کا رخ اسی بلڈنگ کے مین باؤنڈری گیٹ کی طرف تھا۔ وہ ان گاڑیوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ وہی گاڑیاں تھی جو اسے اسرائیلی اہل جہاز کے کمانڈو سینٹر میں نظر آئی تھیں، وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھتا رہا۔ سڑکوں پر آگے بڑھنے والے اندر سے مخصوص وردیوں میں سب افراد برآمد ہوئے، اب تو عابد کا ماتھا ٹھنکا۔ اسی لمحے میں ناعمہ بھی اٹھ کر اس سمت آرہی تھی کہ عابد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ کھلی عابد نے فوراً کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور ناعمہ کو ساری صورت حال بتائی تو وہ بھی متحوش ہی نظر آنے لگی۔ عابد نے ام خالدہ سے پوچھا۔

"کیا طلحہ سے اس وقت ٹیلی فونک رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔" وہ بولی۔

کے نمبر پر ہی اس سے بات کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ وہ وہاں ہوں، لیکن بات کیا ہے..... برادر عزیز؟" اس نے آخر میں ابھی ہوئی نگاہوں سے عابد شیکھری کی طرف دیکھا۔ عابد نے اسے بھی بتایا تو وہ بھی کچھ پریشان ہی ہو گئی۔ تاہم بولی۔ "آپ لوگ ادھر ہی ٹھہرو، میں خود جا کر باہر معلومات کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے عبا پر بڑا سا اسکارف باندھا اور قلیٹ سے نکل گئی۔ عابد اور ناعمہ ہنسنے لگے اور بے چینی سے ام خالدہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ عابد جلد از جلد طلحہ سے فون پر رابطہ کر کے اسے اس تازہ ترین مددوش صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ تاہم انہیں کچھ اطمینان تھا کہ ان کے اصل حلیے بدلے ہوئے تھے کیونکہ کل رات ہی طلحہ ان کے لیے ہلکا پھلکا ریڈی میڈ میک اپ کا سامان لے آیا تھا مگر... کاغذی شناخت وہ اپنی پھر بھی چھپانے سے قاصر ہوتے، اس کے لیے بھی طلحہ نے انہیں کسی حد تک تسلی دی تھی کہ وہ کسی ایجنٹ سے بات کر کے ان کے موجودہ حلیے کے مطابق تصاویر اتار کے کاغذات میں بہر پھیر کرانے کی کوشش کرے گا۔

ام خالدہ تھوڑی دیر بعد لوٹ آئی۔ اس کے صبح چہرے پر ہنسنے کے آثار تھے، دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے "اور کیا ہوا؟" کی تفسیر پیش کرنے لگے۔

"تم دونوں پر یہاں کسی کو کوئی شہ تو نہیں ہوا ہے مگر اسرائیلی خفیہ ایجنسی اور پولیس تم دونوں ہی کی تلاش میں خفیہ سرچ آپریشن کر رہی ہے۔ یہ معمول کی چیکنگ ہے جو تقریباً ہر ہفتے بلڈنگ میں کی جا رہی ہے۔" ام خالدہ نے بتایا۔ عابد اور ناعمہ کے چہروں پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ جان گئے تھے کہ ان کے قلیٹ کی بھی باری آسکتی تھی۔ تاہم عابد نے ام خالدہ سے کہا کہ اس کی کسی طرح اپنے شوہر طلحہ سے بات کرادیں۔ ام خالدہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا اور قریب دھڑے ایک خوب صورت سے دیدہ زیب فنی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی..... ناعمہ نے عابد سے ایک خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"فون ذرا دھیان سے کرنا۔ ممکن ہے کالیں خفیہ طور پر چیک کی جا رہی ہوں۔"

"ہاں....." عابد نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں اشاروں کنایوں میں ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ام خالدہ نے بتایا کہ اس کے شوہر طلحہ سے اس کا رابطہ نہ ہو سکا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں مصروف تھا اور اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ کچھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ بے چارہ یقیناً ان کے کام کے سلسلے میں دوڑ دوڑ میں مصروف تھا۔

"میرا خیال ہے یہاں کی صورت حال پر ہمیں خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" عابد نے خود کلامیہ انداز میں یہ کہتے ہوئے ہونٹ ہنسنے لگے۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھا۔ اسی پر ام خالدہ بولی۔

"میرا خیال ہے آپ دونوں کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے..... کیونکہ آپ دونوں اپنے اصل حلیے میں نہیں ہیں۔" اس کی بات پر ناعمہ بولی۔

"بمشیرہ عزیز! بات صرف حلیے بدلنے کی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ شناختی کاغذات ہم سے مانگ سکتے ہیں پھر ہم دونوں مرد عورت کے جوڑے پر تو انہیں سب سے پہلے شبہ ہوگا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ بھی لے جاسکتے ہیں۔" ناعمہ پریشان ہو رہی تھی، کیونکہ اس کی وجہ واضح تھی، بڑی مشکل سے اپنی جانیں جو کھم میں ڈال کر تو یہ لوگ ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، اس پر کسی گہری سوچ میں مستغرق عابد شیکھری نے کہا۔

برائے وسعت راق

- (1) "خواجہ احمد دین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب (مغربات دین) میں تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص نیا لباس پہننے سے پہلے پاک پانی پر دس مرتبہ سورۃ قدر اور سورۃ اخلاص پڑھ کر لباس پر چھڑک دے تو جب تک لباس کا تار اس کے بدن پر رہے گا اسے مالی شہی نہیں ہوگی۔"
- (2) گھٹنوں سے رخ کی آواز آتا۔ "جن لوگوں کے گھٹنوں میں سے رخ کی آوازیں آتی ہوں ان میں وٹامن ڈی 3 کی کمی ہو جاتی ہے، وٹامن ڈی 3 کی کمی دور کرنے سے گھٹنے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"
- (3) حضور ﷺ کا پیالہ جھاؤ کی لکڑی کا تھا۔
- جھاؤ جسے عربی میں طرخا، فارسی میں گز، پنجابی اور سرانگی میں لائی، مہرا اور انگریزی میں ٹرناریک ٹری (Tamarik Tree) کہتے ہیں۔
- ڈاکٹر کرل چو پڑا نے ٹرناریک ٹری کے پیالے کے مندرجہ ذیل فوائد بتائے ہیں۔
- اس پیالے میں پانی پینے سے جگر کے امراض (Liver diseases) خاص طور پر ورم جگر (Liver Inflammation) استقاء (Oedema) ختم ہو جاتا ہے اس سے گردوں کی ورم (Kidney Inflammation) ختم ہو جاتی ہے۔ پیشاب کھل کر آتا ہے حتیٰ کہ اس پیالے میں پانی پینے سے خون میں صفراوی کیفیت کم ہو کر خون میں چربی کے مواد کو لیڈرول (Cholesterol) اور کیسیٹین کم ہو جاتی ہے پتہ (Gall bladder) میں پتھری بننے والا مواد پیشاب کے ذریعے نکل جاتا ہے۔
- مرسلہ: روشنی رشید، دھیماں کمپ، راولپنڈی

خاموش نظروں سے بازغہ کا چہرہ نکلتا رہا پھر عجیب سے لہجے میں مستنصر ہوا۔ "ویسے تم ہو کون؟ اور اپنے لوگوں کے خلاف ہماری مدد کیوں کر رہی ہو؟ اس طرح تو تمہارے اپنے ہی تمہارے دشمن بن جائیں گے؟"

"میں نے بتایا تو تھا۔ میں کشن پیریز نادون کی بیٹی بازغہ ہوں اور مجھے اب اپنے لوگوں سے سخت نفرت ہو گئی ہے۔" وہ بولی۔ "جبکہ مجھے تم لوگ مظلوم اور حق پر نظر آتے ہو لیکن میری قوم کے لوگوں نے مظلوم اور حق پر فلسطینیوں پر طرح طرح کے جو انسانیت سوز مظالم ڈھار کئے ہیں۔ وہ میری تو کیا کسی کی بھی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں لیکن افسوس تو مجھے اس بات کا بھی بہت ہے کہ میرا اپنا باپ جو مل ایب کا کشن ہے۔۔۔۔۔ پیریز نادون وہ بھی اس گھناؤنے عمل میں پیش پیش رہتا ہے۔"

"مخمس کو اس نرم و نازک سی خوب صورت لڑکی کی باتوں میں سچائی کی بوجھوس ہوئی، وہ اس سے متاثر ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی رو میں آگے بولے جا رہی تھی۔

"پھر تم نے بھی میری جان بچانے کے لیے اس سفاک اور رنگ انسانیت آدمی جزل آنزک فرناش کی چلائی ہوئی گولی سے بھی بچایا اور زخمی ہو گئے۔ ایسا تم نے کیوں کیا؟ اسی لیے ناکہ میں نے تمہاری اپنے باپ اور فرناش کے سامنے حمایت کی تھی، وہ ظالم تو اپنی ہی عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنانا چاہتے تھے۔ میں تم حریت پسند مجاہدوں کو سلام پیش کرتی ہوں۔"

"مخمس ہولے سے مسکرا کے رہ گیا۔ بازغہ کی آنکھیں نمناک ہونے لگی تھیں۔ معا بازغہ نے دیکھا مخمس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ اس کے زخموں سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ وہ مخمس کے خوب رو چہرے پر اترنے والی زردی مائل رگت کو دیکھ کر تشویش زدہ نظر آنے لگی تھی۔ مخمس شاید۔۔۔ بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

زبیدہ کا ایک مزید سناہمی کام آچکا تھا۔ اب اس کے ساتھ صرف دو سناہمی رہ چکے تھے۔ ایک فرہاد اور دوسرا عامر۔۔۔۔۔ دشمنوں کی بی بی مکک کی آمد اور اپنی کمزور پڑتی نفرتی طاقت کو مددگار رکھتے ہوئے زبیدہ۔ اور اس کے دونوں سناہمی سردست دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے تھے، تاہم ایک اہم دشمن یعنی موساد کے انضام شامیر کو جہنم واصل کرنے کے بعد۔۔۔۔۔ زبیدہ دیگر اہم اسرائیلی افسران کی ستاشی تھی، اسے جزل آنزک فرناش اور بارق شمعون کی

کا احساس ہوا اور اس نے سنبھلتے سنبھلتے اندر برسٹ فائر کر دیا پھر ایک ہاتھ سے گن سنبھالتا ہوا کوریڈور کی دیوار کا سہارا لیتے ہوئے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی گن اب بیکار ہو چکی تھی، اس کا خالی بوجھ اسے گمراہ گزرنے لگا۔ وہ اس نے پیچک دی۔

وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا بازغہ سے سامنا ہو گیا۔ اس کی گن پر نگاہ پڑی اور اسے نہتا اور زخمی پا کر بازغہ کی آنکھوں میں تشویش و نظر کی لہریں سمٹ آئیں، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر مخمس کو سنبھالا، مخمس پر بھی اب نیم نشی سی طاری ہونے لگی تھی، بازغہ کے نرم سہارے سے اسے کچھ طمانیت محسوس ہوئی تھی جبکہ بازغہ اسے لیے۔۔۔۔۔ ایک کمرے کا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

"تم کسی طرح ایک عدد ہتھیار کا بندوبست کر سکتی ہو؟" مخمس نے ہانپتی ہوئی آواز میں بازغہ سے کہا تو بازغہ بولی۔

"تم شدید زخمی ہو۔۔۔۔۔ تمہارا بازو اور ٹانگ بری طرح گھائل ہیں۔ اپنی جان کی فکر کرو۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ تمہیں ہتھیار کی نہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔" مخمس کی حالت غیر ہونے لگی تھی، تاہم اس نے نیم بازی آنکھوں سے کمرے کا چاؤن، پلا۔ بازغہ سے لیے ایک اندرونی دروازے سے دوسری طرف ایک ایسی جگہ لے آئی۔۔۔۔۔ جہاں ایک دیوار میں سرنگ سے مشابہ محرابی دہانہ دکھائی دیا۔ یہ زمین دوز جگہ معلوم ہوتی تھی، یا پھر اس کا اندرونی گوشہ کسی طویل سیمٹ سے جڑا تھا کیونکہ یہ کمرہ ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا مگر یہاں اسے بہت سی موٹر نرالیوں موجود نظر آئیں اور ایک بڑی سرنگ کے اندر غائب ہو رہی تھی۔ بازغہ نے شمالی سنبھالی اور مخمس کو سنبھال کے اس پر سہارا کر دیا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور شمالی کے چھوٹے سے قتل پر لگے چند بیٹوں کے ساتھ چھینر چھاڑ کرنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے شمالی حرکت میں آچکی تھی۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟" مخمس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی الجھن آمیز حیرت کا مشابہ تھا۔ بازغہ جواب دہی۔

"اپنے کمرے۔۔۔۔۔ میں اس شمالی کے ذریعے اپنے باپ کے ساتھ یہاں آئی تھی۔"

ان کی شمالی نیم تاریک سرنگ میں آگے کی طرف اپنے سفر پر گامزن تھی، سرنگ کی گول چھت پر کہیں کہیں بلب روشن تھے۔۔۔۔۔ مخمس ہونٹ بیچنے چند ٹائپے پر سوچ اور

خود بھی ماضی میں ایک ٹاپ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ جسے قابلیت اور "سیناریو" کے بل بوتے پر۔۔۔۔۔ موساد کا اسٹنٹ ڈپٹی اور اب اسٹنٹ ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ اس کی تیز بھانپتی ہوئی مکار نگاہوں نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کا زخمی حریف اب۔۔۔۔۔ اپنی پہلے جیسی تیزی یعنی "لائن آف فاسٹ ایکشن" کھو چکا ہے اور موقع ملنے ہی کسی بھی وقت اسے برسٹ چلا کے ختم کر دینے کے درپے ہے۔۔۔۔۔ بارق شمعون نے اسی لیے فوجیوں کو متنبہ کیا تھا کہ وہ بلا چون و چرا مخمس کا حکم مانتے رہیں۔۔۔۔۔ جس کے باعث مخمس کے انداز و اطوار میں وہ تیزی نہ رہی اور یہی کمزوری بارق شمعون کے اندر کے ٹاپ ایجنٹ نے فوراً بھانپ لی تھی، وہ اب اس سے قائمہ اٹھانے کی تاک میں تھا کہ ایک موقع پر جب مخمس نے دروازے سے اس سمیت باہر قدم رکھا اور مخمس کی آنکھوں میں غیظ کا شعلہ چمکا۔ وہ بارق شمعون کو جہنم واصل کر کے آگے کی راہ لینا چاہتا تھا کہ دفعتاً دروازے کی غیر معمولی چوڑی چوکھٹ پار کرتے وقت بارق شمعون نے دانستہ اس طرح جھٹکا کھایا جیسے چوکھٹ پار کرتے وقت اس کا پاؤں رہنا ہو، اس طرح وہ اپنی غیر ارادی حرکت کو ظاہر کرنے کی غرض سے دانستہ تھوڑا جھک بھی گیا اور مل کے مل جیسے ہی وہ گن پوائنٹ سے آڑکھ کے دائیں کاٹھک تیزی سے حرکت میں آئی جس کی ضرب مخمس کی زخمی ران پر لگی، مخمس اس کی چالاکی نہ سمجھ پایا۔ زخم کی نہیں نے اسے ایک لمحے کے لیے لرزادیا اور اس دوسرے موقع سے قائمہ اٹھاتے ہوئے بارق نے اسے اپنے بھاری بھر کم کا ندرے کی زوردار شوکر بھی رسید کر ڈالی۔ مخمس جب تک اس پر اپنی گن سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، وہ خود لڑکھڑا کر دور جا کر۔ بارق شمعون نے اس دوران ایک اور خطرناک حرکت کی۔۔۔۔۔ مخمس کے لڑکھڑانے کے باعث اس کے ہاتھ سے چھوٹی گن پر بھی گرفت جمانی چاہی تھی مگر گرتے ہوئے مخمس کی خوش قسمتی یہ رہی تھی کہ وہ راہداری کی دیوار سے ٹکرا کر گرا کر گن بھی چھوٹ کر اس کے پاس ہی گری، اپنے زخموں کی تاب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان اعصاب شکن لمحات میں بھی مخمس نے جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گن پر جھپٹا مارا۔ ادھر بارق شمعون شکاری کو "شکار" بننے دیکھنے کا حسرت لیے اپنی جان بچانے پر ہی۔۔۔۔۔ موقوف ہونا پڑا اور فوراً حلق کے بل چختا ہوا کمرے کے اندر دوڑ گیا۔

"ہتھیار سنبھالو۔ شکار سامنے ہے۔" فوجی جیسے چالانی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آگئے۔ مخمس کو خطرناکی

"میرا خیال ہے ہمیں ان لوگوں کے ہتھے سرے سے چڑھنا نہیں چاہیے۔ جانے اب تک انہوں نے کتنے مٹھوک لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا ہوگا۔"

عابد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ چانک ان کے قلیٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ ان کے چہرے فق ہو گئے۔ "دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔ ورنہ توڑ دیا جائے گا۔ پولیس۔" باہر ایک کرخت اور بھاری آواز ابھری تھی۔

☆☆☆

مخمس اب اکیلا تھا مگر اندر حوصلوں کی یلغار سی جاری تھی۔ اس کا بازو زخمی بھی تھا مگر اسے اپنے درد کی پروا کب تھی۔ دو آنے والے سراسرائیلی فوجیوں پر اس نے برسٹ چلایا۔ ان کی پیش قدمی کو روکتے ہی وہ مختلف پختل بورڈ کی آڑ لیتا ہوا راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بارق شمعون پر جھپٹا اور چشم زدن میں اسے گن پوائنٹ پر لے لیا۔ فوجیوں نے موساد کے اہم افسر کو مخمس کی گن پوائنٹ پر دیکھا تو اپنی گنیں اس پر تان لیں مگر وہ مخمس پر فائر کرنے سے قاصر ہی رہے کیونکہ اس نے بارق شمعون کو اپنی ڈھال بنائے رکھا تھا۔

"خبردار۔۔۔۔۔ اگر کسی نے گولی چلائی۔ میری گن اس کے ناپاک وجود کے پرچھے اتر دے گی۔ اپنی گنیں فرش پر گرا دو۔ جلدی۔۔۔۔۔" مخمس خون خوار انداز میں غرایا۔ بارق شمعون کا کمرہ چہرہ موت کے خوف سے تاریک پڑتا جا رہا تھا جبکہ اسرائیلی دستہ شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ مخمس نے بارق شمعون کی پشت پر اپنی گن کی نال چھوتے ہوئے اس بار اس کے ذریعے ہدایت دلوائی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"جیسے یہ کہہ رہا ہے ویسے ہی کرو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ مار ڈالے گا جان سے۔۔۔۔۔"

فوجیوں نے اپنی گنیں فرش پر ڈال دیں اور اس وقت مخمس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بارق شمعون سمیت فرار کے لیے دروازے کی طرف رخ کیا۔ وہ زخمی تھا۔۔۔۔۔ مگر یہ جوش و ہشیہ تھا جس نے اسے پامردی کے ساتھ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے رکھا تھا۔ اسرائیلی فوجیوں نے طوعاً و کرہاً اس کی بیروی کی تھی۔ دوسرا حکم مخمس نے انہیں دیوار کی طرف اپنا رخ پھیرنے کا دیا۔ بارق شمعون کی مکار آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ وہ زخمی مخمس کی "کنڈیشن" کو نوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی طرف سے مزاحمت کے جواب میں اپنے اندر کتنی طاقت رکھتا تھا۔ بارق شمعون

ملاش تھی۔ اسے حالات کا اندازہ بھی ہو رہا تھا جو تیزی کے ساتھ مخالف سمت کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے، اگرچہ اس کے گریڈ پلان کا ایک حصہ کامیابی سے ہٹا ہوا تھا مگر اس کے پلان کا دوسرا حصہ نسبتاً زیادہ اہم تھا جو گروپ بی کے کامیاب ایکشن پلان اور کارروائی کے بعد فوری عمل کرنے کا متقاضی تھا، جو بد قسمتی سے نہ ہو پایا اور اب زبیدہ کے پلان کا یہ دوسرا اور نسبتاً اہم مشن ناکامی کے دورا ہے پر تھا بلکہ اب تو انہیں خود اپنی جان کے لالے پڑنے لگے تھے مگر جان جو حکم میں ڈال کر اندھا دھند کارروائی کرنے کی زبیدہ بھی کچھ زیادہ قائل نہ تھی، جب تک کہ اصل ہدف حاصل نہیں ہو جاتا۔

نئی اسرائیلی کمک پہنچے ہی زبیدہ اور اس کے دونوں ساتھی پستی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر..... زبیدہ کو محسن کی بھی فکر تھی۔ نجانے وہ کہاں اور کن حالات کا شکار تھا؟ فرہاد اور عامر اس کے ہمراہ تھے نئی کمک کی آمد کے ساتھ ہی ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے کونے کونے میں ملک الموت بن کے پھیل چکے تھے، ناچار زبیدہ کو اپنا یہ اہم مشن ادھورا چھوڑ کے فرار ہونے کی حکمت عملی پر مجبور ہونا پڑا، جو سردست مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے دفاق پوزیشن اختیار کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مقام پر ان تینوں کو اسرائیلی دستے نے گھیر لیا..... یہ عمارت کا قطعی اور آخری گوشہ تھا..... دونوں طرف سے قازنگ کا تہادلہ ہونے لگا تو ناچار فرہاد نے زبیدہ سے کہا۔

”عزیزی زبیدہ!..... آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں، میں اور حامد دشمنوں کو گور کیے ہوئے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں کو موت کے منہ میں چھوڑ کر نہیں لوٹ سکتی۔ نکلیں گے تو ساتھ ہی۔“ زبیدہ نے حتیٰ لہجہ اختیار کرتے ہوئے جواب دیا تو عامر کو بھی بولنا پڑا۔

”فرہاد ٹھیک کہہ رہا ہے عزیز زبیدہ!..... آپ ہمارے لیے نہیں پوری فلسطینی قوم کے لیے اہم ہیں۔ آپ کا بچ لگنا ہم سے زیادہ ضروری ہے..... خدا کے لیے اپنی قوم اپنے آدرش کی خاطر..... مان لیں ہماری بات۔ یہ یہودی کتے آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے ہم اہم نہیں آپ ہیں۔“ زبیدہ نے اندرونی کرب سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے تلے سچ لے لے۔

”سوچنے کا وقت نہیں..... عزیز زبیدہ!..... آپ پوری

فلسطینی قوم کی ہی نہیں امت مسلمہ کی بھی امانت ہیں۔ ابھی ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔“ فرہاد نے بھی سرخس سے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو زندہ رہنا ہے ابھی..... ہم سب کے لیے..... صادق الخیری اور قیصر النیلی جیسے جاں باز مجاہد کا زخم بھی ابھی ہمارے سینوں میں تازہ ہے۔ ہم آپ جیسی عظیم مجاہدہ کے مزید کسی ایسے زخم کے ہرگز تحمل نہیں ہو سکتے..... جو خدا نخواستہ ہماری کمر توڑ ڈالیں۔“

زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ ایک مجبوری نگاہ اپنے دونوں ساتھی مجاہدوں پر ڈالی اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد اور عامر اسرائیلی فوجیوں کے سامنے اس وقت تک ڈٹے رہے، جب تک ان کے ہتھیار ساتھ دیتے رہے اور زبیدہ ان کی پہنچ سے دور نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد دونوں نے بالآخر جام شہادت نوش کر لیا۔ اس امید فردا کے ساتھ کہ بہت جلد ان کی دلیر لیڈر زبیدہ تازہ دم ہو کر اسرائیلی قابضوں کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دے گی۔

☆☆☆

کئی گھنٹے بیت چکے۔ ارض فلسطین کے لہو لہو افق سے پو پھٹنے لگی تھی مگر ابھی اس صبح کی سپیدی سحر میں مظلوموں اور نیتے بے گناہوں کے فریادی لہو کی سرفی شامل تھی جو ابھی اصل سپید سحر کی خنجر تھی، ابھی امید قیودا دیہہ کو بچھ رہا تھا ہونے کی آس باقی تھی۔ ابھی گل لالہ کا دامن دل و جاں اپنے ہی لہو سے خوں رنگ تھا۔ ابھی مٹی بھر سرفروشان وطن کے اسلام کے سودائے جنوں خیزی کی رفوگری جاری تھی تو دوسری جانب انسان نما شیطانی ٹولوں کی چال گری بھی عروج پر تھی۔ حق و باطل کی جنگ کے میدان کارزار میں اگر ایک طرف رقص اطمین نظر آتا ہے تو دوسری طرف آبروئے وطن اور اسلام کی سر بلندی کی خاطر جام شہادت نوش کرنے والے پرچم اسلام کے نام پر رقص زنجیر بہن کر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ غلط ہے ان کی سوچ جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جنگ صرف فلسطین کی جنگ ہے۔ ہرگز نہیں..... یہ تو پورے عالم اسلام کی جنگ ہے۔

جزل آئزک فرناش کی حالت اس وقت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی بال نوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ یہی حال بارق شمعون کا بھی تھا۔ دونوں اپنے اپنے ساتھیوں، ایہود شاہک اور اصحاق شامیر سے محروم ہو چکے تھے مگر اس سے زیادہ ان کی خارش زدہ حالت ہونے کی وجہ حریت پسندوں کا اسرائیلی ایشی بجلی گھر پر کامیاب حملہ تھا۔ جس کے باعث ان کی اس قدر سبکی اور رسوائی ہوئی کہ

ان کے دیرینہ خواب ”عظیم تر اسرائیل“ کو عالمی سطح پر سخت ذلت و ہزیمت اٹھانی پڑی۔ یہی نہیں ایشی بجلی گھر کی آڑ میں ان کا یورٹیم افزودگی کا پلانٹ بھی تباہ ہو گیا تھا پھر تھپائی میں ڈیوڈ اسٹار کی عمارت پر چھاپا مار مجاہدوں کا حملہ بھی کم نہ تھا۔ جس میں اگرچہ فلسطینی مجاہد کے دوسرے گروپ کو خاطر خواہ کامیابی تو نہیں ہوئی تھی لیکن یہ حملہ بھی پوری یہودی قوم اور اسرائیل کی اوپنٹی ناک کو کاٹنے کے ہی مترادف تھا۔ چونکہ یہودیت کا قیصر ہی مکاری اور دغا بازی سے اٹھا تھا اس لیے انہوں نے حتیٰ الوسع کوشش کرتے ہوئے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر پر فلسطینی چھاپا ماروں کے حصے گوراز میں رہنے دیا مگر ڈیمون حملہ اور ایشی بجلی گھر کی تباہی کے واقعے کو چھپانے سے قاصر رہے تھے کیونکہ اس کی تباہی سے پورا یروشلم اور تل ابیب اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ تاہم اسے بھی فنی خرابی کا تام دے کر اپنے تئیں چھپانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی مگر وہ اس زخم کا اندھا انتقام لینا چاہتے تھے۔ فلسطینی اور عرب بستیوں کے مظلوم اور نیتے... ”موسوم لوگوں پر گولہ باری اس طرح کی بزدلانہ کارروائی یہودیت کا بنیادی شیوا تھا۔ اس پر فی الفور عمل پیرا ہونے کے لیے اسرائیلی اٹھارویں نے فوراً چار بڑوں کی ایک اندر جنسی سیننگ کال ٹول دی۔ ان چار بڑوں میں ایک ڈیوڈ اسٹار کا سربراہ جنرل آئزک فرناش تھا۔ دوسرا موساد کا ڈپٹی چیف بارق شمعون، تیسرا یہودی ایشی جنس یونٹ ”ہگانہ“ کا ڈائریکٹر آئزک رین ہیری اور چوتھا انٹروپیشن سینٹر کا چیف انچارج شمیر گویان تھا۔ جبکہ ہگانہ کے ڈائریکٹر آئزک رین کو ”شن بیٹھ“ نامی اسرائیلی کاؤنٹر ایشی جنس کی بھی فستہ داریاں سونپی گئی تھیں جو ”الیاہیہ“ (alyah) (beth) کا بانی بھی تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ موساد اور ڈیوڈ اسٹار درحقیقت ”ہگانہ“ اور ”شن بیٹھ“ کا بانی ایک پولینڈ نژاد یہودی آئزک رین ہی تھے تو صرف بیس سال کی عمر میں 1901ء میں پہلی مرتبہ فلسطین آیا تھا، وہ اس یہودی تحریک کا خفیہ جال شاکر تھا جو بڑی خاموشی سے ایک سازش کے تحت دنیا بھر سے یہودیوں کو فلسطین پہنچ کر آباد ہونے کا مشورہ دیا کرتی اور پھر اس کا بندوبست بھی کرتی تھی۔

آئزک رین نے حید سے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک رات ستری کی حیثیت سے کیا اور جلد ہی اس نے اپنی کنسٹرکشن کمپنی قائم کر لی لیکن چند سالوں میں اس کا دو ایلا لک گیا تو وہ واپس پولینڈ آ گیا۔ پھر یکا ایک اس کی زندگی میں انقلاب آیا اور 1938ء میں جب وہ دوبارہ اسرائیل

آیا تو وہ یہودیوں کی خفیہ فوج کا جاں نثار سپاہی تھا۔ 1948ء میں آئزک رین لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا اور ”ہگانہ“ (یہودی ایشی جنس یونٹ) کی باقاعدہ داغ تیل ڈال کر اس کا بانی اور چیف بن گیا۔ مکاری میں یکتا نے روزگار ہونے کے سبب وہ خفیہ امور کا چھپکین سمجھا جاتا اور اس کا شمار ہگانہ آرمی کے معزز افسران میں ہوتا تھا۔ جب اسرائیل کے قیام کے ساتھ ہی جنگ کا آغاز ہو گیا تو اسرائیل کی بھاک ڈٹنے داری بھی ایک طرح سے آئزک کے کاندھوں پر آن پڑی۔ اس پر ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ہگانہ چیف ہونے کی حیثیت سے اس کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا لیکن دلے پتلے اور لپے قد کے آئزک رین نے جیسے حالات سے شکست کھانا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے چند دنوں میں ہی اپنے ایجنٹوں کا جال دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ جرمن نازی سبوں سے نکالے گئے یہودیوں کو بھی اسرائیل اور فلسطین میں لاکر بسانا اس ملعون شخص کا کام تھا۔ اب ہگانہ کا ڈائریکٹر آئزک رین ہیری اور اپنے بڑا دادا کا ہم نام ہی نہیں بلکہ اس جیسی ناپاک اور مکروہ خصلت کا مالک بھی تھا۔ اس نے آگے چل کر ہگانہ کی دو ذیلی شاخیں نکالیں، جن میں ایک الیا بیٹھ (Aliya Beth) اور دوسری شون بیٹھ (Shun Beth) تھیں جو یہودی اسرائیل کی جدید کاؤنٹر ایشی جنس ایجنسی کا کام کرتی تھی۔ ان میں مشن بیٹھ وہ تھی جو مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں اور ڈگری یافتہ درس گاہوں میں اسٹار کی بنیاد پر آئے ہوئے ان مسلم طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی جن کا تعلق مسلم ممالک سے تھا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت وہ ان ہونہار مسلم طالب علموں کے درخشاں مستقبل کے آگے روڑے اٹکانے اور انہیں مختلف جموں نے الزامات میں پھنسا کر ایسے جدید تعلیمی اداروں سے رسوا کر کے بے دخل کرنے کا مشن انہیں سونپا گیا تھا۔ بالخصوص امریکا کی اعلیٰ اور جدید درس گاہوں میں ایسے مسلم ہونہار اسکالرز طالب علموں کو بے دخل کرنے کے مشن پر یہ ملعون کفر مسلم کش یہودی باقاعدہ خود بھی اسرائیلی سفیر کی حیثیت سے کچھ عرصہ امریکا میں مقیم رہا جس نے امریکا میں موجود مسلم طالب علموں کے خلاف جعلی ثبوت اکٹھے کر کے امریکی حکام کو گمراہ کیا لیکن آئزک رین کا اصل ٹارگٹ پاکستان اور پاکستانی طلبا ہوتے تھے، ان کا تعلیمی مستقبل داؤ پر لگانا اور انہیں برباد کرنے میں وہ اپنی طرف سے کوئی بھی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرتا تھا۔ امریکا کے بعد اسرائیل کا دوسرا ہمنوا برطانیہ تھا۔ آئزک رین کی شن بیٹھ

دوست کی خاطر

ملنگی بہت ظالم ڈاکو تھا اس کے خوف کے پیش نظر لوگ کہتے تھے۔ دنے راج فرنگی داتے راتی راج ملنگی دا۔ عدالت سے سزا کے طور پر جس دن اس کو اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دی جانی تھی۔ تو صبح سویرے جیل سپرنٹنڈنٹ اس کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”ملنگی کٹھن منزل آگئی ہے اپنے آپ کو اس سفر کے لیے تیار کرو۔“ ملنگی نے جواب میں یہ کہا کہ ملنگی موت کو درد سہا معمولی خراش سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے گرفتاری کا سبب پوچھا تو ملنگی نے گرفتاری کا سبب بتایا کہ ہمارا ساتھی جواب بھی اگلی کوشٹری میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہے گرفتاری سے پہلے جنگل میں ایک محفوظ مقام پر پیٹھے تھے ہمارا یہ ساتھی اس وقت بھی قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھا اچانک ہمارے جاسوس نے پولیس آنے کی اطلاع دی ہم بھاگنے کو تیار ہو گئے اگر ہم اس وقت بھاگ کھڑے ہوتے تو کبھی گرفتار نہ ہو سکتے لیکن ہمارے ساتھی نے کہا ”میں جب تک قرآن مجید کا یہ پارہ ختم نہ کر لوں تلاوت نہیں چھوڑ سکتا۔“ ایک طرف اس ساتھی کے ساتھ موت اور دوسری طرف زندگی کے لیے فرار۔ ان دو صورتوں میں کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے دوست کے ساتھ مرنا گوارہ کر لیا کہ جو شخص قرآن دوستی کے مقابلے میں اپنی جان کی پروا نہیں کرتا ایسے دوست پر اپنی جان بھی قربان کر دینی چاہیے۔

مرسلہ: محمد جاوید شبیر بربرہ، علی پور مظفر گڑھ

چینیت کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں بے گناہ معصوم شہریوں کا بڑی سفاکی سے گویا قتل عام کیا گیا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف انسانی لاشیں، بچھڑوں کی صورت نظر آنے لگیں۔ کہیں معصوم.... شیر خوار بچوں کے اجڑے بچوں کے اعضا بکھرے نظر آتے تو کہیں صرف پرگوشٹ کے لوتھڑے۔ اسرائیل کی اس تلخی جارحیت سے زمین و آسمان تھرا اٹھے مگر کرب ناک المیہ تو یہ تھا کہ اس ظلم اور سفاکانہ بربریت کے انسانیت سوز شیطانی کھیل کی عالمی سطح پر پورٹنگ اور ٹی وی کورینج بھی کی گئی مگر باوصف اس کے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور عالمی امن کے دائمی امریکا کے سر پہ جوں تک نہ رہی۔ ان کے بعد سب ”ماٹھا“ پڑ گیا۔ حکومتی سطح پر احتجاج ریکارڈ کروایا گیا تو ڈرتے ڈرتے..... یوں جیسے کسی چودھری کی بیٹھک میں کوئی غریب مزارعہ ڈرتے ڈرتے اپنی عرضی پیش کر رہا ہو..... عرب کٹھن کے عام خانوں میں لٹھے کے لیے لے دس ترخوان..... بھانت بھانت کے من و سلوٹی کھانوں سے بھرتے رہے لیکن کسی نے خاطر خواہ طریقے اور ذرائع سے اسرائیل کی ریشہ دوازیوں کے آگے سینہ سپر ہونے کی کوشش نہ کی۔ اقتدار کے بھوکے گدھے، مردہ خوری کے ہی منتظر رہے مگر کسی نے امریکا کے لیے پالک اسرائیل کی پیرہ دہستیوں کو اس طرح نہ چین کیا، جو حالات کے متقاضی تھا۔

اور فلسطینی مظلوموں کی اجڑی پھوٹی بے گورونکن لاشیں..... یہ ظاہر مردہ آنکھوں سے آسمان کو کھتی رہیں اور خالق کائنات سے ہی انصاف مانگتی رہیں۔

ابھی فلسطین اپنے ہی خون میں نہایا تڑپ رہا تھا کہ صیہونیوں نے ان کی غیرت و حمیت پر ایک اور چرکا لگایا۔ آئزرائیل میں بیری کے اگلے مکروہ پلان کے مطابق صیہودیوں نے مسلمانوں کے قبلہ اول مسجد اقصیٰ میں گیس کراہتی مذہبی رسومات ادا کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد بھی بے حرمتی کرنے والوں میں اکثریت اسرائیلی فوجیوں اور متعدد صیہودی آبادکاروں کی تھی جو پہلے بھی مختلف رسومات کی ادائیگی کے بہانے سے مسجد میں گیس کر رہے حرمتی کے مرتکب ہوئے۔ ان میں اسرائیل کے اعلیٰ جنس اہلکار بھی شامل تھے۔ جو بڑی تعداد میں مسجد کے اندر مسلمانوں کی سرگرمیاں مانیٹر کرنے اور پیکل سلیمانی کی تعمیر کے صیہودی منصوبے کی تکمیل کے لیے وہاں موجود رہتے تھے۔

آج بھی مسجد کے اندر دراندازی کے دوران صیہودیوں نے کئی ایسی کارروائیاں کر ڈالیں جن سے اسلامی

مجرور کرنا ضروری تھا، یہ ان کا دہرا انتقام لینے کا پرانا مذموم طریقہ کار تھا مگر ساتھ ہی آئزرائیل میں بیری جو نیوز نے ایک نیا ایجنڈا بھی پیش کر دیا۔ جسے اسرائیلی کابینہ کے ارکان نے فوراً منظور کر لیا۔ اس کے بعد آئزرائیل نے اپنی بددیانتی آواز میں میٹنگ کے شرکاء سے مخاطب ہو کے کہنا شروع کیا۔ ”حریت پسندوں کی ایسی کارروائیاں ہمارے گریٹر اسرائیل پلان کو ہمیشہ سے ہی سبوتاژ کرتی آئی ہیں لیکن ہمیں اس کا متوڑ جواب بھی دینے رہنا ہوگا ہر مصلحت سے بالاتر ہو کر ہمیں اس پالیسی پر عمل کرنا ہوگا جو فلسطینیوں کو بری طرح کھینچے اور عرب بستیوں اور علاقوں پر ہمارے قدم مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوں۔“ سب نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

آئزرائیل کے اس نئے ایجنڈے کے مطابق اردن کی سرحد سے متصل مسلمانوں کے تاریخی و ثقافتی علاقے ”وادئ اردن“ (انوار) کو صیہونی ریاست میں ضم کرنا تھا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد اسرائیل مشرقی بیت المقدس اور وادئ گولان کی طرز پر اس علاقے میں بھی اپنے قوانین لاگو کرے گا۔ اس مقدس وادی میں امت مسلمہ کے امین حضرت عبیدہ بن جراح اور جلیل القدر صحابی معاذ بن جبل سمیت متعدد صحابہ کرام اور کثیر تعداد میں تابعین کی آخری آرام گاہیں ہیں۔ یہ مقام کئی تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے پوری امت مسلمہ کے لیے منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

اس ناپاک اور متنازعہ مسودہ قانون کو وہاں موجود اسرائیلی حکمران جماعت ”لیکوڈ“ اور اس کی اتحادی ”بیچوش ہوم“ کے وزرا کی پہلے ہی سے حمایت اور تائید حاصل تھی، جس کے مطابق مقبوضہ وادی اردن کو مغربی کنارے اور مشرقی بیت المقدس کی طرح اپنے انتظامی کنٹرول میں لانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ کابینہ کٹھن میں لیکوڈ اور جیوش ہوم کے آٹھ وزرا نے اس متنازعہ قانون کی حمایت کر ڈالی۔ ان وزرا میں رکن پارلیمنٹ میری ریگیو بھی تھا جو اس سے قبل وادی اردن میں صیہودی بستیوں کی تعمیرات سے متعلق قانون سازی پر عمل درآمد کی بھی نگرانی کر چکا تھا۔ اس متنازعہ مسودہ قانون کی منظوری اور میٹنگ کے اختتام کے بعد اسرائیل کا شرمناک اور انسانیت سوز شیطانی کھیل شروع ہو گیا۔

چیننے چنگھاڑتے دیوقامت اسرائیلی جنگی طیاروں نے فلسطینی اور عرب بستیوں پر وحشیانہ گولہ باری کا آغاز کر دیا۔ غزہ کو کھنڈر بنا دیا۔ نئے نئے معصوم اور بے گناہ فلسطینیوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، صیہونی

وہاں بھی اس کا ز پر مصروف کار تھی۔ مشن ہیچہ بالخصوص امریکا اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں مختلف اسلامی ممالک سے اسکالرشپ ”ٹرانسٹری“ کے لیے آئے ہوئے مسلمان طالب علموں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور ان کے مستقبل کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہر ادھما بھکنڈا استعمال کرتی تھی۔ جعلی الزامات کے ساتھ ساتھ وہ حسین صیہودی عورتوں کو بھی استعمال کرتے تھے، جو انہیں بے راہ روی میں جتلا کر کے اپنے مقصد سے بنانے کا باعث بنی نہیں بنتے بلکہ اپنے ملک اور قوم کی بھی بدنامی کا سبب بنتے۔

آئزرائیل کے لیے بھی یہ ایک بڑا زخم تھا جو PLSO اور الحجاب نے اسے تیونائی اور نجف آپریشن کی صورت میں دیا تھا۔ بین اسی طرح جیسے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کی سات سنگال فورس نے اپرا سالت دن اور ٹو کے ذریعے جنس آپریشن کے دوران غضب خدا کے فلسطینی مجاہد رہنما طویل الوزیر اور پی فرنٹ کے صادق الخیری کو شہید کر کے فلسطینیوں کو زخم دیا تھا۔

اس ہنگامی میٹنگ میں اسرائیلی حکومت کی پارلیمانی کمیٹی بھی موجود تھی اور ان سب کے چہرے بری طرح چمکے ہوئے تھے، ہگانہ آرمی کے آئزرائیل بیری جو نیوز کو اسرائیلی قوم کے ہیرو ”موروثی“ حیثیت حاصل تھی اور اس کا حکومتی عمل داری میں بھی موساد اور ڈیوڈ اسٹار سے زیادہ دخل تھا۔

آئزرائیل بیری جو نیوز ایک لسا تڑنگ اور کالی رنگت کا گول چہرے والا کٹر صیہودی تھا۔ سر بالکل گنجا، ناک قدرے پچی ہوئی تھی جبکہ چندی چندی آنکھوں میں بلا کی مکاری ایک خباثت لیے ہوئے تھی۔

اسٹین لیس اسٹیل راڈز کی سپاٹ میزکریوں پر یہ سارے اکابرین بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے ناپاک اذہان میں خون مسلم بہانے کے لیے بے چینی بھیلی ہوئی تھی، آج یہ صفت فرعون و انیس انتقام کے نشے میں اندھے ہو کر بیت المقدس قبلہ اول اور ارض فلسطین کے خلاف مذموم اور بھیانک فیصلہ کرنے والے تھے۔

میٹنگ کی ابتدا پہلے تو دھواں دھار انداز میں ہوئی اور وہاں موجود سب ہی گویا پہلے سے اس بات پر متفق ہوئے بیٹھے تھے کہ الحجاب اور PLSO کی ان چھاپا مار کارروائیوں کا بدلہ یہ لوگ فلسطین کے معصوم اور نئے عوام سے لیں گے لیکن وہ سمجھتے تھے کہ صرف مارا ماری میں پورا انتقام نہ ہوگا۔ انتقام کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات بھی

یوں تو اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا اور وہ بہت پہلے سے ہی اپنی اس حسین کلاس فیلو جینی کی نیلی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بھانپ چکا تھا مگر وہ لیے دیے رہنے والا شخص تھا۔ ایک حد سے زیادہ اس نے جینی کو آگے بڑھنے نہیں دیا تھا۔

اسرائیل کے فلسطین پر ڈھائے جانے والے ستم پر ڈاکٹر کمال کا دل بھی اپنے مسلم فلسطینی بھائیوں کے لیے تڑپتا تھا۔ جینی سے اکثر اس کا اس سکتے موضوع پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اس کے فیلوز میں جینی ہی وہ فرد واحد تھی جو اس کے اس موقف کو جائز سمجھتی تھی اور اسرائیلیوں کے فلسطین پر اس ظلم و ستم کو برا اور انسانیت کی تذلیل سمجھتی تھی۔

آج بعد نماز جمعہ مسلم کمیونٹی نے ہائیڈ پارک پر جا کے فلسطین پر ہونے والے اسرائیل کے انسانیت سوز ظلم کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ ان میں ڈاکٹر کمال کے ساتھ جینی بھی شامل تھی اور کچھ انسانی حقوق کے علم بردار برٹش گوروں کی تنظیموں کے افراد بھی ان کے ساتھ احتجاج میں ہم آواز تھے جبکہ ڈاکٹر کمال کا اپنا بھائی ظہیر احمد جینی کی نماز کے بعد خاموشی سے کھسک گیا تھا۔ ان لوگوں نے لیے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے، جن میں جلی حروف میں اسرائیل کی غزہ اور دیگر عرب بستیاں کے لیے لوگوں اور زیادہ آبادی والے علاقوں پر وحشیانہ گولہ باری کی شدید مذمت کی گئی تھی۔ پرامن طریقے سے یہ احتجاج ریکارڈ کرانے کے بعد سب نے اپنا اپنا راستہ لیا اور ڈاکٹر کمال بھی..... جینی کے ہمراہ اس کی کار میں یونیورسٹی کمپس کی طرف روانہ ہو گیا۔

”تمہارا شکر یہ جینی!“ کار ڈرائیو کرتی ہوئی جینی کے سرخ و سپید چہرے کی طرف ایک نظر سکتے ہوئے ڈاکٹر کمال نے ہولے سے کہا۔

”شکر یہ..... کس بات کا؟“ جینی نے ایک لمحے کو کار کی ونڈ اسکرین سے نگاہیں نہاتے ہوئے، ڈرا گروڈن موڈ کے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

”تم نے ایک غیر مذہب ہونے کے باوجود ہمارا ساتھ دیا۔“ ڈاکٹر کمال نے کہا۔ اس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی تھی۔

”بس! تمہاری تان مذہب پر آ کر ٹوٹ جاتی ہے۔“ جینی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس پر کمال کو چونکنا پڑا۔ جانے کیوں ایک لمحے کو کمال کو جینی کے لہجے میں چبھتا ہوا طنز محسوس ہوا تھا۔ مختصر اُبولا۔

”تم نے شاید غلط سمجھ لیا۔“

کلمے کا شوق تھا۔ اس کے شوق کو بد نظر رکھتے ہوئے باپ نے بھی اس کی پوری مدد کی تھی اور اسے ڈاکٹر بنا یا تھا مگر کمال احمد صرف ایم بی بی ایس کر کے مطمئن نہ تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ اس کے باپ نے یہاں تک ہی اسے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنا دیا تھا وہ کیا کم تھا... تاہم ڈاکٹر کمال نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اس کا لرشپ کا ایک امتحان پاس کر کے وہ لندن لیڈز یونیورسٹی آ گیا۔ تب تک پلوں کے پیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ماں باپ فوت ہو گئے، دونوں بہنیں اپنے گھروں کی ہوئیں اور ڈاکٹر کمال اپنی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب سجائے، لندن آ گیا۔ وہ مائیکرو بیا لوجسٹ تھا اور پاکستانی حکومت نے پانچ سال کا ایک ”بانڈ“ بھر کے اسے اسکا لرشپ پرائیم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے لیے سرکاری سطح پر لندن لیڈز یونیورسٹی بھیجا تھا۔

ڈاکٹر کمال یونیورسٹی کے کمپس میں ہی رہائش پذیر تھا۔ اپنے بڑے بھائی ظہیر احمد سے ناراضگی کے باوجود اس سے اس کا ملنا جلتا بھی تھا۔ بڑے بھائی نے بھی واجبی سا ہی تعلق رکھا تھا تاہم جیو کی نماز پر دونوں ملتے تھے۔ ڈاکٹری پیسے، شہ، سہ، واہنگی، عمارتیں، باوجود ڈاکٹر کمال ایک دل بھی رکھتا تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع اور سادہ منس شخص تھا۔ صحت اچھی تھی دراز قد تھا، رنگ گورا اور چہرے پر شفاف عدسوں کی ٹیس عینک لگا یا کرتا تھا۔ عمر پچیس، تیس کے درمیان تھی۔ اسے سنسری سے بھی دلچسپی تھی۔ اپنی ذات میں وہ مرنجیاں مرنج آدی تھا۔ مگر نیاے ادب کی کتب بینی بھی اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سادہ فطرت ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے سچے اور گھرے موقف پر ڈٹا رہتا۔ جب کسی سے بدل گفتگو کرتا تو اس کے اندر سے جوش کا ایک طوفان اٹھتا تھا۔ وہ جب اپنے سماجی طلبا کے درمیان کسی اہم اور حساس موضوع پر بحث شروع کرتا تو اس کا جوش اور ولولہ دیکھ کر وہ اگشت بدندان رہ جاتے، جو اسے ”خاموش سمندر“ سمجھتے تھے، انہیں اس کے اندر ایک ولولہ انگیز مدد اور شعلہ بیاں مقرر ہی نہیں بلکہ ایک پر جوش جنگجو انسان بھی نظر آتا تھا..... جینی کرسی ایک برطانوی حسینہ جو اس کی کلاس فیلو تھی۔ وہ اس سے زیادہ متاثر تھی، وہ ایک سنہری بالوں والی حسینہ تھی۔ مقامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے شیرف جان نسوئیر کی بیٹی تھی اس کا بھائی بھی تھا، ریان نسوئیر..... وہ اس سے ایک سال بڑا تھا۔ وہ ایک لا ابالی اور آوارہ منس آدی تھا۔ ڈاکٹر کمال

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، باپ ٹیکسی چلاتا تھا۔ پہلے پبلک ظہیر احمد، پروین سے شادی کے بعد ان کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے کلیٹ میں رہتا تھا جو کرائے کا تھا، ایک حادثے میں پروین کے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ تب تک ظہیر احمد خود بھی اپنی محنت کے ثمرات پر یہاں اپنے قدم جما چکا تھا اور پھر اپنے ساس سسر کا کلیٹ جو کرائے کا تھا، چھوڑ کر ویسٹ کارنر کے علاقے میں ایک دو کمروں کا چھوٹا مکان Mortgage پر لے لیا اور ایک فاسٹ فوڈ ٹائپ کی دکان کی بنیاد بھی وہ پہلے ڈال چکا تھا جو اب ایک چھوٹے سے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں بدل گئی تھی۔

ڈاکٹر کمال اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ کل پانچ بہن بھائی تھے، تین بھائی دو بہنیں ظہیر احمد سب سے بڑا تھا۔ پھر جمال احمد کے بعد کمال احمد تھا۔ دونوں بہنیں چھوٹی تھیں۔ ان کا تعلق پاکستان کے شہر بہاولپور سے تھا جس کے نواحی گاؤں میں ان کا باپ کسی چودھری کا ششی تھا۔ سوائے کمال احمد کے کسی کو بھی پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہ تھی۔ ظہیر احمد شروع میں دینی گیا۔ ایک پاکستانی کنسٹرکشن کمپنی کو لیبر کی ضرورت تھی۔ ظہیر احمد زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر جسمانی محنت مشقت کرنے کا ذمہ تھا۔ وہ کسی طرح ایک مزدور کی حیثیت سے مذکورہ کنسٹرکشن کمپنی میں بھرتی کر لیا گیا اور دن کی مزدوری کرنے لگا۔ فطرتاً وہ خود غرض تھا۔ اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں ماں باپ کی کوئی پروا نہ تھی۔ دینی میں چند سال رہنے کے بعد اسے گویا باہر کی دنیا کا چکا پڑ گیا پھر خود بھی اس کا اٹھنا بیٹھنا کچھ ایسے لوگوں میں ہو گیا کہ اس نے اپنا مستقبل لندن جا کر بنانے کا فیصلہ کیا۔

لندن میں شادی کرنے اور کچھ پاؤں جمانے کے بعد اسے کہیں جا کر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال آیا تو وہ بھی واجبی سا۔ کبھی ٹھوڑے سے پیسے بھیج دیے، کبھی نہیں۔ بوڑھے ماں باپ نے ہی اپنی بانی کی اولاد کو اپنی استطاعت بھر پالا پوسا۔ منجھلا بھائی جمال آوارہ دوستوں اور نشے میں پڑ چکا تھا اور ایک دن زیادہ نشے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ بہنوں کو وہیں کسی نہ کسی طرح بیاہ دیا گیا۔ ماں باپ فوت ہو گئے۔ منشی فیض محمد کو اپنے جس بیٹے پر سب سے زیادہ مقرر تھا۔ وہ چھوٹا بیٹا کمال احمد ہی تھا۔ صحیح معنوں میں آخر وقت تک وہی اپنے بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنا رہا اور جتنا کیوں نا..... منشی فیض محمد نے اپنے خون پسنے کی ایک ایک پائی اپنے اس چھوٹے ہونہار اور فرماں بردار بیٹے پر جو لگائی تھی کیونکہ کمال کو شروع ہی سے پڑھنے

شناخت بری طرح متاثر ہوئی۔ بالخصوص مسجد کے محنتوں کو یہودی مقام قرار دینے کے لیے یہاں وقفے وقفے سے یہودی رسومات اور تقریبات کا انعقاد کیا جاتا رہا نیز..... مسجد اقصیٰ اور اس کے گرد پھیلے ہوئے بارکت شہر القدس کو بھی یہودی رنگ میں رنگنے کا سلسلہ خفیہ اور اعلانیہ جاری رہا۔ الجھاد اور PLSO کی تازہ کارروائیوں کے انتقامی جواب میں اسرائیل کے بزدلانہ عمل سے بے شک چند اسلامی ممالک کی طرف سے لعن طعن کی گئی اور احتجاج بھی کیے گئے مگر اسرائیل اپنے قسائی مزاج سے باز آنے والا کب تھا۔ اب تقریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی عرب بستی پر نئے مظلوم مسلمان عوام پر اسرائیلی بمبار طیارے گولہ باری کرتے رہے واقعی اس بربریت اور سفاکانہ کھیل کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہودی مسلمانوں کی نسل کشی پر اتر آئے ہوں..... مگر یہ شیطانی کھیل جاری تھا۔

☆☆☆

ریجنٹ (Regent) پارک کی مسجد میں جمعہ المبارک کی نماز سے پہلے خطبہ دیا جا رہا تھا اور پیش امام بڑی دردناک آواز میں اسرائیل کے فلسطین پر کیے جانے والے بھیانک اور انسانیت سوز ظلم کے ساتھ عالم اسلام کی بے بسی کے بارے میں بھی ذکر فرما رہے تھے، ان کے دھچکا لب لباب وہی تھا جو خواب غفلت کی نیند میں سوئے ہوؤں کو جگانے کے لیے مقصود ہوتا ہے۔ جو فلسطین کی جنگ کو بے سمجھے ہوئے ہیں کہ یہ ہماری جنگ نہیں۔ اس موضوع پر لندن کے قانون اور مصلحت کوئی کے سبب انہوں نے زیادہ تقریر کرنا مناسب نہ سمجھا مگر جی کی آواز کو تو قیصر و کسریٰ کے دربار میں بھی نہیں دیا جاسکتا تھا تو یہ تو پھر لندن تھا۔ یہاں بھی مسلم کمیونٹی کی جانب سے اسرائیل کی فلسطین پر وحشیانہ اور ظالم گولہ باری پر احتجاج کیا گیا تھا۔

لندن کی ریجنٹ پارک کی اس مسجد میں جمعہ المبارک کی باجماعت نماز میں ایک پاکستانی مسلم گھرانے کے دو نمبلی ممبرز بھی نماز کی ادائیگی کے لیے موجود تھے، یہ دو بھائی تھے، ظہیر احمد اور ڈاکٹر کمال احمد..... یہ دونوں بھائی تھے، ظہیر احمد بڑا بھائی تھا اور وہ دس برسوں سے لندن کے شہر ”لیڈز“ (Leeds) میں مقیم تھا۔ ایک چھوٹے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا مالک تھا۔ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا۔ اچھے وقتوں میں جب برٹش ویزا پالیسی نرم تھی، وہ یہاں اپنی قسمت چکانے آیا تھا، پھر ادھر ہی اس نے ایک پہلے سے آباد مسلم گھرانے کی لڑکی پروین سے شادی کر لی۔

”کیا تم ہی وہ بڑبڑولے اور تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کمال ہو جو آئے روز ہائیڈ پارک پہ جا کر اسرائیلیوں کے خلاف کچھ اچھالتے ہو؟..... یہ خیال کیے بغیر کہ جس ملک (برطانیہ) نے اپنی اعلیٰ تعلیمی درس گاہ میں تم جیسے پختہ پاکستانی کو ایڈمیشن دیا اور لندن جیسے جدید شہر میں تمہیں رہنے کا موقع دیا جس کے تم لوگ صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہو۔ وہاں آ کر..... تم اس طرح کا اشتہار پھیلاتے ہو اور امن کی فضا کو خراب کرتے ہو۔ شرم آتی چاہیے تمہیں۔“

تعصب اور لمبے ترنگے کالے بیودی کی آواز کسی افریقی تیل کی طرح سینٹرل کینٹین میں گونج رہی تھی اور وہاں موجود بھانت بھانت کے ممالک سے آئے ہوئے طلباء یکدم خاموشی سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک مسلم بھی تھے اور مقامی گورے بھی..... مکار بیودی کارلو نے ان گوروں کو بھی خوش کرنے اور اسکاٹ لینے کے لیے..... برطانیہ (لندن) کی بھی تعریف کر ڈالی تھی۔ کئی ایک کے چہروں پر استہزاء مسکراہٹ تھی اور آنکھوں سے شرارت آمیز شوق بھی مترشح تھا۔ جینی پریشان نظر آنے لگی۔ ڈاکٹر کمال نے بہ ظاہر بڑے عمل سے یہ سب سنا پھر اپنی شفاف عدسے کی عینک درست کرتا ہوا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جینی بھی ایسی ہی دعا کر چلائی۔ اسے اٹھ کھڑی، ہڈی کہ شاید کمال اس سے منہ لگے بغیر وہاں سے جانا چاہتا ہے۔

ڈی کارلو اور اس کے ساتھی ٹولے کا ہی نہیں بلکہ وہاں موجود دیگر لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ڈاکٹر کمال بھی دیگر مسلم طلباء کی طرح ڈی کارلو کی ہرزہ سرائی کا جواب دینے بغیر وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ یہ ان بے چارے امن پسند اور ذہین اسکالرز مسلم طلباء کی بھجوری تھی کہ وہ اس طرح کے شر اور گفتگو سے بچنے ہی کی کوشش کرتے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے کینٹین کے ہال میں سرگوشیوں کی سرسراہٹیں بلند ہونے لگیں اور پھر اس وقت سب کو یکدم سانس سونگھ گیا جب انہوں نے ہال میں ڈاکٹر کمال کی پر جوش آواز گونجتی سنی۔

”تم مجھے تعصبی پاکستانی مسلم ڈاکٹر کہہ کر یہاں کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟“ ڈاکٹر کمال نے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں سے عینک اتارتے ہوئے ڈی کارلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت جگہ گھرے کلر کے کوٹ پینٹ میں لمبوس تھا جبکہ ڈی کارلو نے ٹائٹ چٹلون پر صرف شرٹ چڑھا رکھی تھی اور کہیں سے بھی مہذب طالب علم نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آگے بولا۔ ”تمہاری اس ہرزہ سرائی

میں یونیورسٹی کیسپس میں پوری کیسوی کے ساتھ تعلیم پر اچھی توجہ دی جاسکتی تھی۔

کچھ دن گزرے تھے کہ یونیورسٹی کی آرٹ اینڈ ہنری کی فیکلٹی میں ایک اسکالر کا اور اضافہ ہوا۔ یہ ایک برطانوی نژاد لہا ترنگا کالا بیودی ڈی کارلو تھا۔ انتہائی تعصب ذہنیت کا مالک ڈی کارلو ایک شہ پسند بیودی تھا۔ اس نے یہاں آتے ہی سب سے پہلے مسلمان طلباء کا جینا حرام کر دیا۔ آئے روز وہ یونیورسٹی، سینٹرل کینٹین، ہاسٹل فرینک جہاں اور جہاں سے موقع ملتا وہ مسلمان طلباء کو تضحیک کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے کچھ ہم خیال گوروں کا بھی ٹولہ بنا رکھا تھا۔ وہ ڈاکٹر کمال کا ہم عمر ہی تھا اور کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ فرنیچر ڈیکارو..... برٹش پارلیمنٹ کارکن اور اقلیتی امور کا وزیر بھی رہ چکا تھا اور برطانیہ کی مقتدرہ شخصیت میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے اثر و رسوخ کا حامل تھا۔

تعصب ڈی کارلو..... سے امن پسند مسلم طلباء کئی کترانے کی کوشش کرتے، وہ جانتے تھے کہ اس کے منہ تینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ وہ اس کی ہرزہ سرائی کی شکایت کرنے کی ہمت کرتے تھے، ڈی کارلو دانستہ جہد مسلم طلباء کی ٹولی کو دیکھتا اپنے ٹولے کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا اور مسلمان اور اسلام کے تعلقہ تقویات، مکتا شروع کر دیتا۔ ایک دن اس کی مذہبیز ڈاکٹر کمال سے ہوئی۔ دونوں ہم عمر اور یکساں قد و قامت کے تھے..... ڈاکٹر کمال کے بارے میں ڈی کارلو نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا اور بڑی شہدہ کے ساتھ اسے اس کی تلاش بھی مگر چونکہ ڈاکٹر کمال قوت و اوقات میں ادھر ادھر بیٹھنے کے بجائے سیدھا لائبریری کا رخ کرتا اور اضافی وقت وہیں گزارتا تھا۔ جینی بھی کبھی کبھار اس کے ہمراہ ہوتی، تو چائے وغیرہ کی غرض سے..... وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے سینٹرل کینٹین میں آجاتے۔ ڈی کارلو کے ایک ساتھی نے اسے ٹھوکا دے کر..... سامنے اشارہ کرتے ہوئے قدرے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا..... ڈاکٹر کمال جن کے ساتھ بیٹھا چائے پینے میں مصروف تھا، درمیان میں دو میزوں کا قاصدہ تھا۔ ڈی کارلو نے سنسناتی نظروں سے گردن ذرا گھما کر ڈاکٹر کمال کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پہ نفرت انگیز تاثرات اٹھائے۔ چندی چندی آنکھوں میں شر پھونٹنے لگا۔ وہ یکدم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دانت بچھتا ہوا سیدھا ڈاکٹر کمال اور جینی کی میز کے قریب جا پہنچا۔ جینی اسے پہچانتی تھی کمال نے بھی اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔

باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی مذہب اسلام کے بارے میں خاصا مطالعہ رکھتی ہے اور ایسے ہی حائر نہیں ہوتی۔

”ایسا سب سازش کے تحت ہوا۔ مسلمانوں کو مسلمان سے لڑانے کے لیے۔“ ڈاکٹر کمال نے کہا تو نہ جانے کیوں اسے اپنی آواز پھنسی پھنسی ہی محسوس ہوئی۔

”دل کو بہلانے کے لیے خیال اچھا ہے غالب.....“

دفترا ہی جینی کے لیوں سے غالب کی شاعری کا یہ مصرع ادا ہوا جس نے ڈاکٹر کمال کو صحیح معنوں میں ورط حیرت میں ڈال دیا۔ وہ یک ننگ اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔

”مسز کمال!..... بے شک ہر نساد کے پیچھے ایک بڑی سازش ہی کارفرما ہوتی ہوگی مگر سازش کی ہانڈی بھی بھڑکتی ہوئی آگ کے چولہے پر ہی پختی ہے۔ تم لوگوں کے پاس بہترین ضابطہ حیات ہے ایک اللہ، ایک رسول اور ایک کتاب..... پھر اس سے آگے تم کیوں آپس میں بحث و مباحثوں میں پڑتے ہو.....؟“ جینی نے کہا اور کیسپس کی پارکنگ میں کار روک کر نیچے اتر آئی۔ ڈاکٹر کمال بھی اتر آیا۔ جانے کیوں اسے آج محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو جینی کی نگاہوں میں چھوٹا محسوس کرنے لگا ہے۔

اسے جینی کی علمی معلومات اور پختہ مطالعے نے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ جینی بھی اس کی طرح اپنے خشک شیعے سے ہٹ کر کچھ ایسی اضافی نایاب کچھ بھی رکھتی تھی جس سے انسانی دماغ اور دل کشادگی اور وسیع انظری محسوس کرتا ہے اور روح کی تسکین کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، پی ایچ ڈی کے طالب علم جن کے مطالعے میں دنیا جہاں کی معلومات اور غیر نصابی اسٹڈی کا موجود ہونا کچھ ایسی اچھی بات نہیں ہوتی۔

پھر جب دونوں ہاسٹل بلاک کے قریب پہنچ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے سے پہلے ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے تو ڈاکٹر کمال نے مسکرا کر کہا۔ ”جینی! آج مجھے صحیح معنوں میں تمہاری دوستی پر فخر اور خوشی ہے لیکن میرے کہنے کا مقصد اب بھی وہی ہے کہ تم نے انسانیت کے نام سے ہمارے مسلم مسلمان بھائیوں کے حق میں ہمارے ساتھ مل کر آواز بلند کی۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے مگر تم نے کیا۔“

جینی کے نرم گلابی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ ”اس اوکے“ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

جینی فرنیچر ڈیکارو..... مقامی ہونے کے باوجود ہاسٹل میں ہی رہنا زیادہ پسند کرتی تھی، اس کے مطابق گھر کے مقابلے

”میں نے بالکل ٹھیک سمجھا ہے کمال!“ جینی نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے ترنت کہا۔

تمام تر ذہنی اور کسی حد تک نظریاتی ہم آہنگی کے باوصف ان دونوں کے درمیان بھی بحث چھڑ جایا کرتی تھی، مگر باوجود اس کے دونوں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھ لیتے تو اچھے دوستوں کی طرح متفق بھی ہو جاتے۔

”تم لوگ سبھی سب سے بڑی غلطی کرتے ہو کہ ہر کسی کو سب سے پہلے مذہب اور پھر بعد میں فریق کی عینک سے دیکھتے ہو۔ کیا ہمارا ایک دوسرے سے محض انسانیت کا ناتانہیں ہو سکتا؟ میں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کر رکھا ہے اور جس قدر میں نے مذہب اسلام میں کشادگی، روشن خیالی اور وسیع انظری دیکھی ہے وہ مجھے آج تک کسی اور مذہب میں نہیں نظر آسکی۔ تمہارے پیغمبر اسلام نے بھی انسانیت کے درس کے ساتھ ہی ایک خدا اور ایک کتاب (قرآن مجید) کی تبلیغ کی۔ خود ان کی اپنی زندگی انسانیت کی اعلیٰ معراج کا نمونہ نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ تو مجھے بھی یاد آتا ہے تمہارے پیغمبر کا کہ کوئی کافر عورت ہر روز ان کے اوپر کچرا پھینکا کرتی تھی، ایک روز ایسا نہ ہوا تو تمہارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ اس کافر عورت کے گھر تشریف لے گئے، کافر عورت کو حیرت ہوئی۔ آپ نے اس عورت سے فرمایا۔ ”آج تم نے مجھ پر کچرا نہیں پھینکا تو میں سمجھا کہیں تمہاری طبیعت نہ خراب ہو۔ تمہاری خیریت پوچھنے آ گیا ہوں۔“ اس کافر عورت پر اس حسن سلوک کا ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی۔ غرضیکہ تمہارے پیغمبر اسلام کی سیرت طیبہ آپ کے حسن اخلاق اور آپ کے کامل انسانی نمونے کو تو غیر مذہب کے لوگوں نے بھی کشادہ دلی سے تسلیم کیا ہے۔ آپ کی ذات پاک تو خود ایک اللہ، اسلام اور آخری کتاب کا تبلیغی پرچار کرنے والی ذات تھی مگر..... میں محذرت چاہوں گی ڈاکٹر کمال کہ میں آپ کی بات تو نہیں کرتی لیکن تم میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو مذہبی انتہا پسندی کی طرف گامزن ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب ایک دوسرے کو فرقوں کی بنیاد پر جان سے مار ڈالتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے۔“ جینی نے اپنی بات ختم کی تب تک یونیورسٹی کیسپس کے گیٹ کے قریب ان کی کار پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال کو ایک عجیب سی چپ کھا گئی تھی، اس سے پہلے وہ یہی سمجھتا تھا کہ پیغمبر یعنی جینی محض اس کی دوستانہ حمایت میں اس کے ساتھ ہوتی ہے لیکن اسے جینی کی



خبری انہیں سنائی کہ اس نے انہیں قبرص روانہ کرنے کا ایک خفیہ بندوبست کر لیا ہے۔ اس نے بتایا کہ آج رات ایک بچے کا گوشپ سائپرس (قبرص) کی طرف روانہ ہوگا اور دونوں کو الگ الگ اس کے عملے کے طور پر اس میں سوار کرانا پڑے گا۔ جہاز کا پیمان عرب لبنانی تھا نام اس کا موسیٰ زہروی تھا۔ طلحہ نے اسے پہلے ہی عابد شکھری اور نائمہ کی پھونشن سے متعلق آگاہی دے دی تھی۔ مسافر بردار جہاز سے زیادہ کار گوشپ میں عملے کے لوگوں کے بیچ میں ان دونوں کا حقد کی بندرگاہ سے روانہ ہونا زیادہ مناسب اور محفوظ تھا۔

عابد کا اس روز بہت ہی چاہا کہ وہ ایک بار اپنے ماں باپ اور بہن سے فرما کر بات کرے کہ انہیں اپنی خیر خیریت سے آگاہ کر دے۔ مگر طلحہ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس میں خطرہ تھا۔ اسرائیلی اٹلی جنس ان کی کال ٹریس بھی کر سکتی تھی اور راہ فرار کا سارا منصوبہ ٹیل بھی ہو سکتا تھا۔ بہر طور طلحہ نے اور کچھ ٹی وی پر چلنے والی نیوز سے یہ بھی پتا چلا کہ اس وقت اسرائیلی اٹلی جنس اور خفیہ پولیس وغیرہ حریت پسندوں کی تازہ کارروائیوں کے باعث اسرائیلی مشنری اس میں بری طرح الجھی ہوگی۔ تینس آریشن اور بی فرنٹ کے صادق الخیری کی اسرائیلی اٹلی جنس کے خوننی دستے کے ہاتھوں شہادت کے بعد "الجہاد" اور PLSO نے اسرائیل کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں اور ان مٹی بھر ہمدرد فلسطینی کفن بہ دوش مجاہدوں نے موساد اور ڈیوڈ اسٹار کو چھٹی کا ناچ بھار رکھا تھا۔

بہر حال طلحہ کا منصوبہ بے داغ تھا۔ ایک بار پھر ان لوگوں نے منصوبے کی جزئیات پر غور کیا اور بالآخر طے یہ پایا کہ عابد تو ایک عیسائی کے ذریعے سب سے پہلے مذکورہ جہاز راں کینی کے آفس پہنچنے کی کوشش کرے گا اور وہاں سے عملے کو بندرگاہ پہنچانے والی کوشش میں... وہاں پہنچے گا جبکہ نائمہ کو طلحہ ایک عیسائی کے ذریعے عین اس وقت کینی کے دفتر

ذہن اس مشکل اور جان لیوا صورت حال پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تب اس نے ام خالدہ کو آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کا کہہ دیا اور خود لپک کر دوسرے کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر اس کے پیچھے چلا گیا۔ کھڑکیاں کشادہ تھیں اور میز پر بھی پاؤں ٹکا کر کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ کھڑکی انہوں نے باہر سے بند کر دی۔ وقت گویا ان پر بھاری سل کی طرح مسلط ہو گیا تھا جو گزرے نہیں گزرتا تھا۔ اندر جانے کیا ہو رہا تھا۔ انہیں کچھ نہیں معلوم تھا۔ عابد شکھری اور نائمہ ساتھ ساتھ جڑے اونچے رہائشی اپارٹمنٹس کی عمارت کی بارہویں منزل پر تھے۔ جان پر بنی ہوئی تھی، یہ حصہ بلڈنگ کے عقب میں واقع تھا اور دور ساحل سمندر کا منظر تھا۔ کافی دیر بعد کھڑکی کھلی کسی ممکنہ اور متوقع خطرے کے پیش نظر دونوں کے دل یکبارگی زور سے دھڑکے، پھر وہاں ام خالدہ کا چہرہ ظاہر ہوتے دیکھ کر دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ام خالدہ انہیں وہاں ٹکا دیکھ کر ایک لمحے کو تو تھمسی ہو گئی، پھر بولی۔ "اندر آ جاؤ..... وہ چلے گئے ہیں۔"

دونوں آہستہ آہستہ کھٹک کر کھڑکی کے قریب آئے، پہلے عابد نے نائمہ کو کھڑکی کے اندر داخل کیا پھر خود نہایت احتیاط کے ساتھ اندر دوڑ آیا۔

"انہیں کسی قسم کا شہادت نہیں ہوا؟" اندر آ کر سے میں آ کر عابد نے سوالیہ نگاہوں سے ام خالدہ کی طرف دیکھا۔ "دروازہ دیر سے کھولنے پر وہ اسرائیلی کتے برہم ضرور ہوئے تھے۔" وہ جوابا بولی۔ "مگر میں نے بہانہ کر دیا کہ میں ہاتھ روم میں تھی اور بچوں کو دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔"

"ہوں....." عابد نے پُرسوجھ ہمکاری بھری۔ "میرا خیال ہے، خطرہ ٹل گیا۔" نائمہ نے کہا۔ "ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" ام خالدہ بولی۔ "تھوڑی دیر بعد میں دوبارہ باہر نکل کر جائزہ لے کر آؤں گی۔" پھر تھوڑی دیر بعد خالدہ دوبارہ عیا یا بہن کر باہر نکل گئی۔ نائمہ کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمودار تھے، جسے محسوس کرتے ہوئے عابد نے کھٹکی آئینہ لہجے میں اس سے کہا۔ "پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اللہ سے دعا کرو۔ ہم انشا اللہ بہ خیر و عافیت حید سے نکل جائیں گے۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" نائمہ نے زیر لب کہا۔ خالدہ نے آ کر انہیں مژدہ جانفزا ستایا کہ اسرائیلی فوجی جا چکے ہیں۔ دونوں نے بے اختیار طمانیت کی سانس لی۔ اس کے دو گھنٹے بعد طلحہ ابھی آ گیا۔ اس نے بھی ایک خوش

مل بوتے پر کرنا پڑتا ہے اور یہی بات انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے پر ہمباز کرتی ہے۔ تو بھلا ایک ترقی یافتہ ملک کے نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکھانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ اسے ویسے ہی گھر بیٹھے ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ اب رہی بات تمہاری ہائیڈ پارک سے متعلق تو ایک معمولی آدمی کو بھی اپنا جائز موقف پیش کرنے کی یہاں قانونی اجازت ہے اور ہم نے بھی اس قانون کی پاسداری میں ہائیڈ پارک میں پراسن احتجاج کیا..... مگر تم..... مسلم دشمنی کے لہجے میں اندھے ہو کر یہاں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہو..... یہ سب جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر کمال نے اپنی بات ختم کی۔ ہاتھ میں پکڑی عینک دوبارہ اپنے چہرے پر چڑھائی اور دھواں دھواں مسخ چہرے والے ڈی کار لو کو دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اٹھائی جیش دی۔ اس وقت ہال میں ڈاکٹر کمال کی اس منہ توڑ جوانی تقریر پر میزیں بجا شروع ہو گئیں اور "شیم..... شیم....." کی آوازیں بھی گونجنے لگیں۔ ڈی کار لو کا سیاہ رو چہرہ احساس تکلیل سے مسخ ہو کر رہ گیا۔ اس سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا جبکہ ڈاکٹر کمال میز سے اپنی چند کتابیں سمیٹ کر پر دو قار چال کے ساتھ سینرل کینٹین سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جھٹکا اٹا کے پیچھے تھی۔

اس منہ توڑ جواب کے بعد ڈی کار لو کی طرف سے دوبارہ مسلم طالب علم کے ساتھ بدتمیزی یا ہرزہ مرائی دیکھنے میں نہیں آئی، پوری یونیورسٹی نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔ یونیورسٹی انتظامیہ تک بھی "مذاکرے" کی جھنک پہنچ گئی تھی، ایک طرح سے وہ بھی خوش تھے کہ ڈی کار لو جیسے "کالے تیل" کو تیل ڈال دی گئی تھی کیونکہ وہ خود تو ڈی کار لو کے باپ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کر سکے تھے، اور یہ سب بے چارے چند مسلم طلبا کے ساتھ ہی ہو رہا تھا، بھلا فقار خانے میں طوطی کی کون سنا ہے۔ لہذا انتظامیہ بھی چشم پوشی اختیار کیے ہوئے تھی۔ تاہم مسلم طلبا یا خصوص جینی کا خیال تھا کہ اس طرح کی کراری جوانی کارروائی سے ڈاکٹر کمال نے..... اس متعصب بیہودی ڈی کار لو کو اپنا دشمن بنا لیا ہے مگر ڈاکٹر کمال کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا اور لندن بھی قیصر و کسریٰ کے دربار سے کیا کم تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کرخت آواز پر دونوں کے چہرے فق ہو گئے۔ ام خالدہ بھی بے چاری ہر اسان نظر آنے لگی تھی۔ عابد کا

کا جواب میرے پاس بالکل سادہ سا ہے کہ دوسرے پر اس طرح کی تمہاری لغوازام تراشی درحقیقت تمہارے خود کے متعصب ہونے پر دلیل کرتی ہے اور ہاں تمہارے اس طرح کے اشتعال انگیز گرتوتوں سے کون واقف نہیں ہے کہ تم خود اس معزز اور مہذب تعلیمی ادارے کا امن پامال کرنے کی نیت سے آئے روز امن پسند مسلم طلبا کو تھیک کا نشانہ بناتے رہتے ہو..... مگر وہ اس ادارے کے تعلیمی تقدس کو پامال نہیں ہونے دیتے اور نہ ہی تمہارے پیسے کے ساتھ منہ لگتے ہیں، اب رہی بات ایک بڑے بولے کی..... جو ہائیڈ پارک میں..... اسرائیلیوں کے خلاف کچھ اچھا کرتا ہے تو اس بڑے بولے کے منہ سے تم بھی سن لو..... یہ کچھ..... بلکہ کالک..... اسرائیل نے خود اپنے منہ پر ملی ہے۔ خود کو دنیا کی عظیم قوم ثابت کرنے کے جنون نے تم غاصب بیہودیوں نے اپنے ہی گرتوتوں سے خود کو دنیا کی نظروں میں ملعون اور پست ذہنیت قوم ثابت کر دیا ہے۔ فلسطین کے نیتے، بے گناہ اور مظلوم انسانوں پر اس طرح کی سنگی جارحیت کہاں کا انصاف ہے۔ آبادیوں والے علاقوں میں ہمسایہ یاروں سے وحشیانہ گولہ باری کرنا کدھر کا دستور ہے؟ مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس اور فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کرنا کہاں کا شیوا ہے؟ رہی بات لندن میں آ کر ہم پاکستانی مسلمان طلبا کا تعلیم حاصل کرنے کے لیے آنا..... تو..... یہ صرف برٹش حکومت کی خارجہ پالیسی ہی نہیں ہے..... دیگر ترقی یافتہ ممالک میں بھی یہی سب کچھ ہے..... اس طرح یہ ممالک..... درحقیقت اپنا ایک خلا پر کرتے ہیں، بہترین دماغوں کا خلا..... اعلیٰ تعلیم یافتہ اور Skill Persons اور ذہین لوگوں کا خلا..... کیونکہ ان افراد کی شرح ترقی یافتہ ممالک میں وہ نہیں ہے جو اب ہونی چاہیے۔ لہذا ایسے ترقی یافتہ ممالک ان تیسری دنیا کے ملکوں سے ہائر اسٹڈی کے لیے آئے ہوئے ان لوگوں کو بڑی بڑی آفرز دے کر ہائر کر لیتے ہیں۔ انہیں قابل بنا کر واپس اپنے وطن جانے سے روک لیتے ہیں اور ایسا ہوتا آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے..... مذکورہ ممالک میں اس خلا کی وجہ بڑی ٹھوس ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک میں ہر عام اور چھوٹے سے چھوٹے شہری کو ہر قسم کی بنیادی سہولیات حاصل ہیں۔ بیروزگاری الاؤنس سے لے کر کسی کو معمولی کھانسی بھی ہو جائے تو ایبویٹنس اسے لینے رات کے دو بچے بھی گھر آجاتی ہے۔ ان کا معمولی سے معمولی درد بھی حکومت نے اپنے ذمے لیا ہوتا ہے جبکہ تیسری دنیا کے لوگوں کو یہ سب آسائشیں حاصل نہیں یہ سب کچھ ان بے چاروں کو خود اپنے

جدانتظام

ظاہر عابدی معطل

دل کا سارا نظام اللہ نے جانے کیوں پرے میں رکھا ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا احساسات کا معاملہ... اس کا دل بھی بہت اچھا تھا لیکن سرخ آنکھوں میں ایک دکھ کا احساس جھلکتا تھا۔ یہ انسان بھی کیا چیز ہے۔ کئی پردوں میں چھپا ہوا... دل میں درد کی لہریں اور ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے پہرے... عجب تماشا ہے زندگی بھی...

گم شدہ محبت کے ملال میں جھلا

ایک حسینہ کا ماجرا



میں شروع سے ہی بہت نازک مزاج تھی، اس کے علاوہ جسمانی طور پر بھی بہت زیادہ حساس تھی، ذرا سردی یا گرمی بھی اور بیماری نے آن دیو جا۔ نزلہ زکام اور بخار جیسی وبائی لক্ষణیں بھی مجھے بڑی جلدی آچکڑ لیتی تھیں۔ ایسے دنوں میں اکثر امی چند دن کے لیے مجھے اسکول سے چھٹی کر لیتی تھیں۔ میں چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی بھی زیادہ تھی۔ سارے کہتے تھے کہ میں بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ پیاری ہوں۔ شاید اس وجہ

سپنس ڈائجسٹ 117 جنوری 2015ء

بہر طور عابد یہاں اتنی سخت چیکنگ دیکھ کر یہ بھی سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی سیکرٹ سروسز کی نظروں میں کس قدر "اہمیت" اختیار کر گیا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ وہ نہ صرف ساڑھے سات سو غریب الدیار اور جلاوطن فلسطینیوں کو ان کے وطن میں واپس پہنچانے کا سبب بنا تھا بلکہ اس نے آئندہ بھی اس نیک مقصد کو اپنا مشن بنانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ اسی طرح گا ہے۔ لگا ہے دیگر جلاوطن اور بے گھر فلسطینیوں کو ان کے وطن ضرور واپس لائے گا۔

بہر طور وہ نازک مرحلہ آن پہنچا۔ انہیں قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ ناعمہ کا نمبر عابد کے بعد تھا۔ عابد نے اسے آخر میں تاکید کر دی تھی کہ اگر وہ یعنی ناعمہ چیکنگ کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے لیکن بد قسمتی سے عابد دھریا جائے تو ناعمہ خاموش رہے گی اور قبر میں روانہ ہو جائے گی اس پر ناعمہ نے مجبوری لگا ہوں کے ساتھ عابد کی طرف دیکھتے ہوئے بلا تامل کہا تھا۔

"اور اگر میں پکڑی جاؤں تو پھر... تم خاموشی سے شپ میں سوار ہو کر ساتھ میں روانہ ہو جانا۔"

ناعمہ کی اس بات پر عابد بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا تھا۔ تاہم جو ہا ہوا تھا، ناعمہ... یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا۔

"تو پھر میرے لیے یہ کیسے ممکن ہوگا عابد کہ میں تمہیں خطرے میں چھوڑ کر خود..."

"پلیز انا ناعمہ... سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ اس کی بات کاٹ کر محبت بھری رسائیت سے بولا۔ "تمہاری بات اور ہے... اب بحث کا وقت نہیں رہا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں، ویش اسٹ..."

چیکنگ ہوتی رہی... عابد کا نمبر گانا نافرشتین میں اس کا مختصر بیگ چیک کیا گیا اور پھر اسے آگے جانے کی اجازت مل گئی، آگے اٹکلورڈ تھا۔ باقی عملہ وہاں سے گزرنے لگا۔ ناعمہ کی ہاری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ عابد اسے دیکھنے کے لیے دروازے کے ایک طرف سائڈ میں کھڑا ہو گیا اور وہاں سے باقی ماندہ عملے کی چیکنگ کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رگ و پے میں عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ سوسم کے اندریشاک دوسو سے سراسٹھا رہے تھے، بالآخر عابد کی دھڑکتی نظروں نے ناعمہ کو چیکنگ کاؤنٹر پر آتے دیکھا۔

(جاری ہے)

پہنچائے گا جس وقت کوسٹریڈ کورہ کار گوشپ کے عملے کو لے کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو رہی ہوگی۔

رات ساڑھے بارہ اور ایک بجے کے درمیان عابد شیکھری ایک شینہ جیسی میں سوار ہو کے کھپنی کے دفتر روانہ ہو گیا۔ طلحہ نے اپنی آج کی دوڑ میں عابد اور ناعمہ کی ہمیں بدلی ہوئی تصویروں کے ایسپلائی کارڈز بھی تیار کروا لیے تھے... عابد خلاصیوں (ملاح) کے شعبے سے متعلق تھا جبکہ ناعمہ "ڈائٹنگ کار" کے شعبے میں تھی۔

مقررہ وقت میں یہ دونوں عملے کی کوسٹریڈ میں الگ الگ سیٹوں پر سوار ہو کر بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

بندرگاہ پہنچنے کے بعد... متعلقہ کھپنی کے آفس روم میں جا کر ان دونوں نے دیگر متعلقہ عملے کے لوگوں کی طرح Muster roll پر اپنے اپنے سائن کیے۔ مخصوص دروایاں چڑھا میں اور کسٹم چیکنگ کی طرف روانہ ہو گئے۔

عابد کی عقابانی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ساتھ ہی گا ہے بہ گا ہے وہ ناعمہ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ طلحہ نے سختی سے اس بات کی تاکید دونوں کو کر رکھی تھی کہ ان کے بشروں سے گھبراہٹ یا ڈر و خوف کا شائبہ تک نہیں جھلکتا چاہیے۔... ورنہ وہ چیکنگ کرنے والوں کی نظروں میں نہیں آئے۔ اسرائیلی انٹیلی جنس کے کسی گھناگ ایجنٹ کی نظروں میں کھٹک جائیں گے اور انکو اڑی ہو جائے گی۔ یہ اسرائیلی ایجنٹ یہ ظاہر عام لوگوں کی طرح چیکنگ کے مرحلے سے بہ خیر و عافیت گزر چکے کے بعد بھی ان کے شپ میں سوار ہونے تک ان پر خفیہ نظریں رکھیں گے لہذا شپ روانہ ہونے تک کسی قسم کی جلد بازی نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت تو عابد شیکھری کو بھی معلوم تھی کہ عام حالات میں مسافر بردار شپ کے مقابلے میں کار گوشپ کے عملے کی اتنی سخت چیکنگ نہیں ہوتی مگر اب حالات اور تھے، بندرگاہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس بار کار گوشپ کی بھی سختی سے چیکنگ ہو رہی تھی مگر اس وقت عابد کے اور... طلحہ کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ جن پر اسرائیلی کسٹم یا انٹیلی جنس کو ذرا بھی شبہ ہو رہا تھا وہ ان کے چہروں پر امونیا اسپرے بھی کر کے جانچ رہے تھے کہ کسی نے اپنا اصل چہرہ ریڈی میڈ میک اپ کے پیچھے چھپا رکھا ہو تو وہ ظاہر ہو جائے۔

اس وقت چیکنگ کے دوران یہی ہو رہا تھا تاہم عابد کو طلحہ کی ایک مندی پر اطمینان بھی تھا کہ اس پر یا ناعمہ پر کسی کوشہ نہیں ہوگا کیونکہ عملے کا ریکارڈ فوٹو سمیت دو گھنٹے پہلے کسٹم کاؤنٹر پر پہنچا دیا جاتا تھا۔

سپنس ڈائجسٹ 116 جنوری 2015ء

سب مجھ پر توجہ اور دھیان بھی دیتے تھے جس کی وجہ سے میں اکثر بیمار ہو جاتی تھی۔ ادھر کسی کو چھینک آئی ادھر میں نے بھی چھینکنا شروع کر دیا۔ سوئی بخار کے دن آئے تو سب سے پہلے میرے منہ میں تھر مائٹز آیا۔ آشوب چشم شروع ہوا تو سب سے پہلے میری آنکھوں میں لالی اتری۔ بڑی چاہتا میرے لیے بخاری کا ایک محاورہ استعمال کرتی تھیں..... جس کے معنی کچھ یوں تھے..... جس کڑکی بہت ضرورت ہوتی ہے وہ عموماً ڈھیلے اور خراب ہی ملتا ہے۔

میرے ابو ایک مٹی بھٹل کہنی میں آفسر تھے۔ معقول تنخواہ تھی۔ اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔ میرے دو چچا بھی تھے جو ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔ لاہور کی ایک جانب کشادہ رہائشی آبادی میں یہ دو منزلہ مکان تھا۔ یہ تیس چالیس سال پہلے ہمارے دادا نے بنوایا تھا۔ دادا تو اب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ دادی حیات تھیں اور ہم سب کے درمیان تھیں۔ بڑے چچا کی شادی ہو چکی تھی اور ان کے ماشا اللہ تین بچے تھے۔ چھوٹے چچا جو بڑے چچا سے آٹھ دس سال چھوٹے تھے، حال ہی میں شادی شدہ ہوئے تھے۔ چھوٹی چچی کا نام سارہ تھا۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر رہی تھیں۔ کافی اسارٹ اور دلکش تھیں۔ مجھے ان کے لیے گنتے بال سب سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی۔

چھوٹی چچی سارہ بڑے اچھے طور اطوار کی مالک تھیں۔ ہر ایک کے لیے دل میں ہمدردی اور محبت رکھتی تھیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا لیکن چھوٹی چچی کے ساتھ ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی تھا۔ میں نے اسے "چھوٹا" کہا ہے لیکن میرے لیے شاید یہ چھوٹا نہیں تھا۔ چھوٹی چچی کو اکثر الرجی رہتی تھی۔ ناک سرخ رہتی، کبھی کبھی آنکھوں سے پانی بھی لگتا اور وہ ہاتھ میں رومال یا ٹشو پیپر پکڑے نظر آتیں۔ سردی شروع ہوتی تو انہیں کئی دفعہ چھینکیں مارتے بھی دیکھا۔

امی، ابو اور خاص طور سے امی کو وہم کی حد تک میری صحت کی فکر لاحق رہتی تھی۔ امی نے ایک دن بڑی خاموشی سے مجھے کہہ دیا کہ میں چچی سارہ کے ساتھ زیادہ میل جول نہ رکھوں۔ ایسے معاملوں میں، میں خود بھی بہت حساس ہو چکی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں چچی سارہ سے قدرے دور رہنے لگی۔ خاص طور سے جن دنوں ان کی ناک سرخ نظر آتی یا آنکھیں سوجی سوجی ہوتیں..... یا وہ ویسے ہی پڑمردہ دکھائی دے رہی ہوتیں۔ چچی سارہ دادا کے ایک دوست کی

پوتی تھیں۔ یہ لوگ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ چچی سارہ کی الرجی کو بھی اسلام آباد کے موسم سے ہی تھی کیا جاتا تھا۔ وہاں ہوا میں غالباً کسی طرح کا "پولن" تھا جو شہر کے اکثر مکینوں کو اس مصیبت میں مبتلا کیے رکھتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا لیکن چچی سارہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کسی وقت میں اسکول سے ملنے والا ہوم ورک لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ وہ اتنے اچھے طریقے سے ہوم ورک کرتیں کہ میں حیران رہ جاتی۔ پھر ان کی دلچسپ باتیں، ان کا پیار بھرا انداز اور ان کے گز بھر لیے رسمی بال جو حرکت کرتے ہوئے بار بار ان کے دو دھیان چہرے پر آ جاتے تھے اور جنہیں وہ اپنی خوب صورت آنکھوں سے پیچھے ہٹاتی تھیں لیکن اس قسم کے موقعے کم ہی آتے تھے۔ خاص طور سے جب امی گھر میں موجود ہوتیں، میں اس طرح کارسک ہرگز نہیں لیتی تھی۔ امی اور چچی سارہ کے درمیان دلچسپ اور چھیٹانی کارشتہ تھا اور اس رشتے میں اکثر شکایتیں اور تنخیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم اس معاملے میں بھی چچی سارہ کا جھکاؤ اکثر مفاہمت اور صلح کی طرف ہی ہوتا تھا۔ چچا، چچی کے آپس کے تعلقات بھی ٹھیک ہی تھے۔ دونوں سینے میں ایک بار لاہور سے اسلام آباد جاتے اور واپسی پر ہم سب بچوں کے لیے ہماری پندرہ پندرہ چھینکیں، کھلونے اور کپڑے وغیرہ لاتے۔ مجھے یقین ہے میرے اور چچی کے درمیان خوب جھتی اگر ہمارے درمیان یہ الرجی والا معاملہ نہ آ جاتا۔ اب اتنے برسوں کے بعد میں سوچتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں ہم بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ برائے نام مسائل کو بڑے بڑے دوسوں اور واہموں کا روپ دے دیتے ہیں۔ چچی سارہ کے حوالے سے میرے ذہن میں جو گریز پیدا ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ میں ان سے بھگی بھگی رہنے لگی۔ دلی خواہش ہونے کے باوجود میں ان کے پاس زیادہ نہ بیٹھتی اور نہ ہی ان کے کمرے میں جاتی۔ بچپن کی ایک بات مجھے آج تک یاد ہے۔ ایک دن چچی سارہ ہم آنکھوں اور سرخی مائل ناک کے ساتھ کمرے سے نکلیں اور چھت پر چلی گئیں۔ بڑے چچا نے بڑی چچی نبیلہ سے کہا۔ "لگتا ہے سارہ کو پھر الرجی کا ایک ہوا ہے۔"

بڑی چچی نبیلہ نے برا سامنہ بنا کر کہا تھا۔ "کوئی الرجی ورجی نہیں ہے، بس ڈرامے کرتی ہے..... بچن سے دور رہنا کس کو اچھا نہیں لگتا۔"

اس بارے میں بڑے چچا اور بڑی چچی میں کچھ اور

باتیں بھی ہوئی ہوں گی لیکن میرے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ بس چچی نبیلہ کا ایک اڑتا اڑتا سا طنزیہ جملہ میری سماعت سے ضرور ٹکرایا۔ "یہ الرجی سے بھی زیادہ خطرناک چیز ہے۔" یقیناً یہ جملہ چچی سارہ کے لیے ہی تھا، میں کئی دن تک لبھن میں مبتلا رہی، پھر یہ بات خود بخود ذہن سے نکل گئی۔ ایک دن چچی سارہ اچھے موڈ میں نظر آئیں۔ ان کا چہرہ بھی نارمل ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے ساتویں کلاس کے پچہرز تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ چچی چھت پر بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ میں اپنی میتھ کی بک لے کر ان کے پاس جا بیٹھی۔ ان سے دو چار سوالوں کے حل میں مدد لی پھر انگلش گرامر کے دو تین سوال ان سے پوچھے۔ چچی محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں چلاتی رہیں اور ساتھ ساتھ مجھے پڑھاتی رہیں پھر ایک دم کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولیں۔ "نادا! کیا بات ہے۔ تم دور دور رہتی ہو مجھ سے۔ پچھلے ہفتے میرے سر میں اتنا درد رہا، تم نے حال تک نہیں پوچھا؟"

میں کوئی بہانہ بنانا چاہتی تھی لیکن پھر پتا نہیں میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے چچی کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "چچی بگیا ہٹاؤں، آپ برا تو نہیں مانیں گی؟"

"وعدہ..... بالکل نہیں مانوں گی۔" انہوں نے میرے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کو پتا ہی ہے، مجھے بڑی جلدی نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ امی میرے لیے ہر وقت ڈری ہوئی رہتی ہیں۔ آپ کو اکثر الرجی رہتی ہے۔ اس لیے میں ڈراما دور رہنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یقین کر س ائی کے بعد پورے گھر میں مجھے سب سے زیادہ آپ اچھی لگتی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاس بیٹھی رہوں، آپ سے باتیں کرتی رہوں۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور میرے ہال سنوارتے ہوئے بولیں۔ "تو پھر بیٹھی رہا کرو، باتیں کرتی رہا کرو۔ تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ میری الرجی تمہیں نہیں لگے گی۔ بیماری کے جراثیموں سے پیار کے جراثیم زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے جراثیموں کو مار دیتے ہیں۔"

میں مسکادی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے مجھے گٹے لگا یا۔ شفقت سے میرا ہاتھ چومنا اور میری ناک سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے بولیں۔ "مجھے الرجی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو تمہیں اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

اسی دوران میں امی اوپر آ گئی تھیں۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ چھوٹی چچی نے مجھے گلے سے لگا رکھا ہے۔ ان کے

کتنائیں

- ☆ روپے کی قیمت کتنی بھی گر جائے لیکن اتنی کبھی نہیں گر سکتی جتنا روپے کے لیے انسان گر جاتا ہے۔
- ☆ شیشے کو توڑنے کے لیے ایک پتھر کافی ہوتا ہے۔
- ☆ دل کو توڑنے کے لیے ایک لفظ کافی ہوتا ہے۔
- ☆ محبت میں گزارنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔
- ☆ زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا دوست کافی ہوتا ہے۔
- ☆ زندگی کا ایسے نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کا اصل ایسے ہے کہ ہم جینا بہت دیر بعد سیکھتے ہیں۔
- ☆ ہمیشہ اپنی چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان بھانروں سے نہیں بھنروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔
- ☆ اگر کسی اچھے انسان سے غلطی ہو جائے تو درگزر کرنا چاہیے کیونکہ موتی اگر کچھڑ میں بھی گر جائے تو بھی قیمتی ہی رہتا ہے۔
- ☆ برا وقت وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے اور اچھا وقت بادلوں کی طرح ہے جو سورج کی پیش کو بھی روک لیتا ہے۔
- ☆ خالی پیٹ، خالی جیب اور جھوٹا دوست انسان کو وہ سبق سکھاتا ہے جو بڑے سے بڑا استاد بھی نہیں سکھا سکتا۔
- ☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھا کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔
- ☆ مرسلہ۔ رضوان تنولی کرپڑوی اور گنگی ٹاؤن، کراچی

چہرے پر شدید ناگواری کا رنگ بکھر گیا۔ پہلے تو اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ان سے رہا نہیں گیا۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولیں۔ ”دو چار دن ہو گئے ہیں نا ڈاکٹر کے پاس گئے ہوئے۔ اب پھر بیمار ہو کر بیٹھ جانا۔ اوپر سے امتحان سر پر ہیں۔ ٹیل بھی ہو جاؤ گی انشاء اللہ۔“ وہ پاؤں پٹختی ہوئی نیچے اتر گئیں۔ چچی کا رنگ فق ہو گیا۔ میں بھی امی اور چچی کی لڑائی کے خیال سے ہم گئی اور جلدی سے کتابیں سمیٹ کر نیچے اتر آئی۔

اس واقعے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا مزید کم ہو گیا۔ پھر یوں ہوا کہ میرے ابو اور دونوں چچاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ ایک ساتھ رہنا مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چچا نے لاہور ہی میں ایک علیحدہ گھر لے لیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد چچی سارہ سے میرا ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ بس کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی یا پھر ٹیلی کے کسی فنکشن میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ ویسے بھی مجھ پر پڑھائی کا بوجھ بتدریج بڑھ گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان قریب آتے جا رہے تھے اور ابودن رات مجھے محنت کرا رہے تھے۔ ابوند ہوتے تو بڑے بھائی جان مجھے لے کر بیٹھ جاتے اور میں رات گئے تک کتابوں میں غرق رہتی۔ گھر والے مجھے ڈاکٹر بنانا پابند تھے۔ میری بھی خواہش تھی کہ ڈاکٹر بنوں، اور اگر بن جاؤں تو پھر الرجی دوسرے وغیرہ کی فیلڈ میں اسپیشلائزیشن کروں لیکن انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہوتی۔ بس تین چار نمبروں کے فرق سے مجھے پری میڈیکل میں داخلہ مل سکا۔ دوسرا آپشن بی بی اے کا تھا۔ مجھے لاہور کے ایک بہترین کالج میں اسکالرشپ پر داخلہ مل گیا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اسٹڈی شروع کر دی۔ میرا ہر نتیجہ بہترین رہا۔ کلاس میں اول پوزیشن جیسے میرے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی کالج میں میرا ایک فرسٹ کزن یا سر بھی پڑھ رہا تھا۔ وہ ”بی بی اے“ کے فضاہ سمسٹر میں تھا۔ ہم دونوں خالہ زاد تھے۔ میں نو عمری ہی میں یا سر سے وابستگی محسوس کرتی تھی۔ جب کالج میں داخلے کے بعد یا سر سے زیادہ ملنا جلنا ہوا تو یہ وابستگی، انسیت اور پھر لگاؤ میں بدلنا شروع ہو گئی۔ یا سر پیار سے مجھے ”ٹیچ می ٹاٹ“ چھیڑتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ”تم چھوٹی موٹی کا پھول ہو۔ یہ پھول تازگی چھیننے والی ہر چیز کا اثر فوراً قبول کر لیتا ہے۔“

میں مسکرا کر کہتی۔ ”تو تم تازگی چھیننے والی چیز نہ بننا۔“
”دل پر کسی کا بس تو نہیں ہوتا۔ کیا پتا، جو وعدہ میں آج کروں، کل اس پر قائم نہ رہ سکوں۔“

ایسی باتیں ہم ہنسی مذاق میں کیا کرتے تھے، میں اب اتنی نازک مزاج بھی نہیں رہی جتنی بچپن میں تھی۔ نزلہ زکام بھی اب کافی دقت کے بعد اثر انداز ہوتا تھا بلکہ اس حوالے سے میں تقریباً نارمل ہی ہو چکی تھی۔ عمومی صحت بھی اب پہلے سے کافی اچھی رہتی تھی۔

دھیرے دھیرے ہم دونوں کا تعلق ”محبت“ میں بدل گیا۔ امی کی اجازت سے میں کبھی کبھار یا سر کی بائیک پر بھی کالج سے واپس آ جاتی۔ یا سر کا ہارے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ بہت خیال رکھنے والا اور ہمدرد انسان تھا۔ امی، میری اور اس کی انسیت سے آگاہ ہو چکی تھیں اور شاید ذہنی طور پر اس رشتے کے لیے تیار بھی تھیں لیکن وہ چاہتی تھیں کہ یا سر پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔ یا سر کے والد فوت ہو چکے تھے اور یہ لوگ ابھی تک اندرون شہر سات آٹھ مرلے کے گھر میں رہتے تھے۔ یا سر سے بڑی دو بہنیں تھیں جن کی ابھی شادیاں نہ ہوئی تھیں۔ یا سر اور اس کے گھر والوں کی گزر بسر تین دکانوں کے کرایے وغیرہ سے ہو رہی تھی۔ میرے ابو اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھے لیکن اتنی چلک انہوں نے اپنے اندر ضرور رکھی تھی کہ اگر یا سر کو اچھی جا ب مل گئی اور اس نے اپنی مالی حالت بہتر کر لی تو وہ اس بارے میں غور کریں گے۔

انہی دنوں کی بات ہے ایک روز میں کالج سے گھر لوٹی تو مجھے ایک روح فرسا خبر ملی۔ یہ خبر ایک ایسی ہیبت انگیز تھی کہ بارے میں بھی جس کو میں نے کچھ عرصے سے تقریباً فراموش کر رکھا تھا۔ مجھے گھر والوں کی زبانی پتا چلا کہ چچی سارہ اپنے گھر کے پاس ہی ایک ٹریفک حادثے میں شدید زخمی ہو گئی ہیں اور انہیں بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان کی حالت نازک ہے۔ ہم لوگ بھانگ شہر کے دوسرے کنارے پر واقع اس اسپتال میں پہنچے۔ وہ اس وقت آپریشن تھیٹر میں تھیں۔ ان کے سر پر اورر بڑھ کی ہڈی میں شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ امید سے بھی تھے۔ دو ڈھائی ماہ بعد بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ گھر کی قریب ماریٹ سے سبزی لینے کے لیے پیدل ہی نکلی تھیں۔ ایک بھٹی سڑک سے آنے والی تیز رفتار اسکول وین نے انہیں ٹکرائی اور وہ دیوار سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئیں۔ وہ بڑی دلخراش شام تھی۔ سورج کے ساتھ ہی چچی سارہ کی زندگی کا سورج بھی ڈوب گیا۔ وہ آپریشن تھیٹر سے زندہ نہیں نکل پائیں۔ دو معصوم بچوں اور غمزہ خاوند کو چھوڑ کر وہ قبرستان کی گہری تاریکیوں میں جا گئیں۔

ان کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں ان سے

کتنا پیار کرتی تھی۔ میں کئی دن سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔ میرے اندر جیسے ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو کوئی بھی سمجھی کہ ایک عرصے تک ایک بے نام خوف کی وجہ سے میں کیوں ان سے دور دور رہی۔ پھر کبھی کبھی ایک بھولا بسرا فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا۔ یہ فقرہ ایک مرتبہ بڑی چچی نیلم نے ایک زہریلی سرگوشی کی صورت میں بڑے چچا سے کہا تھا۔ وہ بولی تھیں۔ ”اسے الرجی ورجی نہیں ہے۔ بس ڈرامے کرتی ہے۔“ پھر شاید بڑی چچی نے یہ بھی کہا تھا۔ ”الرجی سے زیادہ خطرناک بیماری ہے اسے۔۔۔۔۔“

الرجی سے زیادہ خطرناک؟ کیا چچی سارہ کسی اور خطرناک بیماری میں بھی مبتلا تھیں؟ کوئی ایسی تکلیف جسے ان کے سیکے والوں نے چھپایا تھا اور پھر وہ بھی چھپاتی رہی تھیں۔ وہ کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہ سوال میرے لیے ایک پتیلی بن کر رہ گیا تھا۔

چچی سارہ کی موت کے غم نے کم و بیش تین ماہ تک مجھے گھیرے رکھا۔ پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ بڑے بڑے سنگین صدمے دھیرے دھیرے اپنی شدت کھونے لگتے ہیں۔ گردش روز و شب۔۔۔۔۔ ہمہ وقت رستے زخموں کو خشک کرنے لگتی ہے۔ میں بھی پڑھائی کی مصروفیت میں اس قدر غم ہوئی کہ باقی سب کچھ بھول گئی۔ ایف ایس سی میں نے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور پھر بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ یا سر کے ساتھ بھی تعلقات معمول پر تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ملنے آتے اور جب نہیں ملتے تھے، تب بھی ایک دوسرے کے خیالوں میں غم رہتے تھے۔ سردیوں کی طویل راتیں، گرمیوں کی حسین شائیں، سادوں کی خوب صورت جھڑیاں اور بہار کی چمکیلی خوشبو وار تھیں، ہماری محبت کی گواہ تھیں مگر پانچواں موسم غم کا بھی تو ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ یہ موسم خزاں میں ہی آئے۔ یہ موسم کسی بھی موسم میں انسان کو دیوچ سکتا ہے۔ مجھے اور یا سر کو اس موسم نے سردیوں کی نہایت خشک شاموں میں دیوچا۔ یا سر کی والدہ پر فاج کا حملہ ہوا اور ان کا ایک بازو اور ٹانگ بے کار ہو گئی۔ انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا اور علاج پر اندھا دھند روپیہ خرچ ہونے لگا۔ یا سر کا سینکڑوں لاسٹ سمسٹر بھی بیچ میں ہی رہ گیا۔ پانچ چھ ہفتوں کے اندر اندر ان لوگوں کو اپنی ایک دکان اونٹنے پونے پہنچا پڑی۔ یا سر کی بڑی بہن کی شادی کی تیاری تھی، وہ تیاری ہی درمیان میں ہی اٹک گئی۔ لڑکے والوں کو تاریخ دی تھی۔ یا سر نے جیسے تیسے بہن کی ڈولی تو رخصت کر دی لیکن اس کے لیے اسے اپنی دوسری دکان بھی فروخت کرنا

کہیں آپ کو اعصابی کمزوری تو نہیں؟

آجکل تو ہر انسان ذہنی تفکرات، ناقص غذاؤں بے صبری، بے احتیاطی اور بد پرہیزی کی وجہ سے اعصابی کمزوری کا شکار ہو چکا ہے۔ اعصابی طور پر کمزور لوگ تو ہمیشہ عداوت کی زندگی گزارتے ہیں۔ آپ کی اعصابی کمزوری ختم کرنے، بے پناہ اعصابی قوت دینے کیلئے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں اور کتوری عہر زعفران سے ایک خاص قسم کا ہربلز اعصابی کورس مقوی اعصاب کورس کے نام سے تیار کیا ہے۔ اپنے ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کر کے لطف کو دو بالا کرنے کیلئے اور اپنے خاص لحاظ کو خوشگوار بنانے کے لئے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP مقوی اعصاب کورس منگوائیں۔

المسلم دار احکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک



کہنہ مشق

سرزا محمد بیگ

”م“ سے مثبت اور ”م“ سے منفی... عجب منطق ہے انسان کی ہمیشہ ملال میں مبتلا رہتا ہے اور مانتا نہیں کہ اس نے کچھ غلط بھی کر دیا ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے عقل مندی کا مظاہرہ کچھ مندی عقل سے کر ڈالا... مثبت رویہ چھوڑا اور منافقت کا راستہ اختیار کیا پھر نتیجہ تو یہی نکلتا تھا جو نکلا... لیکن بیگ صاحب کی تدبیروں نے بالآخر مجرم کو گہرے میں لے ہی لیا۔

جملوں کے جملوں سے اقرار جرم کی انوکھی داستان

اور پہتاوے سے وہ غریب نظر آتی تھی۔ میرا یہ انداز اور بعد ازاں درست ثابت ہوا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ جب وہ ایک کرسی پہنچ کر بیٹھ چکی تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”وکیل صاحب! میں بہت پریشان ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اظہاری لہجے میں بولی۔

”وہ تو آپ کی حالت ہی سے نظر آ رہا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ اپنی پریشانی کی وضاحت کریں تاکہ میں یہ اندازہ لگا سکوں کہ میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”وحیدہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“ اس نے دکی لہجے میں بتایا۔

”یہ وحیدہ کون ہے؟“ میں نے کاغذ قلم سنبھالتے

موسم سرما کی ایک ٹنک اور اس شام میں اپنے آفس میں بیٹھا حسب معمول کلائنٹس کو ڈیل کر رہا تھا کہ ایک پریشان حال عورت اپنا دکھڑا رونے میرے پاس آگئی۔ میں نے سلمیٰ نامی اس عورت کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ اس روز میرے آفس میں کلائنٹس کی زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ایک جاتا تو دوسرا آ جاتا تھا۔ وزینگ لابی میں بھی وہ رونے نہیں تھی جو وہاں کا خاصہ تھی۔ نصف درجن سے زیادہ افراد ہر وقت اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ اس مندی میں کچھ تو موسم کا اثر تھا اور کچھ ویسے بھی بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ کلائنٹس کی عدم موجودگی کے باعث اچھی خاصی یوریت کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جیسی سلمیٰ کو انتظار کی کوفت نہیں اٹھانا پڑی تھی اور فوراً سے چہرہ میرے چیمبر میں پہنچ گئی تھی۔

سلمیٰ کی عمر پچاس سے تھوڑی تھی۔ وہ متناسب بدن کی مالک ایک عام سی شکل و صورت والی عورت تھی۔ اپنے چلنے

ہوئے سوال کیا۔ "اور پولیس نے وحیدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟"

"وحیدہ میری اکلوتی بیٹی کا نام ہے وکیل صاحب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پولیس نے اسے بیگ صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"بیگ صاحب کون ہیں..... میرا مطلب ہے، کون تھے؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہاری بیٹی وحیدہ سے ان کا کیا تعلق تھا.....؟"

"جناب! ہم تو غریب اور مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ "میں اور میری بیٹی وحیدہ بفرزون کے قصبی جسے میں واقع گوٹھ نما ایک چھوٹی سی بستی میں رہتے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں کام کر کے ہم اپنی روزی کما تے ہیں۔ وحیدہ بیگ صاحب کے گھر میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کا کام کرتی ہے۔" لہائی توقف کر کے اس نے ایک پوجمل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "اشتیاق بیگ صاحب کا بنگلا نارتھ ناظم آباد میں واقع ہے....."

"ٹھیک ہے....." میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "قتل کی واردات کب پیش آئی ہے؟"

"کل دن میں جناب۔" اس نے جواب دیا۔

آج جنوری کی انیس تاریخ تھی گریہ لڑھکتے روز بستی میں جنوری کا واقعہ تھا۔ اس کا ایک واضح مطلب یہ بھی تھا کہ آج صبح پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔ جب بھی سوال میں نے سلسلی سے کیا تو اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کی بیٹی وحیدہ کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟"

"کل دن میں تقریباً دو بجے جناب۔" اس نے بتایا۔ "ہم دونوں اپنے گھر میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں کہ پولیس ہمارے دروازے پر پہنچ گئی..... پھر وہ لوگ وحیدہ کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے....." بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

واقعات کی تفصیل میں سلسلی نے بتایا کہ وہ خود تین گھروں میں اور اس کی بیٹی وحیدہ دو گھروں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ وہ دونوں روزانہ ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلتی تھیں اور دوپہر ایک ڈیڑھ بجے تک ان کی واپسی ہوتی تھی۔ بنگلوں والے پیسے اچھے دیتے تھے لہذا وہ انہی پانچ بنگلوں تک محدود تھیں اور آدھے دن کی سخت محنت کے بعد

باقی کا آدھا دن آرام کرتی تھیں۔ مزاجاً دونوں ہاں بیٹھیں سادہ اور قناعت پسند تھیں اس لیے زیادہ کے لالچ میں نہیں آتی تھیں۔ سلسلی ایک بیوہ عورت تھی۔

وحیدہ کے پاس دو بنگلوں کا کام تھا اور یہ دونوں بنگلے نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں واقع تھے۔ پہلے وہ نو بجے سے گیارہ بجے تک متقول اشتیاق بیگ کے گھر کا کام کرتی تھی۔ اس کے بعد گیارہ سے ایک بجے دوپہر تک فیاض بیگ کے بنگلے کا کام کرتی تھی۔ یہ دونوں بنگلے قریب قریب تھے وقوع کے روز بھی وہ متقول کے گھر کا کام ختم کر کے بنگلے پر گئی تھی اور پھر وہاں سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول اپنے گھر چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی ماں سلسلی بھی گھر پہنچ گئی۔ پھر وہ دن کے کھانے میں مصروف تھیں کہ پولیس نے وہاں آکر وحیدہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک سلسلی سے گفتگو زادیوں سے سوال کرتا رہا۔ میں نے سلسلی کے بیان کے مختلف اہم پوائنٹس نوٹ کرنے کے بعد تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے سلسلی صاحب! آپ کل اسی وقت میرے پاس آجائیں پھر میں آپ کو بتاؤں گا کہ وحیدہ کی رہائی کے سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"کل آؤں....." وہ قہقہے لایتنا سے بولی۔

"آپ آج کچھ نہیں کریں گے.....؟"

وہ قانونی اور عدالتی معاملات سے بالکل ناواقف نظر آتی تھی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "سلسلی بی! ابھی اس لیے کچھ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی بیٹی عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پولیس نے تفتیش مکمل کرنے کے لیے کم از کم سات روز کا ریمانڈ ضرور لیا ہوگا۔ جب وہ لوگ چالان کے ساتھ وحیدہ کو حوالہ عدالت کریں گے تو اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔ اس دوران میں، میں وحیدہ سے ملاقات کر کے اس واقعے کے حوالے سے معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔" لہائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لے کر سلسلی سے پوچھا۔ "وحیدہ کو کس زمانے میں رکھا گیا ہے؟"

اس نے مجھے متعلقہ زمانے کا نام بتا دیا۔

میں نے اس کی پریشانی کے پیش نظر تسلی اور دلا سے دیے۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سنتی رہی اور میرے خاموش ہونے پر بولی۔ "کیا میری بیٹی سات دن تک پولیس والوں کے قبضے ہی میں رہے گی.....؟"

"ہاں..... یہ قانونی مجبوری ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "جب پولیس کسی ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیتی ہے تو پھر وہ تفتیش کی تکمیل تک اسے اپنی کسٹڈی میں رکھنے کی مجاز ہوتی ہے۔"

وہ اپنی بیٹی کے لیے بے حد فکر مند تھی، حذبذب انداز میں مستفسر ہوئی۔ "وکیل صاحب! میری وحیدہ رہا تو ہو جائے گی نا.....؟"

"انشاء اللہ!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اگر وہ بے گنہگار ہے تو پھر اس کا ایک ہال بھی بیٹا نہیں ہوگا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔"

"یہ تو مجھے پکا یقین ہے کہ وحیدہ نے قتل نہیں کیا۔" وہ بڑے وثوق سے بولی۔ "میری بیٹی کو خواہ مخواہ اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"عدالت سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی لگائی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ میں آج ہی کسی وقت تمہانے جا کر وحیدہ سے ملاقات کروں گا۔"

وہ مجھے دعا بھی دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

اسی رات آفس سے اٹھنے کے بعد میں متعلقہ زمانے پہنچ گیا۔ زمانے میں عدالتی ریمانڈ پر آئے ہوئے بندے ملت ملاقات کرنا آسان کام نہیں ہوتا تھا۔ ہم اس کام کو سہل بنانے کے مجھے ہزاروں گرا آتے تھے۔ اس روز وحیدہ سے ملاقات میں مجھے پریشانی کا سامنا نہیں ہوا۔

جب میں حوالات پہنچا تو وحیدہ چپ چاپ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی، مجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ بدکنے والے انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ "وحیدہ! کیسی ہو؟"

اس نے جواب دیتے کے بجائے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ابھرنے والے آمیز تذبذب دکھائی دیا جیسے خاموش نگاہ سے پوچھ رہی ہو..... میں کون ہوں، اس کا حال احوال کیوں پوچھ رہا ہوں۔

"وحیدہ!" میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام مرزا احمد بیگ ہے۔ میں ایک وکیل ہوں اور تمہیں اس مصیبت سے نجات دلانے آیا ہوں۔ تمہاری ماں نے میری خدمات حاصل کی ہیں اس لیے....."

میں نے رک کر گہری نظر سے اسے دیکھا پھر ہمدردانہ انداز میں کہا۔ "میں تم سے جو بھی پوچھوں اس کا بالکل سچا اور کھرا

جواب دیتا۔"

"جی اچھا.....!" اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔

وحیدہ کی عمر پچیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ دہلی بیتی اور درمیانے قد کاٹھ کی مالک ایک قبول صورت عورت تھی۔ موجودہ حالات نے اس بے چاری، دکھوں کی ماری کو لگرمند کر رکھا تھا۔ میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ "پولیس والوں نے اقبال جرم کروانے کے لیے تمہارے ساتھ زور زبردستی تو نہیں کی.....؟"

"کوشش تو ان کی یہی ہے کہ میں بیگ صاحب کو قتل کرنے کا اقرار کر لوں۔" وہ سادگی سے بولی پھر چونکتے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "وکیل صاحب! آپ نے اپنا نام کیا بتایا ہے.....؟"

میں اس کے سوال کی تہ میں پہنچ گیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میرا نام مرزا احمد بیگ ایڈووکیٹ ہے اور میرا متقول اشتیاق بیگ کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں....."

اس کی آنکھوں اور چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

میں دھیمے انداز میں وحیدہ سے وقوع کے روز پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اسے جہاں تک معلوم تھا وہ مجھے بتا دیا۔ میں نے اس سے متقول اشتیاق بیگ کی تسلی اور دیگر معاملات کے بارے میں بھی سوالات کیے اور اس نے مجھے تسلی بخش جوابات دیے۔ آدھے گھنٹے کی ایک تحقیقاتی گفتگو سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وحیدہ کا اس قتل سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس بے چاری کو کسی سوچتی بھی سازش کے تحت اس کیس میں مصیبت لیا گیا تھا۔

میں نے اس ملاقات کے اختتام پر وکالت تارے، درخواست ضمانت اور دیگر اہم کاغذات پر وحیدہ کے آنکھوں سے لگوائے کیونکہ وہ چٹی آن پڑھ گئی لہذا دستخط وغیرہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اسے ایک بار پھر اس بات کا یقین دلایا کہ میں اپنی کوششوں سے اسے باعزت رہا کروا لوں گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ ازیں میں نے اسے پولیس کی تفتیشی مہربانیوں سے بچنے کے لیے چند پتے کی باتیں بھی بتائیں پھر وہاں سے واپس آ گیا۔

اگلے روز وحیدہ کی ماں سلسلی حسب وعدہ مجھ سے ملنے آئی تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے اس کی بیٹی کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس نے میری فیس پوچھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دے دیا۔

عادل اپنا سامان سمیٹ کر ماموں عثمان کے گھر میں آ گیا۔ جب تک وہ مقتول کے گھر میں تھا (مقتول کی دوسری شادی کے بعد) اس کا صبح شام کسی نہ کسی بات پر اپنی سوتیلی ماں نرگس کے ساتھ جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ان اختلافات کے سلسلے میں مقتول اس کے بجائے اپنی بیوی نرگس کا ساتھ دیتا ہے تو اس کا دل بچھ کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ رنجش بڑھتی گئی اور بالآخر سال بھر پہلے وہ اپنے ماموں کے پاس آ گیا تھا۔ اس کا ماموں عثمان ٹیکسٹائل انڈسٹری میں انجینئر تھا۔ اس کی رہائش گلشن اقبال میں تھی۔ عثمان کی اپنے بہنوئی مقتول اشتیاق بیگ سے بھی نہیں بنی تھی۔

مقتول کا بنگلا دو بیڈروم، ایک ٹی وی لاؤنج، ایک ڈرائنگ روم اور سرسبز لان پر مشتمل تھا۔ یہ ایک ہوادار اور سکون بخش رہائش گاہ تھی۔ ملزمہ وحیدہ روزانہ نو بجے صبح کام کے لیے وہاں پہنچتی اور گیارہ بجے تک وہاں رہتی تھی۔ اس دوران میں مقتول کی بیوی نرگس بھی گھر میں موجود ہوتی تھی۔ اگر اسے کسی ضروری کام سے باہر جانا ہوتا تو وہ انہی اوقات میں نکلا کرتی تھی اور وحیدہ کا کام ختم ہونے سے پہلے واپس آ جایا کرتی تھی کیونکہ اسے اپنے بیمار شوہر مقتول اشتیاق بیگ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔

ملزمہ وحیدہ کے مطابق وقوعہ کے روز وہ حسب معمول کام کرنے مقتول کے بیٹھے رہتی تھی۔ لگ بھگ ساڑھے نو بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون سیٹ ٹی وی لاؤنج میں ایک اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ نرگس نے فون اسٹینڈ کیا اور پھر مرہمہ کے پاس بگن میں چلی آئی۔ وحیدہ اس وقت بگن میں برتن دھور رہی تھی۔

”سنو وحیدہ!“ اس نے ملزمہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔ تم بیگ صاحب کا خیال رکھنا۔“

”ٹھیک ہے باجی۔“ ملزمہ نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کب تک واپس آ جائیں گی؟“

”تمہاری چھٹی کے ٹائم سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔“ وہ سرسری انداز میں بولی۔ ”تمہارے صاحب کی ایک دوا لانا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی گولی کھسی ہے جو بہت کم اسٹورز پر ملتی ہے۔ ابھی ایک میڈیکل اسٹور والے ہی کا فون تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ابھی وہ میڈیکل اسٹور میں نے سوچا، ابھی لے آؤں۔ کیا پتا، پھر ملیں نہ ملیں۔“ لہجائی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

سگھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کر کے اپنا گزارہ کرتی تھی۔ وحیدہ کے باپ عبدالغفور کا بہت پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹیکسٹری میں مزدوری... کرتا تھا۔ ان ماں بیٹی کی رہائش بفرزون کے عقبی علاقے میں واقع ایک گوشہ نما بستی میں تھی۔

سلسلی کے پاس تین گھروں کا کام تھا جبکہ ملزمہ وحیدہ صرف دو گھروں میں جھاڑو برتن اور صفائی دھلائی کیا کرتی تھی جن میں ایک گھر تو مقتول اشتیاق بیگ کا تھا اور دوسرا فیاض شیخ کا۔ پہلے وہ مقتول کے گھر کا کام نمٹاتی تھی۔ اس کے بعد فیاض شیخ کے بیٹے کا رخ کرتی تھی۔ وقوعہ کے روز بھی اس نے اپنا معمول جاری رکھتے ہوئے یہی کیا تھا لیکن جب وہ کام نمٹانے کے بعد اپنے گھر پہنچی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس نے اسے اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

مقتول کی فیملی نہایت ہی مختصر تھی۔ یعنی صرف دو افراد مقتول اشتیاق بیگ اور اس کی بیوی نرگس۔ یہ لوگ نارنج باہم آباد میں واقع دو سو گز کے ایک بیٹھے میں رہتے تھے۔ مقتول ایک صنعت کار تھا۔ شہر کے انڈسٹریل ایریا میں اس کی لیڈر ٹیکسٹس کی ایک چھوٹی سی ٹیکسٹری تھی جہاں سے وہ روزانہ ملک اور حیدرآباد تک مال لے جاتا تھا۔ اس کا بزنس بہت اچھے انداز میں چل رہا تھا کہ اچانک دل نے اس کے ساتھ دھوکا کر دیا۔ ایک رات اسے ہارٹ ایک ہو اور وہ بیٹے کا ہو کر رہ گیا۔ دل کے دورے سے اس کی جان توفیق گئی مگر ڈاکٹر نے کم از کم چھ ماہ تک بیڈریسٹ بتا دیا تھا اور ابھی اس ”بیڈریسٹ“ کے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ اسے کسی شقی القاب شخص نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ سب چارہ بے بسی کی موت مارا گیا تھا۔

نرگس، مقتول کی دوسری بیوی تھی۔ مقتول کی پہلی بیوی رخصانہ بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ پہلی بیوی... سے مقتول کی ایک اولاد عادل نامی ایک پیتا تھا جو اپنے ماموں کے پاس رہتا تھا۔ مقتول کی دوسری شادی نے نرگس بیگم کے درمیان خاصی شدید اور سنگین اختلافات پیدا کیے تھے۔ نرگس نے اپنے ماموں کے گھر میں رہنا تھا۔ وہیں بھی مقتول کا ساری زندگی اپنی سسرال یعنی عادل کی تنہائی کے ساتھ جھگڑا رہتا تھا اور رخصانہ کے انتقال کے بعد تو یہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ عادل کا رجحان شادمانی سے اپنی تنہائی کی جانب تھا لہذا مقتول کی دوسری شادی کے بعد گھر میں کچھ اس قسم کے تنازعات اٹھے کہ

آپ سیدھی سیدھی رعایتی فیس بتائیں۔“

”پچاس فیصد کا مطلب ہے، آدمی!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو اپنی جو فیس بتائی ہے اس کو آدھا کر سکتا ہوں۔ بس، اس سے زیادہ رعایت ممکن نہیں۔“

”جناب.....!“ وہ خوشی اور حیرت کے طے طے تاثرات کے ساتھ بولی۔ ”آدمی فیس کا مطلب تو اتنی رقم ہے جو میں آپ کو ایڈوانس ادا کر سکتی ہوں۔ جیسا کہ میں کہ چکی ہوں، آدمی فیس آپ ابھی لے لیں۔... ہیں نا؟“

”جی ہاں، اس کا بالکل یہی مطلب ہے۔“ میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے دستان بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو جگنا اٹھے۔ اس نے مجھے ڈھیروں دعا میں دیں اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

”دعا“ بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی خرید و فروخت ممکن نہیں۔ اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کے لیے نہ تو کرایہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر ٹیکس لگتے چپاں کرنے کی صورت پیش آتی ہے۔ ایک ”خیر“ کا جذبہ ہے جو ایک انسان، دوسرے انسان کے لیے اپنے دل میں رکھتا ہے۔ دوسروں کی دعا میں لہجے رہتا ہے۔ پتا نہیں، کب کب کسی دعا آپ کو لگ جائے۔ دعاؤں کی قبولیت کا اختیار جس ذات پاک کے پاس ہے وہ ہماری شہرگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور بے شک ادھر شے پر قادر ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو ملزمہ وحیدہ اور مقتول اشتیاق بیگ کے بارے میں مختصراً بتاتا چلوں جس سے کس کے پس منظر پر بھی روشنی پڑے گی اور آگے چل کر اس کیس کی سماعت کے دوران میں آپ کا ذہن کسی ایسی جگہ ٹکرائے گا جو ابھی نہیں ہوگا۔ ایک بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے یہاں بیان کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بعض باتیں آپ سے چھپ بھی لی ہیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب سنسنی خیز مقامات پر کیا جائے گا تاکہ آپ کی نظر ان کے لطف کو دوہرا لایا جاسکے۔

☆☆☆

جیسا کہ بیچھے بتایا جا چکا ہے، ملزمہ وحیدہ اور اس کی ماں سلسلی کا حلق معاشرے کے نچلے طبقے سے تھا۔ وہ لوگوں

اس کے چہرے اور آنکھوں میں تذبذب نمودار ہوا، ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”وکیل صاحب! آپ کی فیس بہت زیادہ نہیں ہے۔“

”بعض لوگوں کو میری فیس بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن بہت سے وکیلوں کی تو مجھ سے دگنی تک فیس ہیں۔“

”مجھے دوسرے وکیلوں کا تو پتا نہیں جناب!“ وہ سادگی سے بولی۔ ”میں تو آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

”آپ یا تو اپنی فیس میں کچھ رعایت کرویں اور یا.....!“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔ ”اور یا..... کیا؟“

”یا یہ کہ.....!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”آدمی فیس ابھی لے لیں، آدمی وحیدہ کی رہائی کے بعد۔“ میں اس قسم کے معاملات نہیں کیا کرتا۔ ”میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”البتہ، فیس میں رعایت والی بات قابل عمل ہے۔“

”ٹھیک ہے جناب! یہ بھی آپ کی مہربانی ہے۔“ وہ احسان بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”جو بھی زیادہ سے زیادہ کم کر سکتے ہیں، وہ کر دیں۔“

میں سال میں ایک آدمہ چیرینی کیس بھی پکڑ لیا کرتا تھا جس میں، میں ایک پیسا بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس عمل سے میں اپنے پیسے کا صدقہ نکالتا رہتا تھا لیکن یہ سال کا آغاز تھا لہذا میں سال کے پہلے ہی سینے میں اس قسم کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا اور سلسلی کو بالکل مایوس کر دینا بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا چنانچہ میں نے درمیانی راہ کا انتخاب اور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس راستے کے استعمال سے مجھے کوئی نقصان نہیں تھا البتہ سلسلی کو اس سے حسب منشا قادمہ ضرور پہنچ سکتا تھا۔

”آپ کی خاطر میں اپنی فیس میں پچاس فیصد کمی کر سکتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مگر میں فیس ایڈوانس ہی میں لوں گا۔ ادھار کی کوئی گنجائش نہیں۔“

وہ قدرے ابھمن زدہ انداز میں بولی۔ ”وکیل صاحب! یہ فیصد، وعدہ کا حساب میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

ہوئے کہا۔ ”آپ بتادیں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔“
 ”میں ایسی کوئی مہربانی کرنے کے موڈ میں نہیں
 ہوں۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”اور دوسری بات یہ کہ عدالتی
 معاملات میں ”فرض کرنے“ سے کام نہیں چلتا۔ جب آپ کو
 یہی نہیں پتا کہ عدالت میں کس کیس کی سماعت ہو رہی ہے تو
 پھر آپ اپنی موٹل کی وکالت کیسے کریں گے؟“

”آپ میرا کام مجھ پر چھوڑ دیں میرے محترم!“
 میں سلگانے والے انداز میں کہا۔ ”صرف اتنا بتادیں کہ
 میری موٹل نے کون سے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“
 میرے سوالات نے ابتدا ہی میں وکیل استغاثہ کو
 ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ وہ برہمی سے بولا۔ ”میں
 ”اشتقاق بیگ مرڈر کیس“ کا ذکر کر رہا ہوں جس کی اس
 وقت عدالت میں کارروائی ہو رہی ہے۔“

”اوہ.....!“ میں نے چونکنے کی اداکاری کی پھر
 گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تو آپ کا خیال ہے، اشتقاق
 بیگ کو میری موٹل وحیدہ نے قتل کیا ہے؟“
 ”تو اور کیا.....!“ وہ بے ساختہ بولا۔ ”اسی لیے تو وہ
 عدالت میں حاضر ہے۔“

”عدالت میں تو آپ اور میں بھی حاضر ہیں میرے
 فاضل دوست۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تو کیا یہ سمجھ لیا
 جائے کہ ہم نے بھی اشتقاق بیگ کے قتل میں حصہ لیا ہے؟“
 ”آپ خواہ مخواہ بات کو الجھانے کی کوشش کر رہے
 ہیں!“ وہ اکٹھاٹ آمیز انداز میں بولا۔

”بالکل نہیں.....!“ میں نے بڑی شدت سے نفی
 میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو الجھے ہوئے معاملے کو
 سیدھا کرنے کی تنگ دو دو میں لگا ہوا ہوں اور اس سلسلے میں
 آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”میرے تعاون کی ضرورت ہے..... کیا مطلب ہے
 آپ کا؟“
 ”آپ نے میری موٹل کے حوالے سے کہا ہے
 کہ..... اس لڑکی نے جو سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے۔“ میں
 نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ ”اور ابھی آپ نے اضافہ کیا
 ہے کہ اسی لیے وہ اشتقاق بیگ کے قاتل کی حیثیت سے اس
 وقت عدالت میں حاضر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ
 میری موٹل کے جرم کے بارے میں بہت پریقین ہیں؟“

”جی ہاں.....“ وہ خاصی کراہی آواز میں بولا۔
 ”میں پریقین ہوں۔“
 اس نے میرے بچھانے ہوئے جال میں پہلا قدم

اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے بتا دیا تھا۔ باقی کی
 معلومات مجھے خود حاصل کرنا تھیں اور اس مقصد کے حصول
 کے لیے میں نے اپنے تمام گھوڑے میدان میں ڈال دیے
 تھے اور مجھے اپنی محنت سے اور خدا کے کرم سے قوی امید تھی
 کہ کامیابی میرے قدم چومے گی۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے
 عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ میں نے جب تھانے جا کر
 حالات میں بند وحیدہ سے ملاقات کی تھی تو اسے بعض ایسے
 مگر بھی بتائے تھے جن کا بروقت استعمال کر کے وہ خود کو
 پولیس کی معروف نفیسی ”مہربانیوں“ سے محفوظ رکھ سکتی تھی
 اور اس نے یہ عین میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اس معاملے
 میں وہ خاصی عقل مند ثابت ہوئی تھی۔

عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے میں نے
 وحیدہ کے وکیل کی حیثیت سے اپنا وکالت نامہ اور ملزمہ کی
 درخواست ضمانت دائر کر دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جج اپنی
 کرسی پر آ کر بیٹھا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی موٹل کے حق میں
 یونٹا شروع کیا۔ ”جناب عالی! ملزمہ وحیدہ ایک معصوم اور
 بے گناہ لڑکی ہے۔ کئی گہری بہانوں کے تحت اس بے جا
 کوٹل کی اس واردات کے ساتھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ میری
 معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میری موٹل کی درخواست
 ضمانت منظور کرتے ہوئے اس کی رہائی کے احکامات صادر
 کیے جائیں۔“

”پور آئر.....!“ وکیل استغاثہ نے ضمانت کے
 خلاف رائے دیتے ہوئے کہا۔ ”ملزمہ ایسی معصوم، بے گناہ
 اور بے جا لڑکی بھی نہیں جیسا میرے فاضل دوست بیان
 کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لڑکی نے ایک سنگین جرم
 کا ارتکاب کیا ہے لہذا اس کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے
 اصولوں کے منافی ہوگا۔“

”سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے.....“ میں نے وکیل
 استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسی کے الفاظ دہرائے
 پھر کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”وکیل صاحب! آپ کس سنگین
 جرم کی بات کر رہے ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔
 ”آپ نہیں پتا، کون سا سنگین جرم.....“
 ”چند لمحات کے لیے فرض کر لیں، مجھے کچھ بھی معلوم
 نہیں.....“ میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے

”میں نے سارا کام ختم کر لیا ہے اور صاحب جی ابھی تک
 رہے ہیں۔“ لگاتی توقف کر کے اس نے پوچھ لیا۔ ”پتا
 آپ کب تک آئیں گی؟“
 ”بس، میں دس پندرہ منٹ میں پہنچنے ہی والی
 ہوں۔“ نرگس نے جواب دیا۔ اور اگر مجھے ایک دو منٹ
 نیچے ہو جائیں تو تم چلی جانا.....“

”بیگ صاحب کو اکیلے چھوڑ کر.....؟“ وحیدہ نے
 حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔“ نرگس نے
 ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اور تمہارے صاحب تو وہ
 بھی آرام سے سو رہے ہیں۔ تم مین گیٹ کو بھیڑ کر اپنے وقت
 پر چلی جانا۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہوں۔ یہ سن کر اس
 لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ جب تمہیں دوسرے گھر پہنچنے میں
 ہو جاتی ہے تو شیخ صاحب کی بیوی تم پر چینی چلاتی ہے۔“

وحیدہ نے نرگس کو مسز شیخ کے فیسے کے بہت سے
 ستارے تھے۔ نرگس نے جب اس کی دکھتی ہوئی رنگ
 انگلی دیکھی تو وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔
 ”جی ہاں..... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“

میں گیارہ بجے تک آپ کے آنے کا انتظار کروں گی۔ اس
 کے بعد باہر کا گیٹ بند کر کے شیخ صاحب کے گھر
 چلی جاؤں گی۔“
 ”ٹھیک ہے.....!“ یہ کہتے ہوئے نرگس نے
 فونک رابطہ منقطع کر دیا۔

وحیدہ نے مجھے بتایا کہ اس نے احتیاطاً گیارہ بجے
 نرگس کی واپسی کا انتظار کیا تھا اور پھر باجی کی حسب ہدایت
 پہنچنے کے بیرونی گیٹ کو بند کر کے دوسرے پہنچنے پر کام کرنے
 چلی گئی تھی۔ گیٹ کو اس نے باہر سے کھڑی لگا دی تھی تاکہ
 وغیرہ کے دباؤ کی وجہ سے وہ خود بخود کھل نہ جائے۔

وحیدہ نے وقوعہ کے روز حسب معمول شیخ صاحب
 کے گھر کا کام ٹھنایا پھر وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تھی۔
 اس کی ماں سلٹی اس سے پہلے گھر پہنچ چکی تھی اور کھانا
 تیار کر رہی تھی۔ وہ دونوں جب دوپہر کا کھانا کھانے میں
 مصروف تھیں تو ایک سب انسپکٹر دوکانگیل کے ساتھ
 کے گھر پہنچ گیا پھر وحیدہ کو اشتقاق بیگ کے قتل کے بارے
 میں گرفتار کر لیا گیا۔

وحیدہ نے جب مقتول کے گھر کو چھوڑا تو اشتقاق
 زندہ سلامت، گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس کے قتل کے
 بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وحیدہ کو جو کچھ بھی معلوم

”تمہارے صاحب نے ناشا کر لیا ہے اور میں نے
 انہیں صبح والی دوا بھی کھلا دی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آرام
 سے سو رہے ہیں۔ ان کی دواؤں میں ایک سکون کی گولی بھی
 ہے۔ وہ تمہیں کسی کام کے لیے نہیں کہیں گے۔ مجھے یقین
 ہے، میری واپسی تک وہ یونہی بے خبر سوتے رہیں گے۔“
 ”ٹھیک ہے باجی! آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“
 وحیدہ نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”اگر صاحب جی جاگ
 بھی گئے تو میں سنبھال لوں گی۔“

اس کے بعد نرگس پہنچنے سے روانہ ہو گئی تھی۔
 یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ نرگس، وحیدہ کو گھر میں چھوڑ
 کر باہر نکلتی ہو۔ اکثر و بیشتر وہ ایسا کرتی رہتی تھی لہذا وقوعہ کے
 روز وحیدہ نے نرگس کے باہر جانے کو کوئی خاص اہمیت نہ دی
 اور حسب معمول اپنے کام میں جتی رہی۔

وحیدہ کا خیال تھا کہ اس کی باجی نرگس دس بجے تک
 واپس آ جائے گی لیکن جب وقت دس سے آگے بڑھنے لگا
 اور نرگس کی شکل نظر نہ آئی تو وحیدہ کو تشویش ہونے لگی۔ جوں
 جوں اس کی چھٹی کا وقت قریب آ رہا تھا، اس کی فکر مندی میں
 اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دو تین بار مقتول کے
 بیڈروم میں بھی جھانک کر دیکھ لیا۔ مقتول اشتقاق بیگ گہری
 نیند سو رہا تھا۔

دس کے بعد، سوادس اور پھر ساڑھے دس بج گئے۔
 وحیدہ سوچنے لگی، پتا نہیں باجی کہاں رہ گئی ہیں؟ کون سے
 میڈیکل اسٹور سے وہ صاحب کی دوا لینے چلی گئی ہیں.....؟

وحیدہ مقتول کے گھر کا کام ختم کرنے کے بعد فیاض
 شیخ کے پہنچنے پر جاتی تھی جہاں اسے گیارہ سے ایک بجے تک
 کام کرنا ہوتا تھا۔ فیاض شیخ کا بھلا، مقتول کے پہنچنے سے پانچ
 منٹ کے قاصطے پر تھا۔ اگر اسے وہاں پہنچنے میں بھی دیر
 ہو جاتی تو..... شیخ صاحب کی بیوی بہت شور مچاتی تھی۔ وہ

ایسی خضہ و عورت تھی کہ شیخ صاحب بھی عالم طیش میں اس کا
 سامنا کرتے ہوئے کھراتے تھے۔ وحیدہ، ایند کے فیسے کا
 سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی اور دل ہی دل میں یہ دعا
 بھی کر رہی تھی کہ گیارہ سے پہلے پہلے نرگس واپس لوٹ آئے
 تاکہ اسے ایند کے غیظ و غضب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مسز
 ایند بڑی دھانسو قسم کی عورت تھی۔

کم و بیش پونے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی تو وحیدہ
 نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف اس کی باجی نرگس تھی۔
 ”ہاں وحیدہ!“ اس نے پوچھا۔ ”سب ٹھیک ہے نا.....؟“
 ”جی، سب ٹھیک ہے۔“ اس نے جلدی سے بتایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ہارٹ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فوری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو امیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



ضمانت نامہ کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ مجھے عدالت کے اس فیصلے پر کوئی اچھا ہوا تھا اور نہ ہی مایوسی۔ میں مطمئن رہی کہ میں نے اپنے حصے کا کام نہایت ہی خوبی سے کر دیا ہے۔ کیس کی باقاعدہ سماعت پر مجھے اپنے جوہر دکھانا تھے۔ آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو پوسٹ مارم رپورٹ اور پولیس کے چالان، یعنی استغاثہ کے بارے میں مختصر آبتنا چلوں۔

پوسٹ مارم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت تین جنوری کی دوپہر دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آٹھ بجے ایک تیز دھار گوشت کاٹنے والی چھری تھی جس کی مدد سے مقتول کی شہرگ کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ مذکورہ خطرناک چھری سے مقتول کی گردن پر اتنا بڑا کٹ لگا یا گیا تھا کہ اس کے زندہ بچنے کے امکانات صفر کے برابر ہو کر رہ گئے تھے۔

پوسٹ مارم رپورٹ کے ساتھ ہی میڈیکل ایکس ریز کی رپورٹ بھی فائل میں لگی ہوئی تھی۔ اس رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ بہ وقت قتل مقتول کسی خواب آدرود کے زیر اثر تھا اور حالت بے ہوشی یا حالت خند میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بھی ثابت ہوا تھا کہ مقتول کے جسم میں نشہ آور دوا کے آثار موجود تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ یہ دوا اور دوا زخم نے ناشتے کے بعد اپنے شوہر مقتول اشتیاق بیگ کو کھلائی تھی۔

استغاثہ نے میری منوکل کے خلاف خاصا مشہور کیا تیار کیا تھا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے علاوہ بھی اس پر مزید الزامات ڈالے گئے تھے۔ نمبر ایک دس ہزار نقدی نمبر دو لاکھ چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری۔ یہ دونوں چیزیں مقتول کی بیوی زمرگ کی الماری سے غائب ہوئی تھیں۔ زمرگ کا دعویٰ تھا کہ جب وہ وقوع کے روز گھر سے نکلے تو یہ نقدی اور جیولری اس کی الماری میں موجود تھیں لیکن جب دن میں وہ واپس آئی تو اس کی الماری کے پتہ کھلے ہوئے تھے اور یہ دونوں اشیاء اپنی جگہ موجود نہیں تھیں۔ اس نے اپنی الماری کا کوٹا کوٹا چھان مارا مگر اسے کہیں بھی نقدی یا زیورات دکھائی نہ دیے۔ الماری کے کھلے ہوئے پتہ دیکھ کر اسے جس گڑبڑ کا احساس ہوا تھا، وہ ایک شوخ حقیقت تھی۔

قصہ مختصر، میری منوکل وحیدہ کو نقدی و طلائی زیورات چرانے اور اپنے صاحب اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے حوالہ عدالت کر دیا گیا تھا۔

رکھ دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ کے یقین سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے میری منوکل کو خود اپنی آنکھوں سے یہ جرم کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“

”نہیں.....“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”پھر کسی بات ہے میرے فاضل دوست؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں وہی تو جانتا چاہتا ہوں۔“

”م..... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ..... میں نے ملزمہ وحیدہ کو یہ قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بھلا اس واقعے کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔“

”کوئی اور معنی شاید ہے اس واردات کا؟“

”کوئی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”تو پھر.....“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو میری منوکل کے بارے میں زبان کو زحمت دیتے وقت محتاط الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ جب تک عدالت میں، اس پر عائد جرم ثابت نہیں ہو جاتا، اس کی حیثیت ایک ملزمہ ایسی ہے لہذا یہ کہہ دینا کہ..... وہ ایک مجرم ہے، اس نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے..... سراسر زیادتی والی بات ہوگی۔“

میری وضاحت نے وکیل استغاثہ کو قدرے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ وہ کھیپا ہٹ آمیز انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن منج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میری منوکل گھروں میں کام کرنے والی ایک بے چاری لڑکی ہے۔ میں آگے چل کر ثابت کر دوں گا کہ قتل کی اس واردات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں لہذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی ضمانت کو منظور کیا جائے۔“

وکیل استغاثہ ایک بار پھر ضمانت رکوانے کے لیے بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ”جناب عالی! واقعاتی شہادتیں سراسر ملزمہ کے خلاف جاتی ہیں۔ خاص طور پر آٹھ بجے پر ملزمہ کے جو فنگر پرنٹس ملے ہیں، انہیں کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

مزید پندرہ تیس منٹ تک وحیدہ کی ضمانت کے حق میں اور ضمانت کے خلاف دلائل کا سلسلہ جاری رہا پھر عدالت نے میری منوکل کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے وحیدہ کو جیو ڈیٹیل ریمانڈ..... پر چیل بھیج دیا۔

جیسا کہ پہلے بھی کئی بار بتایا گیا ہے کہ قتل کے ملزم کی

”جی ہاں..... سب بتایا تھا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”نرگس نے ٹھیک پونے گیارہ بجے اپنے گھر فون کیا تھا۔ فون مزمہ نے اینڈ کیا تھا۔ نرگس نے مزمہ کو تاکید کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہ آئے، مزمہ گھر سے نہیں جائے گی چاہے اسے دوسرے گھر سے کام کی چھٹی ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

”لیکن مزمہ کا بیان اس کے برعکس ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”پونے گیارہ بجے جب مقتول کی بیوہ نرگس نے مزمہ کو فون کیا تو مزمہ نے پوچھا تھا، باجی! آپ کب تک واپس آئیں گی۔ مجھے گیارہ بجے صبح صاحب کے گھر کام کرنے جانا ہے؟ اس پر نرگس نے جواب دیا تھا، میں گھر سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔ تم میری واپسی کا انتظار نہیں کرنا اور گیارہ بجے بیرونی گیٹ بند کر کے صبح صاحب کے گھر چلی جانا ورنہ تمہارے در سے جانے پر شیخ کی بد مزاج بیوی تم پر خواہ مخواہ چیخے چلائے گی۔ ان دونوں بیانات میں اتنا زیادہ تضاد ہے کہ..... میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”کہ..... دونوں میں سے کوئی ایک بیان ہی درست ہو سکتا ہے۔“

”مزمہ وحیدہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔“ آئی اوجلدی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”یہی فتویٰ میں اس کیس کی مدعی اور مقتول کی بیوہ نرگس کے لیے بھی جاری کر سکتا ہوں۔“

”آپ کا فتویٰ درست نہیں مانا جائے گا وکیل صاحب! انکواری آفسیر بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کیونکہ مقتول دل کا مریض تھا۔ نرگس اس کی طرف سے ایسا غیر محاط اقدام اٹھا ہی نہیں سکتی۔ وہ مزمہ کو اس وقت تک گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی جب تک وہ خود مقتول کے پاس واپس نہ آ جاتی۔ یہ تو ایک سامنے کی حقیقت ہے جو معمولی سی عقل رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔“

آئی اوجلدی نے آخری جملے میں مجھ پر چوٹ کی تھی۔ میں نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور مقتول انداز میں پوچھا۔

”آپ کی معلومات کے مطابق وقوعہ کے روز مقتول کی بیوہ نرگس کتنے بجے گھر واپس آئی تھی؟“

”ساڑھے بارہ بجے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بارہ بیٹنالیس پر اس نے تھانے فون کر کے،

”ایک..... سوا ایک بجے کے درمیان۔“ اس نے جواب دیا۔

”میری معلومات کے مطابق مزمہ وحیدہ کو لگ بھگ دو بجے اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! میری معلومات غلط تو نہیں ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ مزمہ کی گرفتاری کا وقت وہی ہے جو آپ نے بتایا ہے۔“

”مزمہ کی گرفتاری یقیناً مقتول کی بیوہ نرگس کی ناندھی پر کی گئی ہوگی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”جی ہاں۔“ اس نے سر کو اٹھاتی جنبش دی۔ ”نرگس صاحبہ نے میری پوچھ گچھ کے نتیجے میں مجھے بتایا تھا کہ وہ مزمہ کو گھر میں چھوڑ کر کسی ضروری کام سے باہر گئی تھی۔ واپسی میں اسے دیر ہو گئی۔ جب وہ گھر آئی تو مزمہ وحیدہ یعنی مزمہ گھر میں موجود نہیں تھی اور نرگس کے شوہر کو بڑی.... بددلی سے گھاکاٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور دوسرے کمرے کی الماری بھی کھلی پڑی تھی۔ مذکورہ الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات بھی غائب تھے۔ نرگس کو شک تھا کہ یہ کارنامہ مزمہ کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا لہذا ہم نے نرگس کے ایما پر مزمہ کو اس کے گھر سے گرفتار کر کے شامل تفتیش کر لیا۔“

”بہت خوب!“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ کی کارکردگی واقعی لا جواب تھی۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس کی تعریف میں سنجیدہ ہوں یا مذاق کر رہا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے بتایا ہے کہ جب نرگس واپس آئی تو مزمہ وحیدہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کیا مزمہ کو اس وقت گھر میں موجود ہونا چاہیے تھا؟“

”جی ہاں.....“ وہ اصراری انداز میں بولا۔ ”مقتول کی بیوی نرگس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر دل کا مریض تھا اور اس نے مزمہ کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی، وہ گھر میں موجود رہے۔“

”مقتول کی بیوہ نرگس نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز دس بیٹنالیس پر اپنے گھر فون کر کے مزمہ سے کیا کہا تھا؟“ میں نے دیکھے لہجے میں کہا۔

وہ میرے ریمارکس پر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

قدرے ناگوار لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”کیا مطلب ہے آپ وکیل صاحب؟“

”مطلب یہ کہ.....“ میں نے جھپٹر چھاڑ کے صلیب آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا یونیفارم خاصا خوب نظر آ رہا ہے، آپ کا شیوہ بنا ہوا ہے، بال بڑے سلیقے سے سنورے ہوئے ہیں اور جوتے بھی چمک رہے ہیں۔ آپ خاصے خوش ذوق معلوم ہوتے ہیں۔“

وہ اپنی تعریف اور وہ بھی ایک وکیل مخالف کی زبان سے سن کر خوش ہو گیا تاہم اپنی خوشی کو دباتے ہوئے اس نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آپ نے بجا فرمایا کہ میں ایک خوش ذوق پولیس آفسیر ہوں لیکن ان باتوں کا زیر نظر کیس سے کیا تعلق ہے؟“

”کوئی تعلق نہیں آئی او صاحب!“ میں نے

بے پروائی سے کہا۔ ”بس، میں نے ایسے ہی ذکر کرنا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ عموماً صبح و شام جن پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے انہیں اپنے طیبے یا یونیفارم سے کوئی دلچسپی دکھائی نہیں دیتی۔ کم از کم تھانہ انچارج کے رینک سے نیچے تو اس بات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں جاتا کہ انسان کا لباس اور طیبہ پر کتنا بڑا اثر ہے۔ یہی اہمیت ہی انہیں یاد آ کر رہتی ہے۔“

”بس جناب.....“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔“

”کیا خوب صورت بات کی ہے آپ نے۔“

میں نے تو صغیر نظر سے اسے دیکھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ خاموش نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ”صنذر صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی.....؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”واقعے سے میری مراد اشتیاق بیگ مرڈر کیس ہے.....!“

”آپ وضاحت نہ بھی کرتے تو میں سمجھ گیا تھا۔“ صنذر صاحب نے لہجے میں بولا۔ ”اس واقعے کی اطلاع مقتول کی بیوی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس نے جس جنورل کی دوپہر تھانے فون کر کے دی تھی۔“

”دوپہر..... کتنے بجے؟“ میں نے سوال کیا۔

”پولیس کے روزنامے کے مطابق یہ اطلاع دوپہر بارہ بج کر بیٹنالیس منٹ پر دی گئی تھی یعنی پونے ایک بجے اور آپ جانے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

اس پیشی پر کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج کرسی انصاف پر براجمان ہوا تو عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ جج نے کارروائی شروع کرتے ہوئے فرد جرم پڑھ کر سناٹی۔ مزمہ نے صحت جرم سے انکار کر دیا۔ یہ بات پہلے بھی کئی بار بتائی جا چکی ہے کہ پولیس کھڑی میں دپے گئے مزمہ کے بیان یعنی اقبال جرم کو عدالت میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ پولیس والوں کے تقابلی حکمذوں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے بعض اوقات مزمہ اقرار جرم کر لیتا ہے اور عدالت میں جا کر اس سے منحرف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ چونکہ عدالت کے علم میں بھی ہوتا ہے اسی لیے وہ پولیس کی تحویل میں مزمہ کے کسی بھی بیان کو سنجیدگی سے نہیں لیتی۔

اس کے بعد مزمہ کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ مزمہ وحیدہ نے میری ہدایت کے عین مطابق نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں مختصر سا بیان ریکارڈ کر دیا۔ یہ وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکی تھی۔

استغاثہ کی جانب سے کل یا بج گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیانات میں کوئی خاص بات ہوگی۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، میں نے جج سے درخواست کی۔ ”جناب عالی! میں اس کیس کے انکواری آفسیر سے چند اہم سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

جج نے فوراً مجھے اجازت دے دی۔ ”پریشن گرائیڈ.....“

تفتیشی آفسیر یا انکواری آفسیر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ کی سی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ موجودہ کیس کے آئی او (انکواری آفسیر) کا نام صنذر علی تھا۔ رینک کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔ صنذر علی پست قامت اور بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے گال پھولے ہوئے تھے، آنکھوں سے شرارت نکلتی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی جاگتا تھا کہ وہ بڑے سائز کا کوئی شہریر ہے۔

جج کے حکم پر آئی او صنذر علی ونش ہاکس میں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور سر تا پا اس کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”آئی او صاحب..... آپ خاصے صاف سترے نظر آ رہے ہیں۔“

کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ "کون سی اہم بات؟" میں نے آئی او کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے بیچ کی جانب دیکھا۔ اس کی دلچسپی ہرگز رتے لمبے کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ میں نے کنساکر گلا صاف کیا اور آئی او کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میری منگل اور اس کیس کی طرز کا دعویٰ ہے کہ وقوع سے چند روز قبل وہ چھری چکن سے غائب ہو گئی تھی۔ جب اس نے مذکورہ چھری کے بارے میں اپنی باہمی یعنی مقتول کی بیوہ نرگس سے استفسار کیا تو اس نے چھری کے حوالے سے اپنی لاپرواہی ظاہر کر دی تھی۔"

"مجھے آڈیٹل کے ماضی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "نہ ہی مجھے یہ سہی جاننے سے کوئی دلچسپی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آڈیٹل پر طرز کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے اور وہ اپنی ماگن کی حکم عدولی کر کے اس کے گھر آنے سے پہلے ہی مقتول کے گھر سے نکل گئی تھی۔"

"آئی او صاحب! میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا آپ پوری دیانت داری کے ساتھ مجھے ایک بات بتائیں گے؟" "کوئل صاحب! میں نے ابھی تک معزز عدالت کے روبرو جو کچھ بھی کہا ہے اس میں دیانت داری کو ایک لمبے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا۔" وہ قدرے ناراضی سے بولا۔ "پوچھیں، آپ کو مجھ سے کون سی بات پوچھنا ہے۔ جو میری نظر میں سچ ہوگا، میں ضرور بتاؤں گا۔"

"یہ جو معاشرے کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں مثلاً مزدور، نشتی، جٹا کش اور سخت کام کرنے والے یا گھروں میں کام کرنے والی نوکریاں وغیرہ....." میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کے خیال میں ان کی کھوپڑی میں دماغ نہیں ہوتا؟"

"میں سمجھا نہیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں....." وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ "اپنی بات کی وضاحت کریں گے؟"

"میرا مطلب ہے، کیا یہ لوگ آپ کی نظر میں عقل سے پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "ان میں اور ایک گدمے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا آپ کو.....؟"

بیچ نے اپنے ہاتھ میں موجود قلم سے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر چند سطریں کھینچیں اور دوبارہ ہماری

مقتول کی لاش کو دیکھ کر کیا اندازہ قائم کیا تھا؟" "جیسا آپ فرما رہے ہیں، میں نے بالکل ویسا ہی دیکھا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "مقتول کی لاش اور بستر کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ موت کے منٹ میں جاتے وقت مقتول نے زیادہ اچھل کود نہیں کی ہوگی۔"

"مجھے پتا چلا ہے، آپ نے جائے وقوع سے بڑی آسانی کے ساتھ آڈیٹل بھی برآمد کر لیا تھا؟" میں نے قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "آڈیٹل کی تلاش میں مجھے زیادہ تنگ و دو نہیں کرنا پڑی تھی۔" "مگر ناک گوشت کاٹنے والی چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی پائی گئی تھی۔"

"آپ نے آڈیٹل پر سے فنگر پرنٹس بھی اٹھائے تھے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔ "اور وہ پرنٹس طرز کے فنگر پرنٹس سے میچ بھی کر گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں ہوں؟"

"نہیں جناب! آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ آواز بلند بولا۔ "جمعی تو یہ بات اور بھی یقینی ہو گئی کہ طرز میں طوطے نہ ہوتی تو آڈیٹل پر اس کی انگلیوں کے نشانات کیوں پائے جاتے۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔" "یہ تم کو کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

"ایک نہیں، اس کیس میں تو بہت سی باتیں غور طلب ہیں آئی او صاحب!" میں نے زہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں پر ہم باری باری غور بھی کریں گے لیکن آڈیٹل پر طرز کے فنگر پرنٹس کی موجودگی ہرگز یہ ثابت نہیں کرتی کہ اس نے مقتول اشتیاق بیگ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔"

"جی کیا مطلب؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میری منگل کی مطابق وہ خطرناک چھری جو اس نے آڈیٹل کی حیثیت کی حامل ہے اس کا تعلق مقتول کے گھر سے ہے۔ طرز اکثر و بیشتر اسے استعمال کرتی تھی۔ اس چھری کے دستے پر طرز کی انگلیوں کے نشانات کا پتہ لگانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس چھری کے حوالے سے طرز نے مجھے ایک نہایت ہی اہم بات بھی بتائی ہے....."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں آئی او

"صفر صاحب! وقوع کے روز جب آپ دوپہر ایک اور سوا ایک کے درمیان جائے واردات پر پہنچے تو وہاں مقتول کی بیوہ نرگس کے علاوہ اور کون موجود تھا؟"

"مقتول کی فیکٹری کا منیجر فرید غوری بھی جائے وقوع پر موجود تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا فرید غوری کو بھی مقتول کی بیوہ نے فون کر کے وہاں بلایا تھا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ "آپ نے اس سلسلے میں مقتول کی بیوہ نرگس سے پوچھا نہیں تھا؟" میں نے سوال کیا۔ "ایک انکوآری آفیسر کی حیثیت سے آپ کو فرید غوری کی جائے وقوع پر موجودگی کا سبب پتا ہونا چاہیے تھا؟"

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" وہ رکھائی سے بولا۔ "آپ نرگس سے خود پوچھ لیجیے گا....."

"میں مقتول کی بیوہ سے ضرور یہ سوال کروں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ میں اس معاملے کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔"

"جمعی آپ کی مرضی!" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آئی او صاحب! جب آپ جائے وقوع پر پہنچے تو آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا؟"

"مقتول بیگ اپنے کمرے میں بیڈ پر مردہ پڑا تھا۔" اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ "اس کی گردن گئی ہوئی تھی۔ خون کے بہاؤ نے اس کا لباس اور بیڈ کا ایک بڑا حصہ سرخ کر دیا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اب اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔"

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ کسی خواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔ اس کے معدے کے کیمیاوی تجزیے سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔" اطلب امکان اس بات کا ہے کہ مقتول کی بیوہ نے ناشتے کے وقت اسے جو سکون بخش دوا کھلائی تھی یہ اس کے اثرات ہوں۔ ان اثرات کی روشنی میں دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ....." میں سانس ہموار کرنے کے لیے لمبے بھر گور کا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جب کسی نشہ آور شے کے زیر اثر کسی شخص کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تو مرنے والے کو زیادہ تر اپنے پھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آپ نے

اپنے شوہر کو پیش آنے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یعنی گھر پہنچنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد.....؟"

"جی ہاں.....!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نرگس صاحبہ بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ ان کی جگہ اگر کوئی اور خاتون ہوتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ سب سے پہلے ارد گرد کے لوگوں کو اکٹھا کرتی۔ پولیس کو اطلاع دینے کا خیال تو بہت بعد میں آتا....."

میری منگل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نرگس کی اجازت پر ہی گیارہ بج کر پانچ منٹ پر پھلے سے نکل گئی کیونکہ نرگس پھلے کے قریب ہی کہیں موجود تھی لیکن آئی او سے ہونے والے سوال و جواب سے جو صورت حال سامنے آ رہی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا، نرگس کے ذہن میں کچھ اور ہی پک رہا تھا۔ جب وہ گواہی دینے و سننے باکس میں پہنچی تو میں اسے اپنے انداز میں گھس سکتا تھا۔ فی الحال تو آئی او سے نمٹنا تھا جو استفسار کا سب سے اہم گواہ ہونے کے ساتھ ہی استفسار کا وارث بھی تھا۔ میں نے مختصر سی جرح کے لیے اسے سچ سے مانگا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ کچھ زیادہ ہی دراز ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن چونکہ میری کرید کے نتیجے میں نئے نئے اکتشافات ہو رہے تھے لہذا بیچ بڑی توجہ اور دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسی دوران میں وقفے وقفے سے اس کا قلم بھی حرکت میں آ جاتا تھا اور وہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگتا تھا۔

"یہ تو جناب..... اپنی اپنی ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔" انکوآری آفیسر نے میرے اعتراض کے جواب میں کہا۔ "بعض لوگ کسی مصیبت کا سن کر ہی ہاتھ پاؤں ڈال دیتے ہیں اور بعض پر قیامت بھی نوٹ پڑے تو وہ کسی چٹان کے مانند اتادہ رہتے ہیں۔"

"پھر تو مقتول کی بیوہ کو "آئرن لیڈی" کی شیلڈ ملنا چاہیے۔" میں نے نیم طنز یہ لہجے میں کہا۔ "ایسے فولادی اعصاب کی مالک ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔"

اس نے میرے طنز کا جواب طنز ہی سے دیا۔ "اگر آپ کا کوئی بورڈ اس قسم کے انعامات کا انعقاد کرتا ہے تو آپ بہ خوشی سز بیگ کو یہ شیلڈ پیش کر سکتے ہیں۔"

میں نے زیر لب مسکرانے پر اکتفا کیا اور سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے انکوآری آفیسر سے پوچھا۔

اشتیاق بیگ کی گردن پر چھری پھیری، نیچے کے نیچے سے دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات نکالے اور چلتی بنی..... میں نے طنز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب۔“ وہ عجب سے لہجے میں بولا۔ ”استفادہ کی رپورٹ میں یہ کہاں لکھا ہے کہ دس ہزار کی نقدی اور طلائی زیورات مقتول کے نیچے کے نیچے رکھے تھے؟“

”آپ جیکشن پور آئے.....!“ وکیل استفادہ نے اپنی موجودگی کے اظہار کے لیے نعرہ متاثر بلند کیا۔ ”وکیل صفائی حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔“

جج نے گہری سنجیدگی سے وکیل استفادہ کی جانب دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ سماعت ہے۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اور وکیل صفائی آدھے پون گھنٹے سے آئی اور صاحب کو پکڑے کھڑے ہیں۔ کام کی کوئی بات نہیں ہو رہی اور محض عدالت کا قیمتی وقت برباد کیا جا رہا ہے اور اب تو انہوں نے حد ہی کر دی ہے.....“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر امداد و طلب نظر سے جج کو دیکھنے لگا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا کہ میں وکیل استفادہ کے اعتراض کا جواب دوں۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن جج کی سمت پھیرتے ہوئے نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

”جناب عالی! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اب تک انکوٹری آفسر صفدر پر جرح کے دوران میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا لہذا عدالت کے قیمتی وقت کے برباد ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وکیل استفادہ کے اعتراض کو ایک سیکنڈ کے لیے درست بھی مان لیا جائے تو پھر سر! آپ نے اس جرح کے دوران میں زیر سماعت کیس کے حوالے سے اپنے پاس جو اہم پوائنٹس نوٹ کیے ہیں انہیں بھی بیکار اور فضول سمجھتے ہوئے کاٹ دینا ہی مناسب ہوگا اور.....“

مجھے یقین ہے سر، آپ ایسا نہیں کریں گے.....“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے وکیل استفادہ اور تفتیشی افسر سمیت حاضرین عدالت پر ایک سرسری نظر ڈالی پھر دوبارہ جج کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ اب میرے انداز میں ایک خاص قسم کا

رہا تھا اسے دیکھ کر مجھے تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وکیل استفادہ کو بہت کم ”زحمت“ اٹھانا پڑے گی۔

”آئی او صاحب!“ میں نے سوالات کے سلسلے کو سینٹے ہوئے کہا۔ ”میری منوکل پر اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے علاوہ بھی دو الزامات ہیں۔ نمبر ایک، دس ہزار نقدی کی چوری۔ نمبر دو، چالیس ہزار کے طلائی زیورات کی چوری..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”آپ نے جب ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا تو خانہ اور جامہ تلاشی بھی لی ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ یہ رقم اور طلائی زیورات برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”ہم نے ملزم کے گھر کا کونا کونا جھان مارا تھا لیکن مال سرودہ اور نقدی کہیں سے برآمد نہیں ہو سکی۔“

”ریمانڈ کی مدت کے دوران میں آپ نے ملزم کی زبان کھلوانے کے لیے کڑی تفتیش بھی کی تھی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”دس ہزار نقدی اور طلائی زیورات کے بارے میں کچھ پتا چلا آپ کو؟“

اس نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی۔ آپ اس کے چہرے پر وہ پہلے واں تازگی اور بشارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خاصا تنکا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ میں وقفے وقفے سے جج کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب بھی میں آئی او کے سامنے کوئی خاص نکتا اٹھاتا اور آئی او اس کا جواب دیتا تو جج اپنے پاس کچھ نوٹ کر لیتا تھا یعنی وہ اہم پوائنٹس اپنے پاس جمع کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میری جرح خاصی سود مند ثابت ہو رہی تھی۔

”آئی او صاحب!“ میں دوبارہ تفتیشی افسر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”آپ کے خیال میں، دس ہزار نقدی اور چالیس ہزار کے طلائی زیورات مقتول اشتیاق بیگ کے نیچے سے نیچے رکھے ہوئے تھے؟“

”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ زنجی سے بولا۔ ”نقدی اور زیورات بھلا کون نیچے کے نیچے رکھتا ہے.....؟“

”آپ کی تفتیش اور استفادہ کی رپورٹ سے تو یہی لگتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی۔

”کیا مطلب.....؟“

”بھئی..... میری منوکل نے استفادہ کے مطابق

انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں، ملزم نے بوکھلاہٹ اور پریشانی میں آلہ قتل کو بیڈ کے نیچے پھینک دیا ہوگا۔ اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس پر وحشت اور دہشت سی طاری ہو گئی اور وہ چھری کو وہیں چھوڑ کر جلد از جلد جھنگل سے فرار ہو گئی ہوگی۔“

”وحشت زدہ یا دہشت زدہ یا بوکھلایا ہوا پریشان شخص پہلی فرصت میں کسی پُر سکون جگہ پر بیٹھ کر اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“ میں نے آئی او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے زہریلے انداز میں کہا۔ ”جبکہ ملزم کا ریکارڈ اس کے برعکس گواہی دیتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”آپ کے مطابق.....“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”ملزم اشتیاق بیگ کے قتل کے بعد اس قدر بوکھلا گئی تھی اور دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ پریشانی اور وحشت میں آلہ قتل کو مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی پھینک کر گھر سے فرار ہو گئی تھی جبکہ واقعات کے مطابق وہ اپنے مقررہ وقت پر فیاض شیخ کے گھر پہنچی تھی اور پورے دو گھنٹے اس نے شیخ صاحب کے گھر میں معمول کے مطابق پُر سکون انداز میں کام کیا تھا۔ اس امر کی گواہی فیاض شیخ کی بیٹی

ایند دے سکتی ہے۔ میں انکوٹری میں اپنے سے آگے بڑھ کر چکا ہوں۔ اگر محض عدالت کا حکم ہوگا تو میں اپنی منوکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے مسز فیاض شیخ ایند حکم کو عدالت تک لانے کا فرض پورا کر سکتا ہوں۔ ایند ایک منسور اور سخت گیر عورت ہے۔ وہ تو عام حالات میں ملزم کے کام میں سے کافی عیب نکالتی رہتی تھیں، کچا یہ کہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ خاموش کیسے رو سکتی تھیں۔ ایک عورت جس نے پانچ منٹ پہلے کسی شخص کا گلا کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو وہ صبر و سکون کے ساتھ پورے دو گھنٹے کسی گھر میں اپنے معمول کے کام کو کس طرح انجام دے سکتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت اور نفسیات ہی کے خلاف ہے آئی او صاحب.....“

تفتیشی افسر صفدر غلی میرے اس بھرپور منطقی اور پر بغلیں جھانکنے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے وکیل استفادہ کی یاد آگئی۔ میں اس قسم کے دھواں دھار جملے وکیل استفادہ پر کیا کرتا تھا لیکن ابھی تک اس کیس میں وکیل استفادہ کی باری نہیں آئی تھی۔ جس طرح آئی او سے جرح کے جواب میں یہ کیس اور اس کیس کے معاملات پرت پرت در پرت کھلتے چلے جا رہے تھے اور کیس تیزی سے اپنے اختتام کی طرف بڑھ

جانب متوجہ ہو گیا۔

آئی او نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”میں تو ایسا نہیں سمجھتا جناب! جب اللہ نے ان کے سر کے اوپر کھوپڑی بنائی ہے تو یقیناً اس کے اندر دماغ بھی رکھا ہے اور یہ بھی معاشرے کے دوسرے یعنی بالائی طبقوں کے مانند سوچتے اور سمجھتے ہیں بلکہ بعض معاملات میں تو ان کا دماغ کچھ زیادہ ہی چلتا ہے۔“

”دماغ کے استعمال اور سمجھ بوجھ کے حوالے سے ملزم وحیدہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ میں نے چپختے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

”وہی خیال ہے جس کا میں آپ کے پہلے سوال کے جواب میں اظہار کر چکا ہوں۔“ وہ خاصے اطمینان کے ساتھ بولا۔

”یعنی ملزم بھی ایک سمجھ دار اور باشعور انسان ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اسے ”الو کی پٹھی“ کہنا درست نہیں ہوگا؟“

”ایسے الفاظ کا استعمال تو کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن اس سے ملزم کے جرم کی یقینی کم یا ختم نہیں ہو جاتی.....“

”ٹھیک ہے، ہم جرم اور اس کی یقینی کی طرف آ جاتے ہیں۔“ میں نے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔ ”میری منوکل پر اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کا الزام ہے اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ کوئی ڈفریا لو کی پٹھی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ.....“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا وجہ ہے کہ اس نے (استفادہ کے مطابق) اشتیاق بیگ کو قتل کرنے کے بعد آلہ قتل کو اسی کے بیڈ کے نیچے پھینک دیا۔ آپ کو وہ خطرناک تیز دھار چھری مقتول کے بیڈ کے نیچے ہی سے ملی تھی نا؟“

”جی ہاں..... وہیں سے ملی تھی۔“ آئی او نے پریشان لہجے میں جواب دیا۔

”وہ اگر چاہتی تو اس چھری کو کسی جگہ بھی چھپا سکتی تھی جہاں سے آسانی سے ڈھونڈی نہ جاسکتی۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”وہ آلہ قتل کو گھر سے باہر کسی پھر ادان میں بھی پھینک سکتی تھی۔ اس نے اپنے سنگین جرم کے سب سے بڑے ثبوت کو مقتول کے بیڈ کے نیچے کیوں ڈال دیا تھا یہ تو وہی بات ہوئی کہ..... آئیل، مجھے مارا“

”آپ کا سوال یقیناً بہت اہم ہے۔“ وہ تائیدی

جذباتی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”جناب عالی! اگر میں نے پچھلے تیس چالیس منٹ تک عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی غرض سے جھک ماری ہے تو میں اپنے اس فعل پر انتہائی شرمندہ اور معذرت خواہ ہوں..... ویش آل پور آنر۔“

”اب آپ کیا فرماتے ہیں وکیل صاحب؟“ جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔
 ”میں کیا کہوں جناب عالی!“ وہ بلا سوچے سمجھے بول گیا۔ ”جب میرے فاضل دوست نے خود ہی اپنی قلمی کا اعتراف کر لیا ہے تو پھر کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔“

جج نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ”وکیل صاحب! آپ کے فاضل دوست اور اس کیس کے ڈیفنس کونسلر مسٹر بیگ نے اپنی کسی قلمی کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ان کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ان کے اٹھائے ہوئے نکتے عدالت کی نظر میں بے معنی اور لغو ہیں تو وہ اپنی جرح کو موقوف کرنے پر تیار ہیں۔“

وکیل استغاثہ خاموش اور الجھن زدہ انداز میں جج کو دیکھتا چلا گیا۔ جج نے مزید کہا۔ اس کا مخاطب صد فیصد وکیل استغاثہ ہی تھا۔
 ”اگر آپ نے یہ بات کو درست مان کر یہ عدالت وکیل صفائی کو مزید سوالات سے روک دے تو پھر آپ کو ان تمام امور کی وضاحت کرنا ہوگی، چاہے یہ نکات بے معنی ہیں یا بامعنی؟“

کہا۔ ”اگر معزز عدالت مجھے جرح جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائے تو میں اپنے فاضل دوست کے اعتراضات کا بڑا مدلل اور شافی جواب دینے کے لیے بہ قرار ہوں۔“

جج نے کبھی انداز میں کہا۔ ”مسٹر بیگ اپنی پروسیجر میں بڑے چاؤ کے ساتھ اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپٹر صفدر علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔“ آئی او صاحب! میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”تو آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ چوری ہونے والے چالیس ہزار کے طلائی زیورات اور دس ہزار نقدی مقتول کے بچکے کے نیچے نہیں رکھے تھے؟“

”جی ہاں نہیں!“ وہ پوری قطعیت سے بولا۔
 ”پھر ان دونوں چیزوں کو کہاں سے چرایا گیا؟“
 ”الماری کے اندر سے۔“
 ”کون سی الماری؟“ میرے سوالات میں تیزی آتی گئی۔
 ”مقتول کی بیوہ نرگس کی الماری میں سے۔“ اس نے جواب دیا۔

میر نے پوچھا۔ ”کیا مذکورہ الماری بھی مقتول کے بیڈروم میں رکھی ہوئی تھی؟“
 ”نہیں۔“ اس نے بڑی شدت سے نفی میں گمان ہلائی۔ ”دونوں میاں بیوی کے بیڈروم الٹ الٹ تھے۔ جس الماری میں سے نقدی اور طلائی زیورات چرائے گئے وہ نرگس کے بیڈروم میں رکھی تھی۔“
 ”آپ نے یقیناً اس بیڈروم اور خصوصی طور پر اس الماری کا بھی معائنہ کیا ہوگا جہاں سے زیورات اور نقدی چرائی گئی تھی؟“
 ”جی ہاں..... یہ تو میرا فرض تھا۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔
 ”آپ کا اس سے زیادہ بڑا ایک اور فرض بھی تھا۔“
 میں نے اسے طنز یہ انداز سے گھورا۔ ”کیا آپ نے وہ فرض بھی پورا کیا تھا؟“
 ”کون سا فرض؟“ وہ پریشانی سے مجھ دیکھنے لگا۔
 ”مذکورہ الماری سے فنکر پرنس اٹھانا۔“ میں نے برسر راتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور ان فنکر پرنس کا ملزمہ کے فنکر پرنس سے موازنہ کرنا۔“

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب۔“
 ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ گلست خوردہ انداز میں بولا۔ ”اس الماری کے کسی حصے پر ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے تھے۔“

”یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے۔“ میں نے جیسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آڈیٹل پر سے تو ملزمہ کے فنکر پرنس مل جاتے ہیں مگر الماری کے کسی حصے خصوصاً اس کے پینڈل پر فنکر پرنس موجود نہیں ہیں؟“

”کیا کہا جاسکتا ہے۔“ وہ جاہلانہ انداز میں بولا۔ ”ہوسکتا ہے، ملزم نے پہلے نقدی اور زیورات چرائے ہوں اور الماری پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیے ہوں۔ پھر مقتول کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ خوفزدہ ہو گئی ہو جس کے سبب آڈیٹل پر سے انگلیوں کے نشانات صاف کرنے کا اسے ہوش نہ رہا ہو اور وہ چھری کو وہاں بیڈ کے نیچے پھینک کر بچکے سے فرار ہو گئی ہو۔“

”ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے آئی او صاحب!“ میں نے سستے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لیکن جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ عقل سے باہر ہے۔ خیر..... میں نے تھوڑی دیر روک کر ایک آسودہ سالہ سہیلی پھر خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔
 ”آئی او صاحب! ملزمہ کی عدالت کے دوران میں لگ بھگ ایک ہفتہ آپ کی کسٹڈی میں رہی ہے۔ آپ نے اسے اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے اور مختلف اشیاء کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہوگا.....؟“
 ”جی ہاں، بار بار دیکھا تھا.....“ وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھتا رہا۔
 ”آپ نے اسے کس ہاتھ کا پلایا تھا؟“
 ”میں سمجھا نہیں.....“ اس کی الجھن دو چند ہو گئی۔
 ”مطلب یہ کہ ملزمہ کس ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے؟“ میں نے فوراً وضاحت کر دی۔
 ”ہاں میں ہاتھ سے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”جیسا کہ عموماً لوگ ہوتے ہیں..... رائٹ ہینڈ!“
 ”میں ذرا، مقتول کے بیڈروم میں چلتے ہیں.....“
 ”جی.....؟“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔
 ”آپ پریشان نہ ہوں آئی او صاحب!“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”ہم عدالتی کارروائی کو ادھورا چھوڑ کر مقتول کے بیڈروم یعنی جائے وقوعہ پر نہیں جا رہے بلکہ

اس کمرے کا ذکر کر رہے ہیں۔“

وہ ایک پوچھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔
 ”آئی او صاحب!“ میں نے دھمکے انداز میں اسے گھسنے کی کوشش کی۔ ”آپ نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرتے ہوئے چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی بڑی توجہ اور غور سے جائزہ لیا ہوگا؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ ”میں نے بھی اپنے ذرائع کی مدد سے اس بیڈروم کا ایک نقشہ بنایا ہے۔ میں کچھ تفصیلات آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ تصدیق کیجیے گا کہ میں غلط ہوں یا صحیح.....!“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔
 ”وہ بارہ ضرب بارہ فٹ کا ایک کشادہ بیڈروم ہے؟“
 ”درست.....!“
 ”کمرے میں داخل ہونے کا راستہ مغربی دیوار سے ہے؟“
 ”جی ہاں، ایسا ہی ہے۔“

”کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ مقتول کا بیڈ اس طرح بچھا ہوا ہے کہ بیڈ کا سر ہانہ مشرقی دیوار کو چھ کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یعنی مشرقی اور جنوبی دیوار کے اتصال سے وجود پانے والے کونے پر بیڈ کا قبضہ ہے۔“
 ”بالکل درست، فرمایا آپ نے۔“ اس نے جواب دیا۔
 میں سوالات کے زاویے تبدیل کر کے رفتہ رفتہ اسے اپنے جال میں پھانسنے کی سعی میں مصروف تھا اور آئی او بے خبری میں میری کھینچی ہوئی لکیر پر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔
 ”بیڈ اپنے سائز میں چھ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

اس نے ایک بار پھر اثبات میں جواب دیا۔
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ.....“ میں نے اپنے ”کام“ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”سرہانے کی طرف سے مشرقی دیوار پانچ فٹ اور سائڈ سے جنوبی دیوار چھ فٹ بیڈ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے؟“
 ”جی ہاں..... بیڈ اور دیواروں کی یہی صورت حال ہے۔“
 ”مقتول کی شہ رگ کاٹ کر اسے موت کے حوالے کیا گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اور بہ وقت موت وہ بیڈ پر سویا ہوا تھا یعنی اس کا سر مشرقی دیوار کی جانب اور پاؤں مغربی دیوار کی سمت تھے۔ اگرچہ اس رخ پر سونا مذہبی طور پر اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن یہاں پر شریعت کی بات نہیں ہو رہی۔ آپ صرف اتنا بتائیں کہ میں نے مقتول کے لینے کے حوالے

”کچھ آیا سمجھ میں جناب کی.....؟“
 ”یہی سمجھ میں آیا کہ.....“ وہ بیجان آمیز سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”قاتل نے اٹنے ہاتھ سے چھری کا استعمال کرتے ہوئے اشتیاق بیگ کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“
 ”یعنی قاتل لیفٹ وینڈو ہے۔“ میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی.....؟“
 ”جی..... جی بالکل!“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔
 ”آپ تھوڑی دیر پہلے اس امر کی بھی تصدیق کر چکے ہیں کہ اس کیس کی طرہ اور میری منوکل وحیدہ دائیں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہے یعنی وہ رائٹ وینڈو ہے..... ہیں نا؟“
 ”جی ہاں.....“ اس نے کمزوری آواز میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

☆☆☆

گزشتہ پیشی پر میں نے اس کیس کے انکوائری آفیسر سب انسپکٹر صفدر علی پر خاصی طویل اور سختی خیز جرح کی تھی جس سے کافی مثبت اور مفید نتائج برآمد ہوئے تھے۔ میں اپنی کارکردگی کو تسلی بخش اور حوصلہ افزا کر رہا تھا۔ میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ عدالت کے علم میں لانے میں کامیاب رہا تھا کہ اشتیاق بیگ کو جس بھی شخص نے قتل کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی تھا یعنی وہ لیفٹ وینڈو تھا جبکہ آئی او نے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میری منوکل اور اس کیس کی طرہ وحیدہ رائٹ وینڈو تھی۔
 اس پیشی پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہ پیش کیے گئے جن میں صرف ایک کا بیان قابل ذکر اور اہمیت کا حامل ہے۔ میں یہاں پر اسی گواہ کا احوال بیان کر رہا ہوں۔
 مقتول کے بیٹھے کے عین سامنے جو بنگلا واقع تھا اس کے چوکیدار نے وقوع کے روز طرہ کو اپنے بیٹھے سے نکلنے دیکھا تھا یعنی مقتول کے بیٹھے سے۔ مذکورہ چوکیدار نما ملازم کا نام افضل خان تھا۔ افضل خان کی عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کا مالک اور عام شکل و صورت والا شخص تھا۔ افضل خان نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔
 ”افضل خان! تم نے وقوع کے روز جس عورت کو مقتول کے بیٹھے سے نکلنے دیکھا تھا کیا وہ یہی ہے؟“ بات

”آئیو بیٹھن پور آرز“ کا نعرہ لگانے کی بھی پوزیشن میں نہیں تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود افراد کو گویا سانپ نے سونگھ گیا تھا۔ سب کی نظریں تفتیشی السراور مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔
 آئی او نے ڈیو دینے سے پہلے ایک مرتبہ پھر متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ..... چڑھ جا بیٹا سولی پر، رام بھلی کرے گا۔
 آئی او نے اس سوئی ہوئی عورت کی گردن کاٹ ڈالی۔ چھری کا ایک لمبا کٹ پوسٹر پر نمایاں ہو گیا جو مذکورہ ”عورت“ کے بائیں کان سے دائیں کندھے کی سمت تھا یعنی کندھے سے شروع ہو کر کان کی طرف گیا تھا۔
 ”یہ آپ نے کیا کر دیا آئی او صاحب.....؟“ میں نے جلدی سے کہا۔
 ”کیوں..... کیا ہو گیا؟“ وہ بوکھلا کر میری جانب دیکھنے لگا۔
 میں نے کہا۔ ”مقتول اشتیاق بیگ کی کئی ہوئی گردن پر کٹ کا اینٹگل یہ تو نہیں تھا۔“
 وہ ابھمن زدہ انداز میں پوسٹر کو دیکھنے لگا۔
 ”آئی او صاحب! میں نے ایک ایک لفظ پر دواؤ ڈالنے ہوئے کہا..... اشتیاق بیگ کی گردن کا کٹ دوپٹے کے کندھے سے شروع ہو کر بائیں کان کے نیچے تک چلا گیا تھا جبکہ آپ کا لگایا ہوا کٹ بائیں کندھے سے شروع ہو کر دائیں کان تک گیا ہے۔ یہ تو بالکل الٹا معاملہ ہو گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
 ”آپ کیسے تو ٹھیک ہی رہے ہیں.....“ وہ متذبذب بھرے انداز میں بھی عورت کی تصویر کو اور کئی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔
 ”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔
 ”شاید میرا ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا.....“ وہ بڑبڑاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”اسی لیے کٹ کا زاویہ بدل گیا ہے۔“
 ”ہاتھ صحیح نہیں پڑ رہا تو ہاتھ کو بدل کر دیکھیں۔“ میں نے اسے شپ دی۔
 اس نے میکانیکی انداز میں چھری کو دائیں ہاتھ سے بائیں میں منتقل کیا۔ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کی مدد سے عورت کی گردن کاٹنے والا ٹول دہرایا تو وہ ہوبہو ویسا کٹ لگا جیسے مقتول کی گردن پر پایا گیا تھا۔
 آئی او سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔

مقتول کی گردن چھری کے مہلک وار سے، کہاں سے کہاں تک متاثر ہوئی تھی؟“
 ”دیکھیں جناب.....“ وہ دونوں ہاتھوں کو اپنی گردن کے ساتھ مصروف کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”وہ خوف ناک کٹ.....“ اس نے اگھٹ شہادت کو اپنے دائیں کان کی لو کے نیچے، چہرے کی ہڈی کے پاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں سے شروع ہوا تھا اور.....“ پھر وہ اسی انگلی کو بائیں کندھے پر، گردن کی جڑ کے قریب لے گیا اور ایک جگہ ٹھہراتے ہوئے بولا۔ ”یہاں تک گیا تھا.....“
 ”اوہ.....!“ میں نے جبرت سے آنکھیں پھیلائی۔ ”یہ تو خاصا لمبا چوڑا اور خطرناک کٹ تھا اور.....“
 شہرگ بے چاری اس کٹ کے سینٹر میں آتی ہے۔ اسے تو کتنا ہی تھا۔“
 ”جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔“ اس نے سر کو اٹھاتی جھنجھکی دی۔ ”جیسی تو مقتول موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔“
 میں نے کہا۔ ”آئی او صاحب! میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے؟“
 ”کیسا تجربہ.....؟“
 ”آپ ساتھ دینے کا وعدہ کریں تو بتاؤں۔“
 ”ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔“
 اس مقصد کے لیے میں پوری تیاری کے ساتھ عدالت میں پہنچا تھا۔ میں نے اپنی فائل میں سے ایک تہ شدہ پوسٹر نکالا اور اس کی تین کھول ڈالیں۔ اس پوسٹر پر ایک عورت چٹ لیٹی گہری نیند سو رہی تھی۔ یعنی وہ کسی سولی ہوئی عورت کی قد آدم تصویر کا پوسٹر تھا۔ میں نے مذکورہ پوسٹر کو ایک میز پر پھیلا دیا پھر اپنے بریف کیس میں سے چمچ کاٹنے والی ایک چھری نکال کر آئی او کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”جناب! سمجھ لیں کہ یہ ایک عورت سوئی ہوئی ہے۔“
 میں نے پوسٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس کے پہلو میں کھڑے ہو کر اس کی گردن کاٹیں گے، بالکل ویسے ہی جیسے قاتل نے مقتول اشتیاق بیگ کی گردن کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔“
 وہ لحاتی ہچکچاہٹ کے بعد اس عجیب و غریب تجربے کے لیے راضی ہو گیا۔ سچ گہری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا کہ میں کون سا شعبہ دکھانے والا ہوں۔ وکیل استغاثہ کی حالت سب سے جدا تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ وہ بے چارہ تو سچ کے انہماک کے چشم نظر

سے جو تفصیلات بتائی ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں؟“
 ”آپ نے بالکل درست نقشہ کھینچا ہے۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مقتول اسی پوزیشن میں اپنے بیڈ پر مردہ پایا گیا تھا۔“
 ”پھر تو آپ اس بات سے بھی اتفاق کریں گے کہ قاتل نے جنوبی اور مشرقی سمت سے مقتول پر حملہ نہیں کیا تھا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
 ”بالکل اتفاق کروں گا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”جن دوستوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اوہر سے تو بیڈ دیواروں کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔“
 ”اور مشرقی جانب سے بھی اس نوعیت کا قاتلانہ حملہ ممکن نظر نہیں آتا.....؟“
 ”جی ہاں..... وہاں سے مقتول کی گردن اتنی دور پڑتی کہ اس پر چھری چلانا ناممکن تھا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر قاتل کو اتنی مشکل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے سیدھا سیدھا شمالی جانب سے حملہ کیا ہوگا جدھر سے مقتول اپنے بیڈ پر چڑھتا اور اترتا تھا۔“
 ”اللہ آپ کا بھلا کرے آئی او صاحب!“ میں نے بڑی رسالت سے کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے.....“
 وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات پوچھ کر کیا حاصل کرنے کی سعی میں لگا ہوں۔ میں نے اسے زیادہ دیر تک سوچوں میں گم نہیں رہنے دیا۔
 ”آئی او صاحب!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے مقتول کی کئی ہوئی گردن کا تو بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا؟“
 ”جی ہاں..... یہ تو بہت ضروری تھا۔“
 ”کٹ کا اینٹگل تو آپ کو یاد ہوگا؟“
 ”جی بالکل یاد ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔
 میں اس حوالے سے اپنے مختلف ذرائع استعمال کر کے بڑی تفصیلی اور مصدقہ معلومات حاصل کر چکا تھا گویا، مقتول کی کئی ہوئی گردن کا ہر زاویہ اور ہر منظر میرے تصور کی نگاہ میں محفوظ تھا اور یہی اس کیس کا وہ اہم رخ تھا جس سے ماہر انداز میں کھیلنے ہوئے مجھے اپنی منوکل اور اس کیس کی طرہ کو بے گناہ ثابت کرنا تھا۔
 ”بالکل یاد ہے۔“ میں نے پُرسوج انداز میں آئی او کے الفاظ دہرائے اور قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”آپ ذرا اس کٹ کی وضاحت کر دیں جس سے واضح ہو جائے کہ

انچارج

میاں، بیوی چوری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔
 خاوند: "جو شخص چوری کرتا ہے وہ بعد میں ضرور بچھتا ہے۔"
 بیوی رومانگ موڈ میں بولی: "اور آپ نے جو شادی سے پہلے میری نیندیں چرائی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"
 خاوند: "بکواس کرتو رہا ہوں، وہ بعد میں ضرور بچھتا ہے۔"
 مرسلہ: قاضی عرفان احمد عاجز،
 چو آسیدن شاہ

دیکھا تھا جبکہ حالات و واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ افضل خان کے بتائے ہوئے وقت پر ملزمہ مقتول کے ہنگامے کے اندر موجود تھی اور کم از کم پونے گیارہ بجے تک وہ ہنگامے ہی میں موجود تھی کیونکہ ٹھیک پونے گیارہ بجے ٹرکس اور ملزمہ کی فون پر بات ہوئی تھی۔
 منج نے ٹھیک کر افضل خان کی طرف دیکھا اور پوچھا: "تم نے غلط بیانی سے کیوں کام لیا۔ کیا تمہیں پتا ہے، اس دروغ گوئی پر تمہارے خلاف تعزیری کارروائی بھی ہو سکتی ہے؟"
 منجھے معاف کر دین جناب۔" وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہو سکتا ہے، اس دن میری گھڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ ساڑھے دس بجے ملزمہ ہنگامے کے اندر موجود تھی اور پونے گیارہ بجے اس کی ٹرکس سے فون پر بات بھی ہوئی تھی تو میں ایسا بیان نہ دیتا۔"
 "بیگ صاحب! پلیز پروسیز۔" منج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"افضل خان! میں اپنے کام سے لگ گیا۔" تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزمہ نے تمہیں بات کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا تھا اور نہ تم اس سے بہت کچھ کہنے والے تھے۔"
 "جی، میں نے یہی کہا ہے۔" وہ قدرے سنہلے ہوئے بولا۔ "میں اس کی گھبراہٹ اور پریشانی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔"

میرے سوال کے جواب میں وہ ترست بولا۔ "میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کہا۔"
 "پھر تم نے کیا بتایا تھا؟" میں نے بہت مصومیت سے پوچھا۔
 "میں نے تو کہا تھا کہ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔"
 "فکس ساڑھے دس؟" میں نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔
 "جی بالکل۔" اس نے جواب دیا۔
 "کیا تم وقت کا درست اندازہ لگانے کے ماہر ہو یا تم نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا جو اتنے وثوق سے بتا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔
 "میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔" اس نے بتایا۔
 "اوکے..... تمہاری گھڑی کا وقت تو درست ہے نا؟"
 "اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 میں نے اپنی فائلوں میں سے چند کاغذات نکال کر منج کی جانب بڑھا دیے۔ منج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔

"جناب عالی! یہ وقوعہ کے روز یعنی بیس جنوری کا مقتول کے ٹیلی فون کا کال ریکارڈ ہے۔ اس ریکارڈ کے مطابق مذکورہ نمبر پر دن کے پہلے صبح میں، پہلے ساڑھے نو بجے اور پھر پونے گیارہ بجے کال آئی تھی۔ ان دونوں کالوں کی تاریخ 21 جنوری پر وضاحت کی جا چکی ہے لیکن میں ایک مرتبہ یہ مختصر ذکر کروں گا....." منج نے ایک مرتبہ میری سانس لی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 "ساڑھے نو بجے کسی کا فون آتا ہے۔ مقتول کی یہ فون انٹینڈ کرتی ہے اور ملزمہ کو بتاتی ہے کہ کسی میڈیکل اسٹور والے کا فون ہے۔ اس کے بعد ٹرکس ہنگامے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ پھر دس بیٹھتا ہے یعنی پونے گیارہ بجے اس کی ٹرکس، ٹرکس کی کال ریسیو کرتی ہے اور ٹرکس اسے بتاتی ہے کہ وہ دس پندرہ منٹ میں واپس آ جائے گی۔ اگر وہ مزید چند منٹ لیٹ ہو جائے تو ملزمہ اپنے وقت پر یعنی ٹھیک پونے گیارہ بجے چلی جائے۔ ملزمہ نے اپنی مالکن کی ہدایت پر اس وقت کو پونے گیارہ بجے کر پانچ منٹ پر بنگا چھوڑا اور بیٹھ کر باہر سے کٹری لگا کر فیاض شیخ کے گھر کی جانب روانہ ہوئی لیکن....." میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں وقف کیا پھر استغاثہ کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
 "لیکن..... افضل خان کا دعویٰ ہے کہ اس نے ملزمہ کو ٹھیک ساڑھے دس بجے ہنگامے سے گھبرائے ہوئے انداز میں کٹری لگا کر باہر سے کٹری لگاتے اور وہاں سے فرار ہوتے

تھی جیسے..... جیسے....."
 "کیا جیسے؟" وکیل استغاثہ نے لقمہ دیا۔ "تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر یہ ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہری تو کوئی اسے پکڑ لے گا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔"
 "مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے منج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر فاتحانہ انداز میں میری جانب نکلنے لگا۔

میں وکیل استغاثہ کے اس انداز کی تہ میں چھپے ہوئے فاتحانہ جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ گواہ کی زبان سے یہ کہلوا کر بہت خوش تھا کہ وقوعہ کے روز جب ملزمہ مقتول کے ہنگامے سے رخصت ہوئی تو لے کر گھبرائی ہوئی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اسے پکڑ لے یعنی..... وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے کر ہنگامے سے نکلی تھی جس کے نتیجے میں گرفتاری کا اندیشہ ہو۔

میں اپنی باری پر وٹس باکس کے قریب آ گیا پھر استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کیا۔
 "افضل خان! تم نے جھوٹی گواہی دینے کے لیے کتنی رقم وصول کی ہے؟"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں....." اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔
 "آئی بیگنیشن یور آرتھ؟" وکیل استغاثہ نے فوراً ٹانگ اڑا دی۔ "میرے فاضل دوست، استغاثہ کے معزز گواہ پر الزام لگا رہے ہیں۔ دس اڑناٹ فیئر۔"

منج نے مجھے ہدایت کی کہ میں متعلقہ امور کو مد نظر رکھتے ہوئے گواہ سے سوال کروں۔ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے سر کو اٹھائی جنبش دی اور گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"افضل خان! تھوڑی دیر پہلے تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز جب تم نے گھبرائے ہوئے انداز میں ملزمہ کو مقتول کے ہنگامے سے نکلنے دیکھا اس وقت دوپہر کے بارہ بجے تھے۔"
 یہ بات میں نے گواہ کو چکر دینے کے لیے کہی تھی۔ میں نے افضل خان کے حوالے سے کافی ہوم ورک کر رکھا تھا اور اسے جکڑنے کے لیے ایک نادیہ جال بھی اس کے اوپر پھینک چکا تھا۔

کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے انگلی سے اکیوڈا باکس میں کھڑی میری ٹوکھل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
 "جی جی..... بالکل سبھی تھی۔" گواہ نے جواب دیا۔
 "ڈراما سوچ کر بتاؤ، یہ کتنے بچے کا واقعہ ہے؟" وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

"ساڑھے دس بجے کا۔" گواہ نے بڑے اعتماد سے بتایا۔
 مجھے یہ سمجھ لینے میں کوئی دقت..... محسوس نہیں ہوئی کہ گواہ ایک رٹا ہوا بیان دے رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتول اشتیاق بیگ کی موت دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی گواہ کے ساڑھے دس بجے والے بیان سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ملزمہ اپنے مالک کو قتل کرنے کے بعد ہنگامے سے نکلی تھی۔

"تم نے ملزمہ کے انداز میں کوئی خاص بات نوٹ کی؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
 "جی....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "اس نے باہر آ کر گیٹ کو بند کیا اور کٹری لگا دی۔"
 "یعنی گیٹ کو باہر سے کٹری لگا دی؟" وکیل استغاثہ نے تصدیق طلب نظر سے افضل خان کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل..... باہر سے کٹری لگا دی۔" گواہ نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔ "مجھے ان کی اس نزامت پر حیرت ہوئی تھی۔"
 "کیا تم نے اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ گیٹ کو باہر سے کٹری کیوں لگا کر جا رہی ہے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"میرے دل میں تو آیا تھا کہ اس سے پوچھوں لیکن اس نے اتنا موقع ہی نہیں دیا....."
 "موقع نہیں دیا..... کیا مطلب؟" وکیل استغاثہ نے سنسنی خیز انداز میں استفسار کیا۔

"جناب! اس اللہ کی بندی نے جلدی سے گیٹ بند کر کے باہر سے کٹری لگائی اور اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا اور کوئی سوال کرتا، یہ آنا فانا میری نگاہ سے غائب ہو گئی....."

"نگاہ سے غائب ہو گئی....." وکیل استغاثہ اس کی بات کھل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملزمہ نے کوئی جادوئی عمل کیا تھا؟"

"نہن..... نہیں جناب۔" وہ جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا مطلب یہ تھا کہ یہ تقریباً بھاگنے والے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی

پانچ چھ منٹ لیٹ آئی تھی۔ میں نے اسے دس منٹ لیٹ چھوڑا۔ یہ ایک بیج کر دس منٹ پر میرے گھر سے نکلی تھی۔ "ابنہ جی! ایک نہایت ہی اہم سوال کر رہا ہوں۔ ذرا سوچ کر جواب دیجیے گا۔" میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہر تن گوش ہو گئی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "دو تہہ کے روز یعنی تیس جنوری کو ملازمہ نے دوپہر گیارہ دس سے ایک دس تک آپ کے گھر میں کام کیا۔ کیا آپ نے اس کے انداز میں کوئی خاص تبدیلی محسوس کی؟" "کس قسم کی تبدیلی؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "مثلاً کسی نوعیت کی بے چینی، اضطراب، پریشانی، بوکھلاہٹ یا گھبراہٹ.....؟"

"نہیں، میں نے اس میں ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی۔" اس نے پُر دُوق انداز میں کہا۔ "اس نے معمول کے مطابق کام کیا اور چلی گئی۔"

"معزز عدالت کے سامنے حقیقت بیانی کا بہت شکر ہے۔" میں نے امینہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر جج کی جانب رخ پھیر کر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" اس کے ساتھ ہی عدالت کا معزز وقت ختم ہو گیا۔ بیج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!"

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور ونس باکس میں اس کیس کی سب سے اہم گواہ یعنی مدعی نرگس کھڑی تھی۔ گزشتہ تیس جنوری کو نرگس کے شوہر اشتیاق بیگ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا لیکن نرگس کے بناؤ سنگار اور پہناوے سے لگتا نہیں تھا کہ وہ بیوہ ہو۔

ونسل استغاثہ اپنا "کام" مکمل کر چکا تو میں جرح کے لیے نرگس والے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جما کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"نرگس صاحب! مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ کچھ عرصہ قبل آپ کے شوہر کو قتل کر دیا گیا۔ میں آپ کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہوں مگر یہ کارروائی بھی ضروری ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ "جب یہ کیس عدالت میں لگا ہوا ہے تو پھر یہ سب تو ہونا ہے۔ آپ اپنا کام شروع کریں۔"

"اس نے کام چھوڑا نہیں بلکہ یہ قتل کے کیس میں گرفتار ہو گئی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اس لیے یہ میرے گھر میں کام کرنے نہیں آسکی۔"

"کیا آپ کو لگتا ہے کہ اس بے چاری نے اپنے مالک اشتیاق بیگ کو قتل کیا ہوگا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ تو اللہ کو پتا ہوگا یا پھر آپ جیسے قانون دانوں کو۔" وہ قدرے بیزار سی بولی۔ "میں کیا جانوں!"

"اوکے....." میں نے مصلحت آمیز انداز میں گردن ہلائی۔ "آپ اتنا تو جانتی ہوں گی کہ ملازمہ کس کردار کی مالک ہے؟" "میں آپ کا سوال سمجھ نہیں پاتی۔" اس نے ابھمن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، یہ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں کیسی ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں چرخی چکاری کی عادت تو نہیں ہے؟"

"جی بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولی۔ "مجھے مرکز اپنی قبر میں جانا ہے اور خدا کو حساب دینا ہے اس لیے میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ اس عورت نے میرے گھر سے بھی کوئی معمولی سی چیز بھی نہیں چرائی۔ یہ اپنے کام سے کام رکھنے والی باقی ہے اور اپنا کام جانا مادہ کر بڑی محنت سے کرتی ہے۔"

"اس کے باوجود بھی اسے آپ کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا پڑتی ہے۔" میں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ڈانٹ ڈپٹ بہت ضروری ہے۔ اس سے انسان کا دماغ درست رہتا ہے۔"

"میری معلومات کے مطابق، ملازمہ روزانہ دوپہر گیارہ بجے سے ایک بجے تک آپ کے گھر کام کرنے آیا کرتی تھی۔" میں نے اصل نکتے کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"کیا دو تہہ کے روز بھی یہ اپنے وقت پر ہی آئی تھی؟" "جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "یہ عموماً گیارہ بج کر پانچ منٹ پر آ جایا کرتی تھی لیکن اس روز یہ تقریباً پانچ چھ منٹ لیٹ آئی تھی لہذا میں نے اسے چھٹی بھی لیٹ ہی دی تھی۔"

"اوہ....." میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تو دو تہہ کے روز آپ نے اسے دیر سے چھوڑا تھا؟"

"زیادہ دیر سے نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "یہ

نظروں سے استغاثہ کے گواہ افضل خان کو دیکھ رہی تھی چہ میگوئیاں بھی کر رہی تھی۔

بیج نے "آرڈر..... آرڈر" کی صدا بلند کر کے عدالت کے کمرے کے مخصوص سکون کو قائم کیا اور خاصے سخت الفاظ میں گواہ افضل خان کو سرزنش کی۔ اس کے بعد وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیگ صاحب! آپ کو گواہ سے اور تو کچھ نہیں پوچھنا؟"

"نہیں جناب عالی!" میں نے نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ "استغاثہ کے معزز گواہ کی بدتمیزی اور دروغ کوئی عدالت کے ریکارڈ پر آچکی ہے۔ مجھے افضل خان سے مزید کچھ نہیں پوچھنا البتہ..... عدالت سے میری ایک چھوٹی سی درخواست ہے۔"

"کیسی درخواست؟" بیج نے مجھ سے استفسار کیا۔ "فیاض شیخ کی بیوی امینہ اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہے۔" میں نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ "میں نے امینہ کو صفائی کے گواہ کی حیثیت سے بلا یا ہے۔ اس کی گواہی ہو جائے تو میری موکل کی بے گناہی مزید ثابت ہو جائے گی۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے امینہ بیگم کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" بیج نے اثبات میں گردن ہلائے ہوئے کہا۔

امینہ، فیاض شیخ کی بیوی بہت موٹی اور غصہ ور عورت تھی۔ فیاض شیخ بھی اس کے سامنے بھیجا بلا ہی نظر آتا تھا۔ ملازمہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی تھی اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتی تھی۔ میرے شاریات کے مطابق امینہ کی گواہی میری موکل کے لیے کافی سود مند ثابت ہونے والی تھی۔

امینہ نے بیج بولنے کا حلق اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کر دیا تو میں مختصری جرح کے لیے ونس باکس کے قریب چلا گیا۔

"امینہ جی.....!" میں نے انگلی سے اکیوژڈ باکس میں موجود اس کیس کی ملازمہ وحیدہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟"

"جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "کچھ عرصہ پہلے یہ میرے گھر میں کام کر چکی ہے۔"

"پھر اس نے آپ کے گھر کا کام کیوں چھوڑ دیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم جسے میری غلط فہمی کہہ رہے ہو نا، وہ ایک سفاک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے نصف درجن گواہ بھی ہیں جن میں جمہاری گلی کے کونے پر واقع جنرل اسٹور کا مالک ظہیر الدین اور اس کے برابر میں موجود پان فروش شاکر بھی شامل ہے..... آئی سمجھ..... یا پہلی بھی چلی تھی؟"

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر کھٹکے لگا۔ بیج نے مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! یہ غلط فہمی والا کیا معاملہ ہے؟"

"جناب عالی!" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر بڑی کساری آواز میں بولنا شروع کیا۔ "استغاثہ کا معزز گواہ افضل خان کافی عرصے سے ملازمہ پر "نگاہ" رکھے ہوئے تھا اور میری معلومات کے مطابق یہ کوئی اچھی نگاہ نہیں تھی۔ میری معلومات کی تصدیق کے لیے جنرل اسٹور کے مالک ظہیر الدین اور پان فروش شاکر کو عدالت میں بلا یا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں افراد اس شرمناک واقعے کے معنی شاہد ہیں جب نصف درجن افراد نے افضل خان کی درگت بنائی تھی اور وہ بھی بیج چوراہے پر....." میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے توقف کیا پھر اپنی بات کو دراز کرتے ہوئے مزید کہا۔

"جیسا کہ میں نے بتایا، گواہ ملازمہ پر کافی عرصے سے بری نظر رکھے ہوئے تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا، یہ ملازمہ سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسی ہی ایک نازیبا کوشش گواہ کو بہت مہنگی پڑ گئی۔ جب گلی کے کونے پر گواہ نے ملازمہ کو زبردستی روکنے کی کوشش کی۔ ملازمہ نے اس کے منہ پر زانے دار طمانچہ رسید کیا تو اس پاس موجود افراد ان کی جانب متوجہ ہو گئے پھر اس سرعام بدتمیزی پر "عوام" نے افضل خان کی خوب خاطر تواضع کر ڈالی تھی اور اب....."

میں نے لمحاتی توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

"اور اب..... یعنی وقوع کے روز جب افضل خان نے دیکھا کہ ملازمہ کو اشتیاق بیگ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے تو یہ اپنی اس دن والی بے عزتی کا ملازمہ سے بدلہ لینے کے لیے اس نوعیت کا بیان دینے کے لیے تیار ہو گیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وقوع کے روز ملازمہ کچھ اس قدر ٹھہرائے ہوئے انداز میں مقبول کے ہنگلے سے رخصت ہوئی تھی جیسے وہ اشتیاق بیگ کو قتل کر کے فرار ہو رہی ہو۔"

میں خاموش ہوا تو عدالت کے کمرے میں موجود افراد کی سرگوشیاں ایک مخصوص نوعیت کی بھنبھناہٹ کی صورت میں ابھرنے لگیں۔ لوگوں کی اکثریت ناپسندیدہ

”میں جنوری کو کراچی میں سن رائز (طلوع آفتاب) صبح سات بج کر سترہ منٹ پر تھا اور سن سیٹ (غروب آفتاب) شام چھ بج کر چھ منٹ پر تھا۔“

”مگر..... میں کیا کروں.....“ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں.....؟“

”اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے آپ سے ایک نہایت ہی اہم سوال کرنا ہے۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”کون سا اہم سوال؟“ اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمودار ہوئی۔

”میں جنوری کی صبح کراچی کے مشرقی افق پر صبح سات بج کر سترہ منٹ پر سورج طلوع ہوتا ہے اور ٹھیک دو گھنٹے تیرہ منٹ بعد یعنی ساڑھے نو بجے فرحان صاحب آپ کو فون کر کے ٹیبلٹ لے جانے کے لیے کہتے ہیں اور آپ نے ابھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے نو بج کر چالیس منٹ پر وہ دوا حاصل کر لی تھی یعنی پونے دس بجے سے بھی پہلے.....“ میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک نگاہ ڈالی پھر استفسار کی گواہ سے استفسار کیا۔

”نرس صاحب! آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کراچی کی ہسٹری میں یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیکل اسٹورز گیارہ بجے یا اس سے پہلے کچھ بعد میں کھلتے ہیں۔ کیا فرحان صاحب کا میڈیکل اسٹور کراچی کی حدود سے باہر ہے یا وہ میں جنوری کو علی الصبح اپنا اسٹور کھول کر کراچی کی ہسٹری میں اپنا نام ذرا مختلف انداز میں لکھوانے کے متمنی تھے.....؟“

”وہ..... وہ جی.....“ وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

”وہ جی اور یہ جی سے کام نہیں چلے گا۔“ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ ”آپ جو بھی جواب دیں گی اس کی تصدیق کے لیے فرحان صاحب کو عدالت میں بلایا جائے گا۔“

وہ بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ دراصل، فرحان کا اسٹور اس وقت بند تھا۔ اس نے اپنے گھر سے مجھے فون کیا تھا.....“

اس کی آنکھیں اور چہرہ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس پر چڑھائی کر دی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے وہ میڈیکل اسٹور فرحان کے میڈیکل اسٹور سے نہیں بلکہ اس کے گھر سے جا کر حاصل کیا تھا؟“

”جی..... جی.....“ وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

دھمکی آمیز الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پھر معزز گواہ کس چیز سے ہراساں ہو رہی ہیں۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ مجھے اپنی جرح مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔“

جج نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بی بی! آپ کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا ہوگا جس نے وقوعہ کے روز آپ کو فون کیا تھا۔ ہو سکتا ہے تمہارے بیان کی تصدیق کے لیے اسے عدالت میں طلب کرنے کی ضرورت پیش آجائے۔“

”جی..... فرحان! وہ جلدی سے بولی۔ ”اس کا نام فرحان ہے۔“

”ہیک صاحب! پلیز پروسیڈ۔“ جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نرس صاحب! میری معلومات اور محکمہ ٹیلی فون ریکارڈ کے مطابق صبح ساڑھے نو بجے آپ کے گھر کے فون پر کسی کی کال آئی تھی۔ آپ نے بتایا کہ اس میڈیکل اسٹور والے فرحان نے میں جنوری یعنی وقوعہ کے روز ٹھیک ساڑھے نو بجے آپ کو اس مخصوص ٹیبلٹ کے بارے میں فون کر کے اطلاع دی تھی۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”میں یاد تو نہیں کہہ رہا؟“

”میں آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی لہجے میں بولی۔

”آپ اپنی گاڑی لے کر بیٹکے سے نکلیں۔ سب سے پہلے آپ نے وہ میڈیکل اسٹور حاصل کیا پھر اپنے دوسرے کام نمٹانے چلی گئیں۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟“

”جی..... جی..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے بیٹکے سے واکنگ ڈسٹینس پر ہے۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے یہ قول دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ..... گاڑی میں تو اور بھی کم وقت لگا ہوگا.....؟“

”جی۔ میں پانچ چھ منٹ میں وہاں پہنچ گئی تھی۔“

”یعنی زیادہ سے زیادہ نو بج کر چالیس منٹ پر آپ نے وہ میڈیکل اسٹور حاصل کر لی تھی؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں سوال کیا۔

”جی، بالکل.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”نرس صاحب! ذرا سوچ کر بتائیں.....“ میں نے

ایک ایک لفظ پر زور دے کر ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”جس شخص نے وقوعہ کے روز آپ کو کسی مخصوص ٹیبلٹ کے بارے میں فون کیا تھا، اس کا اسٹور بھی تاریخ نام آبادی میں ہے۔“

”جی!“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”نارتنہ نام آبادی کا قاصد صبح و عریض علاقہ ہے۔“

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا مذکورہ میڈیکل اسٹور آپ کے گھر کے نزدیک ہی ہے یا کچھ فاصلے پر؟“

”نہ زیادہ دور نہ زیادہ نزدیک۔“ اس نے جواب دیا۔

”دس سے پندرہ منٹ کا فاصلہ ہوگا۔“

”دس سے پندرہ منٹ۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”پیدل یا کار میں؟“

”جی پیدل..... مطلب واکنگ ڈسٹینس ہے۔“ اس نے بتایا۔

”اد کے..... مگر آپ تو وقوعہ کے روز اپنی گاڑی لے کر گھر سے نکلی تھیں؟“

”جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ایک دو کام اور بھی تھے لہذا گاڑی ضروری تھی۔“

”وقوعہ کے روز آپ نے پہلے وہ اہم دوا حاصل کی تھی یا پہلے وہ دوسرے ایک دو کام نمٹائے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ظاہر ہے، میں نے پہلے وہ دوا حاصل کی تھی۔“ اس نے بڑی رمان سے جواب دیا۔ ”دوسرے کام تو کسی وقت بھی کیے جاسکتے تھے۔“

”نرس صاحب! کیا آپ معزز عدالت کو اس میڈیکل اسٹور والے شخص کا نام بتانا پسند کریں گی جس نے وقوعہ کے روز فون کر کے آپ کو اس دوا کی دستیابی کی اطلاع دی تھی۔“

”کیوں.....“ وہ بد کے ہوئے انداز میں بولی۔

”اس کے نام کی کیا ضرورت ہے؟“

”آئیڈینٹیفیکیشن پور آؤٹ۔“ وکیل استفسار نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”ڈیفنس استفسار کی معزز گواہ کو خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”اٹ ازنات فیئر“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! میری صورت ایسی خوف ناک ہے، نہ میں نے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ اٹھا رکھا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک کوئی جارحانہ

”نرس صاحب! کیا یہ درست ہے کہ وقوعہ کے روز یعنی میں جنوری کی صبح آپ کو اچانک گھر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ ایک فون آیا تھا اور.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جی، یہ درست ہے۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور والے کا فون تھا۔ ڈاکٹر نے میرے شوہر کو جو ادویات لکھ کر دی تھیں ان میں ایک گولی اکثر مارکیٹ سے شارت رہتی تھی اور اسے تلاش کرنے میں مجھے کافی دشواری ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس میڈیکل اسٹور والے سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی اس کے اسٹور پر یہ گولی آئے تو وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔“

”تو یہ ٹیلی فونک اطلاع اسی سلسلے میں تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی..... جی ہاں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے اپنی فائفوں کے پاس رکھی ایک کتاب کو اٹھا کر نرس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ فیض احمد فیض صاحب کی شاعری کا مجموعہ ہے۔ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟“

اس نے عجیب سی دلچسپی سے مجھے دیکھا اور لمحاتی تذبذب کے بعد وہ کتاب میرے ہاتھ سے لے کر سرسری انداز میں اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر انسان نے ہر کتاب پڑھ رکھی ہو۔“ میں نے مذکورہ کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”اگر میری معلومات غلط نہیں ہیں تو آپ کی رہائش تاریخ نام آباد کے علاقے میں ہے۔ آپ دو سو گز کے ایک عالی شان بیٹکے میں رہتی ہیں جو دو بیڈروم ایک ڈرائنگ روم، ایک ٹی وی لائونج اور خوب صورت لان پر مشتمل ہے۔“

”آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔“ وہ میرے پھیلائے ہوئے جال میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔ ”یوں محسوس ہوتا ہے آپ نے میرے بیٹکے کا وزٹ کر رکھا ہو۔“

”ابھی تک تو نہیں کیا.....“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ پیشی سے پہلے یہ نیک کام بھی کرنا پڑے گا۔ اپنی ہاؤ.....“ میں نے لمحاتی

”آپ اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟“
 ”جیسے دوسری اتنی بڑی حقیقت کو استغاثہ نے نظر انداز کر دیا ہے۔“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا..... ہم..... میرا مطلب ہے..... آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ وہ جلدی سے سنہلنے ہوئے بولی۔

”میرا مطلب صرف اتنا سا ہے کہ آپ کی الماری پر مضمون کے فنکار پر تش نہیں پائے گئے لیکن استغاثہ کو یقین ہے کہ نقدی اور زیورات اسی نے چرائے ہیں۔ دوسری جانب چھری پر مضمون کے فنکار پر تش پائے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ تل میری مٹوکل نے نہیں کیا.....“
 ”پتا نہیں آپ کس قسم کی ابھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ بیزارگی سے بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”سب سمجھ میں آجائے گا جب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ آج عدالت میری مٹوکل کو بے گناہ مان کر رہا کر دے گی۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور زیر لب مسکراتے ہوئے یوں اضافہ کیا۔ ”لا میں، یہ کتاب مجھے دے دیں۔ اس کا کام ختم ہو چکا.....“

اس کے چہرے پر انجھنوں کا جال ما بھلا گیا۔ شعری مجموعے کو میری جانب بڑھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”اس کتاب کا کیا کام تھا جو پورا ہو گیا اور عدالت کس بنا پر مضمون کو بری کر دے گی؟“

”نرگس صاحبہ! میں آپ کے دونوں سوالوں کا جواب دوں گا۔“ میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن دوسرے سوال کا جواب پہلے اور پہلے سوال کا جواب بعد میں۔ آپ کو میری اس بے ترتیبی پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”جی نہیں، وہ سپاٹ آواز میں بولی۔
 میں نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا پھر کہا۔ ”عدالت آج میری مٹوکل کو اس لیے بری کرے گی کہ وہ دا میں ہاتھ سے کام کرنے کی عادی یعنی رائٹ ہینڈ ہے جبکہ آپ کے شوہر کا قاتل بائیں ہاتھ سے کام کرنے کا عادی یعنی لیفٹ ہینڈ ہے اور..... اس امر کی تصدیق ایک پچھلی پیشی پر اس کیس کے انکوائری آفیسر نے بھی کی ہے۔“

”اوہ.....“ وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی پھر مضطرب نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
 ”تل اس کے کہ وہ کیلی استغاثہ ہمارے بیچ کود پڑتا،

جرت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ نے میرے گھر کا سروے کر رکھا ہو۔“
 ”وکیل کو اس نوعیت کی ساری معلومات رکھنا پڑتی ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور میرے خیال کے مطابق، مقتول اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹ کر آپ کے بیڈروم کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا تھا؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ دونوں انداز میں بولی۔
 ”استغاثہ کے مطابق مضمون نے پہلے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے۔ اس کے بعد آپ کے شوہر کو تل کے بیچنے سے روانہ ہو گئی۔“ میں نے جرح کے سہ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا کہتی ہیں؟“
 ”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ یہ دونوں کام مضمون نے میرے سامنے تھوڑی کیے ہیں۔“ وہ ناگواری سے بولی۔
 ”پر..... میں جو کچھ لکھا ہے، وہی درست ہے۔“

”استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق پہلے مضمون نے نقدی اور زیورات چرائے پھر خود کو دیکھ لیے جانے کے خوف سے اس نے آپ کے شوہر کو تل کر دیا لیکن آپ اس امر کی تصدیق کر چکی ہیں کہ آپ کا شوہر اپنے بیڈ پر لیٹے لیٹے دوسرے بیڈروم میں رہی آپ کی الماری کو نہیں دیکھ سکتا لہذا۔ نرگس خال، اگر مضمون نے آپ کی الماری میں سے نقدی اور زیورات چرائے ہیں تو یہ تو تل آپ کے شوہر کے علم میں آئی نہیں سکتا اور پھر.....“ لہجائی توقف کر کے میں نے نرگس کے چہرے پر ابھرنے والے پریشانی کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔

”اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کہتی ہے کہ آپ کے شوہر کی موت نیند کے دوران میں ہوئی ہے۔ یعنی اگر مضمون نے چوری کی بھی تھی تو آپ کا شوہر کسی بھی قیمت پر اسے دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ ناشتے والی دوا کے طفیل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ اثبات میں نرگس بلا تے ہوئے بولی۔ ”اشتیاق کی ایک دوا ایسی ہے جس سے نیند آتی ہے۔“

”گو یا استغاثہ کا بیان درست نہیں۔“ میں نے سوالیہ نگر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر مضمون نے نقدی اور زیورات چرائے لیے تھے تو اسے آپ کے شوہر کو تل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی؟“

”مگر اس چھری پر مضمون کی انگلیوں کے نشانات ملے۔“ وہ ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

لیے کہہ دیا ہے۔“

”اوہ..... اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کے اس اجانک یاد آجانے والے ضروری کام کی تفصیلات بھی طلب کر لی جائیں گی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میری مٹوکل اور اس کیس کی مضمون وحیدہ کے بیان کے مطابق آڈیٹل یعنی گوشت کاٹنے والی وہ تیز دھار چھری جس سے آپ کے شوہر کو زخم کیا گیا، چند روز پہلے وہ چھری جن میں سے غائب ہو گئی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔“ وہ نا پسندیدہ نظر سے مضمون کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“
 ”او کے..... جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی یہ عدالت لگی ہوئی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”اس عدالت میں مضمون پر دو کیس چل رہے ہیں۔ نمبروں، اس نے آپ کے شوہر اشتیاق بیگ کو تل کیا ہے۔ نمبر نو، اس نے آپ کی الماری میں سے دس ہزار نقدی اور لگ بھگ چالیس ہزار کے زیورات چرائے ہیں۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟“

”جی.....“ اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
 ”میں آپ کے بیچنے کے دو بیڈروم کی وقوع پذیری بیان کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگر میں کہیں غلطی پر ہوا تو نوک دیجیے گا اور ہاں۔“ میں نے ایک مرتبہ پوچھ کر چوٹی میز پر سے فیض احمد فیض کا شعری مجموعہ اٹھا لیا پھر اسے نرگس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب تک میں اپنی بات مکمل کرتا ہوں اس کتاب کو آپ پکڑے رکھیں اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اب آپ سے وہ سوال نہیں کروں گا جو پہلے دو بار کر چکا ہوں۔“
 لہجائی تذبذب کے بعد اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے یوں لٹا شروع کیا۔

”دونوں بیڈروم بیچنے کے پچھلے حصے میں بنے ہوئے ہیں۔ دونوں کا ساکر بھی ایک جیسا ہی ہے یعنی بارہ بائی بارہ فٹ اور دونوں کے داخلی دروازے مغربی سمت میں ہیں۔“
 ”بالکل درست۔“ اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔
 میں نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”مقتول کا بیڈ اور وہ الماری جس میں سے نقدی اور زیورات چرائے گئے، یہ دونوں چیزیں دو مختلف بیڈروم میں ہیں۔ مقتول کا بیڈ اپنے کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ اور آپ کی الماری آپ کے بیڈروم کی شمالی دیوار کے ساتھ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ

”یہ ایمر جنسی عقل سے ماورا ہے۔“ میں نے سخت الفاظ میں کہا۔ ”خیر..... فرحان کو تو عدالت میں طلب کرنا ناگزیر ہو ہی چکا ہے کیونکہ تھوڑی دیر پہلے آپ بتا چکی ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ نے وہ میڈلین فرحان کے میڈیکل اسٹور سے حاصل کی تھی۔ اب تو مجھے آپ کی اس بات پر بھی یقین نہیں رہا کہ یہ کتاب.....“

میں دانستہ اپنی بات نامکمل چھوڑ کر فیض صاحب کے شعری مجموعے کی جانب بڑھا اور ایک مرتبہ پھر وہ کتاب نرگس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

”اچھی طرح سوچ کر بتائیں، یہ کتاب آپ نے پڑھ رکھی ہے یا نہیں؟“

”نہیں..... بالکل نہیں۔“ وہ پوری قطعیت سے بولی۔
 ”او کے۔“ میں نے ایک بار پھر وہ کتاب اس سے واپس لے کر چوٹی میز پر رکھ دی پھر استغاثہ کی سب سے اہم گواہ کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”نرگس صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ نے دس بج کر پینتالیس منٹ پر یعنی پونے گیارہ بجے..... اپنے بیچنے پر فون کر کے مضمون سے کہا تھا کہ آپ گھر کے قریب ہی کہیں موجود ہیں اور دس پندرہ منٹ بعد آپ پہنچ رہی ہیں؟“

”جی..... میں نے یہی کہا تھا۔“ اس نے ذرا سنبھل کر جواب دیا۔

”اور مضمون سے آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے وقت پر یعنی ٹھیک گیارہ بجے پھنسی کر کے چلی جائے اور.....“
 ”نہیں!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ میری واپسی تک بیچنے پر ہی رکے۔ میں دس پندرہ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مضمون نے لفظ بیانی سے کام لیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”جی ظاہر ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔
 ”پونے گیارہ بجے آپ اپنے بیچنے سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھیں۔“ میں نے چہیتے ہوئے انداز میں سوال کیا لیکن آپ کی واپسی ساڑھے بارہ بجے ہوتی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے یہ پونے دو گھنٹے کہاں گزارے تھے؟“

”جب میں نے مضمون کو فون کیا اس وقت میں واقعی گھر سے دس پندرہ منٹ کے فاصلے پر ایک جگہ پر تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن پھر اچانک مجھے ایک کام یاد آ گیا۔ میں مطمئن تھی کہ میں نے مضمون کو گھر پر رکنے کے



راہِ عشق

سید احتشام

کسی کو چاہنا اور چاہے جانا اگرچہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں بلکہ یہ تو فطرت کا تقاضا ہے لیکن ... چاہتوں کا ثبوت دینا گویا اپنی تمام عمر احساسات و جذبات کو گوی رکھ دینے کے مترادف ہوتا ہے مگر یہ مشکل کام اس سچے عاشق نے کر دکھایا تھا جس کی منزل کسی اور کے رستوں میں گم ہو گئی تھی۔

محبت کا بھرم رکھنے والے ایک دلیری کا دلچسپ کارنامہ

مجھے زندگی میں پہلی بار جیوری کا ایک رکن بننے کا موقع ملا تھا۔ قتل کے اس کیس میں میرے علاوہ گیارہ افراد ارکان جیوری کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن دس روز گزر جانے کے باوجود ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کیونکہ جیوری کے گیارہ ارکان ملزم کو سزائے موت دینے کے حامی تھے جبکہ میں فرد واحد ملزم کو بری کرنے کے حق میں تھا۔ دراصل مجھے شروع ہی سے اس کی بے گناہی کا یقین تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ واقعات وہ

ہے۔ فرید غوری وقوعہ کے روز پولیس کی آمد کے وقت جاہل واردات پر موجود پایا گیا ہے اور اس کی موجودگی کے حوالے سے زکس کچھ بتانے پر تیار نہیں لہذا....." میں نے لچاتی توقف کر کے ایک طویل گہری سانس لی پھر سلسلہ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لہذا معزز عدالت سے میری پُر زور استدعا ہے کہ زکس اور فرید غوری کو شامل تفتیش کرتے ہوئے استغاثہ کو اپنا چالان پیش کرنے کی ہدایت کی جائے۔ یہ تو واضح ہو چکا کہ اشتیاق بیگ کو میری موکل وحیدہ نے قتل نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے، زکس اور فرید غوری پر اگر پولیس تھوڑی سی بھی "محنت" کرے تو ان کی یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی..... وحش آل یور آنرا!"

میرے متاثر کن دلائل اور منطقی انکشافات کی روشنی میں عدالت نے زکس اور فرید غوری کو فی الفور شامل تفتیش کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری موکل وحیدہ کو باعزت بری کر دیا۔ میں اس کی بے گناہی ثابت کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

زکس اور فرید غوری جب پولیس کسٹڈی میں اپنے اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے پر الزام لگانا شروع کر دیے تاہم پولیس نے اپنے مخصوص ہتھکنڈے آزما کر انہیں سچ بولنے پر "راضی" کر ہی لیا چنانچہ فرید غوری کو اقبال جرم کرنا ہی پڑا۔

واقعات کے مطابق زکس اور فرید غوری میں ایک خاص قسم کی پھڑکی رہی تھی اور اشتیاق بیگ کی تیارانی کے بعد تو ان کے معاملات کافی حد تک آگے بڑھ چکے تھے لہذا اپنے شوہر کو ٹھکانے لگانے کے لیے زکس کی فرمائش پر فرید غوری نے ایک منصوبہ بنایا اور گھریلو ملازمہ وحیدہ کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا دی۔

فرید غوری بہت ہی کائیاں اور چالاک شخص تھا۔ اس کے ریکارڈ سے پتا چلا کہ وہ جیلے بھی اسی نوعیت کی دو تین کامیاب وارداتیں کر چکا ہے لیکن اس کی اور زکس کی بدقسمتی کہ یہ کیس میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

فرید غوری بلاشبہ اپنے کام کا ماہر ایک بہت مشق کھلائی تو مگر وہی بات کہ شاطر سے شاطر شخص کو بھی ایک روز اس کی عیاری لے ڈالتی ہے۔ فرید غوری کو بھی منہ کی کھانا پڑی تھی۔

میں نے زکس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نے فیض صاحب کے اس شعری مجموعے کا تین بار آپ سے "دین دین" کیا ہے صرف یہ چیک کرنے کے لیے کہ آپ کس ہاتھ سے کام کرنے کی عادی ہیں اور آپ نے ہر مرتبہ یہ ثابت کیا ہے کہ آپ لیفٹ وینڈو ہیں لہذا اشتیاق بیگ کامل....."

"میں نے اشتیاق کو قتل نہیں کیا....." وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "فرید غوری بھی تو لیفٹ وینڈو ہے....."

"فرید غوری....."

میں نے کہیں بھی یہ نہیں کہا تھا کہ زکس نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے لیکن وہ میری بات کو خود پر لے گئی تھی اور اپنی سمت آنے والے تیر کو اس نے فرید غوری کی جانب پھیرنے کی کوشش کی تھی۔

"آغا..... مقتول کا منبر..... وہ وقوعہ کے روز اس وقت جائے واردات پر موجود تھا جب پولیس وہاں پہنچی....." میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "یہ شخص وہاں کیا کر رہا تھا.....؟"

"م..... مجھے پتا نہیں..... یہ تو آپ اسی سے پوچھیں....." وہ کنبہ سے باہر لپکتے ہوئے بولی۔ "مجھے جانے دیں....."

"ارے میڈم..... آپ کہاں جا رہی ہیں؟" میں نے زکس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔ "آپ تو یہاں سے سیدھی جیل جاگیں گی..... اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں۔"

"میں نے اشتیاق کو قتل نہیں کیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

جج کے فوری حکم پر متعلقہ عدالتی عملے نے زکس کو عدالت کے کمرے سے باہر جانے سے روک دیا۔ میں نے روئے سخن اس مقدمے کے منصف کی جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! جیسا کہ گزشتہ پیشی پر میں نے انکو آری آفسر صفدر علی کی تصدیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچا دی تھی کہ اشتیاق بیگ کو کسی لیفٹ وینڈو شخص نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس پیشی پر میں نے کوشش کر کے اس کیس سے متعلق افراد میں سے ایک لیفٹ وینڈو شخصیت یعنی مقتول کی بیوہ زکس صاحبہ کو ایک سپوز کر دیا ہے۔ انہی کی زبانی پتا چلا ہے کہ مقتول کا منبر فرید غوری بھی لیفٹ وینڈو

نہیں ہیں جو بہ ظاہر نظر آ رہے ہیں بلکہ ملزم کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اسی شک کی بنیاد پر جیوری کے باقی گیارہ ارکان سے دس روز تک الجھتا رہا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو وہ قائل ہو رہے تھے اور نہ ہی مجھے قائل کر سکے تھے۔ وہ اپنی سر توڑ کوشش کے باوجود مجھے میرے متوقف سے بنانے میں ناکام رہے تھے۔ بعد ازاں یہ بات میرے علم میں آئی کہ میرا شک اپنی جگہ درست ہے۔ کل کے نہیں پر وہ وہی واقعات تھے جن کا میں نے اندازہ لگا لیا تھا۔ ملزم جارج نہیں جانتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کوئی قتل بھی ہوا ہے۔

پہلے درست ہے کہ مقدمے کے دوران یہ بات سامنے نہیں آئی تھی حالانکہ وہ احمق عدالت کو یہی بیان دینا چاہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک سادہ لوح شخص تھا اور زندہ رہنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا وکیل ہو رہا، بے حد محتاط اور زیرک واقع ہوا تھا۔ وکیل استفسار کا نام ریکٹ تھا۔ وہ ایک تجربہ کار وکیل تھا اور اس کیس کے پرچے اڑانے پر تلا ہوا تھا۔ شکا کو جیسے ہنگامہ خیز شہر میں ہر سال ایک دو بڑے اور سنسنی خیز مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں لیکن یہ مقدمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ عرصے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔

میں شروع ہی سے اس مقدمے میں دلچسپی لیتا رہا اور حتیٰ کہ میرے دل میں یہ خواہش جاگ اٹھی کہ کاش مجھے اس مقدمے میں جیوری کا ایک رکن بنا لیا جائے اور..... ایک روز خلاف توقع عدالت سے میرا بلاوا آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ میں اس وقت تک اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا جب تک باقی ارکان مجھ سے نجات نہیں حاصل کر لیتے۔ بہر حال یہ ایک عجیب اتفاق تھا کہ سالہا سال کے بعد مجھے ایک ایسے کیس میں جیوری کے رکن کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

اخبارات میں کیس کی تفصیل پڑھنے کے دوران ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو جیوری کے ایک رکن کی شدید ضرورت ہے اور اب عدالت کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ اس سے قبل عدالت فیصلہ سنانے والے ممبران کی دو عدد فہرستیں خارج کر چکی تھی کیونکہ ہر رکن اخبارات پڑھ کر اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ یہ ملزم جارج کے حق میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ وہاں پہلے سے دس اراکین جیوری

جلوہ افروز تھے۔ یہ لوگ اس جھوٹے مقدمے کا بڑی... بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اس موقع پر مجھے بھی جھوٹ کا سہارا لینا پڑا کیونکہ میں بھی دوسروں کی طرح شدت سے جیوری کے رکن کے فرائض انجام دینے کا خواہش مند تھا۔ مجھ سے کئی سوالات کیے گئے جن کا میں نے تسلی بخش جواب دیا۔ تب مجھے اس فرض کی ادائیگی کی اجازت دے دی گئی۔ میں نے ان کے سوالوں کے جواب میں کہا تھا کہ میں نے اس مقدمے کی بابت بہت تھوڑا پڑھا ہے اور کوئی ذاتی رائے نہیں رکھتا اور یہ کہ میں سزائے موت کے خلاف نہیں ہوں۔ میں نے ساری عمر لگا تار تین جھوٹ نہیں بولے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد لوگ ایک اور بڑے جھوٹے کو پکڑ لائے اور اس طرح ہم بارہ ہو گئے۔ بارہ مضموم جھوٹے۔

اگلے روز سے اس کیس کی جزئیات سامنے آنے لگیں۔ میں نے نگاہیں گھما کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور مجھ پر یہ عقده کھلا کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی گیارہ مضموم خیر اعلیٰ و مانع یکجا نہیں دیکھے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکاری وکیل اور شاہد وکیل صفائی بھی سبھی چاہتا تھا۔

خدا خدا کر کے مقدمے کی کارروائی کا آغاز ہوا لیکن میں پہلے ہی اس کیس کی تفصیل سے واقف تھا اور سب کچھ جانتا تھا۔ مقدمے کا سب سے اہم سرکاری گواہ مشتاقی پولیس مین وینی تھا۔ وہ ایک فربہ اندام اور خوش طبع شخص تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ ایک رات تقریباً دو بجے اس نے ملزم جارج کو ریلوے بدست کھڑا پایا تھا۔ اس سے کچھ قاصطے پر ایک شخص کی لاش پڑی تھی اور ملزم ہکا بکا اپنے ریلوے گھوڑے پر ہاتھ پائی تھا۔ جب اس نے ملزم سے پوچھا کہ اس نے اس شخص کو کیوں قتل کیا تو ملزم نے اعتراف جرم کرنے سے انکار کر دیا لیکن اپنے ہاتھ میں موجود ریلوے گاڑی کا کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر رہا۔

وینی کے بیان کے مطابق ملزم جارج نشے میں دھت تھا۔ اس نے موقع واردات سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب وینی نے اس سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے تو وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ مقتول کی جلد ہی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کا نام ہووارڈ تھا۔ وہ ایک رندوا تھا۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن میں اور دوسری سینے میں۔ اس کی لاش اسی وقت تجھیز و تمھین کے ادارے کو بھیج دی گئی اور ملزم جارج کو پولیس اسٹیشن کی ایک کونٹری میں بند کر دیا گیا جہاں وہ ساری رات گھوڑے سچ کر سوتا

رہا اور دن چڑھے بیدار ہونے کے بعد اس نے جرم کی صحت سے انکار کر دیا تھا لیکن بعد ازاں اس پر کل کا الزام عائد کر دیا گیا تھا۔

ملزم جارج کا کہنا تھا کہ مقتول ہووارڈ اس کے لیے نطقی اجنبی تھا۔ وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ نشے میں دھت ہونے کے باوجود اس کے پاس ہووارڈ کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ اس کے پاس اس وقت یا زندگی میں کبھی ریلوے تھا۔ اس کی تصدیق اس کے دوستوں نے بھی کی جو سب کے سب معزز شہری تھے۔ جارج بذات خود ایک معزز شہری تھا اور سچ پوچھیے تو بہت سی حقیقتوں میں ایک یہ حقیقت بھی اس کے خلاف جانی گئی۔ وہ خوش حال تھا، اچھے لباس زیب تن کرتا تھا اور اچھی شہرت رکھتا تھا۔ اس قسم کا کوئی آدمی اگر کسی سنگین جرم میں ملوث ہو جاتا ہے تو اس کے کارنامے کو بری طرح اچھالا جاتا ہے اور عام شہری تو درکنار سچ اور جیوری بھی اس سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ جب اس نے عدالت کو اس رات کا واقعہ سنا تو اس کا وکیل ہو رہا، یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل پھس پھسی اور بے جان ہے۔

ملزم نے اس بات کا بھی اقرار کیا کہ جب اس نے فائز کی آواز سنی تو اس کا دل اپنے گھر کی جانب نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نشے میں دھت تھا اور خود اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ولیم اسٹریٹ پر کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریلوے گاڑی موجود تھا۔ یقیناً کسی نے اسے ریلوے گھوڑے دیا ہوگا۔ بہر حال وہ صرف ایک ہی بات جانتا تھا کہ اس نے ہووارڈ کو قتل نہیں کیا تھا۔

وہ ایک خوب رو آدمی تھا۔ اس کی بیوی ایک نوجوان اور دلکش خاتون تھی لیکن اس واقعے نے اس کی ساری دلکشی چھین لی تھی اور اس کی حالت کسی زندہ لاش سے مختلف نظر نہیں آتی تھی۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران وہ اپنے وکیل ہو رہا، یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل پھس پھسی اور بے جان ہے۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ملزم جارج کے بیان کی وجہیں اڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جارج اپنے بیان پر کئی سے ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بے حد اہم گواہ کو توڑنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ گواہ ایک عورت تھی۔ اس کا نام سبز بیٹرن تھا۔ وہ مدعا علیہ کی جانب سے پیش کی گئی تھی لیکن ریکٹ جیسے شاطر

وکیل کی جرح کے آگے ٹھہر نہ سکی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کی گواہ ہے۔ اس کا بیان خاصا واضح تھا تاہم اس گواہ پر محنت کی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بیان کے مطابق وہ اپنی کھڑکی کے قریب بیٹھی، اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔

سوال کیا۔ "کیا تمہارا شوہر ملزم کا دوست ہے؟" ریکٹ نے

"ہرگز نہیں۔" اس نے تیز لہجے میں جواب دیا پھر دوبارہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ اس نے دو آدمیوں کو اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ گولیوں کے چلنے سے ذرا پہلے کا ذکر ہے۔ اس نے ان دونوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے سنا تھا۔ ان میں سے ایک خوب زور زور سے اپنا بازو دلہرا ہاتا تھا۔ اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی اور ان دونوں میں کوئی بھی ملزم جارج نہیں تھا۔ دونوں اس کے مقابلے میں خوب کچھ مچھم تھے اور اسے اس بات کا یقین تھا کہ ان میں سے ایک شخص مقتول ہووارڈ تھا۔ اس نے تسلیم کیا کہ رات اندھیری تھی لیکن چونکہ اسٹریٹ اس کے گھر کے قریب ہی واقع ہے اس لیے اس نے انہیں واضح طور پر دیکھا تھا اور ان کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آواز جارج سے ملتی چلتی نہیں تھی اور تب ریکٹ نے یکے بعد دیگرے دو دھماکے کیے اور سبز بیٹرن کے بیان کے پرچے اڑا دیے۔ اس نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ سبز بیٹرن اونچا سنتی ہیں حالانکہ وکیل صفائی ہو رہا، یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی کہانی بالکل پھس پھسی اور بے جان ہے۔ اس نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے ملزم جارج کے بیان کی وجہیں اڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جارج اپنے بیان پر کئی سے ڈٹا رہا۔ حتیٰ کہ ایک بے حد اہم گواہ کو توڑنے کے باوجود اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

وہ گواہ ایک عورت تھی۔ اس کا نام سبز بیٹرن تھا۔ وہ مدعا علیہ کی جانب سے پیش کی گئی تھی لیکن ریکٹ جیسے شاطر

ریکٹ نے سب سے پہلے اسے یہ اقرار کرنے پر مجبور کر دیا کہ اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ وکیل صفائی ہو رہا، اس نے اس سے قبل بڑی صفائی سے اس سے یہ سوال کرنے سے خود کو روکا تھا لیکن ریکٹ اس کمزور پہلو کو تازہ کیا تھا لہذا اس نے وہیں ضرب لگائی اور بالآخر سبز بیٹرن کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ممکن ہے وہ سب اس کا وہم ہو۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ اس نے جن دو افراد کی آوازیں سنی

تھیں، ان میں سے ایک کی آواز، ملزم جارج کی تھی یا نہیں اور یہ کہ اس نے جس شخص کو ہووارڈ سمجھا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور ہو۔ ریکٹ جو کچھ ثابت کرنا چاہ رہا تھا، اس کا۔ یہ آسانی تصور کیا جاسکتا تھا۔ سز پٹرن نے کوئی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی حالانکہ اس کا مکان جائے واردات سے چوتھائی بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ریکٹ اس کے ہر جواب پر قاتلانہ انداز سے ہماری طرف دیکھنے لگتا اور سز پٹرن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ رو ہانسی ہو گئی تھی۔

وکیل صفائی ہورس تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اس نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اس کے اونچا سنے کا یہ جواز پیش کیا کہ اس وقت یہ نزلے کا شکار ہے جس سے اس کی سماعت متاثر ہوئی ہے لیکن واردات کی رات وہ بالکل واضح طور پر سنے کے قائل تھی۔ اس کی اس دلیل پر سز بھی مسکرائے بغیر بندہ سا۔ دوسرا اہم ترین گواہ ایک دربان تھا۔ اس نے ایک شخص کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور بس۔ وہ شخص اسے فائرنگ کے چند ہی لمحوں کے بعد جائے واردات سے کچھ فاصلے پر بھاگتا ہوا نظر آیا تھا لہذا یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہی قاتل ہے۔ یہاں تک تو یہ بات درست تھی لیکن پھر جائے واردات پر ریولور بدست جارج کی موجودگی کا کیا دراز تھا جس کے ریولور کے جوہر میں تین گولیاں بھی کم تھیں۔

☆☆☆

ان تمام کمزور پہلوؤں کے باوجود وکیل صفائی کے پاس حکم کا اکا تھا جسے مات دینا ریکٹ کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوران تفتیش یہ بات سامنے آئی کہ مقتول کے پاس اپنی بیوی کی ایک تھیسی تصویر ہوا کرتی تھی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ اس کے کچھ دوستوں نے اس کی تصدیق کی تھی اور ایک نے عدالت کو حلفیہ بیان دیتے ہوئے یہاں تک کہا تھا کہ وہ تصویر وقوع کی شب بھی اس کے پاس تھی اور اس نے اپنے دوست کے ہاں سے اپنے گھر روانہ ہوتے وقت وہ تصویر اسے دکھائی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ گھر پہنچنے کے بجائے عالم بالا پہنچ گیا تھا۔ وہ تصویر غائب تھی اور جارج کے پاس سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ نہ جائے واردات کے آس پاس نہیں پڑی ہوئی پائی گئی تھی۔ یہ ایک خوب صورت نکتہ تھا اور کئی سمت اشارے کرتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس پورے کیس میں یہی واحد روانی نکتہ تھا اور اخبارات اسے لے اڑے تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے اس نکتے کو اچھانا شروع کر دیا تھا اور ہر

اخبار اپنے ہر ایڈیشن میں اس تصویر کو شائع کرنے لگا تھا۔ جیوری کے ہر رکن نے وہ تصویر دیکھی تھی اور جان گئے کہ مقتول کی بیوی کیسے نقش و نگار کی عورت تھی۔ وکیل صفائی ہورس نے اپنا زور بیان اس گم شدہ تصویر پر صرف کر دیا تھا لیکن سرکاری وکیل ریکٹ نے اس نکتے کو یوں مسترد کر دیا گویا اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔

میرے خیال میں ہر شخص کو یقین تھا کہ ملزم جارج قاتل ہے اور شاید ہر شخص اپنی جگہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس قاتل کے پیچھے کوئی ایسا راز پوشیدہ ہے جس کی کڑی ملزم جارج اور مقتول کی بیوی سے یا مقتول اور ملزم جارج کی بیوی سے

جاملے گی۔ وکیل صفائی شروع ہی سے ایک راگ الاپتا چلا آ رہا تھا اور اس کی یہ راگنی جیوری کو غلطی متاثر نہیں کر رہی تھی لیکن اس کے پاس کہنے کو بھلا اور تھا ہی کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا۔ آخر میں اس کے پاس ایک ہی چیز رہ گئی تھی اور وہ تھی بیان۔ وہ جانتا تھا کہ جارج کو بری کروانے کے لیے اب صرف ایک بہت ہی دھانسو قسم کے بیان کی ضرورت تھی اور وقت آنے پر اس نے وہ بیان دیا بھی۔

شکل و صورت اور طبع سے وہ کوئی فلم ایکٹر لگتا تھا۔ عدالت کے کمرے میں موجود خطوطین کی نظریں اس پر چلی رہتی تھیں۔ وہ بے شک ایک اچھا مقرر تھا۔ اس نے بے شمار کیس جیتے تھے اور اگر اس نے جارج کا کیس ہاتھ میں لیا ہوتا تو نہ تو یہاں تک بھی نہ پہنچتی۔ میں چونکہ شروع ہی سے اس کیس کی تفصیلات سے آگاہ تھا اور اس کے بارے میں اپنی ایک رائے قائم کر چکا تھا لہذا اس کے بیان کے صرف وہ حصے سنے جو سنے کے قابل تھے۔ دونوں دکلا کی نوک جھونک خاصی دلچسپ تھی۔ اس کے بعض فقروں پر عدالت کا کمر اتھبوں سے گونج اٹھتا۔ پتہ قاتل ریکٹ ایک جیتا جاگتا فتنہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہر وقت طنز آمیز تاثرات بکھرے رہتے تھے اور وہ طنز کے تیر چلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ایک موقع پر ہورس مسکرتی پولیس مین وینی کے بیان کی دجیاں بکھیرتے ہوئے، جائے واردات کی منظر کشی کر رہا تھا اور عدالت کو بتا رہا تھا کہ جب گولی چلی تو مجرم جارج لاش سے کتنے فاصلے پر پکڑا تھا اور اس وقت چاند کی کیا پوزیشن تھی وغیرہ وغیرہ۔ ایسے میں ریکٹ نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ کھینچ کر تبصرہ کیا۔

”مسٹر ہورس کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے چاند کو بطور گواہ طلب نہ کر کے قاش غلطی کی ہے۔“ اس کے اس تبصرے پر عدالت کا کمر از عرفان زار بن گیا۔ اس کے جواب میں ہورس نے کہا: ”اگر چاند کو بطور گواہ طلب کیا جاسکتا تو وینی کو طلب کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔“

اس کی اس بات پر کوئی نہیں ہنسا۔ اس کے بعد ہورس نے ریکٹ کو آڑے ہاتھوں لیا اور مدعا علیہ کے حمایتی چیلنے اور تقبیہ لگانے لگے۔ ریکٹ ہم میں سے کسی کی بھی نگاہ میں پسندیدہ نہیں تھا لیکن اسے ملزم کو مزائے موت دلوانے کا قانونی حق حاصل تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ہورس جیوری روم میں مقبول تھا۔ لیکن وہ ریکٹ کے مقابلے میں پسندیدہ تھا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ ایک کیس پار رہا تھا لیکن اس کے باوجود جم کر لڑ رہا تھا۔ بھی بھی دونوں دکلا لڑ پڑتے اور جج کو انہیں سمجھ کر پڑتی۔

☆☆☆

سارے گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد دکلا کے وکلاء کا آغاز ہو گیا۔ ریکٹ کا بیان ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔ اخبارات نے اس کا نام جلاور کھا تھا کیونکہ وہ اس کیس میں صرف پھانسی کا طلب گار تھا۔ اس نے بہت سے دلائل دیے جن میں کچھ ٹھوس تھے اور کچھ بے باطن۔ سب سے غور طلب نکتہ یہ تھا کہ اب تک قاتل کے محرک کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ گواہان کے بیانات سے بھی اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی لیکن قاتل کا محرک تلاش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ وینی کی گواہی کے بعد کیس مکمل ہو گیا تھا۔ ملزم جارج کسی بھی وجہ سے ہووارڈ کو قتل کرنا چاہتا تھا اور رگھے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اور یہی بات سب سے اہم تھی۔ اس نے ایک انسانی جان لی تھی لہذا قانونا اس کے بدلے اس کی جان سنی چاہیے گی۔

ہورس نے اپنے بیان میں پہلے تو اس کیس کے دوران ریکٹ کے رویے کی شکایت کی اور پھر ملزم جارج کو حالات کا شکار قرار دیتے ہوئے اس کی شرافت، تنگ نامی اور سادہ لوحی کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ اس شخص نے اپنی حماقت سے ضرورت سے زیادہ پی کر خود کو ایک سنگین معاملے میں ملوث کر لیا ہے۔ اس کی تقریر خاصی متاثر کن تھی اور اس نے جس طرح وہ واقعہ بیان کیا، اس سے اس منظر کی تصویر کشی ہونے کے سامنے سچ گئی تھی۔ ملزم جارج نشے میں دھت تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کس سمت جا رہا

مہلت

لڑکا۔ ”آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں۔ میں اسے سونے میں تول دوں گا۔“ باپ۔ ”مجھے کچھ دن کی مہلت دے دو۔“ لڑکا۔ ”شادی کی تیاری کرنی ہے کیا؟ ویسے مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“

باپ۔ ”دراصل میں نے بیٹی کو ڈانٹنگ سے منع کرنا ہے تاکہ اس کا کچھ وزن بڑھ جائے۔“

ایک گھنٹا

ایک اسٹیشن سے ایک بڑی موٹوں والے خان صاحب گاڑی میں سوار ہوئے اور سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد مسلسل اپنی دائیں موٹوں کو مروڑتے رہے۔ جب وہ اپنی منزل پر اترنے لگے تو ایک مسافر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خان صاحب آپ کی بائیں موٹوں ایک گھنٹا پیچھے ہے۔“

جرمانہ

چلتی گاڑی میں بیٹھی ایک خاتون نے زنجیر کھینچ دی۔ ٹی ٹی کچھ دیر بعد ڈبے میں آدھکا اور بولا۔ ”زنجیر کس نے اور کیوں کھینچی؟“ خاتون بول آئی۔ ”کیا گاڑی کے ٹکرانے کا اندیشہ ہے؟“

”دراصل میں انڈے لے جا رہی ہوں۔“ خاتون بولی۔

ٹی ٹی نے غصے سے کہا۔ ”گاڑی کے ٹکرانے کا کوئی امکان نہیں انشاء اللہ۔ آپ زنجیر کھینچنے کا سوراہا بھرتا مانا کریں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

عجیب و غریب مہارتی!

اٹھارویں صدی کے وسط میں جوہپور راج گھرانے کی سابقہ ملکہ، مہارانی کنور بائی اپنے زمانے کی ایک عجیب و غریب خاتون تھیں۔ ہر روز ان کے غسل کے لیے 150 سیر تازے گلاب کا عرق نکال کر رکھا جاتا تھا۔ پھر کینیز ان کو اس عرق گلاب سے تقریباً دو گھنٹے تک نہلاتی تھیں۔ پھر ایک دن کسی نے کہا کہ اگر آپ پھر کے خون سے نہا لیں تو اور نکھار پیدا ہوگا۔ بس پھر کیا عمل میں روز پھر کھینچنے لگے اور دو پھر کے خون سے نہا کر سکون پائی رہی۔

مرسلہ۔ دلدار حسین، حیدر آباد

ہے۔ ایسے میں گولیاں چلیں اور وہ مقتول کے پاس جا کھڑا ہوا۔ قاتل کا ریو لور لاش کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور وہی نے موقع واردات پر پہنچ کر اسے گرفتار کر لیا جبکہ اصل قاتل اپنی جان بچا کر بھاگ چکا تھا۔ ایک دربان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا بھی لیکن اس اندھے کو اس کی شکل نظر نہیں آئی۔

ہورس کے بیان کی روشنی میں ہم نے بے شک اس دربان کی گواہی اور سز بیٹرن کے بیان کو مد نظر رکھا تھا جس کا بیشتر حصہ قبہوں کی نذر ہو گیا تھا لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا کہ سز بیٹرن نے حقیقتاً آوازیں سنی تھیں۔ دو پراسرار افراد آپس میں لڑتے ہوئے گزرے تھے اور ان کی آوازیں خاصی بلند تھیں پھر ہورس نے اس تصویر کا حوالہ دیا جو بے حد اہم تھی اور جس کا اب تک کوئی سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ وہ تصویر ملزم جارج کو بے گناہ قرار دیتی تھی۔ تصویر مقتول کے پاس سے یا پھر جارج کے پاس سے برآمد ہوئی جاوے تھی کیونکہ جارج کو اسے پھینکنے یا چھپانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ہورس کا بیان بلاشبہ ایک عمدہ بیان تھا۔ اس نے جارج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اس کی بے داغ زندگی اور اس کے معزز دوستوں کا حوالہ دیا۔ ساتھ میں یہ کہا کہ کیا ایک ایسا شخص جس نے بھی ریو لور کو ہاتھ نہ لگا یا ہو، کہیں سے کسی کار ریو لور مانگ کر یا چر کر ایک ایسے شخص کو قتل کر سکتا ہے جسے اس نے زندگی میں نہ بھی دیکھا تھا اور نہ ہی جس کے بارے میں سنا تھا۔ ہورس کے دلائل سن کر ہر شخص اس اشکراٹھا لیکن ریکٹ نے اپنے آخری بیان میں اس کے دلائل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”یہ سب محض قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ لاکھ قیاس آرائیاں کریں، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ ملزم جارج ریو لور بدست لاش کے قریب کھڑا تھا اور ریو لور سے گولیاں چلی تھیں اور جہاں تک نشے میں ہونے کا تعلق ہے تو یہ کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ رہے ہوں، دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔“

اتنا کہہ کر اس نے ہونٹوں کے ایک گوشے کو مخصوص انداز میں خم دیتے ہوئے مزید کہا۔ ”اگر جیوری یہ سمجھتی ہے کہ مدہوشی سفاکانہ قتل کا جواز بن سکتی ہے تو ملزم کو بری کر دے تاکہ دوسروں کی حوصلہ افزائی ہو اور لوگ شراب پی کر بے گناہوں کو قتل کرنے نکل کھڑے ہوں لیکن اگر ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی جانوں کو شرابی درندوں

سے، خواہ وہ کتنے ہی نیک نام اور معزز کیوں نہ ہوں محفوظ رکھنا ہی ہمارا فرض ہے تو خصوصی طور پر ملزم جارج کو سزائے موت دے کر ایک اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں۔“

ریکٹ کا بیان اگرچہ ہورس کے بیان سے زیادہ متاثر کن نہیں تھا لیکن اس سے بہت زیادہ مدلل اور قائل کرنے والا تھا اور جہاں تک جیوری کا تعلق تھا، تو وہ بہت پہلے ہی جارج کے لیے سزائے موت تجویز کر چکی تھی۔ سب سے آخر میں جج نے ... دونوں دکھاؤ کے دلائل کی روشنی میں جو کچھ اخذ کیا تھا، پڑھ کر سنا شروع کیا۔ اس کا بیان... بحیثیت مجموعی سرکاری دیکل کی جانب داری کر رہا تھا جو غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس نے آخر میں ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہمیں ملزم جارج کے جرم پر شک ہے تو ہم پر منحصر ہے کہ اسے سزائے موت دیں یا بری کر دیں۔ اس کے اس بیان کے بعد ہم سب اٹھ کر جیوری روم میں چلے گئے اور مقدمے کی اس کارروائی کی روشنی میں فیصلے پر بحث مباحثے کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ڈین نامی ایک انتہائی تنگ نظر اور آدم بیزا شخص جیوری کا سربراہ تھا۔ وہ شروع ہی سے خود کو اتنی اہمیت دینا آرہا تھا گویا اسے ڈین کی وزارت مل گئی ہو۔ وہ اس سے پہلے بھی جیوری کے فرائض انجام دے چکا تھا لیکن سربراہان کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ وہ سارے اسرار اور موز سے بخوبی واقف تھا۔ سارے کے سارے گیارہ ارکان جیوری مختلف طور پر جارج کو سزائے موت دینے کے حامی تھے اور صرف ایک رکن ایسا تھا جو اسے بری کروانے کے حق میں تھا۔ انکشاف قریب انداز کی ذریعہ ہوا تھا۔ میں اس واحد رکن کو جانتا تھا لہذا باقی گیارہ ارکان کوشش و بیج میں مبتلا رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

”دوستو! وہ رکن میں ہوں۔“ میں نے انہیں مخاطب کر کے کہا۔ ”مجھے قائل کرو۔“

میرا یہ جملہ کسی ہم کے گولے کی طرح ان کے سروں پر پھنسا۔ انہیں اس گولے کی توقع نہیں تھی۔ خاص طور سے ہمارا سربراہ ڈین تو ایسا بوکھلایا کہ مجھ سے اس طرح لڑنے لگا گویا یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو۔ اس کا ذہن یہ تسلیم کرنے سے قاصر تھا کہ میں ان کے منصفہ فیصلے کی مخالفت بھی کر سکتا ہوں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ہم فوراً اس کے فیصلے کی تائید کر دیں گے اور وہ اسی وقت جج کو اس فیصلے سے آگاہ کر کے اس کا سہرا اپنے سر باندھ لے گا لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو وہ

ہو رہی ہے، اگر وہ مقتول سے واقف نہ ہوتا تو اسے گولی کیوں مارتا؟“

”دیکھل صفائی بھی یہی جانتا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اور چونکہ وہ اس سے واقف نہیں تھا لہذا اس نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ اور اس گم شدہ تصویر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ایسی کوئی تصویر مقتول کے پاس نہیں تھی۔“ ڈین سرے سے منحرف ہو گیا۔ ”ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جس شخص نے یہ گواہی دی تھی، وہ جھوٹ بول رہا تھا۔“

”تمہاری ثانی اماں کا سر۔“ میں نے پھر کر کہا۔ ”اس شخص نے ہووارڈ کے قتل ہونے سے صرف ایک گھنٹا قبل وہ تصویر اس کے پاس دیکھی تھی۔ اگر اس تصویر کا سراغ لگ جاتا تو ہمیں ایسی بہت سی باتوں کا علم ہو جاتا جن کا ہمیں علم نہیں ہے اور جارج کے سر پر تلوار نہ لگ رہی ہوتی۔ آپ حضرات محض اس وجہ سے ملزم کے خلاف ہیں کیونکہ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ میں اس کے لیے آپ لوگوں کو مورد الزام نہیں ٹھہراتا لیکن یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ چونکہ اس نے شراب پی رکھی تھی لہذا قاتل بھی اسی نے کیا ہے۔“

”یہ سراسر جھوٹ ہے کہ ہم کسی خاص وجہ سے تمہارے خلاف ہیں۔“ ڈین بولا۔ ”لیکن میرے خیال میں یہ فرض کرنے کی ایک اچھی وجہ ہے۔“

یہ بحث پونہ پچھتی رہی اور دس روز گزر گئے لیکن ہم کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس دوران ہم نے ایک دو شہادتیں کھنگالیں لیکن گھوم پھر کر وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلے تھے۔ ججو میرے ہر شخص جارج کو مجرم تصور کر رہا تھا اور ان میں سے بعض اسے بھانسی پر لٹکانا چاہتے تھے۔ بحث جوں جوں بڑھ رہی تھی، لوگوں کی جھنجھلاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جارج اور میرے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ میں انہیں زہر لگنے لگا تھا۔ میری باتیں انہیں زہر لگتی تھیں۔ بہت ممکن ہے وہ یہ سوچتے ہوں کہ مجھے رشوت دی گئی ہے جس میں نے معاملے کو اب تک لٹکا رکھا ہے۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ لوگ گھر سے دور تھے اور ان کے اہل خانہ ان کی واپسی کے منتظر تھے جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں کنوارا تھا اور گھر پر میرا انتقال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ مجھے جارج کی گردن بچانی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس دوران جج گا بے بگا ہے اپنے

حتمل اٹھا۔ پہلے پہل بقیہ ارکان کو میری یہ مخالفت منصفہ خیز لگی۔ وہ یہ جانتا چاہتے تھے کہ میں ملزم جارج کو بے گناہ کیوں تصور کر رہا ہوں؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ جبکہ ساری شہادتیں اس کے خلاف ہیں اور اسے مجرم ثابت کرتی ہیں۔ انہیں اس سے ہمدردی ضرور تھی لیکن جہاں تک بے گناہی کا تعلق تھا تو...

”مسز رسل۔“ ان میں سے ایک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ایک بالکل عام سا کیس ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ دیکھل صفائی ہورس نے مقدمے کی بہت اچھی جیوری کی لیکن وہ اپنے موقف کی حمایت میں ایک بھی ٹھوس دلیل نہ دے سکا۔ میں غفلت میں کوئی فیصلہ کرنے کے خلاف ہوں۔ اگر مجھے اس کے جرم پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو میں دوسروں کے فیصلے کو سزا دیتا لیکن مجھے اس کیس میں شک کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔ ملزم جارج بے شک مجرم ہے، اسے پنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔“

”اسے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔“ میں نے تجویز سے کہا۔ ”اس نے پی رکھی تھی اور شوخی قسمت کہ موقع واردات پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ قاتل اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پھنسا کر فرار ہو گیا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے اور ہورس کا بھی یہی خیال ہے کہ ملزم تین گھنٹے پر جانے واردات پر پہنچ گیا اور نشے میں ہونے کے باعث اس نے لاش کے قریب پڑا ہوا پستول غیر ارادی طور پر اٹھالیا۔ تین اسی لمحے گشتی سپاہی وہی موقع واردات پر پہنچ گیا اور اس نے اسے ریو لور سمیت گرفتار کر لیا۔ میرے خیال میں قاتل نے فرار ہوتے وقت پستول اس کے ہاتھ میں اٹھادیا تھا اور چونکہ وہ مدہوش تھا، اس نے وہ پستول لے لیا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔“

”بکواس۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اس نے یہ جرم ایک منسو بے کے تحت کیا تھا اور شراب اس لیے پی رکھی تھی کہ اپنے اعصاب پر قابو پاسکے۔“

”تمہارے خیال میں وہ مقتول ہووارڈ سے واقف تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”بے شک۔“ ان سب نے بیک زبان ہو کر جواب دیے۔ ”لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ ریکٹ نے بھی کہا تھا کہ تین وہ کوئی ثبوت نہ پیش کر سکا۔“

”اب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔“ ڈین نے لب لعل سے۔ ”میں کے مطالعے سے یہ بات از خود عیاں

پیش کار کو ہمارے پاس بھیجتا رہتا تا کہ ہماری پیش رفت سے آگاہ ہو سکے اور یہ جان سکے کہ ہم کسی فیصلے پر پہنچ سکے ہیں یا نہیں۔ بار بار مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ تنگ آکر جیوری کو برخاست نہ کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ شاید وہ بھی اس صورت حال سے محفوظ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جلد یا بدیر میں ہتھیار بھینک دوں گا۔

☆☆☆

کبھی کبھی پیش کار بھی ہماری بحث میں شامل ہو جاتا۔ اس کے خیال میں، میں ایک ضدی شخص تھا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح جارج کو مجرم تصور کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھ سے کہتا: "آخر تم اتنے ہلکان کیوں ہو رہے ہو؟ کہیں تمہارا جنازہ تو نہیں نکل رہا؟ جلدی سے کسی فیصلے پر پہنچ کر چھٹی کرو۔ ہمیں گھر بھی واپس جانا ہے۔" اور کبھی کہتا: "آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟ چیف جسٹس یا گورنر؟ تمہیں یہ ہاؤ کروانے کا کیا حق ہے کہ جارج مجرم نہیں ہے۔ جبکہ گیارہ معزز اور کان کہتے ہیں کہ وہ مجرم ہے۔ کیا تم خود کو دوسروں سے زیادہ ذہین سمجھتے ہو؟"

اس قسم کے بحث مباحثے ہوتے رہے لیکن وہ لوگ مجھے میرے موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹا سکے اور تب انہوں نے مجھے طرہ طرہ سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا کھانا ایک مخصوص ہونٹ سے آتا تھا۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ میرا کھانا خاصا بد مزہ ہوتا تھا پھر ایک رات کسی نے میرے بستر پر پانی انڈیل دیا۔ میرے کپڑے پراسرار طریقے سے اس وقت غائب ہو جاتے جب مجھے باہر نکلتا ہوتا۔ یہ روزانہ کا معمول بن گیا پھر ان سب نے مجھ سے بول چال ترک کر دی لہذا مجھے بھی ان سے بول چال ترک کرنی پڑی۔ کبھی کبھی مجھے یہ خیال گزرتا کہ ان میں سے کوئی مجھے ایک دو ہاتھ جڑنے کا ارادہ بھی کر رہا ہے۔ بالآخر گیارہویں دن پیش کار ہمارے پاس آیا اور اس نے مزہ سنایا کہ اگر ہم آج کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو جج ہمیں برخاست کر دے گا۔ ممکن ہے وہ جھوٹ بول رہا ہو مگر اس کی یہ بات سن کر سب کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن میں دل میں پریشان ہوا۔

☆☆☆

اس دن وہ لوگ مجھ سے اتنے ناراض نہیں تھے لیکن مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ

میں وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ میں کیا بیان کر رہا ہوں لیکن اب وہ ایک دوسرے کا منہ ٹھٹھنے لگے تھے۔

"بہر حال.....!" میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ آپ یہ سب کچھ فرض کر لیں تو باقی معاملہ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ دنیا میں طرح طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا ایک واقعہ ہے۔ اس وقت کی عدم موجودگی میں ہووارڈ اس لڑکی کو شیشے میں اہلکار شروع کر دیتا ہے۔ وہ اسٹھ کے خلاف لڑکی کے کان بھرتا ہے۔ اسے اس کے متعلق عجیب کہانیاں سنانا ہے۔ لڑکی کا باپ اس کا ہمنوا بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لڑکی اسٹھ کے خطوط کا جواب دینا چھوڑ دیتی ہے پھر ایک دن اسٹھ کو اس کا ایک خط موصول ہوتا ہے جسے پڑھ کر اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے شہر سے آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اور وہ واپس جا کر اپنی شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جبکہ اس کی محبوبہ نے لکھا تھا کہ وہ ہووارڈ سے شادی کر رہی ہے لیکن آپ اس کے لیے لڑکی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے۔ ہووارڈ جھوٹا، مکار اور سخن پرداز تھا۔ اس نے اپنی دوستی سے بدظن کر دیا تھا اور اسٹھ اس کی باتوں کو بھٹانے کے لیے وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے فریب نواز خبریں بھی نہیں سنیں کہ ہووارڈ نے یہی کیسی باتیں اس سے منسوب کر کے لڑکی کو سنائی تھیں اور اس نے اسے اس سے چھین لیا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے غلطی۔ لاطمق تھا لہذا وہ سخت حواس باختہ ہو گیا لیکن وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر یہی سمجھا کہ لڑکی نے اس سے بے وفائی کی اور بس۔ ہو سکتا ہے اس واقعے نے اس کا دل نہ توڑا ہو۔ مردوں کے دل اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ ہاں انہیں ذہنی کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ہووارڈ کو شروع سے ناپسند کرتا آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ یہ عام سی ناپسندیدگی تھی جو مردوں میں ایک دوسرے کے لیے پائی جاتی ہے۔ بہر حال اسٹھ جہاں تھا، وہیں رہا۔ چند دنوں کے بعد اسے اپنی محبوبہ کی شادی کی خبر موصول ہوئی اور عشق کا وہ باپ بے ختم ہو گیا۔ کم از کم اسٹھ نے اپنے تئیں یہی سمجھا اور کبھی سے ہووارڈ نے بھی یہی سمجھا ہو....."

"شب دروہی طرح گزرتے رہے اور ان کا پھلتا پھولتا رہا۔ دونوں اس دن کی آس میں جی رہے تھے کبھی نہ کبھی ان کی شادی ہو جائے گی اور وہ ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ اگر وہ دونوں چاہتے تو اس میں بھی شادی کر سکتے تھے لیکن فرض کیجئے کہ اسٹھ کے دوسرے شہر میں پیرا کمانے کا سہرا موصول کیا گیا اور وہ لڑکی بے شک اس کا انتظار کرتی رہی اور ممکن ہے کہ اسے یہ خیال بھی گزرتا ہو کہ اسٹھ کی شادی سے پہلے وہ ہارڈ ویئر سلیزمن تھا اور گاہے بگاہے اس کا کاروباری دورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ خوب رو، صحت مند اور حال تھا۔ وہ بھی اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے ہووارڈ تھا۔"

دعا

دعا پر اعتماد ہی نیکی ہے، جب ہم تہائی اور خاموشی میں دعا مانگیں تو ہم اس یقین کا اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارا اللہ تہائی میں ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی کی زبان بھی سنتا ہے۔ دعا میں خلوص آنکھوں کو پر غم بنا دیتا ہے۔ یہی آنسو دعا کی منظوری کی دلیل ہیں۔

دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دعا زمانے بدل دیتی ہے۔ یہ گردش روزگار کو روک اور آنے والی بلاؤں کو نال سکتی ہے۔ دعا میں بڑی قوت ہے۔ جب تک سینے میں ایمان ہے، دعا پر یقین رہتا ہے۔ جس کا دعا پر یقین نہیں، اس کے سینے میں ایمان نہیں۔

اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ ہمیں ہماری دعاؤں کی اقا دیت سے مایوس نہ ہونے دے۔ آمین
طالب حسین طلحہ، ہائی ٹیک پورٹی، نیو سینٹر جنرل، ملتان

لفظوں سے خوشبو آئے

میرا مشاہدہ ہے کہ لوگ ترقی کرنے کے لیے دو مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی ناگ کھینچتے ہیں اور انہیں پیچھے دھکیل کر خود آگے ہونا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً ناکام رہتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے ساتھیوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی سعی کرتے ہیں وہ عموماً نہیں بلکہ اکثر کامیاب ہوتے ہیں۔

(Elihu root)

☆ سوچنا اور غور و فکر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ یہ زحمت گوارا کرتے ہیں۔ (ہنری فورڈ)
☆ لوگ پہاڑوں پر سے نہیں اکثر کنکروں پر سے پھسلتے ہیں۔ (کنیوشس)

مرسلہ ریاض بیٹ، حسن ابدال

"بہت خوب۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "تمہارے محفل کی داد دیتا ہوں۔ تم اس پر ایک اچھی کہانی لکھ سکتے ہو لیکن جارج کا اس کہانی سے کیا تعلق؟"

"مجھے اپنی بات عمل کرنے دو۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے، یہ ایک فرضی داستان ہو لیکن تم دیکھو گے کہ یہ حقیقت کی کتنی عجیب عکاسی کرتی ہے۔۔۔۔۔ پھر وقت گزرتا رہتا ہے۔ کئی سال بیت جاتے ہیں۔ ایک روز اسمتھ کو لڑکی کی ماں کا ایک خط موصول ہوتا ہے۔ وہ اسمتھ کو شروع ہی سے پسند کرتی آئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی بیٹی یعنی سوز ہووارڈ مر گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شروع سے آخر تک ہووارڈ کا سارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شادی کے بعد ہووارڈ نے اس کی بیٹی کو ایک لٹے کا بھی سکھ نہیں دیا تھا۔ وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا تھا۔ اس کی انہی حرکتوں نے اس کی بیٹی کی جان لے لی تھی۔ وہ اس سے طلاق لے سکتی تھی لیکن وہ اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ طلاق لینے کے بجائے اس نے خودکشی کر لی تھی۔ آپ سوچ سکتے ہیں وہ کتنی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا رہی ہوگی۔ آپ لوگوں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ ممکن ہے، آپ کو تصویر دیکھ کر اس کی فطرت کا اندازہ ہو گیا ہو۔"

"بہر حال اسمتھ اس کے خط کا جواب دیتا ہے اور تعزیت کرنے کے ساتھ ہی لکھتا ہے کہ اگر ہووارڈ بھی اسے مل گیا تو وہ اس کا بہت برا حشر کرے گا کیونکہ وہی لڑکی کی خودکشی کا ذمہ دار تھا۔ ایسے ہی جیسے اس نے اس معصوم سستی کا گل کیا ہو۔ ہم اسے قتل نہیں کہہ سکتے لیکن کیا واقعی یہ قتل نہیں تھا؟"

ان میں سے نصف درجن ارکان جیوری نے میری تائید میں سر ہلایا۔ وہ سب کے سب شادی شدہ تھے۔ ممکن ہے ان کی بیٹیاں بھی ہوں۔ میں نے سلسلہ کلام از سر نو جوڑتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"لڑکی کی ماں نے اس کے سارے کروت اسمتھ کے گوش گزار کر دیے تھے اور اب وہ جان گیا تھا کہ ہووارڈ نے کس طرح اسے اپنی راہ سے ہٹایا تھا۔"

"پھر ایک رات ان دونوں کی مذہبیٹرولیم اسٹریٹ کے کوز پر ہوئی۔ یہ وہی رات تھی جب سوز پیٹرن اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے نزلے کی شکایت نہیں تھی۔ یہ لڑکی کی خودکشی کے بہت عرصے بعد کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دونوں رقیبوں کی سر راہ ملاقات ہوئی تھی اور ہووارڈ،

اسمتھ کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا جیسی اسمتھ کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اسی شہر میں ہے۔"

وہ سب ہمیں تن گوش تھے کیونکہ اب ان پر حقیقت واضح ہوتی جا رہی تھی کہ میں اسمتھ سے اور اس کی داستان حیات سے واقف ہوں اور میں بے شک واقف تھا۔ تاہم ان میں سے ایک نے فقرہ چست کیا۔ "معلوم ہوتا ہے تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "اس رات ایک بار پھر ان دونوں کا آمنہ سامنا ہو گیا تھا۔ ہووارڈ اس ناگہانی مذہبیٹرولیم کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے پاس ریو انور موجود تھا۔ وہ اس کی ملاقات کے بعد سے ہر وقت اپنے پاس ریو انور لے پھرتا تھا۔ دراصل وہ کوئی خطرہ مول نہیں لیتا چاہتا تھا کہ اسمتھ قطعی غیر مسلح تھا۔ وہ ہووارڈ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ ملاقات اتفاقی تھی۔ دونوں میں تلخ کلامی ہونے لگی۔ ہووارڈ خود کو بے تصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوز پیٹرن نے انہیں اپنی کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کی بحث و کھمراہی سنی تھی۔ اسمتھ نسبتاً خاموش تھا۔ وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا اور اب اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا لہذا اس نے ہووارڈ کو اپنی انتہائی عزیز کسی کا پورا احوال موقع دیا۔ بالآخر ہووارڈ نے اپنی بیوی سے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر اپنے پرس میں سے اس کی کتنی ہی تصویر نکال لی اور مجھ کے آنسو بہانے لگا۔ اس کی اس ریا کاری پر اسمتھ کا خون کھول اٹھا۔ اس نے وہ تصویر بچھٹ لی اور دوسرے ہاتھ کا مٹکا پوری قوت سے اس کے منہ پر مارنا چاہا مگر ہووارڈ نے پھرتی سے غوطہ لگایا، ساتھ ہی اپنا ریو انور بھی نکال لیا۔ اسمتھ نے اس کے ریو انور پر ہاتھ ڈال دیا اور اسی کشمکش میں ریو انور چل گیا لیکن پہلا فائر ہوا ہی تھا۔ اس کے بعد مزید دو فائر ہوئے۔ میں سچ سچ اسمتھ کی طرف واری نہیں کر رہا۔ ممکن ہے اس وقت اس سے غیر ارادی طور پر وہ حرکت سرزد ہو گئی ہو اور وہ اس حرکت کا ذمہ دار نہ ہو یا ممکن ہے، ذمہ دار ہو۔ ہووارڈ نے اس پر چھلانگ لگائی اور اسمتھ نے اس پر دو فائر جھونک دیے۔ ایک ہی سیکنڈ میں معاملہ ختم ہو گیا اور اسمتھ ایک قاتل بن گیا۔ زندگی میں بھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم وہ حرکت کر گزرتے ہیں جس کے کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے، کوئی منصوبہ نہیں بناتے۔ ممکن ہے، اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے اندر ایک جانور بھی بیٹھا ہے، جو کبھی کبھی ہم پر غالب آجاتا ہے۔ آپ اسے

استعمال کہہ لیں۔"

ڈین غور سے میری باتیں سن رہا تھا اور اب مجھ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا تھا۔ "یہ اسمتھ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ "کیا جارج ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسمتھ وہ شخص ہے جسے زبان نے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ جارج کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ عین وقت پر جائے واردات کے پاس سے نشے میں چور ڈمگاتا ہوا گزرتا تو یہ دیکھنے کے لیے رک گیا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اسمتھ جو اپنی اس حد درجہ سنگین غلطی پر انتہائی دہشت زدہ تھا اور موقع واردات سے فرار ہونا چاہتا تھا، اپنی مجبوری کی وہ کتنی ہی تصویر اٹھا کر اور مقتول کا ریو انور جارج کو تھما کر بھاگ گیا۔ اس نے اتنی چڑھا رکھی تھی کہ اسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جرم کی سحت سے انکار کر دیا لیکن اس وقت تک اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔"

میں نے اتنا بیان کرنے کے بعد ایک لمحہ توقف کیا اور ایک چہری سانس خارج کر کے دوبارہ لب کھولے۔ "یہ ہے اس قاتل کا پس منظر۔۔۔۔۔ اور اب ہمارے کرنے کے لیے ایک ہی کام رہ گیا ہے وہ ہے کہ جارج کو باعزت بری کر دیں۔"

ان سب کو سنا پھڑک گیا تھا۔ چند لمحے تک وہ سب ایک تک مجھے گھورتے رہے پھر ڈین کے پتلے میں جان پڑی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔ "رسل! یہ بلاشبہ ایک اچھی کہانی ہے اور اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو تم یقیناً اس شخص کو جانتے ہو گے۔ میری مراد اسمتھ سے ہے۔ نیز تمہیں اپنی کہانی سچ ثابت کرنا پڑے گی اور جو نیکی یہ سچ ثابت ہوگی، ہم جارج کو باعزت بری کر دیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ عین اگر تم جارج کو بے گناہ ظاہر کر کے رہا کروانے کے لیے پابند ہیں والی کہانی سنا رہے ہو تو۔۔۔۔۔"

"بہتر ہے۔" میں درمیان میں ہی بول پڑا۔ "تمہیں بہتر ثبوت کیا چاہیے؟"

اس نے ایک لمحہ غور کیا اور پھر لب کھولے۔ "اگر تم اسمتھ کو پیش کر دو تو بات بن جائے گی۔ کیوں دوستو! لیکن اسمتھ کو وہ تصویر پیش کرنی پڑے گی تاکہ ہمیں یقین آجائے کہ وہی اسمتھ ہے اور اس کی کہانی سچ ہے۔ میرے خیال میں، وہ تصویر ایک ناقابل تردید ثبوت ہے، کیوں دوستو؟" باقی ارکان جیوری نے اس سے

اتفاق کیا۔ وہ سب ایک دوسرے کی باتوں سے اتفاق کرتے تھے سوائے میرے۔۔۔۔۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اسمتھ کا کیا پتہ گا؟ کیا وہ جارج کی جگہ لے لے گا؟ تم لوگوں کو اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے کیا تم لوگ اسے ہووارڈ کے قتل کے الزام میں تختہ دار پر لٹکا دو گے؟ واضح رہے کہ میں نے جو کچھ کہا، سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس وقت تم لوگ اسمتھ کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہو۔ تم اسے سزائے موت دو گے یا رہا کر دو گے؟ اگر تم نے عدالت کو اسمتھ کے بارے میں بتا دیا تو دوسری جیوری اس معاملے کو اس طرح نہیں دیکھے گی جس طرح تم لوگوں نے سمجھا ہے۔ تم لوگوں پر حقیقت منکشف ہو گئی ہے۔ کہو، کیا کہتے ہو؟"

"ہم اسے رہا کر دیں گے۔" ایک نے کہا۔

دوسروں نے بھی اس پر غور کیا لیکن ان کا جواب ان کے چہرے پر تحریر تھا۔ وہ اسمتھ کو رہا کرنے کے حق میں تھے۔ اس سے جو غیر شعوری فعل سرزد ہوا تھا، وہ کسی سے بھی سرزد ہو سکتا تھا۔

"یہ رہتی وہ تصویر۔۔۔۔۔" میں نے تصویر اپنی جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "اسے خوب غور سے دیکھو۔ یہ قاتل کی اس رات سے اب تک میری جیب میں پڑی ہوئی ہے اور اب مجھے غور سے دیکھو۔۔۔۔۔ ہاں، کیا اسمتھ ہوں؟"

کمرے کے ایک سرے سے دوسرے تک زبردست سسٹی پچیل گئی۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے اور وہ پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے ایک تک مجھے گھورتے چلے گئے۔ بہت دیر بعد انہیں ہوش آیا۔ تصویر وہی تھی۔ انہوں نے وہ تصویر درجنوں بار اخبارات میں دیکھی تھی۔ کبھی وہ تصویر کو، کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتے۔ ان سسٹی خیز لحات میں مجھے پچاسی کا پھندا اپنی گردن پر پھینسا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن میں ان کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ ان کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا تھا لیکن انہیں میری بات پر یقین آ گیا تھا پھر ان میں سے ایک پتہ قامت رکن نے جو جارج کو سزائے موت دینے کا زبردست حامی تھا، خوش طبعی سے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ڈرومٹ، ہم میں سے کوئی بھی تم پر فرد جرم عائد نہیں کرے گا۔ آؤ دوستو! یہ آخری قرعہ اندازی ہے۔ جارج بے گناہ ہے اور اسمتھ بھی بے گناہ ہے۔ یہی ہمارا فیصلہ ہے۔"

مہفل شہر و سخن

✽ جبران احمد ملک..... کلشن اقبال، کراچی
کسی نے پھر ہمیں تغیر کر لیا آخر
کوئی مثال تو آئی تری مثال کے بعد
✽ زاہد چودھری..... چھوڑ کینٹ
موسم ہجر میں یہ بارش کا برسنا کیسا؟
اک صحرا سے سمندر کا گزرتا کیسا؟
اے میرے دل نہ پریشان ہو تجھا ہو کر
وہ تیرے ساتھ چلا کب تھا چھڑتا کیسا؟
✽ کمال انور..... کراچی
اس کے بعد اور بھی سخت مقام آئے گا
حاصل یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا

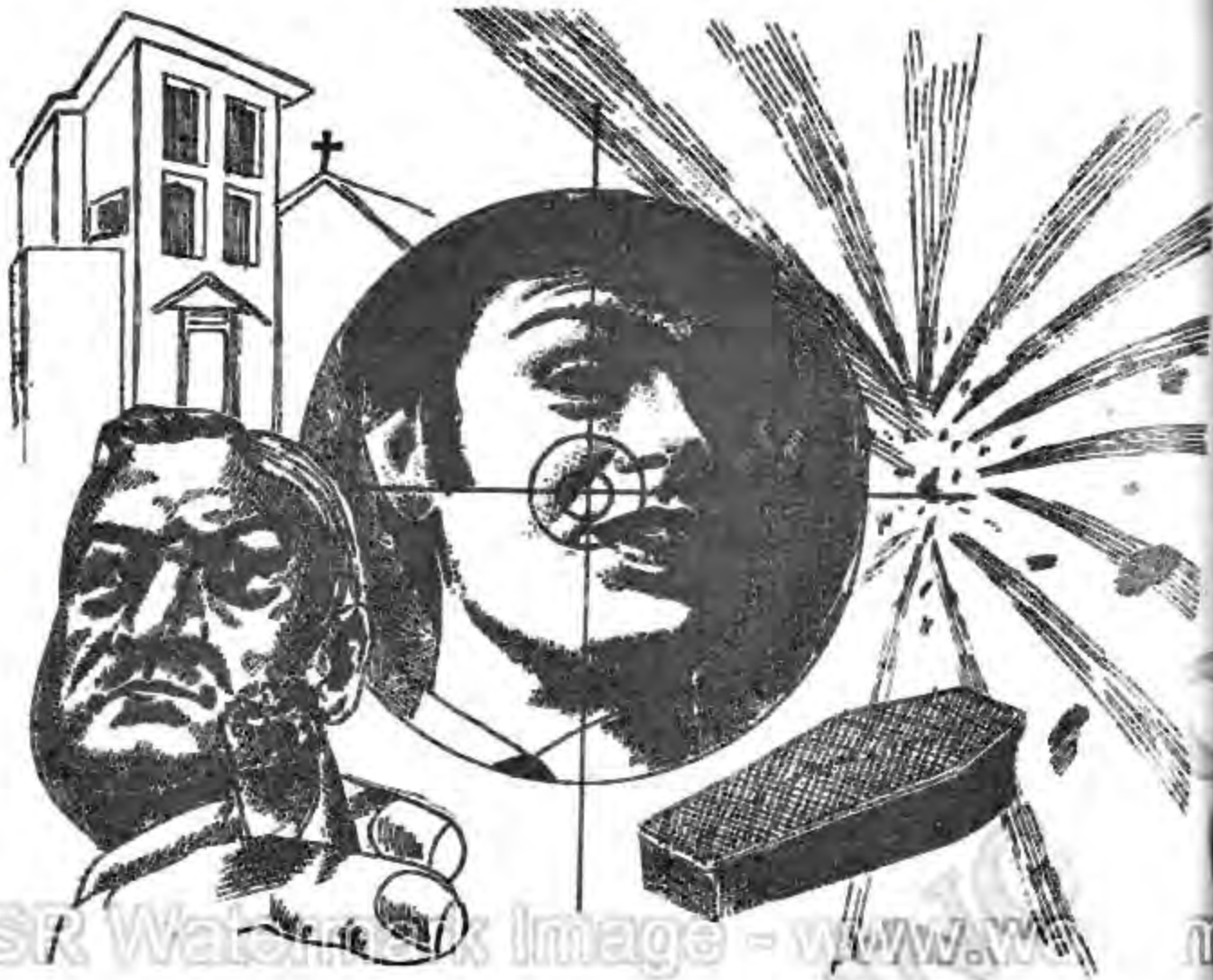
✽ زخمی کرشن..... عمرکوٹ
ہو ستم کشوں کا ملتا وہ مہر ہے شام غم کے ساتھ
بجس رو پڑا تبسم بھی زخم مسکرائے
✽ احسان سحر..... میانوالی
تک آچکے ہیں اب تو فریب نظر سے ہم
گھبرا گئے ہیں اپنے ہی دیوار و در سے ہم
✽ قیصر اعوان..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
نہ میرے قلم سے لکھی گئی نہ میری زبان سے ادا ہوئی
جو آنکھ سے کہنے کی بات تھی وہ حروف میں نہ سائے گی
کوئی پھول چھتا ہے کس طرح کوئی دھول ہوتا ہے کس طرح
یہ وقت وقت کی بات ہے تمہیں زندگی ہی بتائے گی
✽ عبدالجبار رومی انصاری..... لاہور
لاکھ خاموش رہیں ضبط کے خوگر ہو کر
آنسوؤں سے بھی تو کچھ راز عیاں ہوتا ہے
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
جانے کیا مجھ سے زمانہ چاہتا ہے
میرا دل توڑ کر بھی مجھے ہنسانا چاہتا ہے
جاننے کیا بات جھلکتی ہے میرے چہرے پر
ہر شخص مجھے ہی آزمانا چاہتا ہے



✽ نقیہ الرحمن، لیاقت نگر، ارشد کمن..... فصل آباد
کیوں بھلا یاد دلاؤں انہیں وعدہ ان کا
پھر وہ کہہ دیں گے ہمیں تیری قسم یاد نہیں
✽ اسد عباس..... سرگودھا
دنیا کے سب کارج چھوڑے نام پر تیرے انشانے
پہلے کیا تم تھوڑے تھے، تیرا عشق مزید ہوا
✽ امتیاز علی..... سرگودھا
رات کو شمع کی مانند پگھل کر دیکھو
زندگی کیا ہے کسی طاق میں جل کر دیکھو
اپنے چہرے کو بدلنا تو بڑا مشکل ہے
جی بہل جائے گا آئینہ بدل کر دیکھو
✽ محمد اکبر ناچ..... لودھراں
چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ
اتنا برا سلوک میری سادگی کے ساتھ

✽ تفسیر عباس باپیر..... اوکاڑہ
مثل خیال و خواب ہمیں وصل کی وہ راحتیں
مقدم میں پھر ہجر کا زندان اس نے لکھ دیا
پس وہ پیش سا درپیش تھا بوقت رخصت یوں ہوا
قرطاس کذب و ریا پہ اک بیان اس نے لکھ دیا
✽ سعدیہ بخاری..... ضلع انک
اب کسی بات پہ کیا اس سے خفا ہونا ہے
زندگی ہجر کے لیے جس سے جدا ہونا ہے
تم سے پھڑکے ہیں تو اب سینے کی عمر یوں میں
کون دیکھے گا جو اک حشر چا ہونا ہے
✽ مہرین ناز..... حیدرآباد
جو ہم سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہتا
اس شخص کے لوٹ آنے کا امکان سا کیوں ہے
مٹی کا بنا ہے تو کھل کیوں نہیں جاتا
پتھر کا اگر ہے تو پھر انسان سا کیوں ہے
✽ راجہ افتخار علی..... چچا سدن شاہ (موہڑہ)
بھی جہدے بھی آنسو ہزاروں کوششیں لیکن
جو قسمت میں نہیں لکھا وہ رونے سے نہیں ملتا
✽ عمران علی..... عمرکوٹ، نگر پارکر
کیا خوب ہی ہوتا اگر دکھ ریت کے ہوتے
کسی سے گرا دیتے پاؤں سے اڑا دیتے
✽ شبانہ حسن..... لاہور
زیست میں چلتے چلتے
کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
بے تحاشا محبت کرنے والے
بے چہرہ چھوڑ جاتے ہیں
✽ محمد آصف شہزادہ..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
اب تیرے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایہ ابر کی مانند گزر جاؤں گا
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانہوال
یاد کا تضاد ہے تیرے حسن و کرم میں
نہ ہونٹوں سے بہت سخت بولتے ہو
✽ ایم رشید سیال..... روپڑی، سکھر
ایسا کہ مطمئن کر دے!
سچے ہیں اس کے جھوٹ!

✽ طالب حسین طلحہ..... نیو سینٹرل جیل ملتان
شام غم ایسی بلاخیز نہ دیکھی تھی کبھی
آسمان پر نہ رہا کوئی بھی تارا باقی
اب کہیں جتنی نہیں محفل ارہابہ چین
میں ہی رہ گیا اس بزم میں تنہا باقی
✽ احمد علی صدیقی..... نیو سینٹرل جیل ملتان
ہم اپنے زخم دکھاتے کے زمانے میں
کسی نے قصہ غم شوق سے سنا ہی نہیں
لے لے جو اشک تو ہم پر ہی گئے خاموشی سے
ہمارا درد نمایاں بھی ہوا ہی نہیں
✽ سید اکبر شاہ..... مانسہرہ
خاک نکلی آرزو اگر نکلی
ہر سسی اپنی بے اثر نکلی
کونئی باخبر ہے دوراں سے
نکلی اپنی ہی بے خبر نکلی
✽ ناصر علی صدیقی..... رحیم یار خان
بہت سکون سے ہو میرے بن
جیسے ایجنس کوئی سلجھ سکتی ہو
✽ عبدالغفور خان ساغر ٹنگ..... چھب، ضلع انک
بہت پختہ مزاج ہے وہ شخص
اسے یاد ہے کہ مجھے یاد نہیں کرنا
✽ زویب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
اس طرح کیے پھرتے ہیں تیری محبت کو ہم
ٹوٹا ہوا بازو جیسے سینے سے لگا ہو
✽ عرفان احمد عاجز..... چچا سدن شاہ
بنا کے گردش دوراں کو زندگی ہم نے
یہ بار زیست اٹھایا ہنسی خوشی ہم نے
اٹھا کے ناز ترے صبح و شام جان کلیم
بڑھا دیا ترا امانِ دلبری ہم نے
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
تم مکانوں میں ہو مقید تمہیں کیا معلوم
دل میں اخلاص و محبت ہو تو گھر بنتے ہیں
✽ امجد ہرل..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
پھڑکے تجھ سے نہ دیکھے گئے وصال کے موسم
کسی کو ملنے ہوئے دیکھا تو ڈھانپ لیں آنکھیں



شکنبہ

سلیم انور

کھا کھا کر گوشت کا پہاڑ بننا اور پھر فاقے کر کر کے رفتہ رفتہ اس پہاڑ کو گھٹانا ہر زمانے کا فیشن رہا ہے شاید... وہ بھی اس اذیت کا شکار تھا کہ ایک روز اس کے ہاتھ ایسا گر لگا کہ بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا... کیونکہ یہ سب تو زندگی کے جھمیلے ہیں مگر وہ کیوں دھیرے دھیرے موت کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

قاتلے کی ٹکر میں ٹھٹھے والوں کی عجیب منتوں کا اظہار

جس روز میری ملاقات وینڈی ہانڈو سے ہوئی،
میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی۔
بڑا کارٹن ہوئی کے بار کا ماحول نہایت پرسکون تھا
اور ہر شے سے نفاست نکل رہی تھی۔ میری پوری زندگی
پوشن شہر میں گزری تھی لیکن مجھے کبھی رٹو کارٹن میں جانے کی
تجارت نہیں ہوئی تھی۔ باہر سڑک پر لوگ جو لائی کی نم آلود فضا
سے بچنے کے لیے تیز تیز قدموں سے ادھر سے ادھر جا رہے
تھے اور پبلک گارڈنز کی جانب رواں ٹریفک دھیرے
دھیرے بڑھ رہا تھا۔
لیکن رٹو کارٹن کے باری فضا میں مدھم مدھم سرگوشیوں
اور برف کے ڈالوں کی ٹن ٹن کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں
دے رہی تھی۔ میں نے اپنی نگاہیں کھڑکی کی جانب سے

نزمین اعجاز..... فیصل آباد
رستے گلیوں پر ہنستے ہیں، آنکھیں دیرانی پر
کیا منظر بدل گیا اس خوش رفتار کے ساتھ
افتخار احمد..... کوٹلی

اس عمر میں خوش فہمیاں اچھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو وعدوں کے حوالے نہیں کرنا
امجد عباس..... کوئٹہ

اس قدر تنگ نہیں وسعت صحرائے جہاں
ہم تو اک اور ہی وحشت میں ملے ہیں تجھ سے
مدحت..... کراچی

جس بات کو پھرتے ہو چھپائے ہوئے دل میں
وہ بات کسی سے بھی چھپانے کی نہیں ہے
محمد افضل..... لاہور

وہ کوئی نشہ نہیں تھا کہ ٹوٹا مجھ میں
وہ سانحہ بھی نہیں تھا کہ جو گزر جاتا
انجماز احمد..... اسلام آباد

تم نے چاہا بھی تو کس حال میں چاہا ہے ہمیں
جب ہمیں وقت بدلتے ہوئے ڈر لگتا ہے
ہادول خان..... پشاور

سنا ہے اب انہیں رستے فریب دیتے ہیں
جو لوگ چھوڑ گئے تھے مجھے شرارت میں
ثانیب..... حیدرآباد

دکھائی کچھ نہیں دیتا نگاہ ہوتے ہوئے
بچا ہوا ہے وہ قاتل گواہ ہوتے ہوئے
عزیز خورشید..... ملتان

اب جو ملتی ہے تو تمہاری یہی پوچھتی ہے
تم ہو پھڑے ہوئے لوگوں کو ملانے والے
محمد فراز..... کراچی

خاموشی سے ظلم سہے جاتے ہیں لوگ
کتنی تن آسانی بڑھتی جاتی ہے

سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لہ
یہ علم کا سوا، یہ رسالے یہ کتابیں
ایک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے

کائنات مریم، عائشہ ثانی..... حیدرآباد
ہم تو مٹی سے اکائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر توڑنے جاتے ہو ستارے جاؤ

احمد حسن عرضی خان..... قبولہ شریف ہائی پاس
ہار جاتا میں خوشی سے کہ وفا کا تھا سوال
جیت جاتی وہ اگر شرط لگاتی مجھ سے

ہارون بھروس..... مردان
ذرا سی بھول پر جنت سے نکلا
میں بھکا کب تھا بھکایا گیا ہوں

رائمہ..... کوٹلی
کس منہ سے جاؤ گے خدا کے روبرو محشر میں تم
عمر ساری عشق تہاں میں اب گزر جانے کے بعد

نعیم الحسن شاہ..... اسلام آباد
رہتے بھی دل میں ہو، دکھاتے بھی دل ہی ہو
اپنا مقام دیکھو اور اپنے کام دیکھو

رمضان پاشا..... بھٹن اقبال، کراچی
اس وطن کے واسطے دی جتنی قربانی نہ پوچھ
چشم گردوں کی مگر یہ فتنہ سامانی نہ پوچھ

ڈاکٹر محمد ناصر عباس..... خوشاب
دل کے دروازے پہ پھر سے ہے شناسا دستک
پھر وہی شخص نیا روپ لیے آیا ہے

شازیہ کمال..... نارنگ پور، کراچی
سفر کا بوجھ ہے سر پر، لدے ہوئے زر سے
تھکے ہوئے مسافر، چلے تھے جو گھر سے

نورین عباس..... پشاور
اک ایسے عالم وارفتگی سے گزرا ہوں
جہاں سینٹا خود کو تو میں بکھر جاتا

محفل شعرو سخن

کوین
برائے
سمالہ
فروری
2015

نام :
پتا :

پھیرتے ہوئے میز کے مقابل بیٹھی وینڈی پر مرکز کر لیں۔ ہماری یہ ملاقات بارہ برس بعد ہو رہی تھی اور جب اس نے نوپوری اسٹریٹ پر مجھے پہچان لیا تو اسے دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔

وینڈی اپنی انگلی گرنٹل گلاس کے کنارے پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایک عذاب کی زندگی تھی، ہم۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے متعلق میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ کیا تم ہمارے درپردہ تعلقات کے پیش نظر اس موضوع کو زیر بحث لانے سے گریز نہیں کر سکتے؟“

میں نے مٹھی بھر چھوٹے بسکٹ منہ میں ڈالے اور بیڑ کے ساتھ انہیں حلق سے نیچے اتار لیا۔ باوردی ویٹر مشروبات کی ٹرے لیے چھوٹے چھوٹے قدموں سے میزوں کے درمیان منڈلا رہا تھا۔ میرے ذہن کے پردے پر ہائی اسکول کے دور کا منظر گھومنے لگا۔

میں اور وینڈی دونوں ہی بھونڈے پن کی حد تک بھاری بھر کم تھے اور ہمیں اپنے ہم جماعتوں کے وطن وطن اور شہر کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وینڈی ہوشیار اور ذہین تھی اور لوگوں، جانوروں اور پودوں پر مہربان رہتی تھی۔ وہ ہر ایک پر اعتماد کرتی تھی اور ان کی عالمانہ حرکات کو نہیں سمجھتی تھی۔ ان برسوں میں ہم امتحانات میں اس لیے پاس ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ہم ایک جان دو قالب کی طرح تھے۔ ہمارے جسم تو دو تھے لیکن روح ایک تھی۔ یہ مان لیا کہ یہ دونوں جسم بے حد بھاری بھر کم تھے۔

گر بچپن کے بعد وینڈی نے برکٹ سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ اسے نیویارک کی ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی۔ اس نے اپنے کالج کے دور کے ایک ساتھی سے شادی کرنی اور اپنا وزن ڈھیروں گھٹا لیا۔

میں یوشن یونیورسٹی چلا گیا اور ایک اکاڈمٹس بن گیا۔ چار سال قبل میں نے سینڈرا سے شادی کر لی تھی اور شادی کے بعد سے میرا وزن چھیالیس پونڈ بڑھ گیا تھا۔ میری پانچ فٹ آٹھ انچ کی قامت اب دو سو ساٹھ پونڈ کا وزن اٹھائے پھرتی تھی۔

اپنا وزن گھٹانے کے لیے میں نے ہر قسم کا ڈائٹ پلان آزمایا، ہسپاناٹاز کے کورس مکمل کیے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

”تمہارے اندر ایک سے زیادہ انداز سے تہلیلیاں آچکی ہیں۔“ میں نے قدرے غصے سے کہا۔ اپنے وزن گھٹانے کے راز سے متعلق گفتگو سے گریز پر مجھے وینڈی پر

غصہ آ گیا تھا۔ ”یاد ہے ہم نے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا عہد کیا تھا۔ میں تم سے کسی قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں پھر کیا بات ہے؟“

وینڈی اپنی انگلیاں اپنے سرخ لائے بالوں میں پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھیں سبز تھیں اور اس نے جو ڈارک پینٹ سوٹ پہنا ہوا تھا، وہ قیمتی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے وہی نیلی شرٹ اور پتلی سیاہ ٹائی پہنی ہوئی تھی جو میں نئے میں تین دن پہنتا تھا کیونکہ یہ ان چند اشیاء میں شامل تھیں جو میری ملکیت تھیں۔

”بات یہ ہے کہ میں اسے دہرانا نہیں چاہتی۔“ وینڈی نے آہستگی سے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ چھو لیا۔ ”اوکے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں۔ ”لیکن تم نے مجھے بے اعتنا حیرت میں ڈال دیا ہے۔ تم نے کتنا وزن گھٹایا؟ اتنی پونڈ؟“ ”حقیقت میں بیانوے پونڈ۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”یہ صرف مقصد کی جانب درست طور پر راضی کرنے کا سوال تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔ میں دنیا کا سب سے زیادہ ترغیب پانے والا ہوں۔ جب میں نے سینڈرا سے شادی کی تو میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ کتنا وزن گھٹاؤں گا۔ لیکن ہوا یوں کہ میرا وزن مزید بڑھ گیا۔ میں نے تصور کیا تھا کہ سینڈرا اور میں زندگی بھر ساتھ رہیں گے، ہمارے بچے ہوں گے اور مضامقات میں ایک مثالی گھر بنا گئیں گے جس کا احاطہ سفید جالی دار ہوگا۔“ یہ کہہ کر میں نے قدرے توقف کیا۔ وینڈی خاموشی سے میری بات سن رہی تھی۔

”چند روز قبل میں نے اپنا طبی معائنہ کرایا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا، میرا دل میرے اضافی وزن کی تاب کب تک لاسکتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میں چالیس برس کی عمر پا جاؤں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ لیکن میں پھر بھی کھائے چلا جا رہا ہوں۔ یہ ایک بیماری ہے جو مجھے لاحق ہو گئی ہے۔ سینڈرا یہ دیکھنے کے لیے عارضی علیحدگی چاہتی ہے کہ شاید مجھے کچھ ہوش آجائے اور میں اپنا وزن گھٹا لوں۔“ میں نے سر ہلا دیا۔ ”یہی وہ واحد چیز ہے جو میری زندگی بچا سکتی ہے۔“

”مجھے یہ سن کر بے حد افسوس ہوا۔“ میں نے بیڑ کا ایک گھونٹ بھرا۔ ”سنو! یہ میرے لیے قابل قبول ہوگا۔ بات یہ ہے کہ کوئی مجھے اس معاملے میں سنجیدہ

نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ اپنے کام پر بھی میں وہ موٹا آدمی ہوں جو ہر وقت مذاق کرتا رہتا ہے۔ مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے؟ تم نے وزن گھٹا لیا تو پھر میں اپنا وزن کیوں نہیں گھٹا سکتا؟“

وینڈی نے ایک چھوٹا بسکٹ اٹھایا، اس کا کنارہ دانتوں سے چبایا اور باقی بسکٹ اپنے نینک پر رکھ دیا۔ ”مجھے یہ تجویز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ہم یہاں ملاقات کریں۔ تم سے سرراہ ملاقات ہو گئی تھی، بس یہی کافی تھا۔ میں نے سوچا کہ کہیں بیٹھ کر پرانے دور کی یادوں کو تازہ کر لیں گے۔“

میں نے اپنی کرسی پیچھے سرکائی تو اس نے صدائے احتجاج بلند کی۔ میں نے تصور میں کرسی کو لاکھٹے اور خود کو چاروں جانب پھرنے سے قائلین پرکھے ہوئے تریبونز کے مانند ڈھیر پایا جو تم سے اعانت طلب کیے جا رہا ہوں جیسا کہ ہائی اسکول کے زمانے میں کیا کرتا تھا۔ تم اپنی زندگی کے بارے میں بھی تو بتاؤ۔ وہ کون خوش قسمت ہے جس سے تم نے شادی کی تھی؟“ وینڈی نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ ”چند سال قبل اس کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”اوہ گاڈ، وینڈی! یہ تو بڑی ہولناک بات ہے۔“ ابرو میں ہلکا سا غصہ تھا اور ہاتھوں میں جبکہ یہ تم پر غصے عذاب بھیجنا پڑا ہے۔“

وینڈی نے ایک لمبا سانس کھینچا۔ ”جیس، تم..... تم جو کچھ جیل رہے ہو اگر اس عذاب کو کوئی سمجھ سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ میں خود غرض ہو گئی تھی۔“ یہ کہہ کر اس نے چند سیکنڈ کے لیے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا۔ پھر جب اس نے دوبارہ نظریں گھمائیں تو اس کی آنکھوں کے تاثرات نرم پڑ چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہے۔

”شاید تمہارا کام بھی بن جائے۔ میں ایک ترغیب دینے والی اسپیشلسٹ کے پاس گئی تھی۔ اضافی وزن والے افراد کے معاملے میں اس کی کامیابی کا ریت اٹھانے سے فیصلہ ہے۔“

”اس کا راز کیا ہے؟“

”کوئی راز نہیں۔ یہ معاملہ شراکت کا ہے۔ اس کی خدمات منہیں ہیں اور وہ صرف وہ گلٹنس لیتی ہے جو اس کے ساتھ اپنے عہد کو پورا اور مکمل برقرار رکھیں۔“ وینڈی نے بتایا۔

”کیا تمہارے خیال میں وہ میری مدد کر سکتی ہے؟“

”وہ اس معاملے میں عمدہ ہے لیکن میں یہ بات ضرور کہوں گی کہ اس کا طریقہ کار قدرے مختلف ہے۔“

”میں اس نچ تک پہنچ چکا ہوں کہ کسی بھی چیز کو

آزمانے کے لیے تیار ہوں۔“ وینڈی نے اپنا پرس کھولا اور ایک کارڈ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کارڈ لے کر پڑھا۔ اس پر لکھا تھا۔ ”سانٹھا ایلٹن، موٹی ویلن تھراپسٹ۔“

نیچے ایک فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ”وہ اپنا اشتہار نہیں دیتی۔“ وینڈی نے کہا۔ ”میں نے اس کے بارے میں اپنی ایک دوست سے سنا تھا۔ اس کا دفتر یہاں سے چند گھنٹوں کی مسافت پر اسپرنگ فیلڈ میں ہے۔“ وینڈی نے میرے ہاتھ کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”اس سے قبل کہ تم اس سے رابطہ کرو، اس بات کی یقین دہانی کر لو کہ تم واقعی یہی چاہتے ہو۔“

میں نے کارڈ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”یہ میں نے طے کر لیا ہے۔ میں آج رات اس سے فون پر بات کروں گا۔“ وینڈی چند سیکنڈ تک خاموش رہی۔ مجھے اس کی آنکھوں کے تاثرات سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ پھر وہ گویا ہوئی۔ ”ویل، تو پھر یہ طے ہو گیا۔ سانٹھا ایلٹن تمہاری زندگی ہمیشہ کے لیے تبدیل کرنے والی ہے۔“

☆☆☆

اسپرنگ فیلڈ ریاست میساچوسٹس کے وسطی حصے میں واقع ایک قدیم صنعتی شہر تھا۔

جب میں قصبے کی مرکزی سڑک پر کارڈ رائیو کر رہا تھا تو میرے وجود میں ایک بیچانی کیفیت طاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ وہ دن ہے جو میری زندگی کو بدل دے گا۔

سانٹھا ایلٹن کے پاس دستیاب اپاٹمنٹ اس شب سے چھ ہفتے بعد کا تھا جب میں نے اسے فون کیا تھا۔ میرے خیال سے یہ ایک اچھی علامت تھی۔ یقیناً اس کی خدمات کے حصول کے لیے لوگ لمبی قطار میں تھے۔ اسی لیے اس نے مجھے چھ ہفتے بعد کا نام دیا تھا۔

اس نے مجھے جو راستہ سمجھایا تھا، اس پر چلنے ہوئے میں سانٹھا ایلٹن کے دفتر پہنچ گیا جو شہر کے کتر حصے میں ایک پرانے ویٹھاؤس میں واقع تھا۔ اس عمارت کی پہلی منزل پر ایک بار اور ایک گل فروش کی دکان تھی۔ دوسری منزل کی ایک گھڑکی پر سانٹھا کا نام... جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ بیرونی دیوار پر ٹھنڈے رنگارنگ پوسٹرز تھے اور دونوں جانب کی عمارتیں خالی تھیں جن کو تختے لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ سامنے سڑک پار خالی میدان دکھائی دے رہا تھا اور یہ پورا علاقہ صفائی چاہتا تھا۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ ایک کامیاب تھراپسٹ اپنے دفتر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہائر کوالٹی، کمپریٹڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ فولڈر میں موجود کاغذات کو پڑھنے میں یوں مگن رہی جیسے میں نے کچھ پوچھا ہی نہ ہو۔ پھر اپنی ٹیکہ دو بارہ ناک پر جاتے ہوئے مجھے گھورنے لگی۔ "میں یہاں تمہارا مسئلہ حل کرنے کے لیے موجود ہوں۔ ہماری ملاقات کہاں ہو رہی ہے، یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔" اس نے سر ہلچے میں کہا۔

میں بوکھلا سا گیا۔ اس لیے کہ میں توقع کر رہا تھا جو فرد میری اس پریشانی کا حل نکالے گا، وہ ہمدردی کے جذبے سے معمور اور حساس طبیعت کا مالک ہوگا۔ شاید اکھڑا اکھڑا لہجہ میرے مسئلے کے حل کے لیے ضروری تھا، یہ سوچ کر میں چپ رہا۔

ساتھ ساتھ اپنا فولڈر بند کر دیا اور ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ بھر بولی۔ "میرے خیال سے تمہارے لیے ایک سو پچاس پونڈ تک کا وزن کافی رہے گا۔" میں مسکرا دیا۔ "ایک سو پچاس پونڈ وزن زبردست رہے گا۔ لیکن میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ میں کھانا دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔"

وہ اپنے فولڈر پر انگلیاں بجاتے ہوئے بولی۔ "تم نے راجز اینڈ ڈکن کے یہاں بہ طور اکاؤنٹنٹ چار سال تک کام کیا ہے۔ تمہاری آمدنی تیس ہزار ڈالرز ہے۔ تمہاری بیوی سیدھا بہ طور سیکرٹری عارضی ملازمت کرتی ہے اور گزشتہ برس اس کی آمدنی بارہ ہزار ڈالرز تھی۔ تم دونوں کو بچوں کی خواہش ہے لیکن سیدھا تمہارے منہ پر اور وزن کے بارے میں فکر مند رہتی ہے اور اسے امید ہے کہ عارضی علیحدگی تمہیں اپنا وزن گھٹانے اور دبلا پتلا بننے پر مجبور کر دے گی۔"

یہ سن کر میرا منہ لٹک گیا۔ "آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟" "میری بیٹی ہمارے تمام کلائنٹس پر مکمل ریسرچ کرتی ہے مسٹر جم۔ میں ہر سیشن کی فیس تین سو ڈالرز لیتی ہوں اور نتائج کی ضمانت دیتی ہوں۔"

میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ "آپ میرے معاملے میں کچھ زیادہ تیز جارہی ہیں۔" میں نے فونکے ہوئے کہا۔ "میں خود کو کسی بھی چیز کا پابند بنانے سے قبل یہ جانتا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا طریقہ کار کیا ہے؟" ساتھ ساتھ اسٹیشن نے اپنا رخ میز کی طرف کیا، ایک دروازے کھولی اور کاغذ کی ایک شیٹ نکالی۔ "میرا کوئی طریقہ کار نہیں ہے۔ تمہارا جو جی چاہے کھا پی سکتے ہو۔" اس نے یہ کہتے ہوئے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ "پلیز اس پر دھیلا کر دو۔"

کے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کر سکتی ہے۔ اگر معاملہ ونڈری کی سفارش اور میرے عزم مصمم کا نہ ہوتا تو میں وہیں سے گھر واپس چلا جاتا۔

جو چیزیں اوپر جارہی تھیں ان پر ناگوار بورچہ ہوتی تھی۔ ہر طرف خالی بوٹیں اور کھانے پینے کی اشیاء کے رپر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری منزل کے بیشتر دفاتر کے دروازے بند تھے اور ہر شے کی سچ پر گرد کی تھیں جی ہوتی تھیں۔

مجھے آگے کی جانب ایک دروازے پر منتقل کی پیٹ دکھائی دی جس پر ساتھ ساتھ اسٹیشن کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے شیشے پر دستک دی۔ جب کسی نے جواب نہیں دیا تو میں نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔

کمرے کی دیواریں پیلے رنگ کی تھیں اور ان پر کسی بھی تصویر نظر نہیں آ رہی تھی۔ گھڑی کے پاس ایک موٹیل ماڈرن میز اور دو رنگ آلود فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ "ہیلو!" میں نے آواز دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

اتنے میں زمین پر قدموں کی چاپ سنائی دی اور چند سیکنڈ بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے دفتر میں قدم رکھا۔ اس نے اپنے خاکستری بالوں کی شکل میں پابند ہے ہوئے تھے اور چہرے پر گول شیشوں کی ٹیکہ نمایاں تھی۔ وہ عورت دہلی تلی اور اس کا قد لانا تھا۔ اس کا لباس ڈارک بلیو کلر کے اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز پر مشتمل تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نیلا فولڈر دبا ہوا تھا۔

"میں ساتھ ساتھ اسٹیشن ہوں۔" اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور تم یقیناً جم ہیرس ہو اور ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔"

پھر وہ فولڈنگ کرسیوں میں سے ایک پر براجمان ہو گئی اور اپنا اسکرٹ درست کرنے کے بعد مجھے دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے فولڈر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھول دیا۔

"آپ کا حوالہ ونڈری ہائیکور نے دیا تھا۔" میں نے بتایا۔ "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی کامیابی کا ریٹ اٹھانوے فیصد ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا ہوگا کہ جب میں نے یہ بلڈنگ دیکھی تو قدرے بے زار ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن پھر اپنے مقصد کی خاطر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا آپ اپنے تمام کلائنٹس سے اسی جگہ پر ملاقات کرتی ہیں؟"



”میں اس وقت تک کوئی دستخط نہیں کروں گا جب تک اس بارے میں مزید نہ جان لوں کہ آپ کرتی کیا ہیں۔ مجھے تین سو ڈالر کے عوض کیا ملے گا؟“ میں نے اصرار کیا۔ ”ترغیب مسٹر جم۔ اگر تم دستخط نہیں کرنا چاہتے تو پھر تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ میں نے کاغذ کی سمت اشارہ کیا۔ ”مجھے حقیقت میں کس بات کے لیے دستخط کرنا ہیں؟“

”یہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے تم اس بات کے پابند ہو گے کہ میری ہدایات کے مطابق یعنی عمل کرو گے اور اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔ مزید یہ کہ تمہیں اقرار کرنا ہوگا کہ میرے طریقہ کار کو کسی پر آشکار نہیں کرو گے۔ کسی بھی قسم کے انحراف کا مطلب خاتمہ ہے۔“ یہ کہہ کر سائنٹھا ایلٹن نے اپنی آنکھیں نیم وا کر لیں۔ ”تم یہاں سے رخصت ہونے کے لیے آزاد ہو لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اپنی مدد کے لیے میری ضرورت ہے۔ کوئی بھی تمہیں وہ نتائج نہیں دے سکتا جو میں دوں گی۔“

میں نے معاہدے پر ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔ اس پر درج دونوں ہی انگریف من و عن وہی تھے جو ابھی سائنٹھا نے زبانی بتائے تھے۔

لیکن میں اب بھی دستخط کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ سائنٹھا ایلٹن کی سرد مہری مجھے کھل رہی تھی اور اس کی رازداری کی شرط کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر وینڈی ہاپکنز کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس نے اسی تھراپسٹ کی ہدایات پر عمل کیا تھا اور وزن گھٹانے میں کامیاب رہی تھی۔

اس لحاظ سے سائنٹھا ایلٹن میری آخری امید ہو سکتی تھی۔ میں نے میز پر سے ایک پین اٹھایا اور معاہدے کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

سائنٹھا ایلٹن نے معاہدے کا دستخط شدہ کاغذ اٹھا کر اپنے فولڈر میں لگا دیا اور فولڈر اپنی میز کی دراز میں بند کر دیا۔

”پروگرام میں خوش آمدید۔ تمہیں ہفتے میں ایک بار اپنا وزن چیک کرانے کے لیے مجھے رپورٹ کرنا ہوگی اور اس وقت تک آتے رہنا ہوگا جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ اس وزن کے حصول کے بعد تمہیں وزن چیک کرانے کے لیے سال میں صرف ایک بار آنا پڑا کرے گا۔ تم اپنے حصول

کردہ وزن ایک سو پچاس پونڈ سے زیادہ وزن نہیں ہونے دو گے۔ یہ لازمی ہوگا۔ ہماری کوئی ایجنٹ ڈائٹ یا گولیاں نہیں ہیں جو تمہیں کھانا پڑیں گی۔ صرف ایک سو سادہ اصول ہے جس پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا اور تم اس سے بھی انحراف نہیں کرو گے۔“

”وہ سادہ اصول کیا ہے؟“ میں نے جانتا جاہا۔

”ہر ہفتے جب تم اپنا وزن کرانے آؤ گے تو تمہارا وزن لازمی طور پر کم از کم تین پونڈ گھٹنا ہونا چاہیے۔“ سائنٹھا ایلٹن نے جواب دیا۔

”کیا یہ کسی قسم کا لطیفہ ہے؟“

”یہ مذاق یا لطیفہ نہیں ہے مسٹر جم! میں تمہیں اس بات کا یقین دلانہی ہوں۔“ سائنٹھا ایلٹن کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”ہر ہفتے تین پونڈ وزن گھٹانا ناممکن ہے۔“

ابتدائی چند ہفتوں تک تو ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ چند ہفتے میں کوئی وزن گھٹانا سکوں۔“

”کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟“

”یقیناً کرتا ہوں لیکن کیا وہی ترغیب کافی نہیں ہے۔“

”وہ کافی ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے۔ اس وقت تمہاری بیوی اپنی بہن کے ساتھ ایک شاپنگ مال میں ہے۔ وہ اس وقت تک جا رہی ہیں گھنٹے گھنٹے گھنٹے گزار رہی ہیں۔ تمہارا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹ نہیں جاتا۔ اگر کوئی ہفتہ ایسا رہا کہ تم اپنا وزن کم از کم تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہ ہوئے تو تمہاری بیوی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔“ سائنٹھا ایلٹن نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا کہ رہی ہے۔ ”خاتمہ؟ خاتمے سے آپ کی مراد کیا ہے؟“ میں نے اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے مسکرانے لگا۔ ”کیا آپ اسے قتل کر دیں گی؟“

”قتل ایک گندی اصطلاح ہے۔ میں خاتمے کے لفظ کے استعمال کو ترجیح دیتی ہوں۔“ سائنٹھا ایلٹن نے کہا۔

میں نے میز کی دراز کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ معاہدہ جس پر میں نے دستخط کیے ہیں، اس میں کہا گیا ہے کہ آپ کی ہدایات سے کسی بھی قسم کے انحراف کا مطلب خاتمہ ہوگا۔ کیا آپ مجھے بھی قتل کر دیں گی؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر نوبت یہاں تک آگئی تو!“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دل دگنی رفتار سے دھڑکنے لگا اور ہاتھ کاٹنے لگے۔ میں نے اپنی انگلی سے کھونٹے کے انداز میں اس کی جانب اشارہ کیا اور قدرے بلند آواز سے

بولی۔ ”تم پاگل ہو۔ میں پولیس کے پاس جا رہا ہوں۔“ اب میں اسے آپ کے بجائے تم سے مخاطب کر رہا تھا۔

”اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری بیوی کا فوری طور پر خاتمہ کر دیا جائے گا اور اس کا الزام تمہارے سر دھر دیا جائے گا۔ ہم نے تمہارے گھر سے ایسی بہت سی چیزیں ہٹا دی ہیں جن کی وجہ سے تم اس جرم میں یہ آسانی ملوث ہو جاؤ گے۔ اب ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ.... تمہاری بھی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی شروع کر دی جائے۔ تمہاری تھراپسٹ کی حیثیت سے میں سینڈرا کوئل کرنے کے تمہارے ذہن پر سوار خیال اور اس سے متعلق ہماری خفیہ گفتگو کو پولیس پر آشکار کرنے پر مجبور ہو سکتی ہوں۔ پولیس تم پر کبھی یقین نہیں کرے گی کیونکہ تمہارے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جبکہ ایک تھراپسٹ کی حیثیت سے میری بات پولیس کی نگاہ میں زیادہ وزن دار اور اہمیت کی حامل ہوگی۔ سو تم دیکھ سکتے ہو کہ جب تک تم اپنا وزن ایک سو پچاس پونڈ تک گھٹا نہیں لیتے، تم میرے کنٹرول میں ہو۔ اب تمہارے ذہن گھٹنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔“

”اوہ شٹ۔“ مجھے اپنی آواز کا ہتھی محسوس ہوئی۔ ”تم بڑا جاہ رسی ہووہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی ہر ہفتے اپنا وزن تین پونڈ نہیں گھٹا سکتا۔ مجھے اس کا کوئی حصہ قبول نہیں ہے۔“

”میں ایک کاروباری عورت ہوں مسٹر جم۔ اگر میں چاہوں تو تمہیں اس پروگرام سے باہر نہیں نکال سکتی۔ میرے ساتھی میرے لیے نامعلوم ہیں۔ میں ان کے رابطے کے طور پر کام کرتی ہوں۔ تمہاری ادا کردہ رقم کو میں الحاق کبھی کے پوسٹ آفس بکس کے پتے پر روانہ کر دیتی ہوں۔ پھر وہ مجھے میری تنخواہ بھیج دیتے ہیں۔ وزن کنٹرول کرنا ایک بڑا بزنس ہے اور میرے جو باس ہیں انہوں نے اسے اپنے سب سے اہم منافع بخش بنانے کا ایک طریقہ وضع کیا ہوا ہے۔ وہ بے حد خطرناک لوگ ہیں جو تمہارے عہد کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔“

”میں اس بات پر یقین کرتا ہوں۔ دیکھو، تم اپنے ساتھیوں کو بتا دو کہ اگر وہ اس معاملے کو یقیناً ختم کر دیں تو میں تمہیں جو وہ چاہیں گے، ادا کروں گا۔“ میں نے کہا۔

سائنٹھا ایلٹن نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”یہ بات ہمارے کاروبار کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ ہماری ایک شہرت ہے جس کی بدولت ہم جی رہے ہیں۔ اس میں کسی قسم کا اشتراک نہیں ہے۔ ہمیں اپنی کامیابی کے تناسب پر بے حد غور ہے۔ ایک بار جب آپ معاہدے پر دستخط کر دیتے ہیں

تو پھر آپ ہمارے کلائنٹس میں سے ایک بن جاتے ہیں۔ میں اس بارے میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔“ سائنٹھا نے ٹکاسا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”فرض کرو کہ میں اپنا وزن کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوتا تو پھر کیا ہوگا؟“ میں نے جانتا جاہا۔

”ہم جانور نہیں ہیں۔ ہم چمک دکھا سکتے ہیں۔ لیکن ہم منطقی طور پر قابل قبول جواز کے بغیر غیر حاضری تسلیم نہیں کرتے۔ میرے ساتھی ہر وقت تم پر نگاہ رکھے رہیں گے اور میں متنبہ کروں کہ اگر انہوں نے محسوس کیا کہ تمہاری غیر حاضری کا جواز اطمینان بخش نہیں تو پھر میں ان کے رد عمل کی ذمہ دار نہیں ہوں گی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہر ہفتے باقاعدگی سے رپورٹ کرنا تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔“

☆☆☆

جب میں اپنی کارڈ رائیو کرتا ہوا اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا تو میرے ذہن میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ سائنٹھا ایلٹن کے دفتر سے نکلنے ہی سیاہ رنگ کی ایک لٹکن کار نے میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے تعاقب اور نگرانی کو خفیہ رکھنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنی کار کا انٹیمٹ رنگ اتنا محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ میری انگلیوں کے گھٹے سفید پڑ گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ یقیناً سینڈرا کوئل کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہو سکتے۔

یہ میں نے اپنے آپ کو کس جنجال میں پھنسا لیا ہے؟ یہ میں نے سینڈرا کوئل جنجال میں پھنسا دیا؟ اس پاگل پن سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تو ہوگا۔

جب میں اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سینڈرا گھر پر موجود نہیں تھی۔ میں لپک کر اندر پہنچا اور کھڑکی سے جھانک کر باہر کی طرف دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لٹکن کار سڑک پار موجود تھی۔ اگر میں پولیس کو فون کرتا ہوں تو وہ لوگ سینڈرا کوئل کر دیں گے۔ مجھے اس بارے میں منصوبہ تیار کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔

میں نے سب کے نیچے سے کوزے کا ایک خالی تھیلا نکالا اور بکن کے کینٹھ کھول کر ان میں رکھی ہوئی اشیاء جیسے بسکٹ، کیک، بٹر کے جاز، آلو کے چپس، کینڈی بارز نکال کر تھیلے میں بھرنا شروع کر دیں۔ جو بھی شے مجھے کھانے پر درغلا سکتی تھی وہ اس تھیلے میں منتقل ہو رہی تھی۔

جب میں ان اشیاء سے دوسرا تھیلا بھر رہا تھا تو سینڈرا

گھر میں داخل ہوئی۔

”تم کیا کر رہے ہو، ہینی؟“ اس نے پوچھا۔

میں چند سیکنڈ تک اس کی صورت دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا بتاؤں۔ ہم دونوں کی کڑی نگرانی ہو رہی تھی۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ انہوں نے ہمارے مکان میں بھی آواز سننے کا خفیہ آلہ لگا دیا ہو؟

جس معاہدے پر میں نے دستخط کیے تھے، اس کی رو سے میں نے یہ راز آشکار نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔

سیڈرا کی ہڈیاں چوڑی چکی تھیں مگر وہ فربہ نہیں تھی۔ جب وہ اپنے سنہری بال پونی ٹیل کی شکل میں باندھتی تھی تو دیکھنے میں اٹھارہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ ہم نے باہم بہت سی مشکلات سہی تھیں اور میں کئی مرتبہ اسے اپنی سچی گھٹی کر چکا تھا لیکن اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے کتنا زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اسے کھودنا میرے دل کو چیر دینے کے مترادف ہوگا۔

”اس مرتبہ میں یہ کر کے رہوں گا۔“ میں نے اپنی آواز کو کنٹرول میں کرنے کی کوشش کی۔ ”میں اپنا وزن گھٹانے جا رہا ہوں۔“

سیڈرا نے اپنے بازو میری گردن میں محائل کر دیے اور میرے ہوتلوں کا پلکا سا ہونٹے لیا۔ ”تھیک گاڑا یہ نئی تھراپسٹ یقیناً حیرت انگیز ہوگی۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔“

”کچھ زیادہ بتانے کو نہیں ہے۔ اس کا راز ترفیب ہے۔ میں نے ایک فارم پر دستخط کیے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ میں اس کے طریق کار کا راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ حتیٰ کہ تم پر بھی نہیں۔ لہذا تم خود ہی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔“

وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”تم جو چاہتے ہو، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کچھ بھی۔ ہم چھٹی اور مرتی کھا سکتے ہیں۔ ہر قسم کی بزیوں پر گزارہ کریں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ”تم نے مجھے بے حد خوش کر دیا ہے۔ آج ہماری زندگی میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہو رہا ہے۔“

سیڈرا کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے الفاظ کس حد تک حقیقت اور سچائی پر مبنی تھے۔

☆☆☆

ہماری چوبیس گھنٹے کی کڑی نگرانی مستقل جاری تھی۔

وہ سیاہ رنگ کی لیکن کار ہر جگہ میرا پیچھا کرتی تھی۔ دو خواتین گھر سے رنگ کی شیور لیٹ کار میں سیڈرا کا تعاقب کرتی تھیں۔ اگر سیڈرا اپنے تعاقب سے باخبر تھی تو اس نے کبھی مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

دفتر میں میرا کام متاثر ہو رہا تھا۔ میں اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا تھا اور مجھ سے غلطیاں سرزد ہونے لگی تھیں۔ جیسے تک میں ذہنی اور جسمانی طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ دفتر میں لوگوں نے میرے بارے میں باتیں بنانا شروع کر دی تھیں۔ پاس نے بھی کہا کہ دیا کہ اگر میں نے اپنے آپ کو درست نہیں کیا تو وہ مجھے نوکری سے برخواست کر دے گا۔

لیکن میں نے اپنا وزن گھٹالیا۔ پہلے پختے میرا وزن آٹھ پونڈ کم ہو چکا تھا۔ اس سے اگلے پختے چھ پونڈ اور اس کے بعد تیسرے پختے مطلوبہ تین پونڈ گھٹ گیا۔

میں نے ہر مرتبہ سائٹھا اپلسٹن سے منت سماجت کی کہ وہ مجھے اس پر ڈیگرام سے نکال دے اور اس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

یہ چوتھا ہفتہ تھا جب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

جمرات تک میں صرف ایک پونڈ وزن گھٹایا تھا اور مجھے علم تھا کہ اگر میرا سچ تک کچھ نہ کاواؤں، ہوں جس میں سچ اپنا وزن مطلوبہ تین پونڈ تک گھٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی معجزہ رونما ہو جاتا ہے اور میں مطلوبہ وزن تک گھٹا لیتا ہوں تب بھی یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کبھی نہ کبھی تو میں سائٹھا اپلسٹن کے ہدف کو پانے میں ناکام رہ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوگا؟

اس سہ پہر میں سوچوں میں غم بوشن کی سڑکوں پر پونہی گھومتا رہا۔ میں سیڈرا سے مدد طلب نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ ہمارے گھر میں آواز سننے کا خفیہ آلہ نصب ہو۔ اگر ہم اس بارے میں گفتگو کرنے کی خاطر باہر چہل قدمی کے لیے جاتے تب بھی شاید ان کے پاس کوئی ایسا طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری گفتگو سن لیں۔

اس رات جب میں گھر پہنچا تو سیڈرا سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ بڑبڑ ہے۔ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”یاد ہے تم نے کہا تھا کہ اگر میں وزن گھٹانے کی کوشش کروں تو تم میری مدد کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے ایک نوٹ بک اس کے ہاتھوں میں تھمادی۔ میں نے تمام باتیں اس نوٹ بک میں تحریر کر دی تھیں اور وہ منصوبہ بھی بیان کر دیا تھا جس

کے بارے میں مجھے امید تھی کہ وہ ہماری جانیں بچا سکتا ہے۔ سیڈرا کا ڈوچ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور لوٹ بک کی تحریر کا بغور مطالعہ کرنے لگی۔ اسے عمل تحریر پڑھنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں اس بات کا اسے کریڈٹ دیتا ہوں کہ اس نے بالکل بھی کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جب وہ پڑھ چکی تو میں نے اس کی آنکھوں میں کہے ارادے کے تاثرات دیکھے۔ میں جان گیا کہ اب ہم باہم ان لوگوں کو شکست دے دیں گے۔

پھر سیڈرا نے اپنی بہن کو فون کیا اور وہ دونوں شاپنگ مال چلی گئیں۔ اگلے روز جب سیڈرا کی ٹویٹا اس مینو پیکیجنگ پلانٹ روانہ ہوئی جہاں وہ گزشتہ ماہ سے یہ طور سیکرٹری کام کر رہی تھی تو گھر سے رنگ کی شیور لیٹ کار نے حسب معمول اس کا تعاقب کیا۔

البتہ اصل بات یہ تھی کہ سیڈرا کی کار اس کی بہن وائلٹ چلا رہی تھی جس نے اپنے علیے اور لباس سے سیڈرا کا پہرہ چھپا کر لیا ہوا تھا۔

سیڈرا ان کے جانے کے چند منٹ بعد گھر سے نکلی۔ اس نے ہمارے حق میں لان کے احاطے کو عبور کیا اور آئر پورٹ جانے کے لیے بیگلیں کھڑکیں۔ بعد میں جب وہ گھٹے بعد غلی فون کی ٹھنٹی بھی تو میں سمجھ گیا کہ وہ یہ حفاظت جہاز میں سوار ہو چکی ہے۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور میں جانتا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ہمارے درمیان یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہماری زندگیاں محفوظ ہوں گی تو وہ مجھ سے خود ہی رابطہ کر لے گی۔ میں نے گھر کو تالا لگا یا اور پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ سیاہ لیکن کار معمول کے مطابق میرا تعاقب کرنے لگی۔ جب میں پولیس اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو یہ بات نوٹ کی کہ اس سیاہ لیکن کار کا ڈرائیور سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سیڈرا کی نگرانی کرنے والوں کو پیغام دے رہا تھا کہ وہ سیڈرا کو قابو کر لیں۔ لیکن اس وقت تک سیڈرا کی بہن وائلٹ پلانٹ کے قریب دروازے سے نکلنے کے بعد اپنی کار میں سوار ہو کر۔ پونڈ منٹ اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی جو اس نے گزشتہ شب وہاں پارک کر دی تھی۔

جب میں اندر پہنچا تو شیشے کے پارٹیشن کے پیچھے بیٹھی

میرے نفسیاتی ٹیسٹ لے گئے جنہیں میں جان بوجھ کر ناکام بناتا رہا۔ مجھے پرکھنے کے ان سلسلوں کے بعد عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ میری ذہنی کیفیت نارمل نہیں اور میں معاشرے کے لیے خطرناک ہوں۔ ایک جج نے حکم دیا کہ مجھے راج وے ایکرز نامی سینٹرل اسپتال میں اس وقت تک لاک اپ میں رکھا جائے جب تک کہ ڈاکٹرز اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتے کہ میں ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے فٹ ہو چکا ہوں۔ تب ہی میں عام زندگی میں لوٹ سکتا تھا۔

میرا اسپتال پہنچنا یقینی طور پر سنچر کے روز وزن کرانے کے لیے حاضر نہ ہونے کا حتمی طور پر قابل قبول جواز تھا۔ اپنی بابت نئی تصویر کی بہتری کے لیے انہوں نے مجھے پندرہ سو کیلو یونیٹ کی یوم کی غذا پر رکھ دیا۔ اگر میں نے حیرانی پر حسب ہدایت بہتر نہیں کیا تو وہ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ اس وقت تک میرا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو چکا ہوگا۔ اور اس طرح میں نے سائٹھا اپلسٹن کو مات دے دی۔

ہوئی خاتون پولیس افسر نے استنبہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ میں نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنی بیوی کو قتل کرنے والا ہوں۔ وہ ہمیشہ میرے مناپے کا مذاق اڑاتی ہے۔ بالآخر آج میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میرا ذہن صحیح رہا ہے۔ وہ محفوظ نہیں ہے۔ تمہیں اسے بچانے کی خاطر مجھے لاک اپ میں بند کرنا ہوگا۔“

میرے نفسیاتی ٹیسٹ لے گئے جنہیں میں جان بوجھ کر ناکام بناتا رہا۔ مجھے پرکھنے کے ان سلسلوں کے بعد عدالت نے فیصلہ دے دیا کہ میری ذہنی کیفیت نارمل نہیں اور میں معاشرے کے لیے خطرناک ہوں۔

ایک جج نے حکم دیا کہ مجھے راج وے ایکرز نامی سینٹرل اسپتال میں اس وقت تک لاک اپ میں رکھا جائے جب تک کہ ڈاکٹرز اس بات کا فیصلہ نہیں کر لیتے کہ میں ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے فٹ ہو چکا ہوں۔ تب ہی میں عام زندگی میں لوٹ سکتا تھا۔

میرا اسپتال پہنچنا یقینی طور پر سنچر کے روز وزن کرانے کے لیے حاضر نہ ہونے کا حتمی طور پر قابل قبول جواز تھا۔

اپنی بابت نئی تصویر کی بہتری کے لیے انہوں نے مجھے پندرہ سو کیلو یونیٹ کی یوم کی غذا پر رکھ دیا۔ اگر میں نے حیرانی پر حسب ہدایت بہتر نہیں کیا تو وہ ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

اس وقت تک میرا وزن ایک سو پچاس پونڈ ہو چکا ہوگا۔ اور اس طرح میں نے سائٹھا اپلسٹن کو مات دے دی۔

☆☆☆

میرا نیا تھراپسٹ آفس بڑا اور چوکور بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں کا رنگ سفید تھا اور ان پر فریم شدہ کئی... سٹیکٹ آویزاں تھے۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو تھراپسٹ نے اپنی کرسی کا رخ کھڑکی کی سمت کیا ہوا تھا۔ میں میز کے سامنے پہنچ کر خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد تھراپسٹ نے اپنی گھومنے والی کرسی میری طرف کیا تو بے ساختہ میری سچی نکل گئی۔

وہ سائٹھا اپلسٹن تھی جو تھراپسٹ کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔



ماورائے النہار

حجی الدین نواب

جو دہویں لسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُر جوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہو یا بلند آسمان کے سات پرندے... ٹھنڈی ہوائوں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی ہوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کبھی پھولوں کی مہک، کبھی کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھری ہیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموتی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روانہ ہو رہی ہیں، نئے رنگ و ہنگامہ کا تہذیبی ڈیزائننگ۔

ایک پھر پھر روپ، کئی چھاؤں کئی دھوپ، محبت کی مٹائیلوں، رناتوں اور راتوں کا ایک دل رہا سلسلہ



آزادی سے گھومتا رہا۔ کتنا آسان ٹارگٹ تھا لیکن اسے گولیاں مارنے والے شوٹرز خود ہی موت کے گھاٹ اترتے چلے گئے۔

دوسرے نے کہا۔ ”ہماری معلومات کے مطابق مرینہ اسے انڈیا لے گئی تھی اور وہ اب تک وہیں چھپا ہوا ہے۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”مرینہ کا قرضہ عجیب ہے، اس نے مراد کے بچے کی ماں بننے کے لیے اسے چھپا رکھا ہے۔ بڑی عجیب عورت ہے۔ ایک بچہ پیٹ میں لینے کے لیے پچاس لاکھ کی سیٹ کو مال رہی ہے۔ اس کے MET ڈیپارٹمنٹ والے اسے فوراً کیش کرنا چاہتے ہیں۔ پچھلی تمام رات بچے پورے لوگ جاگتے رہے۔ ہیلری ہڈن کے اور میرے کارندے وہاں ایک ایک گھر میں گھس کر اسے تلاش کرتے رہے لیکن وہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔“

”میرا خیال ہے ہڈن کوئی چال چل رہا ہے۔ اس نے مراد کو بچے پورے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ میرے آدمیوں نے دہلی میں ہڈن پر حملہ کیا تھا تا کہ وہ خوفزدہ ہو کر مجھے مراد تک پہنچا دے۔“

”مکی براؤن نے کہا۔ ”MET سے ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اگر مراد ہڈن کے پاس ہوتا تو وہ پچاس لاکھ حاصل کرنے کے لیے فوراً اسے ہمارے حوالے کر دیتا۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”MET والوں کا مراد سے ایسا کوئی سمجھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی پچاس لاکھ جیسی بڑی رقم نہیں لے رہے ہیں۔ ہمارے اہم معاملے کو نظر انداز کر رہے ہیں۔“

”آج صبح میرے دو ماتحتوں نے ہڈن کی بہن لیزا کو اغوا کرنا چاہا تو اچانک ایک شخص نے آکر اسے بچا لیا۔ میرے دونوں ماتحتوں کو اس نے مار ڈالا۔ اس کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔“

”میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہڈن کی بہن کو بچانے والا وہ مراد علی منگی ہوگا۔ مراد مرینہ ہڈن اور ان کے ڈائریکٹر جنرل جان اتھوئی کے درمیان خفیہ گھبڑ ہے۔“

”مکی براؤن نے کہا۔ ”اسے اپنی نفسانی خواہش کی خاطر چھپا کر رکھنے والی مرینہ ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ پہلے مرینہ کو ہی اپنے قابو میں کرنا ہوگا۔“

ڈی بلیک نے کہا۔ ”آج میں نے اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ غضب کی فائر ہے۔ اس نے ایک ہی حملے میں میرے چاروں فائٹرز کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

اور انڈر ورلڈ کے مجرموں سے رابطے میں رہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے اس نے تمام تنظیموں کے سربراہوں کو ایک سیون اسٹار ہوٹل میں شراب و شباب کی دعوت دی تھی۔ دو سو پچاس کروڑ کے سات منزلہ ہوٹل میں ہر سربراہ کے لیے کمرے اور سوئس ریزرو کرائے کئے تھے۔ ایک خوبصورت سے سوئنگ پول میں انتہائی حسین عورتیں باشت بھر کے لباس میں تیر رہی تھیں۔ وہاں سے نکل کر بڑے ناز و انداز سے مہمانوں کو شراب کے جام پیش کر رہی تھیں۔ پھر وہاں سے پلٹ کر پول کے شفاف پانی میں غوطے کھا رہی تھیں۔

تمام سربراہ پول کے کنارے بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ شبابی نظاروں سے آنکھیں سینک رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ حسینا میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ مہمانوں کے سامنے سے شراب کی بوتلیں اٹھالی گئیں۔ ایک مہمان نے نیکی براؤن سے کہا۔ ”مسٹر براؤن.....! یہ کیا؟ ابھی تو پینا شروع کیا تھا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ابھی حسینا میں مست کرنے والی تھیں ہائے یہ کیا کیا؟ تم نے اچانک ہی سب کو غائب کر دیا۔“

”مکی براؤن نے کہا۔ ”ابھی ہم جس بات کے لیے یہاں کجا ہوئے تھے، وہاں صرف وہ بات ہوگی۔ عیش و عشرت کے لیے ساری رات پڑی ہے۔“

”میرے دوستوں! ہماری جرائم سے بھر پور ایک الگ دنیا ہے۔ ہم اس دنیا میں ایک لمبی زندگی گزارتے آرہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے خطرناک مجرم آتے جاتے رہے ہیں جو کسی سے زیر نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کسی دشمن کی گولی سے حرام موت مر گئے۔“

”لیکن وہ... وہ مراد علی منگی کسی کے نشانے پر نہیں آ رہا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ وہ ناقابل شکست ہے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی اسے ایک چنگی میں مسل دے گا لیکن وہ نظر آئے تب... وہ اب تک اس لیے سمجھتا ہے کہ نظر نہیں آتا ہے۔ ہمارے شوٹرز اس کی تصویر سے بھرتے ہیں لیکن نہ جانے کیا بات ہے، وہ جانا بیچانا چہرے نہیں دکھائی نہیں دیتا ہے۔“

ایک تنظیم کے سربراہ نے کہا۔ ”جب وہ دکھائی دیتا تھا تب ہم نے کون سا تیر مار لیا؟“

ایک انڈر ورلڈ کے سربراہ نے کہا۔ ”بڑے شرم کی بات ہے ایک چھپر مارا نہیں جا رہا ہے اور ہم تالیاں پیٹتے جا رہے ہیں۔ وہ جیل سے باہر آنے کے بعد کراچی شہر میں

ہال کی عمارت باہر سے دیکھی ہے۔ اسے اندر سے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیسے دیکھو گے؟ تمام دشمن تمہاری صورت کو دور سے پہچان لیں گے۔“

”میں اسی مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں۔ کیا آپ کسی پلاسٹک سرجری کے ماہر سے رابطہ کر سکتے ہیں؟ میں آج ہی بلکہ ابھی چہرہ بدلنا چاہتا ہوں۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”تم بروقت صبح قدم اٹھا رہے ہو۔ ڈاکٹر ٹینی سن بہت ہی ماہر اور تجربہ کار سرجن ہے۔ میں نے سنا ہے، دو چار گھنٹے میں سرجری ہو جاتی ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں ڈاکٹر ٹینی سن سے معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“

”آپ ان سے اتنا کہہ دیں کہ چہرہ آج ہی بدل جائے۔ کل ہڈن کے معاملے میں مصروف رہوں گا۔“

دھرم داس فون اٹھا کر ڈاکٹر ٹینی سن کے نمبر سچ کرنے لگا۔

جرائم کی دنیا میں اٹلی کی اہمیت اس حوالے سے ہے کہ پہلا گاڈ فادر نہیں ہے ابھرا تھا۔ تب سے اب تک اس ملک میں گاڈ فادر کی قبیلہ نسل در نسل چلتی پھرتی جا رہی ہے۔ ملکی سیاست میں ان کا بڑا اثر ہے۔ ان کا قانون تو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکتا رہتا ہے۔

دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی مجرموں کی تنظیمیں اتنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں کہ بلیک لسٹ میں ہونے کے باوجود آزادی سے آگ اور لہو کا کھیل جاری رکھتی ہیں۔ یہ تنظیمیں لاکھوں پاؤنڈز اور کروڑوں ڈالرز کی ڈینگ کرتی رہتی ہیں۔

تمام تنظیمیں ایک دوسرے کی دوست بھی ہوتی ہیں اور دشمن بھی۔ ان خطرناک لوگوں کی ایک الگ دنیا ہے۔ سب سے الگ اپنی سوسائٹی ہے۔ یہ حرام موت بھی مرتے ہیں اور عیش و عشرت سے زندگی بھی گزارتے ہیں۔

سٹریکیٹ ریڈ الرٹ کا ہیڈ کوارٹر سکلی میں تھا۔ مراد نے ان کے سب سے اہم کارندے برنارڈ کو بلا کر کہا تھا۔ برنارڈ ایک بڑے ملک کا سیکرٹ ایجنٹ تھا اور ریڈ الرٹ کے سربراہ مکی البرٹ کا بہنوئی بھی تھا۔ مراد نے بہنوئی برنارڈ کے بعد سارے مکی البرٹ کو بھی جہنم میں پہنچا دیا تھا۔

اب دوسرا سالامیکی براؤن ریڈ الرٹ کا سربراہ بن گیا تھا۔ اس نے مراد کے سر کی قیمت پچاس لاکھ ڈالرز لگائی تھی۔ اس سلسلے میں وہ دن رات تمام خطرناک تنظیموں سے

باتیں بیان نہیں کروں گا۔ تم یقین نہیں کرو گی۔“

”صرف ایک ہی بات سے یقین کر لوں گی۔ تم کو ڈورڈز... ادا کرو گے۔ یاد ہے نا؟ بولو کیا بولو گے؟“

”میں بولوں گا، میری ماروی کسی عمر کے گھنچے میں کبھی نہیں آئے گی۔“

وہ بولی۔ ”ہاں، تب میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گی کہ اجنبی بن کر آنے والے تم ہی ہو۔“

”تو پھر یہ چہرہ مٹا دوں؟“

”ہاں، میں بر حال میں تمہیں پہچان لوں گی۔ تم اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ جتنی جلدی ہو سکے اپنی شخصیت کو بدل دو۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ چہرہ تبدیل ہونے کے بعد تمہیں کال کروں گا۔“

مراد نے رابطہ ختم کر کے اطمینان کی سانس لی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی ایک ماروی کی طرف سے فکرمندی کہ وہ اس نئے چہرے کو قبول نہیں کرے گی۔ مگر اب اس نے اسے بھولے ہوئے کو ڈورڈز یاد دلانے تھے۔ اب وہ اطمینان سے پیدا کٹی چہرے کو اوداع کہہ سکتا تھا۔

اس نے اپنا فون اٹھا کر ایم این اے دھرم داس سے رابطہ کیا پھر پوچھا۔ ”اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو ضروری باتیں کرنے کے لیے آتا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”مصروفیات تو ہیں۔ یہ کبھی پچھا نہیں چھوڑیں گی۔ مگر تمہارے لیے وقت نکال سکتا ہوں۔ آ جاؤ۔“

وہ آدھے گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کہا۔ ”مراد...! تم نے دشمن کی بہن کو ہلاک نہیں کیا۔ اس کی جان بچائی ہے۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔“

مراد نے پوچھا۔ ”ہڈن آپ سے کچھ کہہ رہا تھا؟“

”تم نے اسے الجھا دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ لیزا کوئی زندگی دینے والا اگر کوئی دیتا ہے تو وہ اس سے ملاقات کیے بغیر کیوں چلا گیا اور اس نے ہاتھی کا ماسک پہن کر اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا تھا۔ وہ دیتا بھی ہو سکتا ہے اور دشمن بھی۔“

”وہ ہوشیار ہو گیا ہے۔ کل کرس ڈے ہے۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ ہال میں جشن منایا جائے گا وہاں سکیورٹی کے لیے سپاہیوں کی تعداد بڑھا دی جائے۔ یہ غیر ملکی سفارت خانے والوں کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ سکیورٹی سخت کر دی جائے گی۔ تم بولو کھل کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے والی ایم سی اے

اس نے بتایا کہ مرینہ نے کیسی چالبازی سے انہیں ہلاک کیا تھا۔ ان میں سے ایک نے حقارت سے کہا۔ ”عورت کتنی ہی زبردست فائز بن جائے۔ پہاڑ جیسے مرد کے مقابلے پر آئے تو جو کڑیاں بھول جاتی ہے۔“

ڈی بلیک نے اس سے پوچھا۔ ”بار برس... تم واقعی زبردست ہو۔ کیا اسے زیر کر سکو گے؟“

بار برس نے پوچھا۔ ”ہیٹ کتنی ہوگی؟“

”اگر اسے جانے سے نہیں مارو گے، اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اسے اپناج بنا کر میرے حوالے کرو گے تو میں ہزار ڈالرز دوں گا۔“

”بہت کم ہیں۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”مرینہ کا بوس آجائے گی تو اس سے انگوٹھا یا جاکے گا کہ مراد کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ مراد سے دور ہو جانے کے باوجود اس کی موجودہ پناہ گاہ کے بارے میں اور اس کی مصروفیات کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔“

”بے شک یہ آسان راستہ ہے۔ ہم مرینہ کی گردن دیوچ کر مراد تک پہنچ جائیں گے۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”جو بھی مرینہ کو اپناج بنا کر لائے گا، میں اسے پچاس ہزار ڈالرز دوں گا۔“

بار برس نے کہا۔ ”پھر تو میں ہی اسے توڑ پھوڑ کر آپ کے سامنے پیش کروں گا۔“

دوسرے فائز امرزی نے کہا۔ ”یہاں تم سے بھی سوا سیر بیٹھے ہیں۔ تم سے پہلے میں اسے اپناج بنا کر لے آؤں گا۔“

ان کے درمیان ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جا رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ”آپس میں نہ لڑو۔ جب وہ ہاتھ آجائے گی تو ثابت ہو جائے گا کہ کون کس سے برتر ہے۔“

وہ بوڑھا استنبول سے آیا تھا۔ اس کی تنظیم کا نام ”ترکے بلند“ تھا۔ ترکی زبان میں اس کے معنی تھے، بلندی پر اڑنے والا پرندہ۔ اس بوڑھے کا نام نظام تھا۔ تھا۔ بڑا پہنچا ہوا تھا۔ سب اسے نظام بابا کہتے تھے۔

میکسی براؤن نے کہا۔ ”نظام بابا! تم ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو۔ تم نے سوچا ہوگا کہ مراد علی منگلی تک کیسے پہنچو گے؟“

”ہاں تم پچاس لاکھ ڈالرز کا معاوضہ دے رہے ہو۔ جرائم کی دنیا میں مراد علی منگلی پہلا دشمن ہے، جس کے سر کی اتنی بڑی قیمت لگائی گئی ہے۔“

اس نے میکسی براؤن کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”تم

غمیے اور جوش و خروش میں ہو۔ مراد نے پہلے تمہارے بہنوئی برنارڈ کو مارا پھر تمہارے بھائی میکسی البرٹ کو ختم کر دیا۔ میں تم سے کہوں گا کہ چھ ماہ تک صبر کرو اور اسے بھول جاؤ تو وہ صبر کرو گے نہ بھولو گے۔“

میکسی براؤن نے پوچھا۔ ”میرے صبر کرنے سے کیا وہ گرفت میں آجائے گا؟“

نظام بابا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”ہاں۔ چھ ماہ بعد وہ تمہارے سامنے اپناج بن کر آئے گا۔“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ہنسنے لگے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا جاو سے اپناج بن کر آجائے گا؟“

وہ ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہاں بیٹھ کر نہیں رہے ہو اور تمہارے چاہناز جاسوس اور شوٹرز ہر دوسرے تیسرے دن مراد کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں۔ آپ ذرا حساب لگائیں۔ اگلے چھ ماہ تک جو تنظیم کے ہرانڈرور لڈوالے کے کتنے وقادار اور جان نثار مارے جائیں گے۔“

ایک نے فضا میں گھونسا لہراتے ہوئے کہا۔ ”چھ ماہ کی بات نہ کرو۔ ہم چھ دنوں کے اندر اس کی لاش گرا دیں گے۔“

نظام بابا نے کہا۔ ”اپنا گھونسا جیب میں رکھو۔ مجھے معلوم ہے، اس نے تمہارے چار بھترے فائزوں کو اپناج پہنچا دیا ہے۔ آئندہ بھی مارے جائیں گے۔ بے چاروں کے جان نثار جان سے جائیں گے۔ تمہارا کیا جائے گا؟“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے مزید آدمی مارے جائیں۔ نظام بابا...! آپ بتائیں چھ ماہ تک اسے بھولنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم اسے تلاش کر چھوڑ دیں۔ وہ کہیں نظر آئے تو اسے گولی نہ ماریں؟“

اس کی انگلی تسبیح کے دانوں پر پھسل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”وہ نظر نہیں آئے گا۔ اسے صرف مرینہ ہی نہیں، سٹیج کیٹ وی ماسٹر کے سربراہ ماسٹر کو بویو بھی زبردست سکیورٹی دے رہا ہے۔“

”آپ معلومات حاصل کریں تو معلوم ہوگا“ ماسٹر کو بویو کی اور کئی دوست تنظیمیں ہیں جن کی مدد سے مراد چھپنے میں کامیاب رہتا ہے۔“

”آپ پلیز یہ بتائیں چھ ماہ بعد آخرا کیا ہوگا؟ وہ کیسے ہمارے ہاتھ آئے گا؟“

”وہ چھپنے والا ہر روز دن رات اس انتظار میں رہے گا کہ کوئی کہیں سے اس پر حملہ کرنے آئے گا اور حیران ہوتا رہے گا کہ کوئی اسے سینگ مارنے نہیں آ رہا ہے۔“

”اسے سکیورٹی دینے والے کو بویو مرینہ اور دوسرے مددگار ہر روز ہر مہینے اس کے دشمن کو کہیں نہیں پائیں گے تو یقین کر لیں گے دشمنوں نے مراد کو بھلا دیا ہے۔ انہوں نے مراد سے خوفزدہ ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔“

”تب وہ بہت محتاط ہو کر اپنی پناہ گاہ سے کبھی کبھی نکلنے لگے گا۔ صبر عام آنے کے بعد بھی اس پر حملہ نہیں ہوگا تو وہ رفتہ رفتہ سکیورٹی کے معاملے میں بے پروا ہو جائے گا۔ ایسے وقت یعنی کم از کم چھ ماہ بعد اچانک اسے چاروں طرف سے حیر کر حملہ کیا جائے گا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ تو وہی بات ہوئی کہ کب باپ مرے گا اور کب جا نکدا ملے گی۔ وہ پناہ گاہ سے نکلے یا نہ نکلے، ہم آس لگائے بیٹھے رہیں گے۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”نظام بابا! آپ کی پلاننگ بہت اچھی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ نامراد چھ مہینوں میں اور زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ آج مرینہ اور کو بویو وغیرہ کا محتاج ہے۔ کل کسی ملک میں انڈر ورلڈ کا ٹیگ لیڈر بن جائے گا۔ ہم اسے پاؤں پھیلانے کا موقع نہیں دیں گے۔“

”چلو میری اس پلاننگ کو جانے دو۔ ایک دوسری تدبیر ایسا ہے کہ مراد پر کوئی نہیں چلائی پڑے گی۔ وہ خود ہی تمہارے پاس دھڑاچا آئے گا۔“

”نظام بابا! آپ کو ایسی تدبیر پہلے بتانی چاہیے۔“

اس نے کہا۔ ”تدبیر پر عمل کرنا بہت مشکل ہوگا۔“

”آپ بولیں۔ ہم عمل کر کے دکھائیں گے۔“

پتا نہیں وہ تسبیح ہاتھ میں لیے بولنے کے دوران کیسے پڑھ رہا تھا۔ انگلیوں کے درمیان دانے پھسلتے جا رہے تھے۔

اس نے کہا۔ ”مراد علی منگلی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے اور وہ ایک بہت ہی حسین لڑکی ہے۔ اس کے عشق میں حالات نے ایسی کردٹ بدلی ہے کہ وہ ایک گدھا کا زوی والے کی فریاد اور شرافت کو بھول کر جرائم کی دنیا میں آ گیا ہے۔“

”محبوب نامی اس کا ایک ہم شکل ہے۔ اسے دیکھتے ہی آپ سمجھیں گے کہ وہ مراد علی منگلی ہے۔ وہ اس ملک میں ایک بہت بڑا ارب پتی صنعت کار ہے۔ مراد کی محبوبہ کا نام ماروی ہے۔ وہ محبوب کی سخت سکیورٹی میں رہتی ہے۔ وہ بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔ وہاں کی ایسی جنس والے اس سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔“

”اگر سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود آپ ماروی کو

وہاں سے انخوا کر کے لانے میں کامیاب ہو جائیں گے تو مراد پاگل ہو کر اس کے پیچھے دوڑا چلا آئے گا۔“

میکسی براؤن نے کہا۔ ”ایسی بات ہے تو ہم ماروی کے متعلق اپنے طور پر معلومات حاصل کریں گے۔ اگر وہ مراد کے لیے مقتطیس ثابت ہوگی تو جان جو تمہم میں ڈالنے والے ہمارے چاہناز ہر حال میں اس مشق کو اٹھا کر لے آئیں گے۔“

”ہم اب تک ان تدابیر سے متفق ہوئے ہیں کہ مرینہ کو اپناج بنا کر اس پر نارج کر کے مراد کا پتا لگانا معلوم کریں۔“

”دوسری تدبیر یہ ہے کہ اس کی محبوبہ ماروی کو کراچی شہر سے اٹھا کر یہاں لایا جائے پھر دیکھیں گے کہ وہ دیوانہ عاشق اور خود ہی آئے گا یا نہیں؟“

”ہمارے ماتحت کام کرنے والے جان کی بازی لگاتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی قدر کرتے ہیں۔ ہم مراد کے مقابلے پر جانے والوں کی ہیٹ بٹ بڑھا دیں گے اور کوشش کریں گے کہ ان کی لاشیں نہ آئیں۔ وہ زندہ آئیں۔ صرف ایک لاش مراد کی لاش جلد سے جلد گرا دی جائے۔“

میکسی براؤن نے یہ کہہ کر ایک مہینہ کو دبا دیا۔ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی حسینا میں مختصر سے لباس میں نمودار ہونے لگیں۔ پھر وہی جام والادور شروع ہو گیا۔

بہ چارے مال کے پیٹ سے بھوکے پیاسے تھے۔ پیش و طرب کی محفلیں پھر سے گرم ہو گئیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عینی سن پلاننگ سرجری کا ماہر تھا۔ لوگ اسے عینی سن کر بڑی کہتے تھے کیونکہ وہ ایک ذرا خنٹلی یا اپنا ریل سا لگتا تھا جبکہ ایسا نہیں تھا۔ اس نے اکلوتے جوان بیٹے رائن سن کو صرف اس لیے گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ دین اسلام سے متاثر ہو گیا تھا اور اکثر ایک عالم دین کے گھر جا کر اچھا خاصا وقت گزارتا تھا۔ وہ جوان پنا گھر سے نکلنے کے بعد کہیں چلا گیا تھا پھر اس نے پلٹ کر باپ سے فون پر بھی رابطہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر اس کے جانے کے بعد اداں رہنے لگا تھا اور گوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی مرچکی تھی۔ تنہا رہنے کے بعد بیٹے کی طرف دل کھنچا جاتا تھا۔ وہ اکثر بیٹے کے بیڈروم میں آ کر اس کے خالی بستر کو دیکھتا تھا۔ اس جگہ آ کر فرس پر بیٹھ جاتا تھا جہاں اس نے بیٹے کو ایک بار نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ پھر اس نے غصے سے پوچھا تھا۔ ”کیا تم نے مسلمانوں کا دین قبول کر لیا ہے؟ اپنے دین سے پھر گئے ہو؟“

دکشا تحریریں لیے جنوری 2015ء کا سال نمبر حاضر ہے

پاکستان

نگہت سیما اور رفاقت جاوید کے ماہرانہ قلم کے شاہکار سلسلے وار ناول

جنگل کا پھول زاہدہ پروین نے کھلائے کچھ نئے طرز کے پھول

نایاب جیلانی کی خوب صورت تحریر **ترکِ وفا** کا اک نیا موڑ

سالانہ کے لیے **انجم انصار** کے ماہر قلم کا شاہکار ناول

سمیرا یونس ہارون محبت بھرے کھل ناول کے ساتھ حاضر ہیں

عظمیٰ آفاق سعید کا پر لطف سفر نامہ دہلی

سکھنے والے

نگہت اعظمی، عنیقہ محمد بیگ، شمیم فضل خالق

نزهت جبین ضیا و دیگر کہنہ مشق رائٹرز کی دلنشین کاوشیں

یہ نیا سال کیا پیغام لاتا ہے پڑھیے

شائستہ زریں

کے کیے گئے سروے کا دلچسپ احوال

آپ کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دکشا اور دلربا مترجم صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

سے دور رہیں۔“

”کیا تم ارادے کے کمزور ہو؟ عورتیں تمہاری طرف جھکتی ہیں اور تم ان کی طرف جھک جاتے ہو؟ میرے بیٹے کیا تمہارے اندر ایمانی قوت نہیں ہے؟“

”میں پارسا رہنے کے لیے ایمانی قوتوں کا ہی سہارا لے رہا ہوں۔ صنف نازک سے کتراتا آ رہا ہوں۔ اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ مجھ میں خوب روئی اور کشش نہ ہو اور آپ نے تو مجھے بہت ہی خوب رو اور پرکشش بنا دیا ہے۔“

”میرا بیٹا ایسا ہی مگلا تھا۔ لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اور وہ ان سے دین ایمان کی باتیں کرتا تھا۔ دراصل اپنی تبت کھری اور مستحکم ہو تو قدم نہیں ڈمگاتے۔ شیطان دور کھڑا نکلتا رہ جاتا ہے۔ دھرم جی نے تمہارے حالات بتائے ہیں۔ تم ایک شریف مجرم ہو۔ پہلے انتہائی سیدھے سادے اور شریف تھے لیکن تمہیں مجرم بننے پر مجبور کیا گیا ہے۔ صرف مجرموں کے لیے ہی مجرم نہیں ہو تو قانون کے محافظ کہلانے والے بھی تمہیں مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”اب کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ میں یہاں کا ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔ کبھی ضرورت ہوئی تو میں بیان دوں گا کہ تم میرے بیٹے ہو۔“

”اس علاقے کے بے شمار لوگ اور جہاں سے لوگ تک پھیلے ہوئے میرے رشتے دار گواہی دیں گے کہ تم میرے بیٹے رابن سن ہو اور تم نے دین اسلام قبول کیا ہے۔ میرے پاس رابن سن کا شناختی کارڈ اور طبی ڈگریاں ہیں۔ میں ایمان علی ولد ڈاکٹر مینن سن کے نام سے تمہارا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنا دوں گا۔“

مراد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں آپ کے یہ احسانات کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ میرے راز دار بن کر رہیں گے تو کوئی مجھ پر کبھی شبہ نہیں کرے گا۔“

”تمہارا فرض ہے کہ میرے احسانات کا بدلہ مجھے دو اور میری ایک خواہش پوری کرو۔“

”جہاں تک میرے اختیار میں ہوگا، میں آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں ہمیشہ میرے بیٹے بن کر رہوں۔“

”میں یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکوں گا۔ پاکستان میں میری جان حیات ہے۔ آپ کی ہونے والی بہو کا نام ماروی ہے۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔“

”میں تمہیں بہو کے پاس جانے سے نہیں روکوں گا لیکن وہاں کیسے جاؤ گے؟ دھرم داس جی نے کہا ہے کہ

اس نے کہا تھا۔ ”الحمد للہ۔ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میرا نام ایمان علی ہے۔“

یہ سنتے ہی اس نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اب بچتا رہتا تھا۔ ایمان علی نے فون کی سم بدل دی تھی۔ اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے تھے۔ وہ کہتا تھا۔ میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو ایک بار اپنے باپ سے ملنے ضرور آتا۔ وہ سنگدل نہیں ہے۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتا تھا۔ پانچ برس تک اس کی کشمکش اور لاتعلقی نے یقین دلادیا تھا کہ وہ اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔ جب ڈاکٹر مینن نے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ پھر سے بیٹے کو زندہ کرے گا۔

یہ سراسر خدائی دعویٰ تھا۔ بیٹے کی جدائی اسے اپنا ریل بنا رہی تھی۔ اسی لیے سب اسے کریمی کہتے تھے۔

وہ کبھی غلامیں نکلتا ہوا کہتا تھا۔ ”میرے بیٹے نے مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ ڈیڑی اور واڑہ کھلا رکھو۔ میں جلد ہی آنے والا ہوں۔“

وہ دل میں عہد کر چکا تھا کہ بیٹا اس دنیا میں رہا ہے یا نہیں ہے؟ اگر مر چکا ہے تو اسے پھر سے زندہ کرے گا۔ ضرور کرے گا۔ پھر وہ دن آیا کہ اس نے مجھ کو دکھایا۔ جو بیٹا کھو چکا تھا اسے زندہ اور تھرک کر دیا۔ ایسا ہوتا نہیں ہے مگر ہو گیا تھا۔

اس وقت سرجری روم میں آئینے کے سامنے ایمان علی سرجری چیئر پر بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر مینن کھڑا ہوا اپنے بیٹے کو سانس لیتے دیکھ رہا تھا۔

مراد سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ میں کہاں ہوں؟ یہ تو کمال ہو گیا۔ میں تو اپنے اندر ایسے کم ہو گیا ہوں کہ خود اپنی صورت نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر! آپ نے مجھے کیا سے کیا کر دیا ہے۔ مجھے غائب کر دیا ہے۔ کیا میں کبھی خود کو دکھائی نہیں دوں گا؟“

وہ بولا۔ ”جب چاہو گے سرجری کے ذریعے تمہارا چہرہ واپس لے آؤں گا۔ ابھی تو میں نے اپنے بیٹے کو زندہ کیا ہے۔ آج سے تم مجھے ڈاکٹر نہیں ڈیڑی بولو گے۔“

پھر وہ ایک متحدہ شیشہ اٹھا کر اس کے چہرے کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ ”خود کو آئینے میں دیکھ رہے ہو یہ بتاؤ میرا بیٹا کتنا پیٹھ سم تھا۔“

”بہت ہی خوب رو تھا۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے خوبصورت نہ بنا لیں۔ معمولی سی صورت ہوتا کہ عورتیں مجھ

سی صورت کو مٹنے نہیں دوں گا۔ ایسا جواب قدرتی حسن نہ اس دنیا میں ہے نہ ہوگا اور نہ ہی آپ جیسے ماہر سرجن سرجری کے ذریعے ایسا حسن پیدا کر سکیں گے۔ ہم اس پہلو پر بعد میں گفتگو کریں گے۔ ابھی رازداری کے سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ڈیڈی نے میرا یہ چہرہ بنا یا ہے اور دھرم داس جی ہمارے رازدار ہیں۔

”دھرم جی! آپ ماسٹر کو یو یو کے وفادار ہیں۔ کیا اس سے یہ بات چھپا سکیں گے کہ میں ڈاکٹر ٹینی سن کا بیٹا بن کر نئی زندگی گزارنے جا رہا ہوں؟“

اس نے کہا: ”ماسٹر کو یو یو میرے کام آتا ہے۔ میں اس کے کام آتا ہوں۔ اس حد تک اس کا وفادار ہوں۔ ورنہ وہ انڈیا میں اور بہت سے اہم معاملات مجھ سے چھپاتا ہے میں بھی اپنے بہت سے اہم راز کی ہوا سے گلے نہیں دیتا۔ تم مجھ پر شبہ کر سکتے ہو۔ لیکن مجھ پر بھروسہ کرنا ہی پڑے گا کیونکہ ڈاکٹر کے بعد میں دوسرا رازدار ہوں۔“

وہ مراد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا: ”تم رفتہ رفتہ یقین کر لو گے کہ میں تمہارا سچا رازدار ہوں۔“

ان کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ رنگ ٹون نے مداخلت کی۔ اس نے بھی سی اسکرین کو پڑھ کر کہا: ”کوئی اجنبی کال کر رہا ہے۔“ اس نے مبینہ ویا کرفون کو کان سے لگا لیا۔ پھر پوچھا: ”ہیلو۔ کون ہیں آپ؟“

کسی نے کہا: ”میں تمہاری موت ہوں۔ اگر پوری زندگی جینا چاہتے ہو تو بتاؤ، مراد علی منگلی کہاں ہے؟“ اس نے مراد کو دیکھا پھر کہا: ”میں کسی مراد علی منگلی کو نہیں جانتا۔ تم شاید راتگ نمبر پر بول رہے ہو۔“

مراد اپنی جگہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دھرم داس کا منہ بھٹکے لگا۔ دوسری طرف سے کہا گیا: ”پانچ گھنٹے پہلے ہمارے ایک تجربے میں مراد کے ساتھ تمہارے گھر سے نکلے دیکھا ہے۔ تم اسے چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ ہم نے تمہارے پی اے سے مراد کا پتا پوچھا تھا۔ اس نے بتانے سے انکار کیا تو اسے گولی مار دی۔ تم اس کے گھر جا کر اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔ یہ تمہارے لیے وارننگ ہے۔ اگر تم نے ایک گھنٹے کے اندر مراد تک نہیں پہنچایا تو اپنی چتا کا ایندھن بن جاؤ گے۔“

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ دھرم داس نے فوراً ہی فون کے ذریعے اپنے پی اے کی خیریت معلوم کی تو دشمن کی دھمکی درست ثابت ہوئی۔ اس بے چارے کو کسی نے گولی مار دی تھی۔

میں چوتیس دن کے اندر نیک نامی حاصل کر کے اس کے پاس نہیں جاؤں گا تو وہ پرانی ہو جائے گی۔

”میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس رب کریم سے وعدہ کیا تھا کہ گناہوں سے باز آ جاؤں گا اور پانچوں وقت کی نمازیں ادا کرتا رہوں گا۔ شکر ہے میرے مجبور...! تب سے میری زندگی میں بہتری آرہی ہے۔ میں گناہوں سے دامن بچاتا آ رہا ہوں اور یہ تو ناممکن نظر آتا تھا کہ میں اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے پاکستان جا کر تین دلا سکوں گا کہ میں اب مجرم نہیں رہا ہوں۔ میں نے ہتھیار چھینک دیئے ہیں۔“

”صرف وہی ہمارا مجبور ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ اب میں آزاد ہوں۔ یا اللہ...! اب میں ہتھیار چھینک کر ماروی کے ساتھ شریفانہ زندگی گزار سکوں گا۔“

”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ جیسے ہی ایمان علی کے نام سے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنے گا، میں یہاں سے پاکستان چلا جاؤں گا۔“

ڈاکٹر نے کہا: ”دھرم داس جی! یہ آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ حاصل کرنا آپ کے لیے گھر کی بات ہے۔ میرے بیٹے کا اسلامی نام ایمان علی ہے۔ کیا دو چار روز میں اس کے اہم ڈاکٹریٹ کاغذات تیار ہو جائیں گے؟“ اس نے کہا: ”آپ ابھی بیٹے کے لیے درخواست لکھیں اور اس کی تصاویر دیں۔“

وہ چٹکی بجا کر بولا: ”یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کل ہی آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔“ مراد خوشی سے کھل گیا۔ اس نے کہا: ”اس کا مطلب ہے میں اپنی ماروی کے پاس دو چار روز میں جا سکوں گا۔“

”بے شک جا سکو گے لیکن وعدہ کرو۔ وہاں سے بہو کو میرے پاس لاؤ گے۔“

”اللہ کو منظور ہو تو اسے اسی پناہ گاہ میں لاؤں گا لیکن کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ بات یہاں آ کر اکتی ہے کہ ماروی میرے ساتھ پاکستان یا انڈیا میں یا لندن میں رہے۔ اس کی وجہ سے میں اس بہروپ کے باوجود پہچان لیا جاؤں گا۔“

دونوں نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ دھرم داس نے کہا: ”جہاں جاؤ گے ماروی تمہاری پہچان بن جائے گی۔“ ڈاکٹر نے کہا: ”میری بہو مصیبت نہیں بنے گی۔ میں اس کی بھی صورت بدل دوں گا۔“

مراد نے کہا: ”نہیں ڈیڈی! میں ایسی پیاری من موہنی

رہوں گا۔ ان سب کے متعلق بہت سی باتیں بتاتا رہوں گا۔“ ایک ملازم نے آ کر کہا: ”دھرم داس جی آئے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا کہ وہ چار گھنٹے بعد آئے، مراد کی صورت تبدیل ہو جائے گی۔ وہ دونوں کلیک کے وزینگ روم میں آئے۔ دھرم داس نے اس کے بیٹے کو دیکھ کر حیرانی سے کہا: ”راہن سن! تم واپس آ گئے؟ تم کیسے بیٹے ہو؟ باپ کو پانچ برسوں سے ترساتے اور پریشان کرتے رہے ہو؟“

مراد نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: ”آپ مجھے اچھی طرح دیکھیں، میری یہ انگریزی لینگویج سٹیں۔ کیا میں واقعی راہن سن ہوں؟“

وہ بولا: ”اس میں کیا شبہ ہے؟ تم ڈاکٹر کے بیٹے ہو۔ میں برسوں سے تمہیں دیکھتا آیا ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے ہندی بھاشا میں بولا: ”دھرم داس جی میں آپ کا سیوک مراد علی منگلی ہوں۔“

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا: ”میری مہارت دیکھ رہے ہو۔ میں نے مراد کو نیا چہرہ دے کر اپنے بیٹے کو زندہ کر دیا ہے۔“

دھرم داس بالکل قریب آ کر مراد کے چہرے کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ پھر بولا: ”بے شک! یہ ماروی کا چہرہ ہے۔ تم نے چہرہ دیکھا ہے؟ ڈاکٹر! تم نے چہرہ دکھایا ہے۔ مراد علی منگلی کو بالکل ہی غائب کر دیا ہے۔ دشمن تو اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرجائیں گے۔“

وہ پھر اسے چھو کر بولا: ”وہ تمہارے اس کے سامنے آ کر بھی اسے پہچان نہیں سکیں گے۔ تم نے کمال کر دیا ہے ڈاکٹر!“

پھر اس نے مراد سے پوچھا: ”اس نئے چہرے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ تم ایک بہت ہی مشہور و معروف اور بہت ہی عزت دار ڈاکٹر کے بیٹے بن گئے ہو۔ تمہیں قسمت سے یہ موقع مل رہا ہے۔ ڈاکٹر کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اسلحہ چھینک دو۔ اپنے تمام دشمنوں کو بھول جاؤ۔“

ڈاکٹر نے کہا: ”دھرم جی بہت اچھی بات کہہ رہے ہیں۔ آج تم نے نیا جنم لیا ہے۔ آج سے تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس لیے اب ناسلحہ اٹھاؤ، نہ نئے دشمن پیدا کرو۔“

مراد نے کہا: ”میری ماروی دل سے چاہتی ہے کہ میں پرامن شہری کی طرح شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ آؤں۔“ وہ سر اٹھا کر خلا میں اسے دیکھتے ہوئے بولا: ”اگر

تمہارے وطن کی زمین تمہارے لیے تنگ ہو گئی ہے۔“ ”اب وہاں مجھے کوئی نہیں پہچانے گا۔ میں چھپ کر ماروی سے ملوں گا۔ وہاں اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کے لیے اس نئے روپ میں نیک نامی سے...“

پرامن شہری کی طرح رہوں گا۔ ہتھیار چھینک دوں گا۔“ ”وہاں نہیں رہ سکو گے۔ اگرچہ کوئی تمہیں نہیں پہچانے گا۔ لیکن ماروی کی وجہ سے تم پہچان لیے جاؤ گے۔“

”ہاں، یہ اندیشہ ہے۔ میں سوچوں گا۔ کوئی تدبیر کام نہ آئی تو ماروی کو یہاں لے آؤں گا۔“

وہ خوش ہو کر بولا: ”یہ ہوتی نابات۔ اس سے اچھی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ میرا بیٹا میری بہو میرے پوتے پوتے یہاں میرے گھر میں رہیں گے۔“

”اگر کسی وجہ سے یہاں نہ آسکا تو؟“ ”تو لندن میں میرا ایک چھوٹا سا بنگلا ہے۔ میرے بعد اور کون میرا ہواگا؟ تم ہی بیٹے کی حیثیت سے میری تمام دولت اور جائیداد کے مالک بن جاؤ گے۔“

ڈاکٹر ٹینی سن کے ذریعے اسے بڑی سہولتیں حاصل ہو رہی تھیں۔ ایمان علی کے نام سے ایک پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بن جاتا تو وہ بہ آسانی سرحد پار اپنی ماروی کے پاس جاسکتا تھا۔

اگر ماروی کے ساتھ پاکستان میں رہنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اپنی شریک حیات کو لے کر وہی ڈاکٹر ٹینی سن کے پاس پھر سے پرامن شہری کی طرح شریفانہ زندگی گزارنے لگتا۔

اس نے ڈاکٹر کا ہاتھ تھام کر کہا: ”آپ بیٹے سے محروم ہو گئے تھے۔ اب میں اس کی کی پوری کروں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا۔“

وہ خوش ہو رہا تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ مراد نے کہا: ”میں کوشش کروں گا کہ جلد سے جلد دشمنوں سے نجات حاصل کروں اور اپنی دلی خواہش کے مطابق یہاں ماروی کے ساتھ رہ کر محفوظ اور پرامن زندگی گزاروں۔“

اس نے کہا: ”تم انگریزی بولتے ہو لیکن لندن کے عیسائیوں والا لہجہ اور اسٹائل نہیں ہے۔ اسے یکھنا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ میرے ساتھ رہو گے تو یہ سیکھ لو گے۔“

”میرے بیٹے کی حیثیت سے وہاں تمہارے کئی عیسائی رشتے دار بھی ہیں۔ وہ مزاج کے کیسے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ تمہارے لیے یہ سب جاننا لازمی ہے۔ میں اہم سے ان کی تصویریں تمہیں دکھاتا

مراد نے اس سے کہا۔ ”ابھی آپ اور ڈیڈی نصیحت کر رہے تھے کہ مجھے اسلحہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ اب بتائیں میں کس دل سے آپ کو دشمنوں کا نشانہ بننے دوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ ابھی اپنے اطراف سیکورٹی سخت کر لوں گا۔“

”دھرم جی! آپ نے ہیلری ہڈن کے لیے بھی سیکورٹی بڑھادی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس کی بہن کو اغوا کر رہے تھے۔ آپ اپنی جوان بیٹیوں اور بیٹوں کو کیسے سیکورٹی دیں گے۔ وہ میری بہنیں ہیں۔ کالج اور شاپنگ کے لیے جاتی ہیں۔ آپ کے بیٹے میرے بھائی ہیں۔ سرکاری عہدوں پر ڈیوٹی کے لیے جاتے رہتے ہیں۔ کسی بھی وقت کہیں سے ایک اندھی گولی آکر انہیں لگ سکتی ہے۔ آپ اچھی طرح سوچیں آپ کے حفاظتی انتظامات دھرم کے دھرم سے رہ جائیں گے۔“

وہ اپنے صوفے پر پریشانی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایک باپ خود کو خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جوان اولاد کی طرف موت آئے۔ فون کال سے ملنے والی دھمکی کہہ رہی تھی کہ اس کی بیٹیاں اور بیٹے نادیہ کن پوائنٹ پر ہیں۔

وہ بولا۔ ”تم نے لیزا کو بچا لیا تھا۔ تم سیکورٹی گارڈز سے زیادہ غیر خطر اور قابل اعتماد ہو۔ تم ہی دشمنوں کو میری بیٹیوں اور بیٹوں کے قریب آنے سے روک سکو گے۔“

ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”دھرم جی کے بچے میرے بچے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ میرے بیٹے ایمان علی! تمہیں اسلحہ نہیں چھیننا چاہیے۔ میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ کچھ روز کے لیے... دھرم جی کے بچوں کی سلامتی کے لیے اسلحہ اٹھا لو۔“

وہ بولا۔ ”کچھ روز کے لیے نہیں ڈیڈی! یہ اسلحہ میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔ آگے جا کر دشمن مجھے نہیں پائیں گے تو ماروی کو اغوا کرنا چاہیں گے۔ مجھے اسلحہ ہاتھوں میں رکھنا ہی ہوگا۔“

دھرم داس اپنے تمام بچوں کو فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ آج اور کل گھر سے نہ نکلیں۔ تا معلوم دشمنوں نے بی اے کو ہلاک کیا ہے انہیں بھی گولی مار سکتے ہیں۔ وہ گھر آکر انہیں تفصیل بتائے گا کہ معاملات کیا ہیں؟

پھر اس نے فون کے ذریعے سیکورٹی گارڈز کو بلا دیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں باہر جا رہا ہوں۔ موٹر سائیکل پر دوڑتے جاؤں گا، چاروں طرف دیکھوں گا۔ جو لوگ مشکوک

لگیں گے، انہیں دور سے نشانے پر رکھوں گا۔ جب آپ خیریت سے گھر پہنچ جائیں گے تو میں واپس آ جاؤں گا۔ آپ بچوں کے متعلق بتائیں وہ کہاں ہیں۔“

”ایک بیٹی اور تین بیٹے گھر میں ہیں۔ بڑی بیٹی پریمنا پر پینٹنگ کلاس اٹینڈ کرنے گئی تھی۔ وہیں رکی رہے گی۔ میں دو گارڈز کو بھیج رہا ہوں۔“

”آپ پریمنا سے پولیس، وہیں گارڈز کے ساتھ رہے۔ جب میں وہاں پہنچوں تو کالج سے نکلے۔“

دھرم داس بیٹی کو کال کرنے لگا۔ مراد نے اپنے ریوالور کو چیک کیا۔ اسے لباس کے اندر چھپایا۔ دو فاضل میگزین جیبوں میں رکھے پھر ہیلمٹ پہن لیا۔ اس طرح اس کی صورت کسی کو نظر نہ آتی۔ پھر وہ کلینک سے باہر آ گیا۔

وہ موٹر سائیکل کے پاس آ کر دوڑتے نظر میں دوڑانے لگا۔ سامنے بچوں کا پارک تھا۔ شام کے وقت بچے کھیل رہے تھے۔ اس کے بعد ایک شاہراہ کھڑک سنگھ تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ادھر جانے لگا۔ وہ پارک کے ایک طرف گھوم کر جا رہا تھا پھر میں گز کے فاصلے پر جا کر رک گیا۔ پارک کے اس حصے میں لڑکیاں اور لڑکے ڈانس کر رہے تھے۔ ان کے ماں باپ تالیاں بجا رہے تھے۔

وہ بہ ظاہر تھا شاد بچنے کے بہانے پارک میں دوڑتے نظر میں دوڑا رہا تھا۔ شام کے سامنے گھرے ہوئے تھے۔ اب تب میں رات کی تاریکی چھانے والی تھی۔

وہاں ایک جالی دار بچہ تھا۔ بچے اس بچہ سے مل کر کھس کر رہتے ہوئے دوڑتے جاتے ہوئے بچہ سے مل کر دوسرے سرے سے باہر نکلتے تھے۔ اب بچوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی پھیلنے کے باعث وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ ایسے وقت مراد نے دو مشکوک افراد کو اس بچہ سے دیکھا۔

وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے ریپتے ہوئے بچہ کے دوسرے سرے پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ اس دوسرے سرے کا رخ ڈاکٹر کے کلینک کی سمت تھا۔

کلینک سے صرف پندرہ گز کا فاصلہ تھا۔ دھرم داس دروازہ کھول کر باہر گاڑی میں بیٹھنے آتا تو گاڑی تک پہنچنے سے پہلے بڑی آسانی سے نارگٹ بن جاتا۔

قاتلوں کے فرار ہونے کے لیے پارک کے احاطے کے باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ احاطے کے باہر جہاں مراد تھا وہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل کو دھکیلتا ہوا بچہ کے دوسرے سرے کے سامنے

آ گیا۔ احاطے کی دیوار نے اور تاریکی نے اسے چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں شوٹرز صاف نظر آ رہے تھے اور بہت ہی ایزی ہارگٹ بنے ہوئے تھے۔

اس نے فون پر کہا۔ ”دھرم جی! آپ اپنے گارڈز کا انتظار نہ کریں۔ آپ دروازہ کھول کر ابھی اسی وقت کلینک سے باہر آئیں۔ میں آپ کے قریب ہی رہوں گا۔“

اس نے فون بند کر کے اسے جیب میں رکھا پھر ریوالور کو نکال کر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس نے بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اگر دھرم داس کے باہر آتے ہی وہ گولی نہ چلاتا یا اس کا نشانہ بچوک جاتا تو دشمنوں کی گولوں سے لگی ہوئی گولیاں باہر آنے والے ایم این اے کا کام تمام کر دیتیں۔

ہوسکتا تھا، وہ اسے جان سے نہ مارتے زخمی کرنے کے بعد اس سے مراد کا پتا پوچھتے رہتے۔ اس وقت انہوں نے اپنا اسلحہ ایک تھیلے میں چھپا رکھا تھا پھر جیسے ہی کلینک کا دروازہ کھلا، انہوں نے پھرتی سے اپنی گولیاں باہر نکال لیں۔ ان دونوں کی گولوں میں ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ نشانہ خطا نہیں ہو سکتا تھا۔ ان سے پہلے ہی مراد ان کی ہانک میں احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ اس نے بڑی بہارت سے نشانہ لے کر ٹریگر کو دبا دیا۔ گولی ایک کی کھوپڑی پر سواری کرتی ہوئی گزر گئی۔

دوسرا شوٹر بدگ گیا۔ چشم زون میں سمجھ گیا کہ کسی کے نشانے پر ہے۔ ایسی سچویشن میں فوراً جگہ بدلتی تھی۔ وہ وہاں سے اچھل کر ایک جھم سے بچھے جانا چاہتا تھا لیکن اچھلنے کے بعد گولی کھا کر زمین پر واپس آیا اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔

فون سے رنگ ٹون ابھرے گی۔ اس نے اسے کان سے لگا دیا۔ دھرم داس نے واپس اندر جا کر دروازے کو بند کر لیا تھا۔ فون پر کہہ رہا تھا۔ ”تم نے مجھے باہر آنے کو کہا تھا۔ وہاں کہیں سے گولیاں چل رہی ہیں۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نے گولیاں چلائی ہیں۔ جو آپ کو نشانے کرنے آئے تھے، ان میں سے ایک مر گیا ہے۔ دوسرا شاید زندہ ہے، زخمی پڑا ہے۔ سپاہیوں سے پولیس فوراً اسے ہسپتال لے جا کر اٹھوائیں کہ وہ گس خطرناک گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔“

اس نے جیسے ہی فون بند کیا، اس کی شامت آئی۔ ایک گولی اس کے ہیلمٹ سے ٹھن کی آواز کے ساتھ گھمائی ہوئی خطرے کی گھنٹی بجاتی ہوئی گزر گئی۔ وہ دھب سے زمین پر گر کر لڑھکتا ہوا احاطے کی دیوار سے لگ گیا۔

آدھا لٹ کر آدھا بیٹھ کر دوڑتے نیم تاریکی میں

دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی دور تاریکی میں جیسے شعلہ سا لپکا، ایک گولی چلی۔ اس کے سامنے کسی کی موٹر سائیکل تھی۔ وہ فائرنگ کی زد میں آئی۔ اس گاڑی نے آنے والی گولی کو روک لیا تھا۔

اسی لمحے میں مراد کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے کسی کو آخری بار چیخنے پر مجبور کیا۔ دوسرا بھاگ رہا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز کی سمت متواتر گولیاں چلانے لگا۔ ایک فائر دوسرا فائر پھر تیسرا... آخر چوتھے فائر پر بھاگنے والا گر پڑا۔

ایسے وقت پولیس کی دو گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی کلینک کے سامنے آ کر رک گئی تھیں۔ مراد فوراً ہی اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے نئے روپ میں ایمان علی کو گن فائر کے طور پر دیکھے۔ اس نے دور جا کر فون پر دھرم داس سے کہا۔ ”یہ یاد رکھیں۔ کسی سے یہ نہ پولیس کہ ڈاکٹر ٹینی من کے بیٹے نے ان قاتلوں سے مقابلہ کیا ہے۔ آپ انجان بن جائیں۔ یہ کہہ دیں کہ آپ کلینک کے اندر تھے باہر نہ جانے کہ لوگوں کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی تھی۔“

دھرم داس نے کہا۔ ”بہت خوب مراد...! میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ ابھی پولیس سے تمہارا کرم سے بات کروں گا۔“

وہ فون کو جیب میں رکھ کر کھڑکی سے بائیک دوڑاتا ہوا ایک ریستورنٹ میں آ گیا۔ صبح ناشتے کے بعد کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک میز پر آ کر کھانے کا آرڈر دیا۔ پھر اپنے فون پر نمبر شیئر کرنے لگا۔

☆☆☆

ماروی ننھے شہزادے سے کھیل رہی تھی۔ محبوب ایک گھنٹے بعد ڈنر کے لیے آنے والا تھا۔ اس کے نصیب میں مہاد کے ساتھ کھانا پینا نہیں تھا۔ وہ دن رات اس کے بچے سے بہلتی رہتی تھی۔ اس نے سرگھا کر اپنے فون کو دیکھا۔ رنگ ٹون اسے بلارہی تھی۔ اس نے بڑے اعتماد سے فون کو اٹھایا۔ دل کہہ رہا تھا مراد آیا ہے اور واقعی وہ اسے پکار رہا تھا۔

اس نے ٹین دبا کر کان سے لگا دیا۔ گویا دل سے لگایا۔ دل والے نے پوچھا۔ ”میری جان! ایسی ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”تمہارے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں یہ خود سوچو۔“

”انشاء اللہ جدائی کے دن ختم ہو جائیں گے۔ ایک اچھی بات سنا رہا ہوں۔ تم سے مشورہ کرنے اور تم سے

یہاں لے آؤں یا لندن لے جاؤں۔ ابھی بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہے۔ ابھی فون بند کر رہا ہوں پھر کسی وقت کال کروں گا۔

وہ کھارہا تھا اور باتیں کر رہا تھا۔ ماروی نے کہا۔ ”یہ اچھی طرح جانتی ہوں دنیا چاہے ادھر کی ادھر ہو جائے تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔ ہائے مراد! میں تم سے جتنا پیار کروں گی اتنا ہی کم ہوگا۔ میں دل ہی دل میں تم پر قربان ہو رہی ہوں۔“

”اسی پیار بھری باتیں کرو گی تو ابھی بھاگ کر چلا آؤں گا۔ بائی داوے، یہ یاد رکھو اب میرا فون نمبر بدل جائے گا۔ یہ سم نکال کر پیسٹ کر دوں گا۔ اگلی کال میں نمبر سے آئے گی۔ خدا حافظ۔“

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ کھاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ماروی کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس کی خدمت کے لیے اگر وہ جلد پاکستان نہ جاسکا تو ماسٹر کو بوبو کو اس کی سلامتی اور مضبوط سکیورٹی کے لیے بولنا ہوگا۔

وہ آخری لقمہ چباتے ہوئے دل ہی دل میں بولا۔ ”اللہ نے چاہا تو کل صبح ہونے تک ماروی کے چاروں طرف سکیورٹی کی آہنی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔“

وہ کھاتے ہوئے بچہ لگا۔ ایسے وقت دھرم داس نے اسے کال کی۔ وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”جی دھرم جی! وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ بتا چلا کہ وہ دشمن کون تھے؟“

اس نے کہا۔ ”تم نے تہا چار شوٹرز کو مار گرایا ہے۔ ان میں سے ایک زندہ ہے۔ بری طرح زخمی ہے۔ وہ مقامی باشندہ ہے۔ سٹڈیکٹ ریڈ الرٹ کے لیے کام کر رہا ہے۔“

”مراد! پتا نہیں تمہارے کتنے دشمن ہیں۔ آج صبح ہمیری ہڈن پریڈیٹرز ریکٹ کے شوٹرز نے حملہ کیا تھا۔ اس کی بہن لیزا کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی تمہارا پتا پوچھ رہے تھے۔ یہ ریڈ الرٹ والے بھی پوچھ رہے ہیں۔ بہنوں تم کالج جاؤ۔ وہاں میرے دو گن مین گاڑی لے کر گئے ہیں۔ تم جاؤ گے تو پریمنا کالج سے باہر آئے گی۔“

”میں ابھی جا رہا ہوں۔ آپ ماسٹر کو بوبو کو میرے اور اپنے حالات بتائیں۔ میں پریمنا کو سکیورٹی دینے کے بعد ماسٹر سے بات کروں گا۔“

دھرم داس نے اسے پریمنا کا فون نمبر بتایا۔ وہ رابطہ ختم کر کے کھانے کا بل ادا کرنے کے بعد ریٹورنٹ سے باہر آیا اور کالج کی طرف جانے لگا۔

برسر اقتدار پارٹی کے ایک ایم این اے پر قاتلانہ

اجازت لینے کے بعد چہرہ تبدیل کر چکا ہوں۔ آج سے کوئی دوست اور دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ تمہارے سامنے آؤں گا تو تم بھی مجھے اجنبی سمجھو گی۔“

”میرے سامنے آؤ اور آزماؤ۔ میں کوڈ ورڈز کے ذریعے تمہیں پہچان لوں گی۔ یہ تم نے چہرہ بدل کر بہت اچھا کیا ہے۔ اب تو نہ دشمن تمہارے پیچھے آئیں گے نہ تم بندوق اٹھاؤ گے۔“

”بندوق تو میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔ چہرہ بدلنے کے بعد میں محفوظ ہو گیا ہوں لیکن تم غیر محفوظ ہو گئی ہو۔ دشمن جانتے ہیں کہ تم میری جان ہو۔ میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ وہ تمہیں گن پوائنٹ پر اغوا کر کے کہیں لے جائیں گے۔ پھر تم سمجھ سکتی ہو۔ وہ درندے تمہاری زندگی کا سودا مجھ سے کریں گے اور مجھے گن پوائنٹ پر آنے کے لیے مجبور کر دیں گے۔“

”یا اللہ! یہ نئی بات کیا کہہ رہے ہو؟ عقل کتنی ہے دشمن ایسا ضرور کریں گے۔ پھر کیا ہوگا مراد؟“

”یہی تو کہہ رہا ہوں کہ بندوق سپینک نہیں سکتا۔ آئندہ تمہارے لیے ایک طویل جنگ لڑنی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تم پر آج نہیں آنے دوں گا۔ یاد رکھو، سب سے زیادہ خطرہ مراپہ کی طرف سے ہے۔ جب وہ مجھے نہیں پائے گی تو تمہیں نقصان پہنچانے یا اغوا کرنے آئے گی تاکہ میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں اور اس کے ساتھ بھی ازدواجی زندگی گزاروں۔“

ماروی نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ کیسی بے شرم عورت ہے۔ کیا شرم اور شرافت اسے چھو کر نہیں گزری ہے؟“

”وہ مغربی ماحول کی پروردہ ہے۔ تم اطمینان رکھو اب وہ نہ مجھے پہچان سکے گی، نہ آئندہ میری مجبور یوں سے کھیل سکے گی۔ میں تمہیں اس کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گا۔“

”کیا تم اگلے ماہ کی دو تاریخ سے پہلے یہاں آ سکو گے؟“

”انشاء اللہ! آج نہیں تو کل یا پھر چوبیس دنوں کے اندر ضرور آؤں گا۔“

”آ تو جاؤ گے لیکن یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ جرائم کی دنیا سے نکل آئے ہو؟“

”تمہاری تو صورت بدل گئی ہے۔ کیا انہیں بتاؤ گے کہ تم نے نئے چہرے کے پیچھے اپنا چہرہ چھپا لیا ہے؟“

”ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے کہ محبوب وغیرہ کو میرے چہرے کی تبدیلی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے یا نہیں؟ وہاں آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔“

نئے سال کا پہلا شمارہ اہمیت کا حامل شمارہ

سرگزشت

ماہنامہ

شکوہ سخن

اس شاعر کا زندگی نامہ جسے کالا پانی کی سزا ہوئی تھی

کیسے کیسے لوگ

انوکھی شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف

سمندر کے بھید

سمندر کی انوکھی دنیا کے رنگ عجیب ہیں

ہم ولدہ

اس فنکار کی سرگزشت جس نے فن میں نام پیدا کیا

مایا

اندرون سندھ سے ایک انتہائی

دلچسپ و سہجہ آموز سچ بیانی

اسکے علاوہ

”سراب“ جیسی ایسے کو گرم کر دینے والی طویل کہانی

”فلمی الف لیلہ“ جو خود میں تاریخ ہے

”الودع“ ایک ایسی ستر کہانی جو معلومات کا خزانہ ہے

اور

ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات

انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

آج ہی سزا کی ایک سال پر پورے پختہ کر لیں

”یہاں جان کے لالے پڑے ہیں اور تم میرے ساتھ بیٹھنے کی ضد کر رہی ہو۔ تمہارے ڈیڈی پر قاتلانہ حملے ہو چکے ہیں۔ میں دور رہ کر سیکو رٹی دوں گا۔ چلو باہر نکلو۔“

”پلیز رابن سن! میری بات مان لو۔ تم نے میری سبیلی شیلہ کے گھر میں میرے ساتھ رات گزار لی تھی۔ ابھی ہم اسی گھر میں جا رہے ہیں۔ وہاں تنہائی میں دو چار گھنٹے گزاریں گے۔ میں ڈیڈی سے کہہ دوں گی کہ شیلہ نے مجھے روک لیا ہے۔“

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اب رابن سن نہیں رہا۔ میرا مذہب میرا من عزاج سب بدل چکا ہے۔ میں عورتوں کے سامنے سے دور رہتا ہوں۔“

”تم نے مجھے لڑکی سے عورت بنا لیا ہے۔ اب مذہب بدل کر مجھ سے نہ بھاگو۔ اپنی موٹر سائیکل دونوں گاڑوں کو دو۔ میرے ساتھ گاڑی میں چلو۔“

اس نے فون بند کیا پھر دھرم داس سے رابطہ کر کے بولا۔ ”دھرم جی! میں آپ کو پریمنا کے بارے میں ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ پانچ برس پہلے رابن سن سے اس کا رومانس چل رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تنہائی میں وقت گزار چکی ہے۔“

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”مرادو! کیا کو اس کو مرید بناؤ؟“

”آپ ذرا صبر سے سنیں۔ ابھی آپ کو سچائی معلوم ہو جائے گی۔ وہ مجھے رابن سن سمجھ کر ضد کر رہی ہے کہ ابھی ایک سبیلی کے گھر جا کر میرے ساتھ تنہائی میں وقت گزارے گی۔ میں نے انکار کیا ہے تو وہ کالج سے باہر آنے سے انکار کر رہی ہے۔ کبھی ہے میں اس کی بات مانوں گا تو گاڑی میں آکر بیٹھنے کی۔ ورنہ میری سیکو رٹی میں نہیں جائے گی۔ آپ اسے سمجھائیں۔“

دھرم داس نے فوراً ہی مرادو سے رابطہ ختم کر کے سبیلی کو مخاطب کیا۔ پھر پوچھا۔ ”رابن سن کے ساتھ تمہارا کیا چکر تھا؟“

”وہ بولی۔“ ڈیڈی! میں اسے جانتی ہوں۔ وہ مجھے مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ گھر آ کر آپ کو یہ بتانے والی تھی کہ وہ تو چھینچ ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ مسلمان ہو گیا ہے۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ وہ مسلمان ہوتے ہی بدل گیا ہے۔ میرا دل تو زور رہا ہے۔“

وہ اقرار کر رہی تھی کہ رابن سن کے ساتھ اس کا پتہ چلا رہا تھا۔ باپ نے پریشان ہو کر کچھ سوچا پھر کہا۔ ”تم گھر آؤ تو میں تمہاری خبر لوں گا۔“

”پلیز دھرم جی! میں ڈیڈی...! کیا آپ نہیں جانتے کہ

میں قانون کے مطابق بالغ ہو گئی ہوں۔“

وہ پیش میں آ کر دو ہانڈے لگا۔ ”جو اس مت کرو۔ میں اہم این اے ہوں۔ دہلی کے دولت مندوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ کیا تم میری عزت کو خاک میں ملانا چاہتی ہو؟“

”جہاں تک عزت اور اونچے مرتبے کی بات ہے آپ میری شادی اس سے کرادیں۔ عزت بنی رہے گی۔“

وہ سمجھ رہا تھا کہ بیٹی جو کہہ رہی ہے وہ ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ دھرم کا کھارہ رہی تھی۔ مرادو کو رابن سن سمجھ رہی تھی اور مرادو اپنی ماروی کے سوا کسی کو منہ لگانے والا نہیں تھا۔

اس نے کہا۔ ”پریمنا! تم گھر آؤ۔ ہم شادی کے مسئلے پر تمہاری مہی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میں جاتی ہوں میرے ڈیڈی ضرور اسے داماد بنا لیں گے۔ آپ میری ایک بات اور مان لیں۔ وہ پانچ برس بعد آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ سبیلی کے گھر جا کر ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ نادان نہیں تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ بیٹی سبیلی کے گھر جا کر مرادو کے ساتھ بہت ہی رنگین و سنگین لمحات گزارے گی۔ اس نے کہا۔ ”ابھی حالات بہت سنگین ہیں۔ دھرم داسی تاکہ میں ہیں۔ سبیلی گھر آؤ۔ یہاں آرام سے رہنا۔ تمہارے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنا تمہاری رہو۔“

”پلیز ڈیڈی! آپ تو ہماری ہر بات مان لیا کرتے ہیں۔ ابھی مان لیں۔ ابھی مجھے سبیلی کے گھر اس کے ساتھ جانے دیں۔“

”تم میری بات نہیں مانو گی تو میں رابن سن سے رشتے کی بات نہیں کروں گا۔ تم باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھو گی یا نہیں؟“

وہ مجبور ہو کر بولی۔ ”آپ اس سے رشتے کی بات کریں گے۔“

”...“ ٹھیک ہے میں باہر گاڑی میں بیٹھنے جا رہی ہوں۔“

دھرم داس نے مرادو سے فون پر کہا۔ ”وہ گاڑی میں بیٹھنے آ رہی ہے۔“

”جی دھرم جی! میں دور سے دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو اسے بھیرت آپ کے پاس لاؤں گا۔“

اس نے فون کو بند کر کے جیب میں رکھا۔ دور کالج کے کونے میں ایک جوان لڑکی دکھائی دی۔ وہ ایک گاڑی کی کچھلی سیٹ پر بیٹھنے جا رہی تھی۔ مرادو بھی موٹر سائیکل پر بیٹھتا ہوا بتاتا تھا۔ ایسے ہی وقت کسی نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن پر اپنے گن کی نال رکھ دی پھر کہا۔ ”بلنا نہیں، گولی لگائے جاسکتی ہے۔ جلدی بولو کون ہو؟ میں دیکھ رہا تھا تم بڑی دیر سے کالج کی طرف دیکھ رہے تھے اور فون پر بولتے ہی چلے

ہو گئی تھی۔ اس نے پھر اس کا نمبر ری ڈائل کیا۔ پتا چلا فون بند ہے۔ وہ کہہ چکا تھا کہ آدھے گھنٹے بعد کال کرے گا۔

وہ اسے تصور کی اسکرین پر دیکھنے لگی۔ رابن سن چھ فٹ سے بھی اونچا ایک صحت مند نوجوان تھا۔ لڑکیاں اس کی خوب روٹی پر مرتی تھیں۔ وہ دین اسلام قبول کرنے سے پہلے ایک کھلنڈرا لپے ہوا ہے تھا۔ حسین لڑکیوں کو خوش کرتا رہتا تھا۔ اس نے پریمنا سے بھی خوش کرنے والی دو چار ملاقاتیں کی تھیں۔ وہ اس کی دیوانی ہو گئی تھی لیکن پھر اچانک ہی رابن سن بدل گیا۔ لڑکیوں سے کترانے لگا۔ اس نے پریمنا سے کہا۔ ”مجھے بھول جاؤ۔ میں نے گناہوں سے توبہ کی ہے۔ میں اپنا مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے والا ہوں۔ اس سے پہلے میں تمام غلطیوں سے پاک ہو جانا چاہتا ہوں۔“

اگر وہ تنہائی میں یہ بات کہتا تو پریمنا بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتی۔ بیاس بھجا کر رہتی لیکن اس نے ایک ریٹائرمنٹ میں یہ کہا تھا اور اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے دین اسلام قبول کیا ہے اور باپ نے طیش میں آ کر اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ ان دنوں وہ انیس برس کی تھی۔ اب چوبیس کی ہو گئی تھی۔ اس نے پانچ برس بعد آکر اسے پھر بھڑکا دیا تھا۔

وہ مسجد میں تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔ ”یا میرے پاک پروردگار! میں گناہوں سے بچنے کی کوششیں کر رہا ہوں اور تو مجھے میری نیک نیتی کا بھرپور صلہ دے رہا ہے۔ تیرا شکر ہے کہ مجھے گناہوں سے دور کر رہا ہے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ ایک وقت کی بھی نماز نہیں چھوڑتا ہوں۔ آج پھر آزمائش سے گزرنے والا ہوں۔ پتا نہیں پریمنا کیسی لڑکی ہے اور کس حد تک جائے گی۔ تو مجھے اس کے شر سے بچالے۔ تو ہی غلطیوں سے اور گناہوں سے بچانے والا ہے۔“

وہ دعا مانگ کر زیر لب آیتیں پڑھتا ہوا مسجد سے باہر آیا۔ اس نے فون نکال کر اس کا سوچ آن کیا پھر پریمنا سے رابطہ کر کے بولا۔ ”اپنے گاڑوں کے ساتھ باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور اپنے گھر کی طرف جاؤ۔“

اس نے خلاف توقع کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گی۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”تم میرے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھو گے تو میں یہاں سے نکلوں گی۔ تم نہیں جانتے میں تم سے کتنی ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

انتقامات سے بہت مطمئن ہوں۔
 ”محبوب نے سیکورٹی گارڈز کی تعداد بڑھا دی ہے۔ تین گارڈز دن رات چھت پر الٹ رہتے ہیں۔ چھ گارڈز احاطے کے اندر کوشی کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مراد...! یہاں تو اب کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔ مرید کا باپ بھی یہاں نہیں آسکے گا۔ تم فکر نہ کرو۔“
 ”جب ایسے محسوس انتقامات ہو رہے ہیں تو میں بھی پوری طرح مطمئن رہوں گا۔“
 ”لیکن یاد رکھو تمہیں دو تاریخ سے پہلے یہاں آنا ہوگا۔ تم مجھے پرانی نہیں ہونے دو گے۔“

”بے شک تم میری ہو۔ صرف میری ہی رہو گی، میں دو تاریخ سے پہلے آؤں گا۔“
 اسے فون پر اپنے بیٹے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ ماروی اسے گود میں اٹھا کر پچکارے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میرا بچہ نیند میں چونک کر اٹھا ہے۔ پتا نہیں اتنے سے بچے ایسا کیا خواب دیکھ لیتے ہیں کہ ڈر جاتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت فون کروں گی۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”ڈیڈ ماروی کی طرف سے فی الحال اطمینان ہو گیا ہے۔ وہ بہت متبیوط سیکورٹی میں رہے گی۔ اب ہلدی نہیں ہے۔ میں دس بارہ دن بعد بھی وہاں جا سکتا ہوں۔“

”یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔ کل تمہارا پاسپورٹ تیار ہو جائے گا۔ تم میرے ساتھ لندن چلو۔ میرے بیٹے کی حیثیت سے اپنے تمام رشتے داروں سے ملو۔ میں تمہیں الیم سے ان سب کی تصویریں دکھاؤں گا۔ ویڈیو متحرک فلم کے ذریعے تم شادی بیاہ اور کرس ڈے کی تقریبات میں تمام رشتے داروں کو ہنسنے بولنے دیکھو گے اور انہیں یاد رکھو گے۔“
 وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور کھلے ہوئے دروازے پر ایک یونا کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ! تم...؟“

عبداللہ نے مراد کو دیکھ کر خوشی سے چیخ ماری۔ ”میرے دوست رابن سن... نہیں، ایمان علی تم آگے؟“
 وہ خوشی سے دونوں بازو پھیلائے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ یونا اتنا چھوٹا تھا کہ مراد کو اس سے گلے ملنے کے لیے اٹھنا نہیں پڑا۔ وہ بیٹھا رہا۔ عبداللہ آکر اس کے گلے لگ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تمہارے بچپن کا یار عبداللہ ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ کوئی سات برس پہلے دو بد معاش تم سے الجھ رہے

موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنے ڈاکٹر ڈیڈی کے جھکے میں آ گیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں دعا میں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے واپس آ جاؤ۔“
 وہ مسکرا کر بولا۔ ”خدا نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ میں خیریت سے آ گیا ہوں۔“

”مجھ سے اسی طرح انگریزی میں بولا کرو۔ میرے لیے اور اسٹائل پر توجہ دیتے رہو۔ لوگوں کو یقین ہونا چاہیے کہ تم برطانوی انگریز ہو اور واقعی ڈاکٹر یعنی سن کے مسلمان بیٹے ایمان علی ہو۔“

وہ جھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ یعنی سن نے کہا۔ ”میں تمہارا بیڈروم دکھاتا ہوں۔ وہاں چل کر آرام سے لیٹ جاؤ۔ نیند آئے تو سو جاؤ۔“

وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کے بیٹے رابن سن کے بیڈروم میں آ گیا۔ آرام سے بیٹھ کر لیٹے ہوئے بولا۔ ”آپ اپنی ہونے والی بہو کی فکر کریں ڈیڈی...! میں اسے وہاں سے نہ لایا تو دشمن اسے ضرور نقصان پہنچائیں گے۔“

”تم اسے کسی طرح پاکستان سے... یہاں لے آؤ۔ پھر میں چاہوں گا کہ تم دونوں لندن جا کر رہو اور دشمنوں سے دور سکون سے زندگی گزارتے رہو۔“

”بہت مشکل ہے ڈیڈی! ادوی جس ملک میں بھی میرے ساتھ رہے گی میری واضح پہچان بنی رہے گی۔ دوست اور دشمن سب ہی کہیں گے کہ اس کے ساتھ رہنے والا مراد علی سنگی ہی ہے۔“

اسی وقت ماروی نے کال کی۔ مراد نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”بولو مراد کی جان! کیسی ہو؟ ویسے تمہارا جواب معلوم ہے کہ میرے بغیر اور کیسے رہو گی۔ آہٹ پہ کان لگے رہتے ہیں۔ درپہ نظر رہتی ہے اور آنے والا نہیں آ رہا ہے۔“

”میں نے یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ یہاں آنے کی ہلدی نہ کرو۔ لیکن دو تاریخ سے پہلے ایسی محسوس پلاننگ کے ساتھ آؤ کہ مجھے یہاں سے لے جا سکو۔“

”میری جان...! مجھے مرید کی طرف سے زیادہ اندیشہ ہے اس لیے جلدی آنا چاہتا ہوں۔“
 ”اس کی فکر نہ کرو۔ میری فرمائش پر محبوب یہاں جدید انکسٹر ڈکھل حنائی انتقامات کر رہے ہیں۔ کوئی بھی کوشی کے احاطے کی دیوار پر چڑھے گا تو یہاں اندر چارنی وی اسکرین پر نظر آ جائے گا۔ کوئی دروازے اور کھڑکیوں کے قریب آئے گا تو خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ میں ایسے

مراد نے اچانک رفتار کم کر دی۔ اس طرح وہ آگے نکل گیا۔ مراد نے فوراً ریو لوور نکال کر اس کا نشانہ لیا۔ وہ پہنچوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ بیک وقت دونوں نے گولیاں چلائیں۔ آگے جانے والا گولی کھا کر موٹر سائیکل سے اچھلا۔ پھر نیچے سڑک پر آ کر دوڑتک لڑھکتا چلا گیا۔
 فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار اور بڑھ گئی۔ ادھر ایک گاڑی نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کئی فائر کیے۔ لیکن وہ دور ہوتے جا رہے تھے۔ گولیاں یوں ہی ہوا میں چلتی رہیں۔

مراد موٹر سائیکل روک کر اتر گیا۔ دور جانے والی گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے بڑے ہوئے شوٹر کے پاس آیا۔ گولی اس کے شانے میں لگی تھی لیکن پتھر جلی سڑک پر اچھل کر گرنے اور لڑھکتے رہنے کے باعث ہڈیاں بچ رہی تھیں۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مراد نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”فون نکالو اور اپنے پاس کو کال کرو۔ کم آن دیر نہ کرو۔“
 اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے فون نکال کر نمبر شی کے پھر رابطہ ہونے ہی بولا۔ ”بابو بھائی! میں نارائن بول رہا ہوں۔ پتا نہیں یہ کون ہے اس نے مجھے لہجہ کے ساتھ...

مراد نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگا لیا۔ کہا۔ ”اچھا تو تم انڈیا میں ریڈ الٹ کے ایجنٹ ہو۔ میں نے تمہارے پہلے آقا کی البرٹ کو اس شہر میں گولی ماری تھی۔“
 ”اب تمہارے دوسرے آقا کیسی براڈن کو حلیم ہو گا کہ اس کے درجنوں جاں نثار اسی طرح حرام موت مرتے رہیں گے۔ پتا نہیں وہ اور کتنوں کو قربانی کا بکرا بنانا ہے گا اپنے اس آقا سے بولو یہاں آئے اور اپنے بھائی کا اور بہنوئی برنارڈ کا انتقام مجھ سے لے۔“

”اور بابو بھائی! غیر ملکیوں کے غلام...! آج کے بعد تو بھی گیا۔ اپنی سانسیں گنتے رہنا۔“
 یہ کہہ کر اس نے فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر شہر سے بولا۔ ”یہ بابو بھائی کہاں رہتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”چاندنی چوک پر رہتا ہے۔ بہت مشہور ہے۔ سب ہی اسے جانتے ہیں۔ مجھے کسی طرح اسپتال پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان بھی نہیں بھولوں گا۔“

مراد نے پوچھا۔ ”میں کیوں احسان کروں؟ یہی زندگی میں کوئی اچھا کام کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو ایک بے قصور لڑکی کو زخمی کرنے اور انہیں مارنے کیوں آئے تھے؟“
 اس نے جواب سے بغیر اسے گولی ماری۔ پھر اپنی

جا رہے تھے۔“
 مراد نے بالکل ساکت ہو کر کہا۔ ”اگر تم میری طرح پیشہ ور شوٹر ہوتو سن لو۔ میں ڈیجس ریٹک کا ایک شوٹر ہوں۔ وہ دیکھو دھرم داس کی بیٹی گاڑی میں بیٹھ کر جا رہی ہے۔ میں اسے زخمی کرنے یا ہوسکا تو اسے اغوا کرنے آیا ہوں۔“
 ”جھوٹ بولتے ہو۔ کیا تمہارا سے اغوا کر سکو گے؟“
 ”نہ کر سکا تو زخمی ضرور کروں گا۔ وہ جا رہی ہے۔ تمہارا بھی یہی مقصد ہے تو دیر نہ کرو۔ وہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میں ریڈ الٹ کے لیے کام کر رہا ہوں۔ چلو ایک سے دو بھلے۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اسے زخمی کرنے میں کامیاب ہوگا تو ریڈ الٹ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔“

وہ دھرم داس کو صرف دمہکی دینے کے لیے اس کی بیٹی کو زخمی کرنا چاہتا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تو پھر چلو۔ دیر نہ کرو۔“
 وہ شوٹر دوڑتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی موٹر سائیکل پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی بانکس کو اشارت کر کے آگے بڑھایا۔ پھر رفتار بڑھا کر آگے جانے والی گاڑی کے پیچھے ہو گئے۔

مراد نے بڑی چال بازی سے دشمن کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ ایک لڑکی کو زخمی کر کے بھاگنے کے لیے ایک ہی شوٹر کافی ہوتا ہے۔
 وہ اپنی موٹر سائیکل کو دوڑاتے ہوئے مراد کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”اس گاڑی میں دو گن مین ہیں۔ اگر ہم کسی طرح انہیں ختم کر دیں تو لڑکی کو لے جا سکیں گے۔ اسے اغوا کرنے سے مجھے ڈبل ہیصاف ملے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”مجھے بھی ڈبل ہیصاف ملے گی۔ چلو آج ہم ڈبل کمائی کریں گے۔“
 وہ بولا۔ ”اگر ہم گاڑی کے پتھروں پر فائر کریں تو یہ آگے نہیں جا سکیں گے۔ گاڑی سے نکل کر ہم پر فائر کریں گے ہم جو ابی فائرنگ سے انہیں ہلاک کر سکیں گے۔ کیا ان سے مقابلہ کرو گے؟“

وہ بولا۔ ”نہیں، مقابلے میں ہم بھی مارے جا سکتے ہیں۔ چلو گاڑی کو ناکارہ بناتے ہیں۔ پھر ہم ان سے دور جا کر دیکھیں گے کہ اس کے گاڑی کیا کرتے ہیں؟“

”تو پھر اسپید بڑھاؤ، اس کار کے قریب ہو کر پتھروں پر گولیاں چلائی ہوں گی۔“
 اس مقصد کے لیے دونوں نے رفتار بڑھائی۔ پھر

وہ واقعی چھوٹے قدمی وجہ سے فضا میں قلابازیاں کھاتے وقت فٹ بال کی طرح دکھائی دیتا تھا پھر اچانک ہی مراد کی آنکھوں کو اور توجہ کو ادھر سے ادھر نکالتے ہوئے فضا میں اڑتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو شوکر مار کر گر گیا۔ وہ شوکر پتھر کی طرح لگی تھی۔ مراد کے حلق سے ہلکی سے کراہ نکلی۔ کبڑی نے درست کہا تھا کہ وہ زخمی ہوگا۔ ریوالور اس کے ہاتھوں سے نکل کر دور فرش پر جا گرا پھر اس سے پہلے کہ مراد اسے اٹھاتا، وہ ایک قلابازی کھا کر اسے اٹھاتا ہوا دور جا کر فرش پر جم کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے مراد کو نشانے پر رکھا لیا۔ مراد ایسے کمالات دیکھ کر اس کا گریوہ ہو گیا۔ اسے گلے لگانے کے لیے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ مراد نے اس کی پیٹھ کو چھتکتے ہوئے کہا۔ ”بھدا میں نے پہلی بار ایک فائٹر کی ایسی بھرتی اور مہارت دیکھی ہے۔ اب تو میں چاہوں گا کہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا کرو۔“ وہ بولا۔ ”اور میں جی جان سے رہوں گا۔“ ”تمہارے ہاتھ پاؤں پتھر کی طرح سخت ہیں۔ میرے ہاتھ دکھ رہے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”برہمنوں سے مشتعل کرنا آ رہا ہوں۔ میں عام یونوں کی طرح نرم و نازک نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر نے کبڑی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خدا تم دونوں کی دوستی کو سلامت رکھے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے مراد کو اپنے بیٹے کی صورت دی ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ تم اس کے ساتھ باڈی گارڈ بن کر رہتے ہو۔“ مراد نے کہا۔ ”میں ہتھیاروں کے بغیر لڑتے وقت کی محسوس کرتا تھا۔ اپنی طاقت سے دشمنوں کو زیر کرتا تھا لیکن لڑنے کی تکنیک یا داؤ بچ نہیں جانتا تھا۔ جو ڈو کرانے بھی نہیں جانتا۔“ وہ بولا۔ ”میں ہوں نا۔ تمہیں سکھاتا رہوں گا۔ دشمنوں نے تمہیں خطرناک شوٹر بنا دیا ہے۔ میں تمہیں... خطرناک فائٹر بنا دوں گا۔ اب ذرا گھڑی دیکھو۔ آدھی رات ہو رہی ہے اور میں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے بھی نہیں کھایا ہے، ابھی ملازم کھانا لگائے گا۔“ وہ چلا گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے شام کو سات بجے کھایا تھا پھر بھی ساتھ دوں گا۔ میرے دوست! تمہارے ساتھ ایک نئی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔“

”میری محبوبہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی ہے۔ وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔ میں تمہاری محبوبہ کو تم سے ملانے کے لیے نکل کر دوں گا۔ تمہارے کام آتا رہوں گا۔ میرا یار جانتا تھا کہ میں کیسے کمالات دکھاتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ اٹھو لاؤ رنج میں آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گا۔“ وہ تینوں بیڈروم سے نکل کر لاؤ رنج میں آگئے۔ وہاں اس نے کہا۔ ”جمناسٹک کے کمالات دیکھو۔“ وہ بیڈروم کے بل جو گنگ کرتا ہوا اچانک ہی بلندی کی طرف اچھلا پھر فضا میں قلابازی کھاتا ہوا مراد کے سر کے فرش پر پہنچ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اگر ذرا بھی ڈگمگاتا تو کھڑا نہ ہوتا، فرش پر اوندھے منہ گرتا۔ یہ اس کی مہارت تھی کہ دونوں بیڈروم پر جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مراد اور ڈاکٹر نے داد دینے کے لیے تالیاں بجائیں۔ وہ بولا۔ ”میرا کمال دیکھنے والے کہتے ہیں کہ میں کبڑی کا کھلاڑی لگتا ہوں۔ سب مجھے عبداللہ کبڑی کہتے ہیں۔“ مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ تمہارے کرتب اور چھوٹے قدم کے حوالے سے یہ نام اچھا لگتا ہے۔ میں بھی نہیں کبڑی کہا کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”ایمان علی امیز پر چھوٹا سا گلدان ہے۔ اسے ایک ہاتھ سے اٹھاؤ۔ کھوکھو تم نے ریوالور پکڑا ہے۔“ مراد نے گلدان کو نہیں اٹھایا۔ اس نے مسکرا کر لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ کبڑی نے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے۔ میرا نشانہ تو جیسے گولی مارنے والے ہو۔“ مراد نے نشانہ لیا۔ وہ بولا۔ ”یاد رکھو میں اسے گراؤں گا اور تم گرنے نہیں دو گے توجہ زخمی ہو جاؤ گے۔ بولو منظور ہے؟“ اس نے کہا۔ ”منظور ہے۔ میں نے بڑے زخم کھائے ہیں۔ ایک معمولی چوٹ کھانے سے نہ ڈراؤ۔“ اس نے پھر جو گنگ کی۔ بیڈروم کے بل اچھلنے لگا۔ وہ فضا میں اچھلا ہوا قلابازیاں کھاتا ہوا ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا۔ ریوالور کے نشانے سے ہٹ گیا۔ مراد نے فوراً ہی گن کا رخ اس کی طرف کیا۔ باؤ بو ہاؤ نو... وہ فضا میں اچھل کر مراد کے بائیں طرف آ گیا۔ وہ اتنی تیزی سے چھلکے لگا رہا تھا اور فضا میں قلابازیاں کھاتے ہوئے فٹ بال کی طرح کھوم رہا تھا کہ مراد کی آنکھیں ایک جگہ نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ نشانہ لینے کے لیے ریوالور کا رخ ادھر سے ادھر کر رہا تھا۔

تھے۔ عبداللہ نے ان کی خوب پٹائی کی تھی۔ یہ بہت زبردست فائٹر ہے۔ یہ جو ڈو کرانے اور جمناسٹک کے کرتب بھی جانتا ہے۔“ عبداللہ نے حیرانی سے کہا۔ ”انکل! آپ اسے میرے بارے میں کیوں بتا رہے ہیں؟ کیا یہ مجھے بھول گیا ہے؟“ ”ہاں بیٹے! انکی ہی بات ہے۔ یہ پچھلی بہت سی باتیں بھول گیا ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“ عبداللہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ڈونٹ وری مائی فرینڈ! تم اپنے ڈیڈی کے پاس اور اس دیوانے دوست کے پاس آگئے ہو۔ ہم تمہیں تمام بھولی ہوئی باتیں یاد دلا دیں گے۔“ ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”تم یہ بتاؤ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟ تقریباً ایک برس بعد آئے ہو۔“ ”کیا بتاؤں انکل! اول ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے تو میرا یہ یار آپ کو چھوڑ کر چلا گیا۔ مجھ سے بھی مل کر نہیں گیا۔ اس کے بعد میری جان میری محبوبہ کینسر کے مرض میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔“ وہ سر جھکا کر قریبی صوفے کے پاس گیا۔ وہ صوفے اس کے قدم سے اونچا تھا۔ وہ اچھل کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اتنی بڑی دنیا میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ سوچ رہا تھا سہمی جا کر فلسوں میں کام کروں گا لیکن میرا یار واپس آ گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“ ڈاکٹر اس کی باتیں سن رہا تھا اور دور تک سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”عبداللہ! تم غضب کے فائٹر ہو۔ اکیلے دو چار پر بھاری پڑتے ہو۔ یہ بتاؤ کبھی تم نے گن چلائی ہے؟“ ”انکل! میں اڑتی چیز یا کو مار گراتا ہوں۔ بچپن سے میرے دماغ میں یہ بات تھی کہ میرا قدم چھوٹا ہے۔ کیوں نہ میں ایسے ہنر اور ایسے کمالات سیکھ لوں جن کے ذریعے دوسروں سے برتر ہو جاؤں۔ قدم اور لوگوں کو مات دے کر ان سے اونچا ہوتا رہوں۔“ ڈاکٹر نے مراد سے کہا۔ ”بیٹے! تم اسے آزما کر دیکھ لو۔ یہ واقعی تیز طرار اور بے باک فائٹر ہے۔ تمہارا بہترین ساتھی اور محافظ بن کر رہا کرے گا۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”انکل! اس سے کیا پوچھتے ہو؟ میں خود اس کا پچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اب اسے نہیں جانے نہیں دوں گا۔ ابھی جاؤں گا اور اپنا ضروری سامان لے کر آ جاؤں گا۔“ ”یہ لندن جائے گا پھر پاکستان جائے گا۔ کیا تم اس

کے ساتھ جاؤ گے؟“ اس نے کہا۔ ”میں اپنے یار کے ساتھ صرف جنت میں ہی نہیں جہنم میں بھی جا سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مراد! میں اسے بچپن سے جان ہوں۔ یہ زبان کا دشمن ہے اور میرے بیٹے کا سچا یار تھا۔“ عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔ ”آپ ”تھا“ کیوں کہہ رہے ہیں جبکہ بیٹا آپ کے سامنے موجود ہے؟“ مراد نے کہا۔ ”میں موجود ہوں لیکن ان کا بیٹا اور تمہارا یار موجود نہیں ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”موجود ہو اور موجود نہیں ہو۔ یہ کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہے ہو؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”عبداللہ...! یہ درست کہہ رہا ہے۔ میرا بیٹا تمہارا یار واپس نہیں آیا ہے۔ گاڈ جانتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا نہیں؟ میں نے سرجری کے ذریعے گمشدہ بیٹے کو زندہ کیا ہے۔“ وہ بڑی حیرانی سے اور بے یقینی سے مراد کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا نام مراد علی منگلی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اور انڈر ورلڈ والے ہی نہیں یہاں کی پولیس اور سی آئی اے والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ میں نے اب تک درجنوں دشمنوں کو گولی مار دی ہے۔ درجنوں کو زخمی کیا ہے پھر جی دشمن ہیں کہ برساتی مینڈکوں کی طرح پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے ان سب سے چھپنے کے لیے تمہارے یار کے اس چہرے کے پیچھے پناہ لی ہے۔ وہ اسے ابتدا سے اب تک کی اہم باتیں بتانے لگا کہ ایک سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو ہلاک کرنے کے بعد دنیا کے بدترین اور خطرناک مجرم اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ایک خطرناک عورت مرینہ لندن کی MET آفیسر ہے۔ وہ بھی یہ ظاہر اس کی دوست اور باطن میں جانی دشمن ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ پیدا کی مجرم نہیں ہے۔ افسوس! یہ جتنا شریف ہے دشمن اتنی ہی مہنگی سے اسے بندوق پکڑتے رہنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ عبداللہ! اس کی صورت دیکھو۔ اب یہ میرا بیٹا ہے۔ تم بولو اسے یار تسلیم کر دو گے؟“ وہ صوفے سے اچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ پھر مراد کے پاس آ کر اس کے ہاتھ کو تھام کر بولا۔ ”تم سر سے پاؤں تک انکل کے بیٹے راہن سن ہو۔ میرے یار ایمان علی ہو۔ خدا کرے کہ ہم تمہارے کام آتے رہیں اور ہمیں انعام کے طور پر ایمان علی زندہ سلامت مل جائے۔ اللہ چاہے گا تو وہ کہیں سے ضرور واپس آئے گا۔“

اس کے ذہن میں جو سب سے اہم غلط خیال پرورش پا رہا تھا، وہ یہ تھا کہ ماروی کو مراد کی دنیا سے غائب کر دے۔ وہ اسے ڈھونڈتا پھرے اور جب اسے معلوم ہو کہ اس کی ماروی مرینہ کی قید میں پڑی ہے تو وہ اس کے سامنے آ کر گھٹنے ٹیک دے۔

سب ہی دشمن کہہ رہے تھے کہ مراد لاپتا ہو گیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ شاید ہمیں بدل کر رہنے لگا ہے۔ مرینہ نے اسے کال کی تو رابطہ نہیں ہوا۔ پتا چلا کہ اس کا فون بند ہے۔

ڈاکٹر کٹر جزل جان انتھونی نے کہا۔ ”دیکھو۔ اس نے تم سے بھی رابطہ ختم کر دیا ہے۔ اسی دن کے لیے سمجھا رہا تھا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ ہم اس کی گمرانی کرتے رہیں گے تو وہ فرار نہیں ہو سکے گا۔ نہ کہیں چھپ سکے گا۔“

وہ بولی۔ ”وہ مجھ سے نہیں چھپ رہا ہے۔ اس نے مجبوراً فون کو بند رکھا ہے یا فون اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ وہ ضرور بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔“

مرینہ کو یقین تھا کہ اس نے مراد کو اچھی طرح فریب کر لیا ہے۔ وہ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگا ہے۔ وہ حالات پر قابو پاتے ہی ضرور اسے کال کرے گا لیکن وہ اندر سے پریشان بھی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مراد اس پر اعتماد نہیں کر رہا ہے۔ ڈاکٹر کٹر جزل اور ہڈن کے آدمی اسے تلاش کرنے بے پور گئے تھے۔ تب سے وہ مرینہ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے۔

وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ”وہ مجھے بڑے جذبے سے میری جان مرینہ کہتا تھا۔ اب شاید نہیں کہے گا۔ میرے اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ والوں نے کام لگا ڈیا ہے۔“

اس نے اپنی رہائش گاہ میں آ کر ماسٹر کو یو یو کال کی اور کہا۔ ”ماسٹر! تمہیں خوش خبری سنارہی ہوں۔ میں نے آج MET آفسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا ہے۔“

ماسٹر نے خوش ہو کر کہا۔ ”مارک ہو مرینہ! میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”ویل مرینہ! جب اس ڈیپارٹمنٹ والوں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا اور ریڈ الارٹ والوں نے بھی تمہارا ہاتھ نہیں تھا، تمہارا تب میں نے تمہیں مرپ بٹھا یا تھا۔ اب کیا خیال ہے؟ میری دوستی کا جواب دوستی سے دوگنی؟ ضرورت کے وقت میرے کام آؤ گی؟“

”ضرور کام آؤں گی۔ مراد آپ کا خاص آدمی ہے۔ آپ اسے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میں اس کی خاطر

ڈیڈی تمہیں مراد علی منگی بنا دیں گے۔“

دونوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ مراد نے کہا۔ ”اب یولو کتنا مزہ آئے گا جب دشمن پورے مراد کی جگہ آدھے مراد کو دیکھیں گے اور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی یقین نہیں کریں گے کہ تم مراد ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں گے اور ایمان علی سمجھتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہارے دماغ میں بڑا اچھا خیال آیا ہے۔ ابھی اس کے کئی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ دشمن عارضی طور پر چکرا جائیں گے۔ انہیں جادو منتر اور آتما شکتی والی کوئی کہانی سنانی پڑے گی۔ یہ کہا جائے گا کہ تمہیں کالے جادو کے ذریعے ایک سے آدھا کر دیا گیا ہے۔“

کبڑی نے کہا۔ ”جب میں بڑی کامیابی سے مراد کے انداز میں یولوں گا، اس کی طرح چلتا پھرتا رہوں گا اور اس کی طرح خود کو فائزر اور کن من ثابت کروں گا تو سب حیران بھی ہوں گے اور اصلیت معلوم کرنے کے لیے میرے پیچھے بھی پڑ جائیں گے۔“

وہ مراد کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”یار! بہت مزہ آئے گا۔ ہم دن رات تماشے کرتے رہیں گے۔“

ڈاکٹر یعنی سن نے کہا۔ ”مراد اتم انہوں کے اور بیچنوں کے دو مشورے اور دشمنوں کے سامنے کبڑی کو لیتی آدھے مراد علی منگی کو کس طرح پیش کرو گے؟ کیسی باتیں بناؤ گے؟ پہلے یہ اچھی طرح سوچ بچھ لو۔ رات بہت ہو گئی ہے ابھی جا کر سو جاؤ۔ سوچنے سمجھنے کا بہت وقت ہے۔ میں کل شام کو کبڑی کا چہرہ تبدیل کروں گا۔“

ڈاکٹر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آئیڈیا زبردست ہے۔ لیکن خوب سوچ بچھ کر اس پر عمل کرنا ہوگا۔“

مراد اور کبڑی ایک کمرے میں آ کر ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے۔ ایسی ہیچل جانے والی بات ذہن میں آئی تھی کہ انہیں فوراً ہی نیند نہیں آ سکتی تھی۔ کبڑی آئندہ مراد بننے کے لیے اسے کالب و لہجہ سمجھنے سیکھنے سو گیا۔ مراد تھا ہوا تھا، اسے بھی نیند آگئی۔

☆☆☆

مرینہ بہت خوش تھی۔ اس نے MET آفسر کے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اسے آفسر کالج اور آفسر آن ایکٹو ڈیوٹی کا آئی ڈی کارڈ مل گیا تھا۔ اسے قانونی طور پر ایسے اختیارات حاصل ہو گئے تھے جنہیں وہ غلط طریقوں سے بھی استعمال کر سکتی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کل تک اسے وہاں سے نکال لاؤں گا۔ مجھے اس کا پتا بتاؤ۔“

بلا بلو چستان کے ایک علاقے میں چھپا ہوا تھا۔ مراد نے اس کا پتا بتایا پھر کہا۔ ”جس طرح میں آپ کے لیے بیٹا ہوں، اسی طرح بلا بلو احمد عرف بلا میرے لیے بیٹا ہے۔ آپ فوراً اس پر توجہ دیں۔ وہ مصیبت میں ہوگا۔“

”فکر نہ کرو۔ وہ کل تک اپنی بیوی کے ساتھ میرے پاس آ جائے گا۔ اور یولو؟“

”اور کچھ نہیں بولتا ہے۔ مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ وہ کل تک آپ کی چھتر چھایا میں بیٹھ جائے گا۔“

”تم کمال کر رہے ہو مراد! دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم نے میرے دشمن ریڈ الارٹ والوں کو پھر نقصان پہنچایا ہے۔ آج دھرم داس اور اس کی بیٹی کو سکیورٹی دیتے ہوئے تم نے ریڈ الارٹ کے پانچ شوٹرز کو مار گرایا ہے۔ آئی ایم پراؤڈ آف یو۔ تمہارا ہیرو ابلاکل یہاں آ جائے گا۔“

اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ مراد اپنے فون کی سم بدلنے لگا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”مرینہ کسی وقت بھی کال کرنے والی ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے بعد اس سے باتیں کروں گا۔ پہلے سوچوں گا کہ چہرے کی تبدیلی کے متعلق اسے بتاؤں یا نہ۔“

چال چلوں جو میرے ذہن میں ابھی تک رہی ہے؟“

عبداللہ کبڑی نے کہا۔ ”ابھی تم نے مجھے مار مار دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے ذہن میں کوئی بات پک رہی ہے۔ کیا کچھ بھڑی پکار ہے ہو کچھ بولو تو سہی؟“

مراد نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”آپ نے مجھے غائب کر دیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا مراد علی منگی پیدا ہو جائے تو؟“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”دوسرا کہاں سے پیدا ہو جائے گا؟“

”آپ غائب کرتے ہیں تو آپ پیدا بھی کریں گے۔ کسی دوسرے کو میرا چہرہ دے سکیں گے۔“

”اچھا تو تم چاہتے ہو میں سرجری کے ذریعے کسی دوسرے کو مراد بنا دوں؟ کیا پک رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“

”سوچ رہا ہوں ایک تو میں ایمان علی کے پیچھے چھپ کر دشمنوں کو دھوکا دیتا رہوں گا۔ پھر آپ کا دوسرا بتایا ہوا مراد علی منگی بھی انہیں آتو بتاتا رہے گا۔“

ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”اچھا آئیڈیا ہے۔“

کبڑی نے ہنستے ہوئے اس کی ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یار! بڑا مزہ آئے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”مزہ اس وقت زیادہ آئے گا جب

ڈاکٹر نے کھانے کی میز پر کہا۔ ”تم دونوں میرے سامنے انگلش لینگویج میں بولتے رہو۔ میں تمہیں برطانوی لہجہ اسٹائل اور محاورے وغیرہ بتاتا رہوں گا۔“

وہ کھانے کے دوران ان کی کلاس بھی لیتا رہا اور ضروری باتیں بھی کرتا رہا۔ مراد بار بار عبداللہ کبڑی کو دیکھتا جا رہا تھا اور کچھ سوچتا جا رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ کر چائے پینے لگے۔ کبڑی نے کہا۔ ”ایمان اتم بار بار مجھے دیکھ رہے ہو اور سوچ رہے ہو بات کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک بات پک رہی ہے۔ ذرا یہ پک جائے تو یولوں گا۔“

ایسے وقت ماسٹر کو بولو نے اسے فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ”میں ماسٹر! میں حاضر ہوں۔“

ماسٹر نے کہا۔ ”ابھی دھرم داس نے بتایا ہے کہ تم ایک نئے چہرے کے پیچھے چھپ گئے ہو۔ یہ تم نے بہت ہی دانشمندی کی ہے۔ اب کوئی دشمن تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔“

وہ بولا۔ ”میں اس نئے چہرے کا راز دار کسی کو نہیں بتانا چاہتا۔ صرف میرے اپنے اعتماد کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کیا مجھے اس سلسلے میں چھپت راز پر بھروسہ کرنا چاہیے؟“

”چھپت راز کچھلے چھ برسوں سے میرا قیادار ہے اس پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ میرے دوسرے وفاداروں پر نہ کرو۔ میں یہ بات چھپت راز کو سمجھا دوں گا۔ وہ ابھی تم سے بات کرے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”ماسٹر! میرے ایک وفادار نے ریڈ الارٹ کے پاکستانی ایجنٹ عالی جناب کو جنم میں پہنچا دیا ہے۔ آپ نے اس کی تعریف نہیں کی۔“

”سوری مراد! میں بہت زیادہ مصروفیات کے باعث بھول گیا تھا۔ وہ تمہارا دست راست کہاں ہے؟ واقعی انعام کا حق دار ہے۔ میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔“

”وہ بے چارہ دشمنوں سے اور قانون کے محافظوں سے چھپتا پھر رہا ہے۔ آپ اسے سکیورٹی دیں۔ یہی اس کا انعام ہوگا۔“

”میں اسے پاکستان میں سکیورٹی نہیں دے سکوں گا۔ البتہ وہاں سے اسے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دوں گا۔“

”وہ میری طرح آپ کے بہت کام آنے والا بندہ ہے۔ یہ میری ولی خواہش ہے کہ آپ اس کی بیوی کے ساتھ اسے اپنے پاس کن شٹی میں بلا لیں۔“

مرینہ نے فون بند کر دیا۔ اس نے پچھلی رات انڈین ٹائم کے مطابق ایک بجے فون کیا تھا۔ تب اسے پتا چلا تھا کہ مراد کا فون بند ہو چکا ہے۔ یعنی گیارہ بجے ماروی سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے فون سے سم نکال دی گئی۔ آئندہ نئی سم کے ذریعے کسی وقت اپنی معشوقہ سے بولنے والا تھا۔ وہ مضیاں بھیج کر سوچنے لگی۔ کیا سکیمنہ ہے؟ اس نے ماروی کو بتایا کہ سم بدلنے والا ہے۔ مجھے نہیں بتایا۔ اب سم بدل کر مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ میں اسے دھوکا دے رہی ہوں۔ وہ بھی مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ آئندہ میرے قابو میں نہیں رہے گا۔ اب تو اس کی کمیٹی اچھی طرح سمجھ میں آگئی ہے۔ اب میں اس دشمن کو تلاش کرتے ہی ریڈ ادرٹ کے حوالے کر دوں گی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس کا بچہ میرے پیٹ میں آ رہا ہے۔ اگلے مہینے تصدیق ہو جائے گی۔

وہ جگن کی طرف جانے کے لیے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسے ہی وقت اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ کچھ محسوس کر رہی تھی اور انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

”نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

وہ تیزی سے بھٹکتی ہوئی دائیں بائیں گئی۔ وہاں سے اس کی بڑ بڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اس کی تھج سنائی دی اور خاموشی چھا گئی جیسے مرگئی ہو۔ مراد کے بچے کی ماں بننے کی امید دم توڑ چکی تھی۔ جس کے باپ کے سر کا سودا کرنے کا ارادہ کر چکی تھی وہ بچہ ہی وجود میں آنے سے پہلے ناپود ہو چکا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد واش روم سے نکل کر کمرے میں آگئی اور سر جھکا کر چلتی ہوئی صوفے کے پاس آئی پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ حالات نے اسے اٹھا کر شیخ دیا تھا۔ بعض عورتیں مرینہ کی طرح پاگل ہوتی ہیں۔ اپنے مرد کے بچے کو کوکھ میں رکھنے اور اسے جنم دینے کے لیے ایک ایک دن گنتی رہتی ہیں۔ اس روز اس کی گنتی ختم ہو گئی تھی۔ نئی گنتی شروع کرنے کے لیے پھر مراد علی منگی کی مراد گئی اسے پکار رہی تھی۔

ہائے کس دل سے اس کے سر کا سودا کروں گی؟ ہرگز نہیں کروں گی۔ وہ شاید مجھ سے بدظن نہیں ہوا ہے۔ مجھ پر شبہ نہیں کر رہا ہے۔ مجبوراً مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا ہے۔ آج شام تک یا رات تک ضرور نئے نمبر سے بات کرے گا۔ اس کی سوچ پہلے منگی تھی پھر مثبت ہونے لگی۔ وہ بھری

فون پر رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟ یہ معلوم ہوتا تو پتا چل جاتا کہ مراد نے اپنے فون کی سم بدل دی ہے اور ایسا اس نے صرف اپنی ماروی سے باتیں کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ ہر حال میں اسے اہمیت دیتا ہے۔

وہ اپنے فون کو دیکھ کر سوچنے لگی کیا کرے؟ کیسے معلوم کرے؟ وہ تو فون انٹینڈ نہیں کر رہی ہے۔ اس نے مجبوراً پھر ماروی کے نمبر شیخ کیے پھر چاچی کی گالیاں سننے کے لیے تیار ہو گئی۔

دوسری طرف کال تیل جا رہی تھی پھر بند ہو گئی۔ منی انٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ مرینہ نے زیر لب کہا۔ ”کب تک فون کاتی رہے گی۔ ایک بار گالیاں دینے کے لیے ضرور بولے گی۔ اس سے پہلے ہی چاچی منگی کے دماغوں کو ایسا جھٹکا پہنچاؤں گی کہ وہ فون ہی توڑنے لگیں گی۔“

اس نے پھر نمبر شیخ کیے۔ رابطہ ہونے پر ماروی کی آواز سنائی دی۔ ”تم کیوں ہمارے پیچھے پڑ گئی ہو؟“

مرینہ نے کہا۔ ”مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ مراد مر چکا ہے۔“

فون پر ماروی کی تھج سنائی دی۔ ”نہیں۔ نہیں وہ نہیں مر سکتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

وہ بولی۔ ”تم بھولتی ہو۔ یہ میں جانتی ہوں کہ اس کی لاش کہاں پڑی ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی اسے معلوم ہونے والا تھا کہ مراد اس سے رابطہ رکھتا ہے یا نہیں؟

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مرینہ نے مسکرا کر اپنے فون کو دیکھا پھر بشن دبا کر اسے کان سے لگا کر طنز یہ انداز میں پوچھا۔ ”مجھے گالیاں دے رہی تھیں۔ اب کیوں فون کر رہی ہو؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مرینہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ سچ بولو۔ مراد زندہ ہے؟“

”مجھ سے کیا پوچھتی ہو، اسے فون کرو۔ خود معلوم کرو۔“

وہ بے چاری نہیں جانتی تھی کہ کیسی مکاری سے شیخ معلومات حاصل کر رہی ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مراد نے پچھلی رات کہا تھا کہ فون کی سم بدل دے گا۔ پھر مجھ سے باتیں کرے گا۔ ابھی میرے پاس اس کا نیا نمبر نہیں ہے اور اس نے کل رات سے اب تک مجھے کال نہیں کی ہے۔“

”اس نے آخری بار تم سے کب بات کی تھی؟“

”کل رات گیارہ بجے۔“

ہے۔ ماسٹر اسے چھپا رہا ہے۔ پھر مجھے اٹو بنا رہا ہے۔ ایسا ہو رہا ہے۔ تو میں ماسٹر کو بوبو کے سنڈکیٹ کو کس نہیں کر کے رکھ دوں گی۔ اب میں مراد کے جھانسنے میں نہیں آؤں گی۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے کیش کروں گی۔ پورے پچاس لاکھ وصول کروں گی۔“

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”ڈی جی جان اتھونی درست کہتا ہے۔ مجھے اس کی دیوانگی سے باز آ جانا چاہیے۔ مجھے کسی بھی پہلی فلائٹ سے انڈیا جا کر اسے ڈھونڈ کر پچاس لاکھ ڈالر جیسی بڑی رقم وصول کر لینا چاہیے۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مگر وہ کہاں چھپا ہوگا؟“

سوکن کے دماغ نے کہا۔ ”ماروی کے اہم چھپا ہوگا۔ ہاں وہ کہیں بھی ہوتا ہے، کسی بھی حال میں ہوتا ہے موت سے بھی لڑتا رہتا ہے۔ تب بھی ماروی سے ضرور رابطہ رکھتا ہے۔“

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھیج کر سوچنے لگی، پھر اس نے ماروی کے نمبر شیخ کیے۔ ادھر وہ مراد کے بچے سے لگی ہوئی تھی۔ بچہ اپنے باپ کی طرح ضدی تھا۔ وہ اسے کھلونوں سے بہلا رہی تھی۔ ضدی جو نئے مراد ابھی روتے روتے چپ ہوا تھا۔ اس نے فون پر انٹینڈ نہ ہو کر پوچھا کہ کہاں چھپا پتا نہیں کون ہے۔ تو تم بات کرو۔“

منی نے فون لے کر بشن دبا کر کان سے لگا دیا۔ پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون ہو بھائی؟“

مرینہ نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

منی نے کہا۔ ”منی میں پوچھ رہی ہوں۔ تم کون ہو؟“

”میں مرینہ ہوں۔ ماروی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا تو تو ہے شیطان کی بیٹی؟ تو ماروی سے کیا بات کرے گی؟ اور کیوں کرے گی؟“

مرینہ نے کہا۔ ”لیٹنگ تو پلیز۔“

وہ بولی۔ ”میں انگریزی سمجھ لیتی ہوں۔ تیری پلیز کو جھاڑو ماروں۔ چل بھاگ یہاں سے۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ ماروی نے کہا۔ ”تم نے اچھی سنائی ہے۔ کبخت ہمارے پیچھے لگنے سے باز نہیں آ رہی ہے۔“

مرینہ نے رابطہ ختم ہونے پر اپنے فون کو دیکھا۔ چاچی کی باتیں سن کر اسے آگ لگ رہی تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو اس بڑھیا کی ہڈی پہلی توڑ کے رکھ دیتی۔ وہ اپنی انسلٹ پر تھلا کر صوفے پر پہلو بدلنے لگی۔ وہ ماروی سے باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ مراد اس

آپ کے کام آتی رہوں گی۔ ابھی میں نے اسی کی بات کرنے کے لیے آپ کو کال کی ہے۔“

ماسٹر کو بوبو سمجھ گیا کہ وہ کیا بولنے والی ہے۔ اس نے کہا۔ ”مراد کی بات کیا کرو گی؟ چپت راؤ نے اسے دشمنوں سے بچا کر راتوں رات کو لکھ پہنچا دیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ لاپتا ہو گیا ہے۔ فون سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کی خیر خیر تم سے پوچھنے والا تھا۔“

”میں بھی اسے کال کر رہی ہوں لیکن بات نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ضرور کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔“

”ہمارا بھی یہی خیال ہے، وہ ایسی مصیبتوں میں ہے کہ اپنے فون سے بھی محروم ہو گیا ہے۔“

مرینہ نے کہا۔ ”ماسٹر! ایک گھبراہٹ سی ہے۔ کہیں کسی دشمن نے اسے گولی تو نہیں مار دی؟“

”اسکی بات نہیں ہے۔ جب بھی وہ دشمنوں کے ہاتھوں مرے گا وہ خوشیاں منا میں گے بلکہ جشن منائیں گے اور مجھے طعنے دینے کے لیے فون کریں گے۔ اس کے لیے اچھا سوچو۔ وہ موت کا رخ پھیرنے والا شیر دلیر کہیں زندہ ہے۔ ہم جلد ہی اسے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے سنیں گے۔“

مرینہ نے کچھ باتیں کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ سوچنے لگی۔ ”جب سے اسے چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ در بدر ہو رہا ہے۔ نہ آئی تو MET آفیسر نہ بنتی۔ ایک طرف سے فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ دوسری طرف سے نقصان اٹھا رہی ہوں۔ مجھے جلد سے جلد انڈیا جانا ہوگا پتا نہیں وہ کہاں پھنسا ہوا ہے اسے میں ہی وہاں سے نکال کر لاسکوں گی۔“

پھر اچانک ہی دل میں ایک خیال آیا۔ ”کہیں وہ مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا ہے؟“

ایسا سوچتے ہی اس کی پیشانی پر ٹھٹھیں پڑ گئیں۔ اسے یاد آیا کہ پہلے بھی ماسٹر کو بوبو اور جگ دیو نے مراد کو اس سے چھپایا تھا۔ اسے دھوکا دیا تھا۔

اسے کہا تھا کہ مراد انڈیا رورلڈ کے وینکٹ راؤ کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ مائیکرو فلم حاصل کرنے میں اس لیے ناکام رہی تھی کہ ماسٹر نے بڑی رازداری سے مراد کو وہ مائیکرو فلم حاصل کرنے کے لیے اس پر سوا سیر ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ پہلے بھی ماسٹر جگ دیو اور مراد نے دہری چالیں چل کر اسے اٹو بنا یا تھا۔ اب بھی یہی کر رہے ہوں گے۔

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچنے لگی۔ ’میں دھوکا کھا رہی ہوں۔ وہ مجھے بدل کر کہیں آرام سے

بدل کر سوچ رہی تھی۔ میں خواہتا ہوں اس سے بدظن ہو رہی ہوں۔ نہیں میں پھر اسے محبت سے قابو میں کروں گی۔ وہ ضرور مجھ سے رابطہ کرے گا۔ وہ مجھے بھول ہی نہیں سکتا۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزاج بھی بدل گیا۔ ارادے بھی بدل گئے۔ اب وہ آئندہ ہونے والے بچے کے باپ کو کیلچے سے لگانے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔ سوچتے رہنے سے یہ بات عقل میں آئی کہ مراد کو چیتنے کے لیے ماروی کا دل بھی جیتنا ہوگا۔ اگرچہ یہ مشکل ہے پھر بھی کوشش تو کی جاسکتی ہے۔ اس نے ماروی سے بات کرنے کے لیے پھر فون کو اٹھایا۔ ادھر وہ ہائے ہائے کر رہی تھی کہ مراد مارا گیا ہے اور اس کی لاش گھس پڑی ہوئی ہے۔ مٹی نے کہا تھا۔ "بیٹی اس ڈاکن کی بات پر بھروسہ نہ کرو۔ وہ بچی جھوٹی اور مکار ہے۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "میں کیسے معلوم کروں کہ وہ زندہ ہے؟"

"ڈرامہ کرو۔ وہ جیسے ہی کسی مشکل سے لگے گا، سب سے پہلے تمہیں فون کرے گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی نے لپک کر فون کو اٹھایا پھر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے مٹی کی ہسکرین کو پڑھ کر بولی۔ "وہی چڑیل ہے۔" مٹی نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لاؤ مجھے دو۔ ابھی اسے کھری کھری سنائی ہوں۔"

"نہیں چاچی! میں دیکھتی ہوں۔ وہ کیا کہتا چاہتی ہے۔" اس نے مٹی کو دبا کر اسے کان سے لگا لیا پھر کہا۔ "ہاں بولو۔ کیا سچ بولنے آئی ہو؟"

"ہاں ماروی! اس وقت میں غصے میں تھی۔ جو منہ میں آیا بول گئی۔ مجھے معاف کر دو۔"

"تعب یہ تم مجھ سے معافی مانگ رہی ہو۔"

"اگر معاف کر دو گی تو میں تمہاری بہن بن کر رہوں گی اور بہن کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالوں گی۔ مراد سے ملنا تو دور کی بات ہے، اس کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔"

"میں تمہاری اس تبدیلی پر حیران بھی ہوں اور خوش بھی ہوں۔ یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جلدی جلدی کیسے بدل جاتی ہو۔ تم کہہ رہی ہو کہ میرے حق پر ڈاکا نہیں ڈالو گی۔ مراد سے بھی نہیں ملو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

"ہاں ماروی! خدا اسے دشمنوں سے بچائے۔ مجھے قلعہ خیر ملی ہوگی۔ دشمنوں نے مراد کے دھوکے میں کسی اور کو مار ڈالا ہے۔"

وہ خوشی سے چخ کر بولی۔ "یا اللہ! میرا مراد زندہ ہے۔"

"ہاں۔ اسی خوشی میں مجھے معاف کر دو۔" وہ بولی۔ "میں نے معاف کیا، میرے خدا نے معاف کیا۔"

"وعدہ کرو۔ مراد سے کہو گی کہ ہم بہنیں بن چکی ہیں اور آئندہ میں بھی اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

"مریدنا خدا تمہارے اس نیک ارادے پر تمہیں قائم رکھے۔ مراد فون کرے گا تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ تم بالکل ہی بدل گئی ہو۔ میری بہن بن گئی ہو۔ ابھی کچھ خیال نہ کرنا، فون بند کر رہی ہوں۔ شکرانے کی نماز ادا کرنے جا رہی ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ مرید نے اپنے فون کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "نماز پڑھنے لگی ہے۔ خدا سے کہنے لگی ہے کہ میں مراد کے سامنے بھی نہ جاؤں۔ اسے بھی ہاتھ نہ لگاؤں۔"

"الو کی ہنسی! مراد کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھتی ہے وہ جاگیر دار پہلے میری زمین کا ہے۔ میں اسے تیری زمین تک پہنچنے ہی نہیں دوں گی۔"

وہ اپنی فطرت سے باز آنے والی نہیں تھی۔ پھر سے وہی سبق دہرانے والی تھی یعنی پہلے محبت سے اسے راضی کرنے والی تھی۔ وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسے اپنا بی بی بنا کر حاصل کرنے والی تھی۔ پہلے مٹی کو ہونا تھا کہ اس کے بچے کو جنم دینے والی ہے تو پھر اس ترقیاتی کے بکرے کو پچاس لاکھ میں ضرور فروخت کر دیتی۔

☆☆☆

اس سرجری روم کا آئینہ جادوئی کمالات دکھاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس آئینے میں مراد کا چہرہ غائب ہو گیا تھا اور ایمان علی کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ اب اسی آئینے میں عبداللہ کبڈی کا چہرہ مٹ گیا تھا۔ مراد کا چہرہ پھر سے ابھر آیا تھا۔ مراد کبڈی کے سامنے بیٹھا اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور ڈاکٹر مٹی سن فاطمہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ حالات کا تقاضا تھا۔ جو بیس گھنٹوں میں دو چہرے بدل گئے تھے۔ کبڈی نے مسکرا کر مراد کے انداز اور لب و لہجے میں کہا۔ "سامیں! مجھ کو کیا دیکھتے ہو؟ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ میرا نام مراد علی مٹی ہے۔"

مراد نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے ہوئے کہا۔ "تم کسی شک و شبہ کے بغیر مراد بن گئے ہو۔ صرف قد سے مات کھا گئے ہو۔"

"قد کے معاملے میں یہ کہانی یاد کر لی ہے کہ کس طرح ایک تاشک مہاراج نے کرودھ میں آکر میرے قد کو آدھا

کر دیا ہے۔ میں مرید کو اور محبوب علی چانڈیو کو اور اس کے ساتھ رہنے والے معروف گجلی اور کبیرا کو یہی کہانی سناؤں گا لیکن ابھی ایک کمی ہے۔ میں ان سب کو چہروں سے نہیں پہچانتا ہوں۔ وہاں سے ان کی تصویریں حاصل کرو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "مراد تم ماروی سے حقیقت نہیں چھپانا چاہتے۔ اسے بتانا چاہتے ہو کہ کبڈی کو مراد بنا یا گیا ہے۔ ماروی سے کہو کہ ان سب کی تصویریں میرے ای میل پر Send کرے۔ یہ مسئلہ ہو جائے گا۔"

مراد نے کہا۔ "میں ابھی ماروی سے بات کروں گا اور اسے اپنا راز دار بناؤں گا۔ کبڈی تم جب تک ان سب کے چہرے اچھی طرح ذہن نشین نہیں کرو گے اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تفصیلی باتیں یاد نہیں کرو گے اور میں جب تک برطانوی لیجے میں انگریزی بولنا نہیں سیکھوں گا، تب تک ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔"

اس نے کہا۔ "میں تو بہت بڑا انتقال ہوں۔ دس بارہ دنوں میں تمام سبق یاد کروں گا۔"

"اس سے پہلے تمہیں مراد کی حیثیت سے مرید کا سامنا کرنا ہے۔ میں اس کے بارے میں بہت سی اہم باتیں تمہیں یاد کرواؤں گا اور آج رات دس بجے فون پر اس سے باتیں کرنا ہوں گا۔"

کبڈی نے کہا۔ "وہ یہاں آنے کے لیے چل جائے گی۔ میرا پتا پوچھ گئی۔"

اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے دور ایک بجھا کرانے پر لینا ہوگا۔ مرید کو بتایا جائے گا کہ مراد وہاں چھپ کر رہتا ہے۔ وہ وہاں اس سے ملنے آئے گی۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "یہاں سے بہت دور آگرہ میں میرے ایک ڈاکٹر دوست کے تین بھنگے ہیں۔ کیا آگرہ جا کر رہنا چاہو گے؟"

"چھپ کر رہنے کی خاطر آگرہ زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ اپنے دوست سے بات کریں۔"

ڈاکٹر کے فون سے رنگ ٹون سنائی دی۔ وہ فون اٹھا کر بولا۔ "میں یہ کال اٹینڈ کرنے کے بعد اپنے دوست سے بات کروں گا۔"

مراد اور کبڈی ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ وہ کبڈی کو مرید کی باتیں ابتدا سے بتانے لگا۔ مرید سے ہونے والی گفتگو جتنی اسے یاد تھی وہ سب اسے یاد کرانے لگا۔

اس نے وہ واقعات تفصیل سے بتائے جب مرید اسے گولی مار کر زخمی اور لاچار بنا کر ایک مکان میں لے آئی

تھی اور اس سے جسمانی تعلقات قائم کیے تھے۔ کبڈی نے کہا۔ "میں پھر سے تمام باتیں یاد کرتا ہوں۔ کوئی بات بھولوں گا تو تم سے پوچھ لوں گا۔"

ڈاکٹر نے آکر کہا۔ "بات ہو گئی ہے۔ اس کے تینوں بھنگے خالی ہیں۔ تم دونوں کل صبح مالک مکان کے پاس جا کر ایک لاکھ روپے ایڈوانس کے طور پر ادا کرو۔"

مراد نے کہا۔ "ہم وہاں ایک مہینے سے زیادہ نہیں رہیں گے۔ مرید سے ملاقات کے بعد اس سے ضرور دشمنی ہوگی۔ اس کے جاتے ہی ہم وہ بنگلا چھوڑ دیں گے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔" وہ رہائش کا انتظام کر رہا تھا۔ کبڈی مرید کو سبق کی طرح یاد کر رہا تھا۔ مراد ان سے کچھ دور ایک صوفے پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے ماروی کے نمبر سچ کیے۔

ماروی نے فون کی تھمسی سی اسکرین پر انجانے نمبر پڑھے۔ مراد اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ آئندہ ہم بدل کر رابطہ کرے گا۔ اس نے مٹی دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ "ہیلو؟"

اس کی آواز سنائی دی۔ "ماروی! میں بول رہا ہوں۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "میں پچھلی رات سے انتظار کر رہی ہوں۔ مرید نے توجہ دیا کہ وہ کبڈی کو ہمیں گولی مار دی گئی ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "او گاڈ...! اس نے تمہیں کال کی تھی؟ میں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ تمہاری طرف بھی رخ نہ کرے۔"

"وہ کب ماننے والی ہے۔ پہلے تو تمہاری موت کی جھوٹی خبر سنائی۔ پھر دوسری بار فون کر کے معافی مانگی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے بھی کسی نے تمہارے بارے میں قلعہ اطلاع دی تھی پھر اس نے مجھے بہن کہا اور وعدہ کیا کہ کبھی تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔ اپنی زبان سے تمہارا نام بھی نہیں لے گی۔"

"مراد! میں کیا سمجھوں؟ وہ اچانک ہی شیطانی بلا کی طرح نازل ہو جاتی ہے۔ کیا وہ تمہارا بیچھا چھوڑ سکتی ہے؟"

"وہ ایک نمبر کی جھوٹی اور مکار ہے۔ وہ بھلا میرا بیچھا کیا کرے گی۔ تم اطمینان رکھو، وہ آئندہ میرے نئے بہروپ میں بھی مجھے پہچان نہیں سکے گی۔ ماروی! میں پندرہ یا بیس دنوں میں ایک زبردست پلاننگ پر عمل کرتے ہوئے تمہارے پاس آؤں گا۔ اب میں جو کہہ رہا ہوں اسے توجہ سے سنو۔"

وہ عبداللہ کبڈی کے بارے میں اسے بتانے لگا۔ وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، ہارٹ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ایک اور بات سنو۔ میں ہڈن کو سیکورٹی پہنچا رہا ہوں اور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں دہری چالیں چل رہا ہوں۔ ریڈارٹ سے کسی نے اسے فون پر کہا ہے۔ میرے خلاف زہرا گلا ہے کہ مراد کو دھرم داس کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

”اچھا تو ہڈن بھی آپ سے پوچھ رہا ہے کہ آپ نے مجھے کہاں چھپا رکھا ہے؟“

”ہاں کہتا ہے، اگر میں تمہاری خفیہ پناہ گاہ کا پتا بتا دوں تو وہ مجھے دس لاکھ ڈالر دے گا۔“

مراد نے کہا۔ ”میری جان کے دشمن سو دے بازی سے باز نہیں آئیں گے۔“

کبڈی نے کہا۔ ”پارافینسی ڈریس شو میں چلو۔ تفریح بھی رہے گی۔ اس دشمن سے نمٹ بھی لو گے۔“

مراد نے کچھ سوچ کر فون پر پوچھا۔ ”دھرم جی آگیا ہڈن آپ کے ساتھ ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ابھی ایک گھنٹے بعد وائی ایم سی اے ہال میں جانے کے لیے وہ میری کار میں بہن کے ساتھ بیٹھ گا۔ آگے پیچھے گاڑیوں میں سڑ گا رڈز ہوں گے۔“

”آپ جن راستوں سے گزریں گے وہاں کسی جگہ کرسس ٹائٹ منایا جا رہا ہوگا؟“

”ہاں جگہ جگہ دشمن گھومتے ہیں اور ہولوں کو سجایا گیا ہے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے گروہ کی صورت میں مستیاں کرتے پھر رہے ہیں۔“

”آپ کوئی ایسی جگہ بتائیں جہاں ناچ گانا ہو رہا ہو۔“

”وہ من کلب کے سامنے ناچ گانے اور طرح طرح کے تماشے ہوتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ہڈن کو وہاں مراد نظر آئے گا۔“

”کیا تم پھر اصلی روپ میں آگئے ہو؟“

”نہیں۔ وہ ایک نقلی مراد ہوگا۔ آپ کو اس کے بارے میں پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ جب آپ ہڈن کو لے کر نکلیں گے، تب ہم بھی یہاں سے نکل پڑیں گے۔“

مراد نے رابطہ ختم کر کے صوفے سے اٹھتے ہوئے کبڈی سے کہا۔ ”چلو، دشمنوں کے سامنے آؤ اور انہیں اپنے پیچھے دوڑاؤ۔“

مراد نے اپنے کمرے میں آکر سامنا کلاز کا ماسک اور لباس پہن لیا۔ دونوں نے اپنی اپنی گنز کو اچھی طرح چیک کر کے لباس کے اندر چھپایا۔ پشس سے بھرے ہوئے میگزین سامنا کلاز کے بیگ میں رکھے پھر وہاں سے چل پڑے۔

ادھر لیزا اور ہڈن اپنے ہنگلے سے باہر آئے۔ اس وقت

حیرانی سے مسکراتے ہوئے سننے لگی کہ اب دنیا والوں کو چار فٹ کا بونا مراد علی منگی نظر آیا کرے گا۔

وہ بونا مراد اس سے ملنے کراچی آئے گا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان ایمان علی ہوگا۔ وہی ماروی کا اصل مراد ہوگا۔

وہاں ماروی کی کوشی میں مراد اور کبڈی کس طرح ہیرا پھیری سے رہیں گے، یہ باتیں ماروی کو تفصیل سے بتانے لگا۔ وہ تمام باتیں اچھی طرح سننے اور سمجھنے کے بعد بولی۔ ”تم کہتے ہو تو میں اس بونے مراد کو سب کے سامنے اپنا مراد تسلیم کر لوں گی اور اس سے لگاؤٹ ظاہر کرتی رہوں گی لیکن تم سے کیسے ملوں گی؟“

”میں رازداری سے ملنے کے راستے نکال لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ فی الحال محبوب، معروف، جلی، سمیرا، چاچا اور میڈم روزی کی تصویریں چاہتا ہوں۔ تم یہ تمام تصویریں چاچا کو دے کر کہو کہ وہ کسی نیٹ کیفے میں جا کر میرے بتائے ہوئے ای میل ایڈریس پر انہیں بھیج دیں۔ ہماری اس پلاننگ میں صرف چاچا اور چاچا ہی رازدار رہیں گے۔ میں یہاں کا ای میل ایڈریس Send کر رہا ہوں۔“

اس نے ماروی کو اپنے موجودہ حالات اور منصوبے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد مرید سے ملتا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنا فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دھرم جی تم سے کچھ بولنا چاہتے ہیں۔“

مراد نے اپنی سم نکال دی تھی۔ دھرم داس کو نیا نمبر معلوم نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”مراد! آج کرسس ٹائٹ کی بڑی دھوم دھام ہے۔ تم فینسی ڈریس شو کی تقریب میں آنے والے تھے۔ کیا یہاں وائی ایم سی اے ہال میں آرہے ہو؟ میں خود کو اور ہڈن کو یہاں بھری پور سیکورٹی دے رہا ہوں۔“

اس کے سر کا سودا کرنے والوں میں ایک ہڈن بھی تھا۔ مراد نے اس کی بہن لیزا کو دشمنوں سے بچایا تھا لیکن اس کے بھائی کو زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

وہ فی الحال کبڈی کو مراد بنانے کے سلسلے میں اس قدر مصروف ہو گیا تھا کہ ہڈن کو نظر انداز کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا پھر کسی دن اسے موت کے سردخانے میں پہنچائے گا۔

اس نے دھرم داس سے کہا۔ ”میں اپنے معاملات میں بہت مصروف ہوں، گھر سے لگتا نہیں چاہتا۔ کیا آپ میری ضرورت محسوس کر رہے ہیں؟“

”ہاں تم رہتے ہو تو لگتا ہے کہ سیکورٹی کے لیے پوری فوج آگئی ہے۔ تمہارے آگے دشمن دم نہیں مارتے ہیں۔“

لیزا ایک لومڑی کے بہروپ میں تھی۔ ہڈن نے جیتے جیتے کاماک
 پہن لیا تھا۔ وہ دونوں دھرم داس کی کار میں آکر بیٹھ گئے۔
 دھرم داس اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ وہ
 ڈرائیور بھی ہتھیاروں سے لیس تھا۔ بہت محتاط سیکورٹی
 تھی۔ وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو ان کے آگے پیچھے سب
 گاڑیوں کی گاڑیاں تھیں۔
 ہڈن نے راستے میں دھرم داس سے کہا۔ ”مسٹر داس!
 میں نے مراد کے سلسلے میں آپ پر شبہ کیا۔ مجھے افسوس
 ہے۔ میں نے بعد میں سوچا کہ ریڈارٹ کے کسی کارندے
 نے مجھے آپ کے خلاف ہڑکانے کے لیے جھوٹ کہا ہے۔ بھلا
 آپ جیسا معزز ایم این اے مراد کے ساتھ کیوں دیکھا جائے
 گا جبکہ آپ اس کے خلاف مجھے سیکورٹی دے رہے ہیں۔“
 دھرم داس نے کہا۔ ”مسٹر ہڈن! آپ نہیں جانتے
 ریڈارٹ والے میرے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ صرف
 مجھ پر ہی نہیں میری بیٹی پر بھی حملہ کر چکے ہیں۔“
 ”ایسا لگتا ہے ہم سب نے موت سے ڈرنا چھوڑ دیا
 ہے۔ تم پر، ہم پر حملے ہو رہے ہیں۔ پھر بھی ہم لائف
 انجوائے کرنے کیسی ڈریس شو میں جا رہے ہیں۔“
 ”کتنے ہی مسائل اور مصائب موت بن کر دھمکیاں
 دیتے رہتے ہیں۔ انسان ہے کہ سرخس حاصل کرتے رہنے
 سے باز نہیں آتا۔ میرے بیٹے بیٹیاں بھی مع کرنے کے
 باوجود ہنسنے اور ناچنے گانے کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔“
 وہ بولتے بولتے رک گیا پھر ڈرائیور سے
 بولا۔ ”گاڑی روکو فوراً گاڑی روکو۔۔۔“
 گاڑی رُک گئی۔ ہڈن نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
 وہ بولا۔ ”مسٹر ہڈن...! دوسن کالج کے سامنے
 دیکھو۔ سب ناچ رہے ہیں۔ وہاں مراد ہے۔“
 ہڈن کے اعصاب یکھت تن گئے۔ اس نے فوراً ہی
 اپنا ریوالور نکال لیا پھر کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے
 بولا۔ ”کہاں ہے...؟ وہ کہاں ہے...؟“
 کلب کے سامنے درجنوں لڑکیاں اور لڑکے ایک قلمی
 گانے کی دھن پر ناچ رہے تھے۔ ان کے ساتھ مراد علی منگی
 بھی بہت مست ہو کر ناچتا گا تا دکھائی دے رہا تھا۔
 دھرم داس اور ہڈن آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے چینی سے
 دیکھ رہے تھے۔ ہڈن نے کہا۔ ”ارے یہ تو آدھا ہے۔“
 دھرم داس کو معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر ٹینیسن نے عبداللہ
 کبڑی کو مراد بنا دیا ہے۔ وہ بھی حیرانی سے بولا۔ ”یہ تو یونہی
 ہے لیکن بالکل مراد ہے۔ یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

ہڈن نے کہا۔ ”میں نے سوچا تھا کہ اسے دیکھتے ہی
 گولی مار دوں گا مگر کیا اسے ہلاک کرنا مناسب ہوگا؟“
 دھرم داس نے کہا۔ ”نہیں ہڈن! اپنا نہیں یہ کون
 ہے۔ اسے خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرنا چاہیے۔“
 لیزا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”کیا منگ منگ کر ڈانس کر
 رہا ہے۔“
 دھرم داس نے کہا۔ ”میں گاڑیوں سے کہتا ہوں اسے
 پکڑ کے لے چلیں۔ اس سے معلوم کریں کہ یہ کون ہے؟“
 آگے پیچھے کی دو گاڑیوں سے دو گاڑیاں اتر کر دھرم داس
 کے پاس معلوم کرنے آئے کہ وہاں لڑکے کی وجہ کیا ہے؟
 ہڈن نے کھڑکی سے سر نکال کر گاڑی سے کہا۔ ”وہاں
 دیکھو ایک بوٹا ڈانس کر رہا ہے۔ اسے پکڑ کر اپنی گاڑی میں بٹھا لو۔“
 دھرم داس نے کہا۔ ”جاؤ۔ اسے پکڑو۔۔۔“
 ایسا کہتے ہوئے انہوں نے ڈانس کرنے والی
 لڑکیوں اور لڑکوں کے ہجوم میں دیکھا تو چونک گئے۔ وہ نہیں
 تھا۔ بھڑ میں گم ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا پلک جھپکتے ہی
 غائب ہو گیا ہے۔
 وہ دونوں کار کے دروازے کھول کر تیزی سے باہر
 آئے پھر ہجوم کی طرف جاتے ہوئے گاڑیوں سے
 بولے۔ ”جلدی آؤ اس بونے کو پکڑو وہ کہاں گیا ہے؟“
 وہ ادھر ادھر جا کر اسے ڈھونڈنے لگے۔ جس مراد کو
 ڈھونڈ رہے تھے، وہ ایمان علی بن کر وہاں موجود تھا۔
 دھرم داس... اسے دیکھ کر اس کا بازو تھام کر ہجوم سے
 دور آکر بولا۔ ”تمہارے کہنے کے مطابق میں نے یہاں
 گاڑی رکوائی ہے لیکن میں نے یہاں ایک چھتکار دیکھا
 ہے۔ بالکل تمہاری شکل صورت کا ایک یونہیہاں ناچ رہا تھا۔
 تم یہاں کب سے ہو؟ تم نے اپنے ہم شکل کو دیکھا ہوگا۔“
 وہ بولا۔ ”دیکھا ہے۔ آپ ایمان علی کے دوست
 عبداللہ کبڑی کو تو جانتے ہوں گے؟“
 ”ہاں اچھی طرح اس بونے کو جانتا ہوں۔“
 اس نے کان کے پاس سرگوشی کی۔ ”دھرم جی ایہ وہی
 ہے۔ ڈاکٹر ڈیڈی نے اسے میرا ہم شکل بنایا ہے۔“
 وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”ہے بھگوان! یہ تم
 لوگوں کو کیا سوچھی ہے؟“
 پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں کبڑی کو جانتا ہوں پھر
 بھی دھوکا کھا گیا۔ دھمن تو اس کے پیچھے ناچتے پھریں گے۔“
 مراد نے کہا۔ ”اچھا میں جا رہا ہوں۔ کبڑی میرا
 انتظار کر رہا ہوگا۔ اب ہم وائی ایم سی اے ہال میں نظر

آئیں گے۔“
 وہ سب اسے ہجوم میں تلاش کر رہے تھے۔ مراد تیزی
 سے چلتا ہوا دھرم کلب کے پیچھے جانے لگا۔ وہاں انہوں نے
 اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ مراد ادھر پہنچنے ہی خشک گیا۔
 کلب کے پیچھے نیم تاریکی میں کبڑی موٹر سائیکل کے
 پاس دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص
 اپنی گن سے اس کا نشانہ لے کر کھڑا تھا۔
 کبڑی چاہتا تو جتنا سنگ کا کر ب دکھا کر اس کی گن
 گر سکتا تھا لیکن وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔
 وہ گن میں حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم آدھے کیسے
 ہو گئے؟ یہ کیا راز ہے جلدی بناؤ؟“
 وہ بولا۔ ”جلدی کیا بتاؤں۔ میں پیدا ہی ہونا
 ہوں۔ میرا نام عبداللہ کبڑی ہے۔“
 وہ سخت لہجے میں بولا۔ ”جو اس مت کرو۔ میں اندھا
 نہیں ہوں۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تم مراد علی منگی
 ہو۔ جلدی بناؤ اتنے چھوٹے کیسے ہو گئے ہو؟“
 کبڑی نے کہا۔ ”جب سے پیدا ہوا ہوں کسی نے
 مجھے گود میں نہیں اٹھایا۔ ایسا کرو۔ مجھے گود لے لو۔ میرے
 سر چلو۔ میرے ماں باپ اور رشتے دار تمہیں یقین دلا میں
 نے کہ میں منگی ونگی نہیں ہوں، کبڑی ہی ہوں۔“
 پھر وہ بیچوں کے ہلی اچھلتے ہوئے بولا۔ ”کبڑی
 کبڑی۔ کبڑی کبڑی..... بھی تم نے کبڑی کیسے ہے؟ آ
 ٹوٹو۔ ٹوٹو۔ کہاں کہاں اور کہاں کاٹو۔ آٹوٹو۔ ٹوٹو۔۔۔“
 اس نے یکبارگی فضا میں اچھل کر اس کے ہاتھوں پر
 لگ ماری۔ جیسے پتھر آکر لگا ہو۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔
 گن ہاتھوں سے نکل کر فضا میں اوپر کی طرف گئی۔ جب
 نیچے آئی تو مراد نے اچھل کر اسے کچل کر لیا۔
 اس نے سرگھما کر دیکھا تو مراد نے گن کے دستے سے
 اس کے منہ پر ضرب لگائی پھر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ جلدی
 بولو کس کے لیے کام کر رہے ہو؟“
 وہ بولا۔ ”م..... میں نہیں جانتا..... میرا ایک ساتھی
 کسی کے لیے کام کرتا ہے۔ اس نے مجھے مراد کی تصویر دی تھی
 اور وہ ہزار روپے دے تھے کہا تھا کہ اسے ہلاک کرو گے تو
 اور چالیس ہزار روپے دے دیے جائیں گے اور کہا تھا کہ اسے
 زخمی کر کے قیدی بناؤ گے تو اور دس ہزار زیادہ ملیں گے۔“
 کبڑی نے اپنے ریوالور میں سائیکلنگ لگا کر پوچھا۔
 ”تمہارا ساتھی کہاں ہے؟“
 ”وائی ایم سی اے ہال میں ہے۔“

کبڑی نے اسے گولی مار دی۔ پھر مراد سے کہا۔ ”تم کیا
 صورت لے کر پیدا ہوئے ہو؟ مجھے یہ صورت ملی ہے تو اب
 ساری بندو قیں میری طرف آتی رہیں گی۔ کیا جب پیدا ہوئے
 تھے میرے یا تو اس پاس گولیاں چل رہی تھیں؟“
 مراد نے اس کی پیٹھ پر ایک دھبہ جماتے ہوئے
 کہا۔ ”چلو بیٹھو۔ آگے تمہاری صورت کا استقبال کرنے
 والے اور ملیں گے۔“
 اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔
 کبڑی پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ پھر وہ رفتار بڑھاتے ہوئے وہاں
 سے جانے لگے۔
 جب وہ چلے گئے تب بونے مراد کو تلاش کرنے
 والے ادھر آئے۔ وہاں سناٹے اور دیرانی میں ایک لاش
 پڑی تھی۔ کرسس کی رنگینیاں سامنے شاہراہوں پر تھیں۔
 وہ سب کرسس ٹائٹ انجوائے کرنے نکلے تھے۔
 ایک لاش کی رپورٹ دے کر تھانے پولیس کے چکر میں نہیں
 پڑنا چاہتے تھے۔ چپ چاپ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر وہاں
 سے جانے لگے۔
 ہڈن نے کہا۔ ”تعجب ہے۔ وہ یونہی چلا داتا تھا۔ ادھر
 دکھائی دیا۔ ادھر غائب ہو گیا۔“
 دھرم داس کو حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ اس نے
 کہا۔ ”مجھے تو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ ہم نے مراد علی
 منگی کو دیکھا تھا۔ بھلا وہ ایک سے آدھا کیسے ہو جائے گا؟“
 ہڈن نے فون پر ڈائریکٹر جنرل سے کہا۔ ”ابھی میں
 نے مراد علی منگی کو دیکھا ہے۔ مگر وہ ایک یونہی ہے۔“
 ڈائریکٹر جنرل جان اتھوٹی نے پوچھا۔ ”کیا تم نے
 کسی بونے کو مراد کا ہم شکل پایا ہے؟“
 ”نہیں سر اوہ ہو بہو مراد تھا۔ ہم اسے پکڑ کر اس کی
 اصلیت معلوم کرنا چاہتے تھے لیکن وہ اچانک ہی بھیڑ میں کہیں
 گم ہو گیا۔ یہ کبھی میں نہیں آ رہا ہے کس سے کہاں تلاش کریں؟“
 جان اتھوٹی نے کہا۔ ”کیوں تلاش کرو گے؟ وہ مراد
 تو نہیں ہے۔ میں کرسس ٹائٹ انجوائے کر رہا ہوں۔ تم نے
 ایک بونے کو دیکھ کر خواہ مخواہ مجھے ڈسٹرب کیا ہے۔“
 اس نے فون بند کر دیا۔ ہڈن زیر لب بڑبڑانے
 لگا۔ ”وہ کون تھا؟ اس نے الجھا دیا ہے۔ وہ سر سے پاؤں
 تک مراد تھا۔ اگر مراد تھا تو پاکٹ ایڈیشن کیسے بن
 گیا ہے؟“
 اس نے پاس بیٹھی ہوئی بھین کو دیکھ کر پوچھا۔ ”جس
 نے تمہیں دشمنوں سے بچایا تھا وہ پورا تھا یا آدھا؟ میرا

مطلب ہے کیا وہ چھوٹے قد کا تھا؟“ وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”وہ تو بہت اونچا پورا لمبا چوڑا تھا۔ میں اس کی بائیک پر پیچھے بیٹھی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پہاڑ کے دامن میں بیٹھی ہوں۔“

کبڑی منظر عام پر آ کر ایک دشمن کی موت اور دوسرے دشمنوں کی پریشانی بن گیا تھا۔ اب وہ مراد کے ساتھ فنی ڈریس شو میں پہنچ گیا تھا۔ وہاں تو مختلف ماسک کے پیچھے دشمن ہی دشمن تھے۔

اس محفل میں ہر سو حسن کی جلوہ نمائی تھی۔ شباب کی گرمی سے ان کے کپڑے ہلکے گرم ہو رہے تھے۔ دوسری کی گرمی تھی۔ ایسے میں حسیناؤں کی دھوپ نکل آئی تھی اور آتش کو جواں رکھنے کے لیے شراب پانی کی طرح بہ رہی تھی۔

عورتوں اور مردوں نے طرح طرح کے ماسک پہنے ہوئے تھے۔ کوئی لومڑی بنی ہوئی تھی، کوئی بلی اور کوئی خرگوش اور اسی کے مطابق انہوں نے بڑے ہی دیدہ زیب لباس پہنے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ماسک کے بغیر اصلی شکل میں تھے۔ مراد سامتا کلاز بنا ہوا تھا۔ دھرم داس نے اسے بتا دیا تھا کہ ہڈن ٹائیکر کے ماسک میں چھپا ہوا ہے۔ عبداللہ کبڑی ماسک کے بغیر مراد کا چہرہ لے کر ہال میں پہنچا تو چھپے ہوئے دشمنوں میں کھلبلی پیدا ہوئی۔

جو مراد کو تلاش کرنے اور ہڈن کو ہلاک کرنے آئے تھے وہ آدھے مراد کو دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اگر مراد ہے تو یوں کیسے بن گیا؟ محفل کہہ رہی تھی کہ وہ مراد نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو حرام موت مرنے منظر عام پر نہ آتا۔

وہ سب پی رہے تھے۔ ان کا قول تھا کہ پتے پتے رہنے سے مرنے کا خوف نہیں رہتا۔ مارنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ پتے کے بعد ایک کے دو نظر آتے ہیں۔ گدھا، گھوڑا اور گھوڑا گدھا دکھائی دیتا ہے اور قد آور شکو کر یونا بن کرنا چھٹے لگتا ہے۔

کبڑی ایک اچھا نما چوتھے پر کچھ لوگوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ شیطان کے ماسک والا ایک شخص نئے میں مست ہو کر کبڑی کے پاس آیا پھر اس پر جھک کر بولا۔ ”ہیلو مراد!“

اس نے موسیقی کی دھن میں تھرکتے ہوئے کہا۔ ”تم نے زیادہ پی لی ہے۔ میں مراد نہیں عبداللہ کبڑی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”یہ ہو نہیں سکتا۔ اتنا بتا دو تمہارا قد فنی پر سنٹ کیسے ہو گیا۔ تم تو ہنڈرڈ پر سنٹ تھے۔“

کبڑی نے دور کھڑے ہوئے مراد کو آنکھ ماری۔ وہ

تیزی سے چلتا ہوا آیا پھر شیطانی ماسک میں کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں بونے مراد کا ایک راز بتاتا ہوں۔“

وہ اسے ہال سے باہر ایک اسٹور روم میں لے آیا پھر بولا۔ ”تم کس کے لیے مراد کو ڈھونڈ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”تم کوئی سوال نہ کرو۔ مجھے بونے مراد کا راز بتاؤ۔“

مراد نے سائیکسنگ لگے ہوئے ریوالور کو اس کے سینے سے لگا کر کہا۔ ”ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فون نکالو اور اپنے پاس کو بولو۔ مراد تمہارے سامنے کھڑا ہے۔“

موت سینے سے آ کر لگی تو نشتے کی مستی ہوا ہو گئی۔ اس نے فون پر نمبر سچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ پھر رابطہ ہونے ہی بولا۔ ”باس! میں مراد کے نشانے پر آ گیا ہوں۔ اس سے کسی طرح سمجھو تا کرو۔ مجھے بچالو۔“

باس نے کہا۔ ”مراد سے میری بات کراؤ۔“

وہ فون بڑھا کر بولا۔ ”باس تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

وہ فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے یہ بتاؤ ریڈ الارٹ ہو یا ڈیٹیکٹ ریڈیکٹ؟“

”میں ڈیٹیکٹ ریڈیکٹ کا ڈی بیگ بول رہا ہوں۔“

”مست بولو۔ میرے رہا ہوں۔“

اس کی دھیمی آواز کون سکونے۔

یہ کہتے ہی اس نے پچھاک کی آواز کے ساتھ گولی مار دی، فون کو ایک طرف پھینک دیا پھر ریوالور کو لباس میں چھپا کر بڑے ہال کی رنگین محفل میں آ گیا۔ وہاں کبڑی موسیقی کی دھن پر گار رہا تھا اور لڑکیوں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

میں ہوں یونا بازی گر۔ میں ہوں یونا بازی گر۔ میں ہنستا ہی رہتا ہوں دشمن کو ناچ چکا گر۔

ایک بلی بن کر آنے والی لڑکی ناچنے لگانے اور پنے کے دوران مراد سے دو بار آ کر ٹکرائی تھی پھر تیسری بار آ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ خود کو اس سے چھڑانے لگا۔ وہ کبلی بننے ہوئے بولی۔ ”میں تین راتوں تک تمہارے سینے میں نہاتی رہی تھی۔ یہ پریمنا تمہارے سینے کی بو سے تمہیں پہچان رہی ہے۔“

”میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔“

اور واقعی پریمنا اس کے سینے کو پہچاننے کا غلط دعویٰ کر رہی تھی۔ جس راہن سن یا ایمان علی کے ساتھ راتیں گزار چکی تھی، اب وہ نہ جانے کہاں تھا۔ وہ نشتے میں تھی۔ بول رہی تھی۔ ”مجھے بازوؤں میں اٹھا کر لے چلو۔ یہاں فرسٹ فلور

میں کئی کمرے خالی ہیں۔“

وہ بولتے وقت بہت ہی جذباتی ہو کر اپنے بھرے ہوئے بدن سے اس کے بدن کو سہلا رہی تھی۔ مراد نے الگ ہونے کے لیے ایک زور کا جھٹکا دیا تو وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی شرابی پر گری۔ کئی بوتلیں اور شیشے کے نازک جام ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پریمنا کے ساتھ نیچے جا گرے۔ کتنے ہی لوگ اسے اٹھانے کے لیے اس کی طرف لپکے۔ مراد ناچنے والوں کی بھیڑ میں دوسری طرف چلا گیا۔

وہ غصے میں بول رہی تھی۔ ”یو ایڈیٹ۔ نان سنس! میں تجھے زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ آئی ول۔ کل یو۔۔۔“

وہ کئی ہاتھوں کا سہارا لے کر اٹھ گئی۔ دور تک دیکھنے لگی۔ اس کا سر چکرار رہا تھا۔ مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھرم داس نے آ کر اسے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بہت پی لی ہے۔ چلو یہاں سے۔“

ایک عورت وچ لیڈی (جادو گرنی) کے ماسک میں تھی۔ وہ کبڑی کا ہاتھ تھام کر ڈانس کرتی ہوئی اسے کھینچ کر ایک طرف لے گئی پھر کہا۔ ”مراد علی متکی! یہ کیا بھید ہے؟ تم سب کو حیران کر رہے ہو۔ تمہارا قد چھوٹا کیسے ہو گیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”کسی کا قدرہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ بڑھ سکتا ہے۔ ہماری دنیا میں کئی ایسا نہیں ہوا اور میں کوئی متکی دہی نہیں ہوں۔ دیکھو میوزک آن ہے۔ میں گا رہا ہوں۔ مجھے جانے دو۔“

وہ ہاتھ چھڑا کر پھر رقص کرنے والوں کے درمیان ناچنے لگانے لگا۔ مراد نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ کوئی وچ لیڈی اسے ایک طرف لے جا کر اس کے مراد ہونے کی تصدیق کر رہی تھی۔

کبڑی نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا۔ ”ابھی اس عورت کا ہاتھ پکڑ کر بتاؤں گا کہ وہ کون تھی؟“

وہ گانے لگا۔ ”میں ہوں یونا بازی گر۔ میں ہوں یونا بازی گر۔“

وہ ناچتے ہوئے ایک ایک عورت کو چھو کر کہنے لگا۔ ”اگوبکر جیسے بو۔ اچی توے پورے سو سو میں نکلا دھاگا۔ ارے پکڑو دشمن بھاگا۔“

اس نے وچ لیڈی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ شراب کا جام ہونٹوں سے لگائے پی رہی تھی۔ مراد نے آ کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ”ارے چھوڑو۔ میں جوان لڑکی نہیں ہوں۔“

وہ اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ ”میں ریڈ الارٹ کا شوٹر ہوں۔ پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرنے آیا ہوں۔“

وہ ہال کے باہر آگئے تھے۔ وہ چھپلی کی طرح پھڑ پھڑا کر اس کے بازوؤں سے اتر گئی۔ پھر اسے گھور کر بولی۔ ”وہ سامنے والا کمر خالی ہے۔ دروازہ کھلا ہے۔ فوراً چلو۔ ورنہ یہاں کہیں سے اندھی گولی آ کر ہم میں سے کسی کو چاٹ جائے گی۔“

وہ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ وچ لیڈی نے فوراً ہی دروازے کو اندر سے بند کر کے لباس کے اندر سے سائیکسنگ لگا پستول نکال لیا۔ اس کا نشانہ لیٹے ہوئے بولی۔ ”تھو ہے تمہارے پچاس لاکھ ڈالر پر۔ وہ مراد علی متکی میرے دل میں ہے۔ اس کی رکھشا کرنا میرا کرتو (فرض) ہے۔ کوئی اسے ہاتھ بھی لگائے گا تو میں اسے نرک میں پہنچا دوں گی۔“

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر کو دبا یا۔ دھیمی آواز میں گولی چلی وہ عین وقت پر اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر جھک کر اس کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر اوپر اٹھا دیا۔ دوسری گولی چھت پر جا کر گئی۔ یہ اپنا بیجاؤ کر رہا تھا۔ وہ زبردست لڑاکا عورت تھی۔

مراد نے اسے سمجھایا۔ ”میری بات سنو۔ گولی نہ چلاؤ۔ میں دشمن نہیں ہوں۔ میں تمہیں...“

بات پوری ہونے سے پہلے اس نے مراد کے پیٹ میں جھٹٹا مارا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا گیا لیکن ایسی بھی تکلیف نہیں تھی کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس نے وچ لیڈی کو دبوچ کر رکھ دیتے ہوئے پیچھے دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس کا سر ڈرا جھکا تو مراد نے اس کی گردن میں بازو کا پھندا ڈال دیا۔ ڈرا زور لگایا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ایسے میں پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے لڑنے والی کو ایک جھٹکے سے فرش پر پھینک دیا۔ پھر پستول کو اٹھا کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔

وہ نہتی ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی۔ فرش پر سے اٹھتے ہوئے مراد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں موت سے کھیلتی رہتی ہوں۔ چل گولی چلا۔ یہاں سے باہر نکلتے ہی مرے گا۔ میری بیٹیاں تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔“

”میں گولی نہیں چلاؤں گا کیونکہ دشمن نہیں ہوں اور ریڈ الارٹ کا شوٹر بھی نہیں ہوں۔“

وہ بے یقینی سے بولی۔ ”ابھی تو نے کہا تھا۔“

”میں جھوٹ بول کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم کس گروہ

سے تعلق رکھتی ہو؟

”میں کیسے یقین کروں کہ اب سچ بول رہے ہو؟“ وہ بڑی محبت سے بولا۔ ”تم مراد کے لیے نیک جذبات رکھتی ہو۔ پچاس لاکھ ڈالر زہر تو تم کو توئی ہو۔ میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔“

اس نے جھک کر پستول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے حیرانی اور بے یقینی سے مراد کو دیکھا پھر پستول لے کر فرش سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم کون ہو؟“

وہ بولا۔ ”پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ؟“

وہ بولی۔ ”میرا نام جگتی بانی ہے۔ میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ہم نے ایٹانے (نا انسانی) کے خلاف لڑنے کے لیے ایک تنظیم بنائی ہے۔ اس تنظیم کا نام گھاگرا پلٹن (Peticoat Army) ہے۔ یہ نام ہم نے نہیں لوگوں نے رکھا ہے کیونکہ ہماری دل (جماعت) میں صرف تعلیم یافتہ ہنرمند اور خطرناک فائزر کھلانے والی عورتیں ہیں۔“

”ہم نے مراد علی مگلی کی ہسٹری معلوم کی ہے۔۔۔ وہ بے قصور ہے۔ پاکستانی جاسوس نہیں ہے۔ ہم اسے انصاف دلائیں گے۔ جو اس کا دشمن ہوگا اسے ہم جینے نہیں دیں گے۔“ مراد اسے بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہا تھا۔ جگتی بانی نے کہا۔ ”اب تم یوں کون ہو؟ کیا اس بڑے مراد کو جانتے ہو؟“

مراد نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہاں بے چارہ مراد۔۔۔ میں تمہارے اندر انسانی ہمدردی اور مراد سے اپنائیت دیکھ کر جھک گیا ہوں گا۔ ابھی ہم نے یہ راز کسی کو نہیں بتایا ہے۔ پہلے تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے تم جادوؤں کو اور کسی تاحترک مہاراج کی جادوئی طاقتوں کو مانتی ہو؟“

”کیوں نہیں مانوں گی؟ ضرور مانتی ہوں۔ ہمارے دیس میں جادو تو نا بہت ہے۔“

”تو سنو ابھی جو ہال میں ناچ رہا ہے اور گا رہا ہے وہی مراد علی مگلی ہے۔ ایک تاحترک مہاراج نے کرودھ (ٹپس) میں آکر اسے جادوئی طاقت سے بونا بنا دیا ہے۔“ جگتی بانی نے حیرت سے اپنا ہاتھ کھٹے ہوئے منہ پر رکھ لیا۔ مراد نے کہا۔ ”بے چارہ مراد دشمنوں سے چھپنے کے لیے شمشان گھاٹ میں گیا تھا۔ وہاں ایک تاحترک مہاراج ایک تھال میں گیندے کے پھول ماش کی دال کا آنا سیندور اور تلی کا تیل رکھ کر آسن جمائے بیٹھے تھے اور کوئی منتر پڑھ رہے تھے۔ مراد دشمنوں سے بچھا چھڑانے کے لیے ادھر سے بھاگتا ہوا جانے لگا تو مہاراج کی تھال کو ٹھوکری لگی۔ ان

کے تمام جنت منتر کا سامان دور تک بکھر گیا۔ سب ہی مٹی میں مل گیا۔“

”تب تاحترک مہاراج نے کرودھ میں آ کر ایک منتر پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ سگوتا اور چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا قد گھٹ گیا اور وہ بونا بن گیا۔“

جگتی بانی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہائے۔۔۔ بچا رہا! ہم اس تاحترک مہاراج سے ملیں گے۔ اس سے سچی گریں گے۔ اس کے چرنوں میں گر جائیں گے تو وہ اسے واپس قدا اور بنا دیں گے۔“

”بے چارہ مراد نہیں جانتا کہ وہ مہاراج کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور اب وہ کہاں ہوں گے؟“

دروازے پر دستک سنائی دی۔ پھر کسی لڑکی کی آواز آئی۔ ”ماتا جی اتن بڑی دیر سے یہاں ہو۔ خیریت تو ہے؟“ جگتی بانی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میری بیٹی ورشا آئی ہے۔“

اس نے دروازہ کھولا تو وہاں تین جوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے دور عبد اللہ کبڈی چھپا ہوا تھا۔ اسے تشویش تھی کہ مراد بند کمرے سے باہر کیوں نہیں آ رہا ہے؟

مراد نے ہاتھ اٹھا کر اسے آنے کا اشارہ کیا۔ لڑکیاں اندر آ رہی تھیں۔ کبڈی بھی ان کے پیچھے کمرے میں آیا تو وہ سب نے اپنی ماں سے کہا۔ ”ماتا جی! یہ دیکھو مراد آیا ہے۔“

دوسری نے کہا۔ ”مراد نہیں اس کا ہم شکل ہے۔“ تیسری نے کہا۔ ”میں شرط لگانے کو تیار ہوں مراد تو پہاڑ جیسا ہے، وہ بونا ہو ہی نہیں سکتا۔“

وہ آپس میں بحث کرنے لگیں۔ جگتی بانی نے ڈانٹ کر کہا۔ ”چپ ہو جاؤ۔ یہ مراد علی مگلی ہے۔“

سب نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ جگتی بانی نے آگے بڑھ کر کبڈی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بیٹے! ابھی تمہارے دوست نے بتایا ہے۔ تاحترک مہاراج نے تم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم اس مہاراج کو ڈھونڈیں گے۔ اگر وہ سیدھی طرح تمہیں واپس قدا اور نہیں بنائے گا تو ہم عورتیں اسے اتانکا دیں گی۔“

وہ تینوں لڑکیاں ہمدردی اور محبت سے کبڈی کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بانی اسے سینے سے لگا کر بولی۔ ”آج سے میں تمہاری ماں ہوں۔ تم دشمنوں کے مقابلے میں اکیلے نہیں رہو گے۔ یہاں سے کوئیکہ گھاگرا پلٹن (Peticoat Army) میں دو سو فائزر عورتیں ہیں۔“

وہ جگتی بانی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ”میری اتی

ماروی

وقات پا چکی ہیں۔ میں آپ کو اتنی کہوں گا۔ آپ میرے لیے فائنٹ کریں۔ بھارت سرکار کو یقین دلائیں کہ میں نہ تو پاکستانی جاسوس ہوں اور نہ ہی پیشہ ورجرم ہوں۔“

”گھر نہ کرو۔ گھاگرا پلٹن میں چھ مانی ہوئی پیرسٹر ہیں۔ پندرہ پریس رپورٹر اور نو نو گرافر ہیں۔ دور کی کوڑیاں لانے والی جاسوس ہیں۔ یہ سب کی سب تمہارے لیے فائنٹ کریں گی۔“

پھر وہ اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگی۔ وہ تینوں بہت مایوس ہو کر یوں مراد کو دیکھ رہی تھیں۔ جگتی بانی نے کہا۔ ”مراد! ان تینوں نے تمہیں اپنا آئیڈیل بنایا تھا۔ ایک دوسرے سے لڑتی تھیں اور کبھی تمہیں کہہ دیتے تھے کہ تم سے شادی کریں گی۔“

ان تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی ماں کہہ رہی تھی۔ ”یہ میری بڑی بیٹی ٹینا ہے۔ یہ دوسری ڈولی ہے اور یہ سب سے چھوٹی ورشا ہے۔“

ورشا چور نظروں سے سنا کر کھڑکے رہی تھی اور اچانے میں اصلی مراد کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بونے مراد کے مقابلے میں چھ فٹ سے بھی اونچا صحت مند جوان تھا۔ لڑکیوں کی طبیعت کا تصور کرتی ہیں۔

مراد نے کبڈی سے کہا۔ ”ہمیں ہال میں جانا ہے اور دشمنوں سے بچنا ہے۔“ اتنی! آپ اپنا فون نمبر دیں اور میرا نمبر لیں۔ میں کل آپ سے بات کروں گا اور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔“

انہوں نے ایک دوسرے کے نمبر Save کیے۔ کبڈی تینوں لڑکیوں کے سامنے آ کر بولا۔ ”ماتم نہ کرو۔ اگر میں تمہارا آئیڈیل تھا تو پھر ماتم کیسا؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ تم تینوں میرے ہاتھ پاؤں پکڑ کر دوڑ اپنی اپنی طرف بھاگتی رہو گی تو لہسا ہو جاؤں گا۔“

جگتی بانی ہنسنے لگی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر بڑے ہال میں آگئے۔ وہاں کرس نائٹ کا جشن شباب پر تھا۔ طرح طرح کے لذیذ کھانوں کے علاوہ شراب کی ٹرائیاں بھی گردش میں تھیں۔

ریڈ الٹ اور ڈیمبرس ریکٹ کے شوئرز بھی پی کی مست تھے۔ بونے مراد نے انہیں الجھا دیا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہو کر ہیلری ہڈن کو ڈھونڈ رہے تھے۔

ڈی بلیک نے غم دیا تھا کہ ہڈن کو گولی مار دی جائے تب ہی ڈائریکٹر جنرل مجبور ہو کر مراد کا ہاتھ تانے کا چیکہ MET ڈیپارٹمنٹ کی مرید بھی اس کا موجودہ پتا نہیں جانتی گی۔

ہڈن اپنے ماسک کی وجہ سے محفوظ تھا۔ کسی قابل کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن شراب اسے لے ڈوبی۔ اس پر نشہ حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے ایک جوان عورت کو اغوش میں لے کر چومنے کے لیے ماسک کو چہرے سے ہٹا یا تو ایک شوئرز سے دیکھ لیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہوا اس کے پیچھے آیا پھر اس کی پشت سے ریوالور کی نال کو لگاتے ہوئے کہا۔ ”گن میرے کوٹ کی جیب میں ہے، کوئی دیکھ نہیں سکے گا۔ چپ چاپ باہر چلو۔ منہ سے ذرا آواز نکالو گے تو یہیں گولی مار دوں گا۔“

وہ سہم کر بولا۔ ”پلیز گولی نہ چلاتا۔ مجھ سے دوستی کرو۔ میں تمہارا مطالبہ کرنی کی صورت میں ادا کروں گا۔“

”او کے باہر چل کر باتیں ہوں گی۔ کم آن، آگے بڑھو۔“ اسے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اس کے لباس کے اندر بھی ایک پستول تھا۔ سوچ رہا تھا جب جان دینی ہی ہے تو باہر جاتے جاتے پستول نکال کر اس سے مقابلہ کرے گا۔ شوئرز بھی مجبور تھا۔ اس عمارت کے اندر گولی مار کر بھاگنا چاہتا تو درجنوں سکیورٹی والے اسے گولی مار دیتے۔ وہ بڑے ہال سے باہر آگئے۔ عمارت کے مختلف حصوں سے گزرنے لگے۔ ہر جگہ جشن منانے والے موجود تھے اور سٹیگارڈز بھی کھڑے ہوئے تھے۔

شوئرز نے کہا۔ ”تیزی سے چلو۔“

ہڈن اس کے آگے تیزی سے چلتے چلتے اچانک بیٹھ گیا۔ اس حرکت سے پیچھے والا فوراً ہی رک نہ سکا۔ ہڈن کے اوپر سے گزرتا ہوا آگے آ کر گرا۔ اتنی ہی مہلت ملتے ہی ہڈن نے لباس سے پستول نکال کر اسے گولی مار دی۔

دور کھڑے ہوئے گارڈز دوڑتے ہوئے اس کی طرف آنے لگے۔ مراد ایک ستون کی آڑ میں تھا۔ اس نے گولی چلائی تو وہ ہڈن کے ہاتھ میں لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور چلا گیا۔ اس کی طرف آنے والے گارڈز پلٹ کر اس سے دور ہو گئے۔ جواباً گولیاں چلانے سے پہلے ادھر ادھر چھینے لگے۔

ایسے ہی وقت ہر عورتا رکی چھائی۔ کسی نے مین سوئج کو آف کر دیا تھا۔ ریڈ الٹ کے شوئرز سمجھ ہو کر بڑی پلاننگ سے ایکشن میں آئے تھے۔ ان میں سے دو شوئرز مین سوئج کے پاس تھے۔ جو گارڈ اسے آن کرنے آ رہا تھا۔ اس کی طرف گولیاں چلا رہے تھے۔ باقی شوئرز اس حصے میں تھے جہاں ہڈن فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں

رینگتا ہوا اپنے پستول کی طرف جارہا تھا لیکن صبح سمت سے
بھٹک گیا تھا اور مراد کی طرف ستون کے پاس چلا آ رہا تھا۔
اندھیرے میں شوٹرز گولیاں چلا رہے تھے۔ فائرنگ کے
لحاتی شعلے جل بھڑے تھے۔ مراد نے ستون کے پیچھے محفوظ
رہ کر ان لحاتی شعلوں کی سمت گولیاں چلا گئیں تو دو افراد کی
چتخیں سنائی دیں۔ پتا نہیں وہ دشمن تھے یا گارڈز تھے؟ پھر
اس نے فرش پر بیٹھ کر ذرا جھک کر کسی کے سانس لینے کی آواز
سنی۔ پر فیوم کی مہک سے پہچانا کہ وہ ہڈن ہے۔

اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”فوراً لیٹ جاؤ۔ ورنہ
کوئی گولی ابھی ادھر آئے گی۔“
وہ گھوڑے کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں سے چلتا آ رہا
تھا۔ فوراً ہی فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ مراد نے کہا۔ ”میں
تمہارے پر فیوم کی مہک سے پہچان رہا ہوں۔ تم ہڈن
ہو۔ ڈرو نہیں۔ میں وہی ہوں جس نے تمہاری بہن لیزا کی
جان بچائی تھی۔“
وہ بولا۔ ”تھینکس گاڈا مجھے ایک ہتھیار دو۔ مہربانی
ہوگی۔“

”میرے پاس ایک ہی ریوالور ہے۔ میرا لباس
تھام کر دیکھتے ہوئے چلو۔“
اس کی بات پر ہی ہونے ہی آواز کی سمت ایک گولی
آئی۔ اس نے منہ سے آواز نکال کر نادانی کی تھی۔ چونکہ وہ
فرش پر لیٹے ہوئے تھے اس لیے بچ گئے۔ تیزی سے رینگتے
ہوئے ایک سمت جانے لگے۔

مراد کسی بھی نئی جگہ جاتا تھا تو پہلے وہاں سے نکلنے کے
راستے ذہن نشین کر لیتا تھا۔ وہ وائی ایم سی اے کی عمارت
سے بھی نکلنے کے راستے دیکھ چکا تھا۔ اس وقت فرش پر چپ
چاپ رینگتا ہوا ہڈن کو اپنی راہنمائی میں لے جا رہا تھا۔
وہ خطرے سے دور ہو گئے تھے۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ کی
آوازیں آرہی تھیں۔ کرائے کے شوٹرز اور سچ سپاہیوں کے
درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ مراد نے فون کے ذریعے
کبڈی کو مطلع دیا۔ ”گاڑی کے پاس آؤ۔ میں آ رہا ہوں۔“
پھر وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے۔ باہر شاہراہ کی روشنی
کے باعث اندر گہری تاریکی نہیں رہی تھی۔ وہ جھکتے ہوئے،
چھپتے ہوئے عمارت کے باہر ایک تیلی گلی میں نکل آئے۔
وہاں کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل کے پاس کبڈی کھڑا ہوا
تھا۔ ہڈن اسے دیکھ کر ہلک گیا۔ کبڈی نے کہا۔ ”رک کیوں
گئے۔ میرے سر کی قیمت حاصل کرنے کے لیے اپنے دن
رات حرام کر رہے ہو۔ آؤ میرے شانے سے سرتار لو۔“

ہڈن نے کہا۔ ”تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں ہال
میں بھی تمہیں دیکھتا رہا۔ کسی پہلو سے یقین نہیں آ رہا ہے کہ
تمہارا قد اتنا چھوٹا ہو گیا ہے۔“
وہ سائیکلنگ ہوا ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیجے
ہوئے بولا۔ ”میں پچاس لاکھ ڈالرز ہوں۔ گولی چلے گی تو
یقین آ جائے گا لیکن یقین کرنے والے دیر ہو چکی ہوگی۔“
ہڈن نے فوراً ہی پلٹ کر مراد کو دیکھا پھر چیخ کر
کہا۔ ”مجھے اپنا ریوالور دو۔“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ مار
کھا کر کبڈی کی طرف ریوالور کے نشانے پر آ گیا۔ پیچھے
سے مراد نے اس کی کمر سے ریوالور لگا کر کہا۔ ”میں وہیں
ہال میں تمہیں ختم کر سکتا تھا لیکن نہیں کیا۔ ایک فون کال
ضروری تھی۔ چلو اپنا فون نکالو اور مرید کو کال کرو۔“
اس کے آگے پیچھے موت تھی۔ اس نے حکم کی تعمیل
کی۔ رابطہ ہونے پر دوسرے طرف موسیقی گانے اور
تہمتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہاں بھی کرسٹیا نائٹ کی
دھوم دھام تھی۔ مرید بھی نشے میں مست ہو رہی تھی۔ اس
نے پوچھا۔ ”ویل ہڈن! کیا تم وہاں انجوائے کر رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”وہاں بہت شور ہے۔ کہیں دور آ کر بات
کر دو اور میری بات سنو۔ میرے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔“
”جسٹ اے منٹ! میں دوسری جگہ جا رہی ہوں۔“
ہڈن نے مراد سے پوچھا۔ ”میں مرید سے کیا بولوں؟“
”بولو کہ تم مراد کو دیکھ رہے ہو اور وہ بولتا ہو گیا
ہے۔ اس سے یہ نہ کہنا کہ مراد کے ساتھ یہ سائنٹا کلاز
تمہارے پیچھے ہے۔“

دوسری طرف مرید کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو ہڈن!
یہاں شور ہنگامہ نہیں ہے۔ اب بولو۔“
”میں کیا بولوں؟ ایسے وقت بولتے ہیں، پیچھے کنواں
آگے کھائی۔ میں کیا کروں میری مائی؟ مراد موت بن کر
آ گیا ہے۔ یہ شاید مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سے کسا
طرح سمجھو تا کرو۔“
وہ خوشی سے چیخ کر بولی۔ ”کیا مراد وہاں ہے؟ اسے
فون دو۔ ہائے، میں اس کی آواز سننا چاہتی ہوں۔“
ہڈن نے کبڈی کی طرف فون بڑھاتے ہوئے
کہا۔ ”مرید! تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“
کبڈی نے فون نہیں لیا۔ ادھر منہ کر کے بولا۔
”سوری مرید! میں ایک گھنٹے بعد تم سے بات کروں گا۔ سو
سوری! ابھی دشمنوں سے نمٹ رہا ہوں۔“

ادھر سے مرید نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟ یہ مراد کے
لب دلچے میں بول رہا ہے لیکن آواز وہی نہیں ہے۔“
ہڈن نے کہا۔ ”اس کی آواز وہی گئی ہے اور قد سکر گیا
ہے۔ تمہارا مراد بولتا ہو گیا ہے۔“

وہ بولی۔ ”کیا بکواس ہے۔ وہ پہاڑ جیسا مرد بولنا کیسے
ہو جائے گا؟ اس سے بولو، مجھ سے بات کرے۔“
کبڈی نے مراد کا اشارہ پاتے ہی کوئی بات نہیں
کی۔ ہڈن کو گولی مار دی۔ وہ کراہتا ہوا فون سمیت زمین پر
گر پڑا۔ مراد نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گگ ماری۔ کبڈی
ہڈن کا فون اٹھا کر پیچھے آ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی آگے بڑھ
گئی۔ فون سے مرید کی آواز آرہی تھی۔ ”ہڈن! چپ کیوں
ہو گئے؟ بولتے کیوں نہیں؟“

کبڈی فون کو منہ کے سامنے لا کر گانے لگا۔
”میں ہوں بولنا بازی کر۔ مجھ سے کرو نہ اگر مگر۔ میں
ہوں بولنا بازی کر۔“
اس نے فون کو دور پھینک دیا۔ موٹر سائیکل تیز رفتاری
سے چلی جا رہی تھی۔



دوسری صبح انڈیا کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے
باکرجینٹس پھر سے تھے۔ ”آج کی تاریخ خبر... دہلی کی کرسٹیا
نائٹ میں خون کی ندیاں بہ گئیں۔ شراب پینے والوں کے
اندز لہو باہر۔ آج کی تاریخ خبر۔ آج کی تاریخ خبر...“
اخبارات کی سرخیاں کہہ رہی تھیں۔ ”وائی ایم سی
اے ہال میں جہاں کرسٹیا نائٹ منا رہے تھے وہاں
دہشت گرد گولیاں برس رہے تھے۔“

تمام ٹی وی چینلز کہہ رہے تھے وہ دہشت گرد نہیں
تھے۔ برطانوی سفارت خانے کے منتظم ہیلری ہڈن کے
اشمن تھے۔ اسے ہلاک کرنے آئے تھے۔ خبروں میں یہ بھی
کہا جا رہا تھا۔ بدنام زمانہ قابل بیرونی ملکوں سے آرہے ہیں
اور کسی مراد علی منگلی کو تلاش کر رہے ہیں۔ مراد علی منگلی پاکستانی
جاسوس ہے۔ وہ یہاں سے ایک اہم راز چرا کر فرار ہونا
چاہتا تھا۔ سب ہی کے بیانات کا لب لباب یہی تھا۔

اب تک راجستھان اور یوپی کے علاقوں میں مراد کا
چرچا محدود پیمانے پر تھا۔ اس روز 25 دسمبر کو پہلی بار اس کا
نام پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا۔ تمام اخبارات اور
ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویریں دکھائی جا رہی
تھیں۔ یہ کہا جا رہا تھا کہ اب وہ کسی علاقے میں چھپ کر نہیں
رہ سکے گا۔

پھر اسی دن اخبارات کے صفحے شائع ہوئے۔ ٹی وی
کی خبروں میں بتایا گیا کہ پچھلی رات مراد کو وائی ایم سی اے ہال
میں دیکھا گیا تھا۔ وہ چھپنے والا سرعام آ گیا تھا اور وہاں ناچتا
گا تا رہا تھا۔

ان خبروں میں ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات
کئی گئی کہ مراد علی منگلی کا قد چھ فٹ سے کچھ زیادہ تھا۔ اب وہ
گھٹ کر چار فٹ کا بولنا ہو گیا ہے۔

یہ واقعی یقین کرنے والی بات نہیں تھی۔ لوگ ہر گلی اور
محلے میں اس بولنے پر تبصرے کر رہے تھے اور اس کے متعلق
اپنے اپنے طور پر خیال آرائی کر رہے تھے۔

ایم این اے دھرم داس نے بیان دیا۔ ”میں نے
اس بولنے کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس سے باتیں کی
ہیں۔ وہ ہرگز مراد علی منگلی نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادہ سا
ناچنے گانے والا اور تماشے دکھا کر ہنسانے والا جو کر ہے۔
میں اسے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس اور انڈین انٹیلی جنس
دالوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا تا کہ اس کی صحیح شناخت
ہو جائے اور وہ بے چارہ مصوم بولنا مراد علی منگلی کے دھوکے
میں مارا نہ جائے۔“

”اس نے مجھے کہا تھا کہ کرسٹیا نائٹ کے جشن کے
بعد میرے پاس آئے گا لیکن وہاں گولیاں چلنے لگی
تھیں۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ وہ بھی
خوف زدہ ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔“

”مجھے امید ہے وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میرا فون
نمبر اس کے پاس ہے۔ ایک تو مجھے اس بولنے سے ہمدردی
ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اصل مراد علی منگلی جو پاکستانی
جاسوس ہے وہ بولنے کا ہم شکل ہو کر فائدہ اٹھائے گا۔ وہ ہم
سب کی توجہ اس بولنے کی طرف لگا کر فرار ہو سکتا ہے۔ ہم
اس جاسوس کو سرحد پار نہیں کرنے دیں گے۔“

دھرم داس اتر چہ دیس بھگت بن کر مراد کے خلاف
بیان دے رہا تھا لیکن اپنے دل اور دھرم سے اور یقینی سچائی
سے مراد کو بے قصور ماننا تھا۔ وہ اس پر سے پاکستانی جاسوس
ہونے کا جھوٹا الزام منانے نہیں سکتا تھا لیکن در پردہ اس کا حامی
ہو کر اسے سرحد پار کر سکتا تھا۔ اس کے لیے وہ بہت کچھ کر
رہا تھا۔ ایمان علی کی حیثیت سے مراد کا نیا شناختی کارڈ اور
پاسپورٹ بنوا چکا تھا۔ آئندہ عبداللہ کبڈی کو آئی جی آف
پولیس اور انٹیلی جنس والوں کے سامنے پیش کر کے اس کا بھی
شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے والا تھا۔

دوسرے دن جگنی بائی نے کبڈی کو فون پر مخاطب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ پیریم کوالٹی، ہیرس کوالٹی، کمپریڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ✧ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



دیکھا ہے پھر آدھی رات کے بعد ہڈن نے مجھے فون کیا تو تم وہاں موجود تھے۔ ہڈن نے کہا تھا کہ تمہاری آواز دب گئی ہے اور قد سگڑ گیا ہے۔ تم بونے ہو گئے ہو۔

”یہ کیا بچوں جیسی باتیں ہیں۔ پلیز سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟ میں نہیں مانتی کہ مراد یونا ہو گیا ہے؟ یہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو کبھی نہیں مانوں گی۔“

”ٹھیک ہے کہ یہ نہ ماننے والی بات ہے، کیا مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی نہیں مانو گی؟“

اس نے یہ کہتے ہوئے تکلیف سے کراہنے کے بعد ایک لمبی سانس لی۔ مرینہ نے پوچھا۔ ”کیا تم کسی تکلیف میں ہو؟“

”ہاں واٹس روم میں ہوں۔“

وہ ناگواری سے بولی۔ ”یونان سنس کیا ایسے وقت مجھ سے بات کر رہے ہو؟“

”مجھوری ہے۔ دشمنوں نے اتنا مصروف کر دیا ہے۔ تم سے کیا چھپانا۔ جب ہم بے پور میں چھپے ہوئے تھے۔ یاد کرو وہاں تم میرے ساتھ شاور لیتی تھیں۔ اسی طرح اس وقت بھی میرے تن پر کچھ نہیں ہے۔ ہائے مرینہ! آ جاؤ نا۔“

وہ حقارت سے بولی۔ ”اے بونے...! بالشت بھر کے وجود...! ایک لگ، ہاں کی تمہارے ہونے جا کر کرے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا قد گھٹ جانے سے پیار بھی گھٹ گیا ہے۔ کیا آئندہ میرے ساتھ نہیں رہو گی؟“

”تو ہے کون؟ یہ یونا مراد کیسے بن گیا ہے؟ یہ تو بالکل ہی ناممکن ہے۔ تو مراد علی منگی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”اگر میں ثابت کر دوں تو کیا مجھے گود میں لے کر میرے بچے کی ماں نہیں بنو گی؟“

مرینہ کا دکھ تازہ ہو گیا۔ وہ ہاں بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ اسے پھر سے مراد کی ضرورت تھی لیکن جو مراد آنے والا تھا اس کے گلے لگنے کے لیے اسے گود میں اٹھانا پڑتا۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”کل رات ہڈن نے کہا تھا کہ مراد اس کے سامنے ہے۔ سچ بولو کیا تم نے ہڈن کو گولی ماری تھی یا وہاں اور بھی کوئی تھا؟“

”میں تنہا تھا۔ میں نے ہی اسے گولی ماری تھی۔ جب سے تم مجھے بے پور میں چھوڑ کر گئی ہو، تب سے ہڈن اور اس کے آدمی مجھے مار ڈالنے کے لیے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اس کا قبضہ ہی تمام کر دیا ہے۔“

”کیا تم ثابت کر سکتے ہو کہ تم ہی مراد علی منگی ہو؟“

کیا۔ وہ خند سے بیدار ہو کر جمانی لیتے ہوئے بولا۔ ”سوری اتنی اتمام رات بڑی بھاگ دوڑ رہی۔ اس لیے لمبی تان کر سورا تھا۔“

”چلو میں نے چکا دیا۔ خند تو پوری ہو گئی ہے نا؟“

”ہاں۔ آپ اجازت دیں گی تو شاور لے کر فریش ہو کر آپ سے بات کروں گا۔“

”تم جب بھی بات کرو۔ ابھی یہ سن لو کہ اچانک ہی پورے دیس میں تمہارا نام گونجنے لگا ہے۔ ٹی وی دیکھو۔ اخبار پڑھو۔ تمہیں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ میں نے آج شام کو پریس کانفرنس بلائی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے لوگ بھی آئیں گے۔ میری گھبراہٹ کی اہم عورتیں بھی ہوں گی۔“

”گھبراہٹ کی طرف سے اخبارات اور ٹی وی کو بیان دیا جائے گا کہ تم مراد علی منگی نہیں ہو۔ تمہیں پاکستانی جاسوس نہ سمجھا جائے اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کہنے کے لیے تم... سے مینٹگ ضروری ہے۔ تم نہادھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں ٹھیک دو بجے گاڑی لے کر آؤں گی اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ اپنا پتا بتاؤ۔“

کبڑی نے کہا۔ ”میرا جگری دوست ایمان علی بھی ساتھ رہے گا۔ آپ ڈاکٹر منی من کے ٹھیک میں دو۔ بجے آ جائیں۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ مراد سو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ”تم ہاتھ روم سے آ جاؤ گے تو میں جاؤں گا۔“

اس نے کہا۔ ”دو بجے اتنی آنے والی ہیں۔ واقعی ایک ماں ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ تم پر سے لیتی مجھ پر سے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تم کرنا چاہتی ہیں۔“

”یار! مرینہ کل سے ہمارے فون کے انتظار میں سلگ رہی ہو گی۔ میں نے جیسا تمہیں سمجھایا ہے اسی طرح اس سے دو باتیں کر لو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“

وہ ہاتھ روم میں جاتے ہوئے بولا۔ ”آل رائنٹ میں ابھی اسے کال کر رہا ہوں۔“

اس نے ہاتھ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون پر مرینہ کے نمبر شیخ کر کے اپنا لباس اتارنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد واٹس ایپ کے آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔ کون؟“

وہ فون کے پاس آ کر بولا۔ ”میں ہوں تمہارا مراد۔“

وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”تم مراد کیسے ہو سکتے ہو؟ ہڈن نے پہلے ڈائریکٹر جنرل سے کہا تھا کہ اس نے ایک بونے مراد کو

☆☆☆

جگنی بائی تینوں بیٹیوں کے ساتھ اپنی کار میں آئی۔ مراد اور کبڑی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ اور عبداللہ کبڑی ماں بیٹے بن گئے تھے لیکن اس مراد کے بولنے پر تینوں لڑکیوں کو بہت مایوس کیا تھا۔ ان تینوں نے مراد علی منگلی کے متعلق سنا تھا کہ وہ دسی بدسی مجرموں کے ساتھ تباہ لڑتا آ رہا ہے اور دشمنوں کو نرک میں پہنچا جا جا رہا ہے۔ ایسی دلیری اور جان بازی کی باتیں لڑکیوں کو متاثر کرتی ہیں۔ ٹینا اور شا اور ڈولی تینوں نے اسے اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا اور اس آئیڈیل نے اپنا قد گھٹا کر ان تینوں کے عشق کو اور ان کے جوش جذبوں کو گھٹا کے خاک میں ملا دیا تھا۔ اب وہ پٹری بدل کر ایمان علی کی پٹری پر آ رہی تھیں۔ وہ اپنے چہرے، اپنے قد اور جسامت کے اعتبار سے بہت ہی خوبصورت تھا۔ دیکھنے والیاں اس کی طرف کھنچی جاتی تھیں۔ اس وقت وہ ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھا تھا، وہاں ورشا آ کر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ٹینا نے اس کے سامنے آ کر ذرا تن کر کہا۔ "ورشا! میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھے یہاں بیٹھنے دو۔"

ورشا نے کہا۔ "اس صوفے پر چھوٹی بڑی عمر کا حساب نہیں لگایا ہے۔ تم یہاں بیٹھ سکتی ہو۔"

ڈولی نے کہا۔ "یہ ورشا بڑی چالاک ہے۔ جس پر چاہتی ہے اپنا قبضہ بجا کر بیٹھ جاتی ہے۔" پھر وہ مراد کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "ایمان! چلو تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔"

ٹینا نے مراد کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہ کسی کے پاس نہیں میرے پاس بیٹھیں گے۔"

ورشا اٹھ کر صوفے پر گھٹنے ٹیک کر مراد سے لپٹ گئی۔ پھر بولی۔ "میں بھی دیکھتی ہوں کس میں ہم ہے۔ میرے ایمان کو کون یہاں سے لے جائے گا۔"

جگنی بائی یہ تماشا دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ بڑے پیار سے بڑی ممتا سے کہہ رہی تھی۔ "ان لڑکیوں کا بچپنا نہیں جاتا۔ جب دیکھو بچوں کی طرح لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔"

ورشا تو پہلے لگ کر بیٹھی تھی۔ اب اچھی طرح لپٹ کر مراد کا دل دھڑکا رہی تھی اور ماں اسے ہنسی کہہ رہی تھی۔ پھر وہ بڑے پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ "اے لڑکیو۔ بہت ہو چکا۔ چلو ہوا دھر آ کر بیٹھو۔ ہمیں کام کی باتیں کرنے دو۔"

ماں نے اٹھ کر انہیں بھیج کر وہاں سے ہٹایا پھر ورشا کا کان پکڑ کر کہا۔ "چل چھوڑ ایمان کو۔ ادھر جا میں یہاں

ہے پور میں مراد کو جا کر پکڑے۔ یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ نے میرے اعتماد کو نہیں پہنچایا ہے۔"

"تم بکواس کر رہی ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نے ہڈن کو ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"آپ نہ مائیں۔ اس ایک فلفلی سے ہڈن ڈیجریس ریٹ اور ریڈارٹ والوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ دشمن یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ اور ہڈن میرے وہاں سے آنے کے بعد مراد پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی خفیہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔"

"اسی لیے آپ کو فون پر دھمکی دی گئی۔ لندن پہنچے ہی مجھ پر حملہ کیا گیا اور کل رات ہڈن کو انہوں نے مار کر ہی دم لیا ہے۔ آپ نادان نہیں ہیں۔ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہڈن کے بعد صرف میں ہی نہیں آپ بھی ان کے ڈسٹھ وارنٹ میں ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم جان بوجھ کر مراد کے ساتھ کانٹوں کے بستر پر سونے جا رہی ہو؟"

"آپ کے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اب میں مراد کو وہاں نہیں چھوڑوں گی، اسے یہاں لے آؤں گی۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"اس شرط پر لاؤں گی کہ آپ پچاس لاکھ حاصل کرنے کی جلدی نہیں کریں گے۔ میرے ماں بٹنے کا انتھار کریں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک اس کے بچے کی ماں نہیں ہوگی، ہم اس کے سر کی قیمت وصول نہیں کریں گے۔ تم کسی بھی جہلی فلائٹ سے انڈیا چلی جاؤ۔ میں ابھی نکل اؤ کے کرتا ہوں۔"

وہ فون بند کر کے زیر لب بولی۔ "وہ میرا قد آور مراد ہوگا۔ تب اسے پیار سے لاؤں گی۔ بونا ہوگا تو ایسا ہاتھ ماروں گی کہ کھڑے کھڑے زمین میں دھنس جائے گا۔"

اس نے تصور میں قد آور مراد کو دیکھا پھر اس کے نمبر بیچ کیے۔ دل کہہ رہا تھا کہ وہ اس بار قد آور کی آواز سنے گی لیکن دوسری طرف سے شپ چل رہا تھا۔ ایک ٹریلی آواز بہ رہی تھی کہ کسی وجہ سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔

اس نے آدھے گھنٹے بعد کال کی پھر وہی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کبھی بونا کوئی بھی ہو سہم بدل کر بولتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈائریکٹر جنرل نے اسے فون پر کہا کہ اسے دوسرے دن صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے جانا ہے۔ ان کی سیٹ اؤ کے ہو گئی ہے۔

رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں گھٹ رہا تھا۔ پہاڑ کو تصور میں تنکا بنانے سے وہ تنکا نہیں بن جاتا۔ مراد قد میں بلند و بالا تھا اور اس کے حواس پر چھار ہا تھا۔

وہ زیر لب بڑبڑائی۔ "نہیں۔ وہ بونا کوئی بہرہویا ہے۔ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے مراد کا ہم شکل بن گیا ہے۔"

"اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا پھر اصلی مراد کہاں ہے؟"

اس نے ذہانت سے سوچا۔ وہ چہرہ بدل کر چھپا ہوا ہے۔ ایک بولنے کے ذریعے دشمنوں کو دھوکا دے رہا ہے۔ وہ مٹھیاں سمجھ کر بڑبڑائی۔ "میں جاؤں گی اور اس بولنے کی گردن دبوچ کر اصل مراد کو سامنے آنے پر مجبور کروں گی۔ وہ سچ نہیں اگلے گا تو اسے گولی مار دوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی کہ انڈیا پہنچ کر کس طرح محتاط رہنا تھا۔ محتاط رہنے کے لیے لازمی تھا کہ مراد پر ہمہ رسا نہ کرے۔

اگر وہ قد آور مراد سامنے آئے گا، اس سے دوکتی رکھے گا تو اس کے بچے کی ماں بننے تک نہ اسے نقصان پہنچائے گی، نہ کسی کو پہنچائے دے گی اور اگر یہ درست ثابت ہوگا کہ کسی تاہترک مہاراج نے اسے بونا بنا دیا ہے تو وہ اس بالشت بھر کے مراد کے بچے کی ماں بن کر نہیں رہے گی۔ اس کی کپڑے کو اپنے وجود پر پھینکنے ہی نہیں دے گی، اسے گولی مار کے پچاس لاکھ ڈالر وصول کر لے گی۔ اس نے ڈائریکٹر جنرل جان اتھوٹی سے فون پر کہا۔ "میرا میں ایک ہفتے کی چھٹی چاہتی ہوں۔"

جان اتھوٹی نے مسکرا کر بڑے یقین سے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ انڈیا جاؤ گی۔ مراد کے پاس۔"

"آپ صرف مراد کے حوالے سے کیوں بول رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا ایک سیکرٹ ایجنٹ ہڈن مارا گیا ہے۔ میں اس کے قاتلوں کو پکڑنے جا رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "ہڈن کی ہلاکت کے سلسلے میں وہاں ہمارے جاسوس تحقیقات کر رہے ہیں۔ تمہیں ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جانے کو نہیں کہا گیا ہے اور نہ ہی میں کہوں گا۔ اب سچ بول دو انڈیا کیوں جاؤ گی؟"

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی فلفلی درست کرنے جاؤں گی۔"

وہ غصے سے بولا۔ "کیا یک رہی ہو؟"

"آپ نے مجھے بے خبر رکھ کر ہڈن کو حکم دیا تھا کہ وہ

"ہاں تمہیں یقین کرنا چاہیے۔ ایک تاہترک مہاراج نے مجھ سے ناراض ہو کر مجھے پورے سے آدھا کر دیا ہے۔"

وہ اسے بتانے لگا کہ شمشان گھاٹ میں تاہترک مہاراج کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بولی۔ "میں مانتی ہوں۔ جادو ٹونے کے ذریعے عجیب بیبت ناک تماشے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں مانوں گی کہ کسی مہاراج نے تمہیں پھونک مار کر بونا بنا دیا ہے۔"

"پھر تم کیسے یقین کرو گی کہ میں تمہارا مراد ہوں؟"

وہ بولی۔ "میری اور مراد کی ایسی پرسنل بات بتاؤ جسے میں اور وہ جانتا ہے۔ کوئی تیسرا جان ہی نہیں سکتا۔"

وہ بولا۔ "رات کو تنہائی میں بند کمرے کے اندر کوئی تیسرا دیکھنے نہیں آتا۔ میں تیسرا نہیں ہوں۔ تمہارے ایک ایک انداز کو بیان کر رہا ہوں۔"

وہ بیان کرنے لگا تو مرینہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ایسی باتیں بتا رہا تھا جسے وہ جانتی تھی اور صرف مراد جانتا تھا۔

بولنے نے پوچھا۔ "کیا ہوا پچ کیوں ہو گئیں؟ مجھ سے اور کوئی سوال کرنا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "ہماری دنیا میں بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ مجھے آتا ہی ہوگا۔ تمہیں آنکھوں سے دیکھنا ہی ہوگا۔"

"آنے سے پہلے یہ اچھی طرح سن لو۔ میں نے اب تک کسی کے سامنے اعتراف نہیں کیا ہے کہ میں مراد ہوں۔ یہاں میرے حمایتی مجھے ایک سیدھی سادی سی زندگی گزارنے والا بونا ثابت کرنے والے ہیں۔"

"یہ راز صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ تم وہاں کسی سے یہ بول کر نہیں آؤ گی کہ ایک بولنے مراد سے ملنے جا رہی ہو۔ یہ کہو گی کہ تمہارا مراد بونا ہو ہی نہیں سکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم جانے انجانے میں دشمنوں کو ساتھ لگا کر نہیں آؤ گی۔"

"مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں کہ مجھے کس طرح محتاط رہ کر وہاں آنا چاہیے۔ اپنا ہاتھ اتارو۔"

"جب یہاں انر پورٹ کے باہر آؤ گی تو بتاؤں گا۔ تم بتاؤ کب آ رہی ہو؟"

"میں نکل اؤ کے کرانے کے بعد بتاؤں گی۔" ان کا رابطہ ختم ہو گیا۔

مرینہ خاموش فون کو ہاتھ میں لیے مراد کو تصور میں دیکھ رہی تھی اور دیکھنے کے دوران میں بار بار اس کا قد گھٹتا

کبڑی تھا۔ پیچھے دو ہینس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک گن مین نے کہا۔ ”تم نے پریس کانفرنس بلائی ہے۔ کیا ارادہ ہے اس یونے مراد کو قانونی طور پر سیکورٹی دینے کی باتیں کرنے والی ہو؟“ وہ بولی۔ ”ہاں۔ کیا مجھے یہ نیک کام نہیں کرنا چاہیے؟“ ”ضرور کرو۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہ یونائی اصل مراد علی منگی ہے۔ پتا نہیں کس طرح یونائی بن کر ہمیں الجھا رہا ہے۔“ کبڑی نے کہا۔ ”میں مراد کا ہم شکل ہو کر مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ میں باہر آ رہا ہوں مجھے ابھی طرح دیکھ لو۔ میں نے زندگی میں بھی بندوق نہیں پکڑی۔ مراد علی منگی کیسے بن جاؤں گا۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ گویا سپاہی میدان میں اتر آیا۔ ایک گن مین نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہماری گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تمہیں لے جا کر تمہاری اصلیت معلوم کریں گے۔“ اسی وقت فائرنگ کی آواز کے ساتھ گن مین کے حلق سے کراہ نکلی، اس کے ہاتھ سے گن نکل گئی۔ وہ لاکھڑا ہوا پیچھے گیا۔ مراد انہیں ہانک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قانون کے رکھوالے آ کر ان سے منسنے والے تھے۔ دوسرا گن مین مٹھی جگہ سے بھاگ کر کہیں چھپ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ گولی کہاں سے چلائی گئی ہے۔ کبڑی نے اچھل کر اس کی ناک پر ایک لات ماری تو اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ اسی لمحے میں درشانے ایک گولی ٹھونک دی۔ لڑکیاں بڑی تیز تھیں۔ جتنی بائی نے اچھی ٹریننگ دی تھی۔ کار کے پچھلے حصے میں بیٹھی ہوئی مینا اور ڈولی دروازے کھول کر چھٹائیں لگاتی ہوئی دشمنوں کے پاس آئیں۔ وہ پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے دو چار ٹھوکریں ماریں تو وہ زمین پر ہی پڑے رہ گئے۔ پھر ہر طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ اب انہیں ڈر نہیں لگ رہا تھا کیونکہ گولیاں چلانے والے قابو میں آ گئے تھے۔ پولیس کی ایک گاڑی سائرن بجاتی ہوئی آ گئی۔ جتنی بائی کو سب ہی جانتے تھے۔ کتنی پولیس کے افسر نے پوچھا۔ ”مائی! انہوں نے آپ پر ایک کیوں کیا تھا؟“ وہ بولی۔ ”آپ انہیں لے جائیں۔ میری پریس کانفرنس کا وقت ہو گیا ہے۔ میں دو چار گھنٹے بعد تھانے آ کر بیان دوں گی یا ہو سکے تو آپ پریس کانفرنس میں آ جائیں۔“

پھر وہ مراد سے بولی۔ ”بیٹے! ہم چھوٹی سی گاڑی میں ایزی ہو کر بیٹھیں گے تم درشا کو اپنی بائیک پر لے چلو۔“ وہ جواب سے بغیر کبڑی اور دو ہینسوں کے ساتھ کار میں جا کر بیٹھ گئی۔ مراد نے پریشان ہو کر درشا کو دیکھا۔ وہ جیسے بائیک پر نہیں اس کے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ایک بات تمہیں سمجھا دوں کہ میں لڑکیوں سے دوستی نہیں کرتا۔“ وہ بولی۔ ”میں بھی کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ دوستی تو ہوتے ہوتے ہو جاتی ہے۔“ کار آگے چل پڑی تھی۔ اس نے گل مار کر بائیک اشارت کرتے ہوئے سوچا۔ ایک گل اسے ماروں گا تو پیچھے لگ کر بیٹھنا بھول جائے گی۔ وہ بولا۔ ”پلیز ڈرائنگ ہو کر بیٹھو۔“ یہ کہہ کر اس نے بائیک آگے بڑھائی تو وہ جھٹکا کھا کر اس سے لپٹ گئی۔ ”ہائے میں کیا کروں؟ تمہیں کس کے نہیں پکڑوں گی تو گر پڑوں گی۔“ اس نے تو اچھی طرح کس لیا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور گر پڑو۔ بلائیں اسی طرح نازل ہوتی ہیں۔ بائیک تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ آگے ڈیمبر کی سرد ہوا آگئیں تھیں۔ پیچھے جون جوٹائی کی گرمی تھی۔ عجیب موسم تھا۔ دو خاتم موسم بیک وقت حملہ کر رہے تھے۔ درشا کے سن کو اور اس کی صحت مندی کو متعارف کر رہے تھے۔ وہ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”یا اللہ! اس سے پہلے کہ میں ڈنگاؤں یہ گاڑی ڈنگا جائے۔ مجھے یہ نظر آ رہا ہے کوئی حادثہ ہو گا تب ہی یہ لگ ہوگی۔“ اس کی دعا قبول ہو گئی۔ حادثہ تو نہیں ہوا۔ کچھ اور ہو گیا۔ آگے جانے والی کار رک گئی تھی۔ وہ خود نہیں رک گئی۔ اسے دو گن بیٹھوں نے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ مراد ان سے کچھ دور تھا۔ اس نے اپنی گاڑی روک کر درشا سے کہا۔ ”نور! کسی دکان میں جا کر چھپ جاؤ۔ تم دیکھ رہی ہو لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ابھی گولیاں چلتے والی ہیں۔“ وہ اپنے بیٹی کوٹ سے ایک پستول نکالتے ہوئے بولی۔ ”ماتا جی نے ہمیں بھاگنے اور چھپنے کی نہیں مقابلہ کرنے کی تربیت دی ہے۔“ مراد نے مسکرا کر اپنا رولور نکال لیا۔ ادھر دو گن مین کار کی آگے دو کھڑکیوں پر آ کر جھک کر اندر دیکھ رہے تھے۔ جتنی بائی ڈرائیونگ سیٹ پر تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر عبداللہ

مراد نے کہا۔ ”تم اسے بیچاری کہہ رہے ہو؟ پتا نہیں وہ کیسی آفت ڈھانے آ رہی ہے۔ میں اپنے طور پر کچھ رہا ہوں کہ وہ کیا سوچ کر آ رہی ہے اور کیا کرنے والی ہے؟ بہر حال میں ابھی اس سے بات کروں گا۔“ رابطہ ختم ہو گیا۔ جتنی بائی نے پوچھا۔ ”یہ کون بے چاری ہے جو آفت ڈھانے آ رہی ہے؟“ کبڑی نے کہا۔ ”اس کا نام مرینہ ہے۔ یہ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے اور مجھ پر وار بھی کرتی ہے۔ میرے ذریعے پچاس لاکھ ڈالر حاصل کرنے آ رہی ہے۔“ وہ بولی۔ ”تمہو ہے اس پر۔ یہاں آ تو جائے ہم عورتیں اس کا جینا حرام کر دیں گی۔“ کبڑی نے کہا۔ ”نہیں اتنی! میں اس عورت سے تمہا غمنا چاہتا ہوں۔ کسی ایسی جگہ اس سے ملنا چاہتا ہوں جہاں کسی کی مداخلت کے بغیر اس سے نمٹ سکوں۔“ ”اس شہر کے باہر ہمارا ایک فارم ہاؤس ہے، وہاں تم اس بلا سے نمٹ سکو گے۔“ مراد نے خوش ہو کر کہا۔ ”اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔ آپ کا یہ بیٹا مراد کل ہی اسے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دے گا یا ہمیشہ کے لیے غمنا کر دے گا۔“ ”وہ خطرناک بلا ہے تو اسے ختم کیا کرو۔“ ”وہ بڑی عجیب بلا ہے۔ ابھی ہم فیصلہ کریں گے کہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا جائے گا۔“ مینا نے کہا۔ ”ماتا جی! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ دو گھنٹے بعد کانفرنس شروع ہونے والی ہے۔“ ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں چلو۔“ ڈولی نے کہا۔ ”ہم سب ایک کار میں کیسے سامنے گے؟ ہم چار ماں بیٹیاں ہیں اور یہ دو مرد ہیں۔“ مراد نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ یہ مراد تم لوگوں کے ساتھ کار میں بیٹھے گا۔ میں پیچھے پیچھے موٹر سائیکل پر آؤں گا۔“ درشا یہ سنتے ہی باہر چلی گئی۔ جب وہ سب باہر آئے تو انہوں نے دیکھا، وہ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر قبضہ بنائے بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ ”میں کار میں تنگ ہو کر نہیں بیٹھوں گی۔ اس بائیک پر ہوا کھاتی ہوئی جاؤں گی۔“ مینا نے غصے سے کہا۔ ”دیکھو ماتا جی! یہ کتنی چالاک ہے۔ ہم سے پہلے یہاں آ کر بیٹھ گئی ہے۔“ ماں نے کہا۔ ”میں نے تم سب کو سمجھا یا ہے جو چالاک ہوتے ہیں وہ بازی مار لیتے ہیں۔ باقی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔“

بیٹھوں گی۔“ وہ بیٹی کو ہٹا کر مراد کے پاس بیٹھ گئی۔ یوں اس ماحول میں جو لچل پیدا ہو گئی تھی وہ ختم ہو گئی۔ وہ جتنی بائی سے بولا۔ ”صرف آپ یہ راز جانتی ہیں کہ یہ عبداللہ کبڑی نہیں ہے مراد علی منگی ہے۔ ایم این اے دھرم داس بھی ہماری بہتری چاہتے ہیں۔ انہوں نے فون پر کہا ہے کہ وہ مراد کو کل قانون کے اعلیٰ محافظوں کے پاس لے جائیں گے۔ انہیں یقین دلا دیں گے کہ یہ مراد نہیں ہے۔ یہ بے چارہ سونامی سے تباہ و برباد ہو جانے والا ایک مظلوم یونائی ہے۔“ کبڑی نے کہا۔ ”میں بیان دوں گا کہ پچھلے برس جو سونامی آیا تھا، اس میں میرا پورا خاندان نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اس سمندری طوفان کے وقت میں ناگپور میں تھا۔ اس لیے ابھی زندہ سلامت نظر آ رہا ہوں۔“ مراد نے کہا۔ ”کوئی اس کے بیان کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ اس کے ماں باپ اور رشتے دار اور دوست یا دشمن سچ بولنے کے لیے اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ جتنی بائی نے کبڑی سے کہا۔ ”مراد! تم یہی بیان ابھی پریس کانفرنس میں دو گے۔ ہم عورتیں تمہاری تائید کریں گی اور بولیں گی کہ تم دنیا میں تباہ ہو گئے ہو۔ مگر مگر گوم کر کھیل تماشے کرتے ہو۔ اچھا کھاتے کھاتے ہو اور اب۔۔۔ گھبراہٹوں کی چھتر چھاپا میں پناہ لینے آ گئے ہو۔“ وہ سوچ سمجھ کر پاننگ کر رہے تھے۔ یہ طے کر رہے تھے کہ انہیں دنیا والوں سے آئندہ کیا کہنا ہے اور کس طرح قانون کے محافظوں کا اعتماد حاصل کر کے جلد ہی یہاں سے پاکستان جانا ہے۔ مراد کے فون سے رنگ نون ابھرنے لگی۔ اس نے مٹن دھا کر فون کو کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے چیت راؤ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟ اپنی سم بدل دی ہے۔ مجھے یہ نیا نمبر دھرم داس نے دیا ہے۔“ مراد نے کہا۔ ”سوری میں مصروفیات کے باعث نیا نمبر دینا بھول گیا تھا۔ یہ بتاؤ کیسے فون کیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”مرینہ تم سے رابطہ کرنے کے لیے مچل رہی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے بے چین ہے کہ کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے آ رہی ہے۔ یہاں دلی شام چار بجے تک پہنچے گی۔“ پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”کیوں اسے تڑپا رہے ہو؟ بے چاری سے دو باتیں کر لو۔“



پہلے آئیے

منظر امام

عجب دستور ہے جاہے آپ حقدار ہوں یا نہیں، بس پہلے آئیے، پہلے پانی کے اصول کے مطابق مطلوبہ چیز آپ کے حصے میں آجاتی ہے۔ یہی ضم اس کے لیے کسی ناسور سے کم نہ تھا جس کی آرزو میں وہ زندگی کے دن کم کر رہا تھا وہی کسی اور کی تمنا بن کر اس سے دور ہو گئی تھی فقط اسی عجب دستور کے مطابق۔

وقت کو کارآمد کرنے والے ایک بے وقوف

عاشق کا اگلا سفر

آپ نے فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا۔
 بیرو اور بیرون ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے
 تاب رہتے ہیں لیکن عالم سماج دیوار بن کر دونوں کے درمیان
 کھڑا ہو جاتا ہے پھر بیرو دعا مانگنے کی مزار پر پہنچ جاتا ہے۔
 تو ابی ہو رہی ہوتی ہے جو پانچ چھ منٹ تک جاری رہتی ہے۔
 بیرو اس دوران میں آنکھیں بند کیے کوئی دعا مانگ رہا ہے۔
 تو ابی ختم ہونے پر جب آنکھ کھولتا ہے تو بیرون
 سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔
 اس قسم کے سین ہر قسم میں ہوا کرتے ہیں جب فلمی
 راشر کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں کو کس طرح ملوایا جائے تو
 وہ تو ابی اور مزار کا سہارا لیتا ہے۔
 یہاں تک ابی جوانی کی بات ہے۔
 میں ایک لڑکی کے عشق میں پری طرح گرفتار ہو گیا
 تھا۔ وہ بہت شوخ قسم کی لڑکی تھی لیکن مٹی خوبصورت ویسے یہ

ہی رومانک جگہ ہے۔ وہاں کوئی روکتا توکتا نہیں ہے۔ ہمیں
 بڑی آزادی ہوگی۔
 مراد نے مسکرا کر کہا۔ ”تم بڑی وہ ہو۔ چلو اندر
 جاؤ۔ پارکنگ ایریا میں گاڑی کا ٹوکن لے کر آتا ہوں۔“
 اس نے جواب سے بغیر بائیک آگے بڑھائی۔ ڈولی
 کھڑی ہوئی تھی، ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”پارکنگ ادھر ہے ادھر
 کہاں جا رہے ہو؟ سنو تو۔ ارے کہاں جا رہے ہو؟“
 وہ رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے دیدے حسرت سے
 پھیل گئے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سستی میں ڈوبے
 ہوئے شباب کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ تمام راستے بھرے
 بھرے بدن کا تعارف پیش کرتی آرہی تھی۔ وہ پھر بھی نہیں
 پھلکا تھا۔

مراد نے ایک جگہ موٹر سائیکل روکی پھر فون پر جگنی
 بائی سے کہا۔ ”آپ کی بیٹیاں بڑی شوخ اور پھیل
 ہیں۔ آپ نے ورشا کو دیکھا تھا۔ اس نے کیسے میری بائیک
 پر قبضہ جایا تھا۔“
 جگنی بائی ہنستے ہوئے بولی۔ ”نادان ہیں۔ ابھی ان
 کے ہنسنے کھینچنے کی عمر ہے۔“

”جی ہاں۔ ڈولی ہنستے کھینچتے ہوئے مجھے راستے سے
 ہٹا کر ایک پارک میں لے گئی تھی۔ یہاں وہ جی نہیں چلا
 رہی تھی جبکہ مجھے کانفرنس اینڈ کرینی تھی۔“

”میں ابھی ڈولی کے کان پکڑتی ہوں۔ فون اسے دو۔“
 ”میں اسے پارک کے سامنے چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔“
 ”یہ تم نے بہت ہی اچھا کیا۔ ابھی نادان ہے۔“
 ”اسی سزا ملے گی تو محفل آئے گی۔“

”وہ بچی تو راستہ جاتی ہے۔ یہ بچہ نہیں جانتا۔ یہاں
 اندر روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔“

”انتظار کرو۔ پریشان نہ ہونا۔ ابھی کسی کو بھیج رہی
 ہوں۔ وہ تمہیں یہاں لے آئے گا۔“

وہ انتظار کرنے لگا۔ اس نے صبح کے بعد پھر ماروی
 سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ حالات اتنی فرصت ہی نہیں دے رہے
 تھے۔ وہاں فٹ پاتھ پر ٹریفک کے شور میں بات کرنا
 مناسب نہیں تھا لیکن دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسے یاد
 کرتے ہی رنگ ٹون بڑے پیار سے گتکتانے لگی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
 سنسنی خیز کرداریں ایام کی دلچسپ داستان
 کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

سای زخمی ہونے والے مجرموں کو اٹھا کر اپنی گاڑی
 میں ڈالنے لگے۔ بھیڑ چھٹنے لگی۔ جگنی بائی مراد اور کھڑی
 اپنی گاڑیوں کی طرف آئے تو ورشا ٹھٹک گئی۔ ڈولی اس
 سے پہلے آکر موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ مراد نے
 پریشان ہو کر کہا۔ ”یک نہ خد دو خد۔ دل میں ہو رہی ہے
 گھد بڈ۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔“
 ورشا نے پاؤں جھٹکتے ہوئے آکر کہا۔ ”ڈولی! ہٹو
 یہاں سے۔ یہ میری جگہ ہے۔“

ڈولی نے کہا۔ ”حکومت کرنے والے گدی چھوڑتے
 ہیں تو دوسری حکومت آکر بیٹھ جاتی ہے۔ آئی چیئنگ یو... تم
 مجھے یہاں سے ہلانے سکوگی۔“

ماں نے اپنی کار کے پاس سے آواز دی۔ ”ورشا!
 یہاں آ کر بیٹھو۔ تماشا نہ کرو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

ورشا نے حسرت سے مراد کو دیکھا۔ پھر ہنسنے سے
 پاؤں ہٹتی ہوئی کار میں بیٹھنے چلی گئی۔ کار اور موٹر سائیکل کا
 قافلہ وہاں سے چل پڑا۔ مراد نے نگ مار کر بڑی سہولت
 سے بڑے آرام سے بائیک آگے بڑھائی۔ پھر بھی وہ جھٹکا
 کھا کر اس سے لپٹ کر بولی۔ ”کیسی لگتی ہوں؟“

وہ مٹھائی سے کیا بولے کہ بہت مٹھی ہو۔ مٹھا مٹیس
 سے کیا بولو۔ لے کر کھینچ رہی ہو۔ ایسے لمحات میں تو بڑے بڑے
 پارسا اپنی تو بہت بڑے دیتے ہیں۔ وہ بہت ہی ملائم اور رس بھری
 تھی۔ تو یہ کرنے کے باوجود مراد کے ہوش اڑ رہے تھے۔

جی میں آ رہا تھا گاڑی کو کہیں نکرا ہی دے۔ تب ہی نجات
 ملے گی۔ ویسے ایمان کی بات ہے۔ خدا اگر بچاتا ہے تو پہلے
 اپنے بندوں کی پارسانی کو آزماتا بھی ہے۔ مرینہ
 مونیکا پریمینا لیز اور شا اور اب ڈولی وہ ہر آزمائشی مرحلے
 سے پارسانی کا بھرم رکھتا آ رہا تھا۔

آگے ٹریفک کا اتنا جھوم تھا کہ جگنی بائی کی کار دور تک
 دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مراد نے پوچھا۔ ”وہ اس پورا ہے
 سے دائیں گئے ہیں یا بائیں یا ہمیں سیدھا جانا ہوگا؟“

ڈولی نے کہا۔ ”بائیں طرف چلو۔“
 وہ ادھر چل پڑا۔ آگے گاڑیاں کم تھیں۔ راستہ صاف

تھا لیکن ان کی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے سڑک
 کے کنارے رک کر کہا۔ ”وہ کدھر گئے ہیں؟“

ڈولی ہنستے ہوئے بولی۔ ”انہیں تو کانفرنس اینڈ کرنا
 تھی۔ ہم وہاں جا کر کیا کریں گے۔ دیکھو ہم ٹھیک پارک
 کے پاس آ کر رکے ہیں۔ بڑا خوبصورت پارک ہے۔ کئی
 جگہ جھاڑیوں کے درمیان لو اسپاٹ بنائے گئے ہیں۔ بہت

بھی ہر کہانی کا اپنا ایک خاص رنگ ہے کہ لوگ خوبصورت لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی کسی کہانی میں یہ نہیں پڑھا ہوگا کہ وہ بہت بد صورت لڑکی تھی اور میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔

بہر حال، میں جس لڑکی سے محبت کرنے لگا تھا، اس کا نام صفیہ تھا اور وہ ایک ایسے گھر میں رہتی تھی جس میں اس کے ماں باپ کے علاوہ چار عدد پہلوان قسم کے بھائی بھی تھے۔

اسی لیے یہ سوچنا فضول تھا کہ میں ہمت کر کے اس سے اپنی پسند کا اظہار کروں گا۔ البتہ دوسری قسم کے طریقے آزمائے جاسکتے تھے۔ جیسے کوئی وظیفہ پڑھ لیا، پھر تائزم کی کوشش میں اپنی آنکھیں بردار کر لیں یا کسی قدر فقیر کی خوشامد شروع کر دی کہ وہ محبت کے لیے راستے آسان کر دے یا آخر میں مایوس ہو کر کسی مزار پر پہنچ گئے۔

میرا ایک دوست تھا بابر علی۔ میں اس قسم کے اچھے بونے معاملات میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ میں نے بابر علی سے کہا: ”یازدیں صفیہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”کون صفیہ؟“

”ارے وہی، زمان صاحب کی بیٹی جس کے چار عدد باڈی بلڈر بھائی ہیں۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن اس سے تو میں بھی محبت کرنے لگا ہوں۔“

بابر نے بتایا۔

”تو پھر فیصلہ کر لو۔“

”ہاں کر لو فیصلہ۔“

ہمارا ایک خاص طریقہ تھا۔ ہم بے شمار معاملات میں اس قسم کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ یعنی فرض کریں ہوٹل میں چائے ہی بیٹی ہے اب کون پلائے؟ اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا کہ ہم دونوں اپنے اپنے گھر سے قریبی ہوٹل تک کا فاصلہ قدموں سے ناپ لیا کرتے جس کا گھر پانچ قدم نزدیک ہوتا اسے چائے پلائی پڑتی تھی۔

اس معاملے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ میرا گھر اس لڑکی کے گھر سے سو قدم زیادہ قریب تھا۔ نسبت بابر علی کے گھر سے۔ اس لیے بڑی ایمانداری اور سچائی کے ساتھ فیصلہ ہو گیا کہ اس لڑکی سے محبت کرنے کا حق میرا ہے، بابر کا نہیں۔

چلیں حق تو مان لیا گیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح؟

تو بابر علی نے مزار پر جانے کی ترکیب بتائی۔ اس نے کہا تھا کہ ویسے تو کہانیوں وغیرہ میں مزار کو آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن چونکہ تمہارے پاس وقت نہیں ہوگا اس لیے مزار ہی سے آغاز کرو۔

اور ہم دونوں مزار پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے بابر علی سے کہا۔ ”دیکھو بھائی! ایسا نہ ہو کہ تم اپنے لیے دعا مانگنا شروع کر دو ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”نہیں یازدیں جب میں پیچھے ہٹ گیا ہوں تو پھر کیوں مانگوں گا؟“

اور میں نے بہت خشوع و خضوع کے ساتھ آنکھیں بند کر کے دعا مانگنا شروع کر دی۔ میرا خیال تھا کہ آنکھیں کھولنے کے بعد اس حسین چہرے کو دیکھنے کا موقع ملے گا لیکن جب اس کے بجائے مجاہدوں کی صورت دکھائی دی تو میں بد دل ہو گیا۔

”یازدیں کیوں کرتا ہے؟“ بابر علی نے تسلی دی۔ ”اب اتنی جلدی تو دعا قبول نہیں ہوگی کچھ صبر تو کرنا پڑے گا۔“

بہر حال تین چار دنوں کے بعد اتنا ہوا کہ صفیہ نے مجھے مسکرا کر دیکھ لیا۔

لیکن پھر ایک ہفتہ اور گزر گیا جب کچھ بھی نہیں ہوا تو میں نے بابر علی سے پوچھا۔ ”یازدیں مسئلہ ہے وہ ابھی تک میری طرف راغب کیوں نہیں ہوئی حالانکہ میں نے بہت زبردست دعا مانگی تھی۔“

”یارے! تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ راغب ہو چکی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے پریشان ہو کر بابر علی کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہاری طرف راغب ہو چکی ہے؟“

”میری ایسی قسمت کہاں؟“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”وہ اپنے ٹیوٹر کی طرف راغب ہو چکی ہے۔“

”ٹیوٹر؟“

”ہاں تم نے شاید دھیان نہیں دیا ایک ٹیوٹر اسے پڑھانے کے لیے آتا ہے۔“

”تو اس سے کیا ہوا وہ تو ٹیوٹر ہی ہو گا نا؟“

”یہی تو اصل کہانی ہے، وہ صرف ٹیوٹر نہیں ہے بلکہ میں ان دونوں کو اس ایک ہفتے میں کئی بار باہر نکلے ہوئے بھی دیکھ چکا ہوں۔“

”یہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”اس لیے نہیں بتایا کہ تمہارا دل ٹوٹ جاتا۔“

”تو اب کون سا سلامت رہ گیا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اچھا خاصا گھپلا ہو گیا ہے۔ دعائیں ہم مانگیں اور بہاریں غیر لوٹیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک بار پھر مزار پر جاؤں گا اور شکایت کروں گا کہ میرے ساتھ ایسی نا انصافی کیوں ہوئی؟“

میں بابر علی کے ساتھ مزار پر پہنچ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے بہت شکوے کیے۔ ”جناب! آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے میرے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ میں نے اتنی دعائیں مانگیں اور آپ نے اس لڑکی کو محبت کی اور سے کروادی۔ اب بھی وقت ہے اس لڑکی کا رخ میری طرف پھیر دیں ورنہ ایسی کہانیوں اور فلموں سے میرا اعتبار ختم ہو جائے گا۔“

جی بھر کر شکوہ کر لینے کے بعد مجھے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے بابر علی سے کہا۔ ”یار، جانے کیوں آج مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا ہے شاید میرا مسئلہ حل ہونے والا ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو پیارے۔“

لیکن پھر بھی کچھ نہیں ہوا۔ پہلے تو ایک آدھ بار اس لڑکی نے مجھے مسکرا کر دیکھا بھی تھا لیکن اس شکوے کے بعد مسکراتا تو درکنار، اس نے دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میری بے قراری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو حاصل کر کے رہوں گا۔ یہ ٹیوٹر دن ہوتا ہے میری محبت کے راستے میں رکاوٹ بننے والا۔ میں نے ایک بار اس ٹیوٹر کو بھی دیکھ لیا۔ اچھا خاصا

بانکسا لو جوان تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ مجھ سے بہتر تھا لیکن بہتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ میری محبت کو مجھ سے چھین کر لے جائے۔ میں اور بابر علی ایک دن سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ”یازدیں ٹیوٹر کا کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ مت کرو۔ دونوں اپنی محبت میں آگے بڑھ چکے ہیں۔“ بابر علی نے کہا۔ ”اس لیے تم کچھ نہیں کر سکتے۔“

”لیکن یازدیں نے جو مزار پر جا کر اتنی دعائیں مانگی ہیں ان کا کیا ہوگا؟“

”ہوسکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں خلوص نہ ہو۔“

”اب کیسا خلوص چاہیے۔ آنسو تک تو نکل آئے تھے؟“ میں نے بتایا۔

”میرا خیال ہے کہ کسی بات کی کمی رہ گئی ہے۔“ بابر علی کچھ سوچ کر بولا۔ ”تم ایسا کرو مزار پر ایک دیگ خیرات کر دو اور جو لوگ کھانا کھانے آئیں ان سے کہنا کہ تمہارے حق میں دعا کریں تب بات بن جائے گی۔“

”مشورہ تو معقول ہے لیکن دیگ کتنے کی ہوگی؟“

”کم از کم تین سو کی۔“ بابر علی نے بتایا۔ (اس زمانے میں تین سو بہت ہوتے تھے)

”یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“

ماہنامہ سوسائٹی ڈائجسٹ

جاسوسی ڈائجسٹ

سرد موسم کی سرخیزیاں
2014 کے آخری شمارے کی تقریبیں

● بدلہ ہوا زمانہ

زمانے کی سفاکیوں اور خود غرضیوں کی تذکرہ ہوجانے والی زندگی کا زندگی نامہ احمد اقبال کے قلم سے

● آوارہ گرد

دکھ سکھ کے شکر کا تھیلوں کی ایک نالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک کو اپنی حواس کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹو کی شوہریت

● جوازی

احمد اقبال کے شہزاد قلم سے ایک جوازی کے کھیل کے نئے انداز

● مغرب کے نالہ انداز

مغربی دنیا کی تہذیبوں اور ماحول کی عکاس اور محبت کی شہزادہ قاتل لاکھون کی کہانیاں

● سرورق کئی کہانیاں

چوتھ کھایا ہوا انسان سانپ سے زیادہ زہریلا ہو جاتا ہے... ایسی ہی چوٹ کی کاروباری ضرب... سرورق کے رنگ کی جیٹی تڑپ

● دوسری کہانی

خانہ کی گیس کو زہریلا بنا دینا... ایسی بلندی اور ایسی پستی کا سنسنی خیز ماحول



...کتنی... کتنی... کتنی... کتنی...

...کتنی... کتنی... کتنی... کتنی...

...کتنی... کتنی... کتنی... کتنی...

اما ابوالعباس

ضیاء نسیم بلگرامی

زبانوں میں تاثیر اور دعائوں میں اثر بلا جواز نہیں... اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے... اور جو لوگ ان ریاضتوں کو اپناتے ہیں گویا اپنا آرام تہج کر آزماتشوں سے بھرے رستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ آپ کا شمار بھی انہی اولیائے کرام میں ہوتا ہے جو اللہ کی رضا میں راضی رہتے ہیں اور جن کی رضا سے اللہ رب العزت خوش ہوتا ہے۔

راہ حق کی عنایتوں اور کرامتوں کا قصہ



مصر کے مشہور زمانہ صوفی شیخ ابوالحسن شاذلی علم کا سمندر تھے۔ ان کے مریدوں اور ارادت مندوں میں ابوالعباس واحد وہ شخص تھے جنہیں شاذلی کے علم کا وارث قرار دیا گیا۔ شاذلی نے کوئی کتاب بھی نہیں لکھی لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیمات محفوظ ہیں اور جن نعت کا یہ کام احمد ابوالعباس مری نے انجام دیا اور بعد میں انہیں سیدی امام احمد ابوالعباس کہا جانے لگا۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے کسی نے سوال کیا۔

... کہ وہ لڑکی اپنے ٹیوٹر سے محبت کرنے لگی ہے جو اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ دعا میں نے مانگی اور قائمہ کسی اور کو ہو جائے۔

اور اسی وقت کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہی ٹیوٹر میرے پیچھے کھڑا مسک رہا تھا۔ ”تم؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تم آؤ میرے ساتھ۔“ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“

وہ مجھے قبر والے کمرے سے باہر لے آیا۔ احاطے میں اور بھی کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر لے آیا۔ وہ بڑی نفاست سے سجا ہوا کمرہ تھا۔ چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ فرش پر کالیٹن بچھا ہوا تھا۔ گاؤں کی لگے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ”میں نے تمہارا شکوہ تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر سن لیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن تم کیا اسی کمرے میں رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہاں یہ میرا کمرہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس حزر کے جوگراں اور سولی لڑائی میں ان کا کیا ہوا۔“

”لیکن تم تو ٹیوٹر ہو۔“ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک متولی کا بیٹا ٹیوٹر نہیں ہو سکتا! اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارا شکوہ سن لیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ صفیہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ ”ظاہر ہے صاحب حزر سے تمہاری رشتے داری جو نکل آئی ہے۔ وہ تمہارا ساتھ نہیں دیں گے تو کس کا ساتھ دیں گے؟“

”یہ بات نہیں ہے بے وقوف۔ خود اندازہ کر لو، جب میں دن رات یہاں رہتا ہوں تو میں نے اس محبت کے لیے بہت پہلے سے دعا مانگی ہوگی۔ میری درخواست صاحب حزر کے پاس بہت پہلے پہنچی ہوگی۔“

اس کی یہ بات ایک لمحے میں سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہر جگہ پہلے آؤ پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ پھر کیا تھا، میں اٹھا اور دوسری سمت قدم بڑھا دیے۔ اسی لیے شاید اللہ نے اس کائنات میں چاروں جانب رستے ہی رستے بنائے ہیں۔ چاہے جس جانب نکل جاؤ۔

”بھائی تمہارا مسئلہ بھی تو ایسا ہے جتنا گڑباد لوگے اتنا بیٹھا ہوگا۔“ بابر علی نے بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔“ بہر حال کسی نہ کسی طرح میں نے ایک ویگ غریبوں میں تقسیم کر دی۔ دو چار نے تو بہت دل کھول کر دعا میں وی تمہیں جن سے یہ امید ہو گئی تھی کہ شاید میرا کام بن جائے گا۔ وہ ظالم مہربان ہو جائے گی۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ وہ ظالم مہربان ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہوتی چلی گئی۔ خواخواہ بابا کے مزار پر جا کر میں خوار ہوتا رہا یا تو قلموں وغیرہ میں سب جھوٹ دکھاتے ہیں یا پھر کوئی اور بات ہوگی۔

اس لڑکی کا اس ٹیوٹر کے ساتھ چکر چلتا رہا۔ دونوں کو خود میں نے کئی بار ایک ساتھ دیکھا تھا۔ لڑکی اس کے ساتھ چلتے ہوئے جیسے اس پر قربان ہوئے جا رہی تھی۔ بابر علی نے ایک دن مجھ سے کہا۔ ”بھائی میرا مشورہ ہے کہ تم اب اسے بھول جاؤ۔ تم محبت کے معاملے میں زبردستی تو نہیں کر سکتے۔“

”لیکن میں بابا کے مزار پر جا کر شکوہ ضرور کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہوگی کہ اتنی خوشامدوں کے باوجود مجھے کچھ نہ ملے۔“

”تمہاری مرضی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری دعاؤں میں خلوص شامل نہ ہا۔“ ”جو اس مت کرو۔ میری دعا میں سوائے خلوص کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔“

بابر علی نے مجھے منع بھی کیا تھا لیکن میں پھر دوسرے دن مزار پر پہنچ ہی گیا۔ میں صبح کے وقت گیا تھا اس وقت لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ مزار پر سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ مزار کے مجاور اور گھراں حضرات بھی اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ب آواز بلند یوں ناشروع کر دیا۔ ”بابا بہت پریشان اور مایوس ہو کر یہ شکوہ کر رہا ہوں۔ بابا آپ لوگ تو اللہ کے بہت پیارے بندے تھے اسی لیے آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے میں نے آپ کے پاس صفیہ نام کی ایک لڑکی کے لیے دعا کی تھی جس کے باپ کا نام غیاث الدین ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ اس لڑکی سے میری محبت کا بندوبست کروادیں۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔“

”بابا میں نے ہزاروں قلموں میں ایسی صورت حال دیکھی ہے کہ دعا ختم نہیں ہوتی کہ محبوب سامنے آ جاتا ہے لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہو رہا؟ ایک بات اور بتا دوں

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! آپ کو مکالمے میں کیا نظر آیا؟ حالانکہ میں اتنی ہی بات کا اٹناہ گارہوں کہ آج جب میں دربار شاہی سے آ رہا تھا تو میں نے ایک موڑ پر بڑی حسین عورت دیکھی۔ اس کا گدرا یا ہوا شباب اور جسم اور لباس سے اٹھتے ہوئے جوش اور مستی مجھے دعوت عصیان دے رہے تھے۔ اس عالم میں، میں نے بے اختیار خواہش کی اے کاش یہ مجھے مل جاتی اور میں اس کو تصرف میں لاسکتا۔ پھر و مرشد! اگر آپ اس کو بدکاری تصور فرماتے ہیں تو میں واقعی گناہ گارہوں۔“

ابو العباس نے تنبیہ کی۔ ”اول تو اپنی نظریں نیچی رکھا کر اور جب تجھ کو اپنے آپ پر اتنا اختیار ہو جائے کہ خیالات اور تصورات بھی تیرے تابع ہو جائیں، اس وقت سر اٹھا کر چلنے میں کوئی حرج نہیں۔“

کسی مرید نے آپ کو یوں سرگوشی میں باتیں کرتے جو دیکھا تو دوسرے سے کہا۔ ”معلوم نہیں ابو العباس اس شخص کو کیا سمجھا رہے ہیں۔ اگر کوئی اچھی بات بتا رہے ہیں تو اس اچھی بات سے دوسروں کو بھی آشنا کرنا چاہیے اور اگر کوئی بری بات کر رہے ہیں تو بری بات ان کو ذیبت نہیں دیتی۔“

آپ نے اس مرید کو آواز دی۔ ”اے معترض! ذرا میرے پاس تو آ۔“

وہ شخص آپ کے قریب چلا گیا۔ آپ نے کہا۔ ”اے شخص! خدا تجھ کو پسند نہیں کرتا۔ اگر میں دوسروں کے راز کھولنا شروع کروں تو اس مجلس کے کتنے ہی چہرے شرم اور ندامت سے جنگ جائیں گے اور کسی کو مت دکھانے کے لائق نہ رہیں گے۔ خدا سار العیوب ہے۔ خدا نے اپنی یہ صفت اپنے بندوں میں بھی رکھ دی ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر و مرشد! میں اپنی بات پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کر دیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں کیا معاف کروں گا، معاف کرنے والا تو اللہ ہے، اس سے معافی مانگ۔“

اس شخص کے ہاتھ میں بڑی سی پونگی تھی۔ اسے آپ کے سامنے رکھ دیا، بولا۔ ”حضرت! اس وقت میں اس لیے حاضر ہوا تھا کہ آپ کو چند مزے مزے کی چیزیں کھلاؤں۔ آپ اسے قبول فرمائیں اور میرا دل رکھنے کے لیے میرے سامنے ہی اس کو تناول فرمائیں۔“

آپ نے پونگی کھلوائی تو اس میں سے کباب، گوشت، روٹیاں اور کھجوریں نکلیں۔ آپ نے ان چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو قریب موجود لوگوں نے ایک عجیب و غریب، تماشا دیکھا۔ ابو العباس کی پانچوں انگلیاں بچرکے لگیں۔ بالکل ایسا لگا گویا انگلیوں کی ساری ریں تھریں ہوئی ہیں۔

آپ نے کھانے پر سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس شخص سے پوچھا۔ ”میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا! رکھانے سے پہلے میں تجھ سے چند سوال کروں گا۔ تو ان کے صحیح جواب دے گا کیونکہ جو جوابوں میں ہی تیری نجات ہے ورنہ میں تجھ سے دست کشی اختیار کر لوں گا۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”حضرت! میری یہ مجال کہ میں آپ سے غلط بیانی کروں۔ میں اگر جھوٹ بول بھی دوں گا تو آپ اس جھوٹ کا اپنے کشف سے پتا چلائیں گے۔ اس لیے جھوٹ کا قاعدہ؟ آپ جو چاہیں پوچھیں، اللہ نے چاہا تو میں سچ ہی بولوں گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”سچ بتا، کیا یہ کھانا تیرے گھر کا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! سچ بات تو یہ ہے کہ میرے ایک دوست نے میری دعوت کی تھی۔ میں دعوت میں گیا لیکن کھانا نہیں کھایا اور وہ کھانا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اب آپ تناول فرمائیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! اپنا یہ کھانا واپس لے جا کیونکہ درویش مشتبہ کھانا نہیں کھا سکتے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! مشتبہ کھانا کیسا؟ یہ بالکل سچ ہے۔ میں آپ کو کھانے کی پاکیزگی کا یقین کس طرح دلاؤں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر تو اس پر معر ہے کہ میں تیرے میزبان کی قسمی کھول دوں تو سن، تیرا میزبان شراب کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کاروبار کی کمائی مجھ پر اور میرے مشوں پر حرام ہے لیکن تم پوچھ سکتے ہو کہ میرے بیٹے کہاں ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے سعادت مند اور صالح مرید ہی میری اولاد ہیں۔“

اس شخص نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”حضرت! مجھے تو بس یہ بات بتائیے کہ آپ نے یہ کس طرح معلوم کر لیا کہ یہ کھانا مشتبہ ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو تو نے میرے ہاتھ اور انگلیوں میں کوئی تبدیلی محسوس کی تھی؟“

مرید نے کہا۔ ”جی ہاں، میں نے آپ کے ہاتھ، انگلیاں اور ان کے اعصابی نظام کو درہم برہم اور کانپتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟“

”حضرت! آپ زندگی بھر جو کچھ فرماتے رہے یا تعلیم دیتے رہے، اسے اگر تحریر بھی فرما جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کون کہتا ہے کہ میں نے اپنے پیچھے کتابیں نہیں چھوڑیں؟“

سوال کرنے والے نے عرض کیا۔ ”اگر آپ نے کتابیں تصنیف کی ہیں تو ان کا مجھے علم نہیں ہے اور میں اپنے سوال پر شرمندہ ہوں۔ براہ کرم اپنی تصانیف سے مطلع فرمائیے تاکہ ان سے مسلسل اور مستقل فیض حاصل کیا جائے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اے شخص! میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں احمد ابو العباس میری مستقل، جامع اور شرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔“

شاڈلی کی وفات کے بعد کسی مرید نے ابو العباس سے پوچھا۔ ”ابو العباس! پھر و مرشد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جس طرح شیرنی کا بچہ شیرنی کی گود میں۔ آخر اس کا مفہوم کیا ہے؟“

ابو العباس نے جواب دیا۔ ”اللہ کا ولی، اللہ کے ساتھ طمانیت اور سکون سے رہتا ہے۔ اس کو حرص، طمع، شہرت و نمود اور دوسرے نفسانی مسائل و رفلانے رہتے ہیں مگر اللہ اس ولی کی حفاظت کرتا ہے جس سے وہ ولی، اشرار و دنیا سے محفوظ رہتا ہے بالکل شیرنی کی طرح جو اپنے بچے کو کسی بھی ورقلانے یا پھسلانے والے کے حوالے نہیں کرتی۔“

کسی دوسرے مرید نے پوچھا۔ ”جناب! رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے خود کو پہچانا، اس کا واضح مفہوم ارشاد فرمائیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو اس کی خواری اور عاجزی کے ساتھ پہچانا، اس نے اپنے رب کو اس کی عزت اور قدرت کے ساتھ پہچانا۔“

ان تشریحات نے حاضرین کو جدمش جتا کر دیا اور ہر طرف سے سبحان اللہ، جزاک اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

کسی اور نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایک سوال اور۔ حضرت شاڈلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کسی ولی کی حقیقت کھول دی جائے تو وہ پوچھا جائے لگتا ہے۔ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا ولی کی پرستش جائز ہے یا یہ گمراہی ہے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہاں پوچھ جانے سے مراد پرستش کی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ تمہارا شیطان (شیطان کومت پوجو) اس کا واضح مطلب ہے کہ شیطان تمہیں جس چیز کا حکم دے وہ تم نہ مانو، یعنی شیطان کی اطاعت یا عدم اطاعت ہے۔ ولی کی پرستش کا مطلب ہے اس کی پیروی کرنا، اس کی اتباع کرنا۔“

انہی سوال و جواب میں عصر کا وقت آ گیا۔ نماز کی صفیں قائم ہوئیں اور ابو العباس کو امامت کے لیے کھڑا کیا گیا۔ جب وہ نماز پڑھا رہے تھے تو آپ کے مقتدیوں نے کسی ارادے کے بغیر ہی دیکھا کہ ابو العباس کا جسم نور سے بھر گیا اور ان پر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔

نماز کے بعد لوگوں نے دلی زبان میں استفسار کیا۔ ”حضرت! یہ نور کیسا تھا جس میں آپ کا وجود چھپ گیا تھا اور وہ بارش کیسی تھی جو آپ پر ہو رہی تھی..... بالکل پھوار کی طرح؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”اگر تم لوگ اپنے سوال کا جواب چاہتے ہو تو سنو، وہ نور جس میں، میں چھپ گیا تھا اور وہ بارش جو پھوار کی طرح مجھ پر ہو رہی تھی، شرح و تفسیر اور معانی و مطالب کی تھی۔ اگر ان کی تجسیم کی جائے تو میرے عزیزو! ان کی شکل یا تو نور کی طرح ہوگی یا پھر بارش یا پھوار کی طرح۔“

لوگوں نے حلقہ طور پر شاڈلی کے اس قول کی تائید کی کہ میری کتابیں میرے اصحاب ہیں اور ان میں ابو العباس میری مستقل، جامع اور شرح تصنیف ہے۔ میری بہت سی باتیں اور تعلیمات ابو العباس کے ذریعے ہی سمجھی جاسکتی ہیں۔

ایک دن فجر کے بعد لوگوں نے آپ کے آس پاس ہجوم کیا اور سوالات کی بھرمار کر دی۔ آپ ان کے سوالات کے جواب دیتے دیتے نڈھال ہو گئے۔ عین اس وقت جب آپ اٹھنے والے تھے، ایک شخص ہانپتا ہانپتا مجلس میں داخل ہوا اور ایک کونے میں بیٹھ گیا۔

آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ”ذرا اس شخص کو تو بلاؤ۔“

ایک مرید نے اس شخص کو شانے سے پکڑ لیا اور عرض کیا۔ ”بھائی! تجھے ابو العباس یا فرماتے ہیں، ذرا زحمت کر۔“

وہ شخص آپ کے پاس آکھڑا ہوا۔ آپ نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ ”اے شخص بتا، میں تیرا راز اپنا راز کبھوں گا۔ خدا تجھ پر تم کرے آج تو نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس میں زنا کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ آخر کیا ہے؟“

امیر کے دوست نے اس پورے واقعے سے عبرت پکڑی مگر اس کے دل کے کسی گوشے میں اب بھی یہ شہر بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے اسے جتنی زیادہ نہیں، اتنے ہیں نہیں جتنا ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے انہیں مشہور کر رکھا ہے۔ اس کے دل میں آپ کو بخشنے اور باتیں کرنے کی بڑی خواہش تھی چنانچہ وہ اسکندریہ سے قاہرہ پہنچا اور آپ کی مجلس میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ آپ وعظ کرتے رہے۔ آپ نے دوران وعظ فرمایا۔

"لوگو! اسوئی اچھی بات نہیں ہے۔ جب تک تم خود کسی شخص کے بارے میں ذاتی طور پر تصدیق یا تردید نہ کرو اس کے متعلق حکمت سوچو۔"

اس اجنبی کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کے لیے اور اس کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ آپ فرما رہے تھے۔ "اتفاق سے اس مجلس میں وہ شخص بھی موجود ہے جس نے اسکندریہ کے امیر کو ورغلا کر مجھ سے لڑا دینا چاہا تھا۔ جو میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ فقراء کے منصب میں امر انکی دربارداری شامل نہیں ہے لیکن اس شخص نے امیر اسکندریہ کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مجھ پر بوجہ لایا جیل اپنے دربار میں طلب کر کے میرا امتحان لے۔ میں کچھ ہوں یا نہیں اس سے اس شخص یا اسکندریہ کے امیر کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچتا اور نہ نقصان مگر یہ دونوں پھر بھی درپے آزار تھے۔"

اب یہ شخص خاموش نہ رہ سکا۔ اپنی جگہ سے اٹھا اور آپ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔ "حضرت! آپ اپنی تقریر میں جس شخص کا ذکر فرما رہے ہیں، وہ میں ہی ہوں۔ میں اپنی غلطی پر تادم ہوں۔" پھر حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا۔ "لوگو! میں تصدیق کرتا ہوں کہ یہ شخص تو خدائی دریا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے ربانی مدد کے فیض سے کہتا ہے۔ آج میں توبہ کر کے آپ کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں اور اس طرح شامل ہو رہا ہوں کہ اب یہاں سے کہیں اور جانے کا میں خیال تک نہ لاؤں گا۔"

آپ کی ضرورت سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں اسکندریہ سے پہلے جس شہر میں قیام کیا، اس کے امیر نے آپ سے اپنی خواہش کی۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں امراء سے نہیں ملتا۔

امیر نے کہلوا دیا۔ "جناب! میں آپ کا مداح ہوں اور آپ سے ملاقات کی دیرینہ خواہش رکھتا ہوں۔"

آپ نے جواب میں کہلوا دیا۔ "وہ میرا مداح ہے لیکن میں اس کا مداح نہیں ہوں۔ مجرورہ کیسے مداح ہے کہ خود کو قاہرہ و مصر سے پہنچا نہیں اور میں اس کے شہر سے گزرنے کا تو میرا مداح بن گیا اور ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا۔"

امیر کے قاصد نے کہا۔ "حضرت! صبح فجر کے بعد امیر نے آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "آئے لیکن میں اس سے ملاقات نہیں کروں گا کیونکہ فقراء کو امراء کی چھتیں راس نہیں آتیں۔"

قاصد چلا گیا اور صبح امیر اپنے مصاحبین کے ساتھ جب آپ سے ملنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ آپ فجر سے پہلے ہی اسکندریہ چلے گئے۔ امیر بہت مایوس ہوا اور مصاحبین سے کہا۔ "یہ فقراء بھی عجیب لوگ ہیں جو امراء سے خواہوا بدظن رہتے ہیں۔"

☆☆☆

ایک دن آپ نے پرہیزگاری، ہمت اور استغنا پر تقریر کی۔ پوری مجلس وجد میں آگئی اور لوگوں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ بعد آپ کو اپنے ایک ارادت مند کے پاس جانا پڑ گیا۔ ارادت مند نے آپ کی دعوت کی تھی ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی طرف سے ایک کتا آ نکلا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ کو اس پر رحم آ گیا۔ آپ نے صاحب خانہ سے کہا۔ "ایک روٹی لاؤ تاکہ میں اس کتے کو بھی دعوت میں شریک کر لوں۔"

صاحب خانہ نے آپ کے سامنے کئی روٹیاں لا کر رکھ دیں۔ آپ نے اس میں سے ایک روٹی نکال کر کتے کے آگے ڈال دی۔ کتے نے روٹی کی طرف دیکھا بھی نہیں، یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

آپ یہ سمجھے کہ شاید کتے کی نظر روٹی پر پڑی نہیں ہے ورنہ ضرور کھاتا۔ روٹی کو اٹھا کر کتے کے منہ کے سامنے رکھ دیا۔ کتے نے روٹی پر ایک نظر ڈالی اور منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔

آپ نے کتے سے کہا۔ "یہ روٹی میں نے تیرے لیے ڈالی ہے، کھاتا کیوں نہیں؟"

کتے نے آپ کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ نے روٹی اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دی اور کہا۔ "یہ روٹی میں اپنے ہاتھ سے تجھ کو کھلا رہا ہوں، میری خواہش ہے کہ تو حکم میرا نہ کرکھا لے تاکہ میں تیری حکم میری سے مسرت حاصل کر سکوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تجھ کو معلوم نہیں کہ مشہور صوفی حضرت محاسبی کی کسی انگلی میں ایک ایسی رگ تھی جو انہیں مشتہر کھانے سے بچڑک کر باز رکھتا کرتی تھی لیکن میری انگلیوں میں ساٹھا ایسی رگیں ہیں جو مشتہر کھانے کو اپنے قریب دیکھ کر بے اختیار چمکے گئے کسی قسم کے وہ شخص اتنا خوف زدہ ہوا کہ کانپنے لگا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "حضرت! مجھ کو معاف فرمادیں کیونکہ میں نے یہ مشتہر کھانا قصداً آپ کے سامنے رکھا تھا۔ اس طرح میں آپ کی بزرگی اور روحانیت کا امتحان لے رہا تھا۔"

آپ نے فرمایا۔ "سبحان اللہ، جس کی خدا خود حفاظت کر رہا ہو، اس کو امتحان اور آزمائش میں ڈالنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ اور خردوار جو تو نے کسی دل چلے کا امتحان لیا کیونکہ اگر اس نے تجھ کو آزمائش اور امتحان میں ڈال دیا تو معلوم نہیں تیرا کیا حشر ہوگا۔"

اس کے بعد آپ نے دفور جوش میں اپنی ڈاڑھی پکڑی اور فرمایا۔ "اگر علمائے عراق اور شام کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان بالوں کے پیچھے موجود شخص میں عظمت اور بزرگی کا کتنا بڑا پہاڑ چھپا ہوا ہے تو وہ میری زیارت کو حاضر ہوں اور یہ حاضری بھی منہ کے بل دی جائے۔"

آپ کا قیام قاہرہ میں ہی تھا لیکن لوگوں نے آپ کو اکثر اسکندریہ میں دیکھا، اسکندریہ میں ان کے پیر ابو الحسن شاذلی رہتے تھے۔ ان کی مجلس میں شریک ہوتے، وعظ سنتے اور ختم وعظ پر قاہرہ واپس چلے جاتے۔ شاذلی کی وفات کے بعد آپ کے ارادت مندوں نے آپ کے اس کمال کا دوسروں سے ذکر کیا تو انہیں یقین نہیں آیا۔ اس کے بعد جب یہ شہر ہوا کہ آپ مکان سے دوسروں کے دلوں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں تو آپ کے ایک منکر کو بہت ہنسی آئی۔

اس نے کہا۔ "یہ شعبدہ باز بھی کتنے غضب کے ہوتے ہیں، کیسے کیسے کرشمے دکھا کر ایک زمانے کو اپنا قائل اور معتقد بنا لیتے ہیں لیکن مجھ کو آج تک کوئی بھی متاثر نہیں کر سکا۔" اس نے اسکندریہ کے امیر کو مشورہ دیا کہ وہ ابو العباس کو قاہرہ سے طلب کرے اور ان سے کرامتوں کا مطالبہ کرے۔

امیر نے اسی وقت ایک فرمان جاری کر دیا اور حکم دیا۔ "ابو العباس! تم میرا فرمان وصول کرتے ہی اسکندریہ آ جاؤ، ورنہ میں تمہیں زبردستی بھی بلوا سکتا ہوں۔"

آپ نے یہ مختصر فرمان پڑھا اور نامہ بر کو زبانی جواب دے دیا۔ "امیر سے کہہ دینا کہ ابو العباس کہتا ہے، تو تو صرف اسکندریہ کا امیر ہے اور میں جس امیر کا تابع ہوں، وہاں اسکندریہ کا امیر میرے امیر کے دربانوں میں بھی نظر نہیں آتا۔ میں نے اپنے انہی نامہ بر اسکندریہ نہیں آؤں گا۔"

حاکم اسکندریہ کو جب یہ جواب ملا تو وہ بہت تھمایا لیکن موقع و مصلحت دیکھ کر اس نے فوراً ہی ایک دوسرا خط لکھ دیا۔ یہ خط نرم زبان میں لکھا گیا تھا اور پورے خط کا انداز فدویانہ اور عاجزانہ تھا۔ اس میں لکھا گیا تھا۔

"پیر و مرشد! مجھے احساس ہے کہ میری جانب سے آپ کو جو پہلا خط روانہ ہوا تھا، اس کا اب دلچسپی نہ تھی لیکن اب میں شرمندہ ہوں اور آپ سے اپنی پچھلی نصیحت کی معافی مانگ رہا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اسکندریہ تشریف لے آئیں۔"

آپ کی زیارت کر لوں گا اور آپ میرا ہاتھ پکڑ لیں گے۔ میں نے آپ کو فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں، اب آپ بھی مجھ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیں۔"

آپ نے خط پڑھا اور نامہ بر سے کہا۔ "اگر تیرا حافظہ درست ہے تو میرا جواب امیر تک پہنچا دینا۔ یونان کا بادشاہ جب مصر آیا تھا تو موجودہ شہر اسکندریہ میں اترتا تھا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام اسکندریہ پڑ گیا۔ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسکندریہ نے اپنے ہم عصر بے غرض اور قانع فلسفی دیوجانس سے ایک بار کہا تھا کہ دیوجانس! میرا فیض عام ہے اور میں نے بخشش اور انعام سے لوگوں کو مالامال کر دیا ہے اگر تو بھی کبھی آ جائے اور اپنی خواہش کا اظہار کرے تو میں تجھ کو مالدار کروں گا۔"

اسکندر کی پوری بات سن کر دیوجانس نے جواب دیا تھا۔ "اسکندر! امیر! غلام ہے، میں نے اس کو محکوم کر لیا ہے لیکن اسی غلام نے تجھ کو اپنا غلام بنا لیا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کچھ کیا مانگوں، مجھ کو مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔"

"چنانچہ اسے قاصد اپنے امیر سے کہہ دینا کہ حرص و طمع اور شہوت کو میں نے اپنا غلام بنا لیا ہے لیکن اس غلام نے اسکندریہ کے امیر کو اپنا غلام بنا رکھا ہے پھر میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں تعلق پیدا کروں اور اس کے پاس کیوں پہنچوں۔ اور اپنے امیر سے حتی سے کہہ دینا کہ مجھ جیسے آدمی سے دل لگی نہیں کیا کرتے۔ ہم دونوں کبھی بھی یک جہت نہ ہوں گے۔"

نامہ بر زبانی جواب لے کر چلا گیا۔ اس کے بعد امیر نے بڑی کوشش کی کہ خود قاہرہ جائے اور آپ سے ملاقات کرے لیکن وہ ناکام رہا اور ملاقات کی خواہش لیے ہوئے اس دنیا ہی سے کوچ کر گیا۔

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنے رب کے حکم پر ہی نکلوں گا اور کلام کروں گا تم لوگ میرے حق میں دعا کرو کہ اللہ مجھ کو معاف کر دے اور مجھ کو میرے کلام کے مطابق بنا دے۔"
 مرید باہر آ گیا اور اپنی گفتگو سے سب کو مطلع کر دیا۔ لوگ بہت آزرده ہوئے اور بہتوں نے اعلان کر دیا کہ ہم اس وقت تک یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ آپ باہر نکل کر شرفِ کلامی نہیں بخشیں گے۔
 اس بات کو بہتوں نے گزر گئے۔ آپ اپنے حجرے میں مستحکم رہے۔ لوگوں کو یہ انتظار تھا کہ آخر یہ تھقل دور کس طرح ہوگا۔ آخر ایک دن حجرے میں آپ نے ایک روشنی سی محسوس کی۔ آپ پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور غشی کے عالم میں آپ نے نہ کوئی کہہ رہا ہے۔

"اے ابو العباس! تجھ کو اس بات کا اتنا اثر نہیں لینا چاہیے تھا۔"
 انہوں نے کہا۔ "میں شرمندہ اور نام ہوں اے میرے رب! مجھ کو باہر نکلتے اور لوگوں سے کلام کرتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گا اور لوگوں کو تعلیم و تفسیر کس طرح کروں گا؟"
 آواز آئی۔ "تجھ کو جو علم دیا گیا ہے اور جو طاقتیں ملی ہیں، ان کی نشر و اشاعت بھی تجھ کو سونپی گئی ہے۔ تو حجرے سے باہر نکل اور سب سابق اپنا کام شروع کر دے۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے میرے رب! میں اس حکم کی تعمیل کروں گا لیکن میری استدعا ہے کہ مجھ کو میرے کلام کے مطابق اعمال کرنے کی توفیق بھی مرحمت ہو اور آئندہ کی پشیمانیوں سے محفوظ رکھ۔"
 اس بار انہیں سختی سے حکم دیا گیا۔ "اے ابو العباس! اب زیادہ قیل و قال نہ کرو اور باہر نکل کر تشنگانِ علم کی بیاس بجھاؤ نہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے تجھے جو کچھ دیا گیا ہے اس کو چھین لیا جائے کیونکہ جو تجھ کو بخشا جاسکتا ہے وہ سلب بھی کیا جاسکتا ہے۔"
 آپ کو ایک جھٹکا سا لگا اور آپ ہوش میں آ گئے۔ اسی وقت حجرے سے باہر نکلے اور لوگوں سے کہا۔ "لوگو! میں تم میں دوبارہ آ گیا ہوں اور اسی طرح تم میں اٹھوں۔ اٹھوں اٹھوں گا اور کلام کرتا رہوں گا جس طرح ہمیشہ کرتا رہا ہوں کیونکہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔"
 لوگوں نے خوشی میں نعرے لگائے اور احتراماً کھڑے ہو گئے، ہر ایک کے چہرے سے سبکی محسوس ہو رہا تھا گویا یہ روزِ عید ہے اور وہ سب مل جل کر بید کی آہیں اٹھا رہے ہیں۔

☆☆☆

آپ کے پاس ایک اجنبی شخص آیا۔ آپ نے اس پر خصوصی توجہ دی اور نہایت دلچسپی اور محبت سے کہا۔ "آج بھائی بیٹھ جاؤ، کیسے آنا ہوا؟"
 اس شخص نے کہا۔ "بعض خیالات مجھ کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ میں ایک پیر کے پاس گیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آؤ دیر بیٹھ جا۔ ابھی تیری بات سنتے ہیں۔ مجھ میں اتنا یارا کہاں تھا کہ صبر کر کے بیٹھ جاتا، چنانچہ میں آپ کے پاس آ گیا۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو کیا پوچھنا چاہتا ہے؟"
 اس نے کہا۔ "حضرت! میں نے کچھ لوگوں کو ملاحظہ میں لیا اور دیکھا ہے اور ان کے برعکس کچھ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کیے خفا میں گم ہیں، میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ ان میں بزرگ اور برتر کون ہے؟"
 آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! جو ظہور کو دوست رکھتا ہے وہ ظہور کا بندہ ہے اور جو خفا کو دوست رکھتا ہے، وہ خفا کا بندہ ہے لیکن جو خدا کا بندہ ہے اس کے لیے ظہور اور خفا دونوں ہی برابر ہیں۔"

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ "حضرت! مجھ کو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اس ڈر کو اپنے دل سے نکالنا چاہتا ہوں۔"
 آپ نے جواب دیا۔ "اے شخص! تو یہ بات اچھی طرح اپنے دل میں بٹھالے کہ جس کی اللہ سے دوستی ہوگی، وہ موت سے ہرگز نہیں ڈرے گا۔ لیکن جو جتنا دور ہوگا، وہ موت سے اتنا ہی خوف زدہ ہوگا چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو شخص بھی خدا سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہو، اس کو چاہیے کہ پہلے اس طرح خود کو کسوٹی پر کس کر دیکھے، پتا چل جائے گا کہ اپنے دعوے میں وہ کتنا سچا ہے یا کتنا جھوٹا ہے۔"

وہ شخص مطمئن اور آسودہ سا ہو گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا۔ "اب میں اس در کا ہو گیا کیونکہ آسودگی اسی در سے ملتی ہے۔"
 جب وہ چلا گیا تو ایک مرید نے کہا۔ "حضرت! یوں تو ہر روز آپ کے پاس کوئی نہ کوئی اجنبی آتے جاتے ہیں لیکن آپ ان پر کلام کرنا پڑے گا۔"

کتے نے روٹی کی طرف دیکھا اور کھائے بغیر وہاں سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔
 آپ کو کتے کی حرکت ناگوار گزری اور کہا۔ "کیوں کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ خدا نے تجھے رزق بھیجا ہے تو اس کو کھالے۔ تیرے انکار کی وجہ میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔"

ابھی ان کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ انہوں نے محسوس کیا گویا کوئی انہیں مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ "اے ابو العباس! تو نے آج جس پر بیزگاری، ہمت اور استقامت پر گھنٹوں وعظ کیا ہے انہوں نے کہا کہ جب تیرے سامنے اس کی کوئی عملی شکل آئی تو تو محض تابلہ نظر آنے لگتا ہے۔"

آپ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور بے اختیار زبان سے نکلا۔ "اے ابو العباس! لعنت ہے تجھ پر کہ کتنا تجھ سے زیادہ پر بیزگار نکلا۔"
 اس کے بعد آپ بے ہوش ہو گئے۔

ہوش میں آنے کے بعد آپ نے خلوت نشینی اختیار کی اور لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھ کر چلے جاتے۔ انہیں پریشانی تھی کہ آخر ابو العباس کو ہو کیا گیا ہے کہ ملنا جلنا اور بولنا ہی ترک کر دیا ہے۔

آخر ایک مرید نے آپ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ آپ نے اس کو اندر بلا لیا۔ اس نے اندر پہنچ کر یہ محسوس کیا کہ آپ ذرا دیر پہلے شاید رو رہے تھے۔ مرید نے پوچھا۔

"حضرت! آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "بھگدہ، جھپک ہوں۔"

مرید نے کہا۔ "حضرت! کیا ابھی ابھی اس ناچیز کی آمد سے پہلے آپ مطمئن تھے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "نہیں تو، یہ تو نے کس طرح سمجھ لیا؟"

مرید نے عرض کیا۔ "میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ آنکھوں کے نیچے غمگینی کے سیاہ حلقے اور غمی کو آسانی دیکھ اور محسوس کر لیتا۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اس دنیا میں خوش کون ہے؟ صرف وہ شخص جو اچھے برے کی تمیز نہیں کر سکتا۔"

مرید نے عرض کیا۔ "حضور! آپ نے چند دنوں سے جو ریش اختیار کر رکھی ہے، اس سے مریدوں کو کوئی فائدہ ملتا ہے؟"

اور وہ اس تبدیلی کا جب جاننے کے لیے پوچھ رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کن ترانیوں سے باز آ جاؤں گا کیونکہ خاموشی میں عظمت ہے۔"

مرید نے کہا۔ "آپ کس چیز کو کن ترانی فرما رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "وہ سب کن ترانی میں شمار ہوگا جو زبان سے تو نکل جائے مگر خود اس کے معیار پر پورا نہ اترے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں نے جن باتوں کی یقین کی ہے، میں خود ان پر پورا نہیں اترتا تھا۔"

مرید نے کہا۔ "یہ آج آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں تو ایک بات جانتا ہوں، وہ یہ کہ آپ اگر یوں خلوت نشین رہے اور اپنے عاشقوں اور ارادت مندوں کو اپنے دیدار اور کلام سے محروم رکھا تو وہ پاگل ہو جائیں گے اور آپ کی خلوت میں زبردستی داخل ہو جانے کی گستاخی کریں گے۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تو باہر جا کر شاہین سے کہہ دے کہ میں نے اپنے رب کے ایما پر خلوت نشینی اور سکوت اختیار کیا ہے۔"

اب جب وہی یہ حکم دے گا کہ میں باہر نکلوں اور لوگوں سے کلام کروں تو باہر آ جاؤں گا۔"

مرید نے ضد سے کام لیا۔ "حضرت! بحث و تکرار سے آپ کی سچ خراش تو ضرور ہوگی لیکن میں اپنے اور اپنے جیسے دوسروں کے اطمینان کے لیے یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ کو اپنے رب کے ایما کا علم کیونکر ہوا؟"

آپ نے کتے والا واقعہ سنا کر فرمایا۔ "اس دن میں نے پر بیزگاری، ہمت اور استقامت پر جو کچھ کہا تھا، بعد میں مجھ کو یہ بتایا گیا کہ میں اپنے وعظ میں جو لاف گزارا کرتا رہا ہوں اور جو کن ترانیاں بنائی ہیں، ان کے اصل مفہوم سے ایک کتا مجھ سے زیادہ واقف ہے مجھ کو اس سے سبق لینا چاہیے۔ چنانچہ اب میں اتنا خوف زدہ ہو چکا ہوں کہ باہر نکلنے اور بات کرنے کی ہمت ہی جواب دے گئی ہے۔"

مرید نے عرض کیا۔ "لیکن آپ کے مرید آپ کی یہ باتیں نہیں مانیں گے اور آپ کو اس حجرے سے باہر نکلتا اور لوگوں سے کلام کرنا پڑے گا۔"

کی دوسری کوئی مثال نہ ملتی مگر اس کے مفرد دل نے مجھ کو اس سے دور ہی دور رکھا۔“

مریدوں کو جو اس کا علم ہوا تو اس عالم کے پاس گئے کہ اس کا تاثر معلوم کریں۔ اس عالم نے آپ کے مریدوں کو دیکھتے ہی ان کا مذاق اڑایا، کہا۔ ”افسوس کہ میں نے تو ابو العباس کا بڑا نام سنا تھا لیکن جب ان سے ملا تو مجھے اپنی برتری اور ان کی کستری کا لہجہ ہی میں انکشاف ہو گیا۔ بفضل خدا میں ان سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں۔“

چند دنوں بعد ایک ایسا شخص آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا جو اپنے برے افعال کی وجہ سے بدنام تھا۔ اس نے آپ کے مریدوں سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بھائیو! میں حضرت ابو العباس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھے شرف باریابی بخشیں گے؟“

ایک مرید نے آپ سے اس کے لیے اجازت ملاقات چاہی تو ابو العباس کو اس آنے والے پر بہت پیار آیا، بولے۔ ”اس کو فوراً بلاؤ۔ میں اس سے ابھی اسی وقت ملوں گا۔“

اس آنے والے کو فوراً ہی آپ کے پاس پہنچا دیا گیا۔ آپ نے اس کو بڑے تپاک سے لیا۔ ”ہاں بھائی کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو؟“

اس نے جواب دیا۔ ”حضرت! خیریت سے تو ہوں۔ بس آپ کے پاس آتے ہوئے ایک خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ بڑی ہمت کر کے آیا ہوں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیوں، یہاں آتے ہوئے خوف کیوں محسوس ہوتا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں ہمیشہ سوچتا رہتا تھا کہ میں ایک گناہ گار انسان، آپ خاصہ خاصان، معلوم نہیں شرف باریابی ملے یا یوں ہی ناکام واپس آنا پڑے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میرے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا امیر کا قصر نہیں، درویش کی کتیا ہے اور وہ لوگ جنہیں اپنے گناہوں کا احساس ہے اور اپنے اعمال پر شرمندہ ہیں، ان کے لیے تو میری کتیا کا درہر وقت کھلا رہتا ہے۔“

آنے والا آپ کی باتیں سن کر رونے لگا، بولا۔ ”حضرت! آپ میرے حق میں دعا کیجئے کہ میں اپنے نامہ اعمال میں مزید گناہوں سے محفوظ رہوں اور خدا میری توبہ قبول کرے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”خدا تیری عداوت اور پشیمانی دیکھ رہا ہے، اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔“

آپ اس کو بڑی دیر تک نصیحتیں کرتے رہے اور اس کی ہمت افزائی کرتے رہے اور آخر میں کہا۔ ”اور جب تو یہ محسوس کر لے کہ خدا نے تیری توبہ قبول کر لی ہے اور خدا کی توفیق سے تو نے سیدھی راہ اختیار کرنی ہے تو بیٹھیں سے تو گویا ایک مٹی صراط پر کھڑا ہو جائے گا کیونکہ تقویٰ اور پرہیزگاری کے پہلو میں، اس سے متصل شیطان بھی آن موجود ہوتا ہے اور وہ ہر وقت تقویٰ اور.....

پرہیزگاری پر فخر اور غرور کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح سارا کیا دھرا بردہ ہو جاتا ہے اور آدمی ایک ایسی دلدل میں اتر جاتا ہے کہ بس اس دلدل سے خدا ہی نکالے تو انسان نکل سکتا ہے ورنہ ہر راہ بند ہو چکی ہوتی ہے۔“

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”حضرت! میں تو آپ کے قدموں میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور ہر قدم پر آپ سے راہنمائی چاہتا ہوں کیونکہ کسی راہنمائی کے بغیر یہ کام مشکل ہے۔“

اس کے بعد وہ شخص آپ ہی کے پاس رہ گیا۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتا اور شام کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس شخص میں بزرگی اور عظمت کے آثار محسوس کیے جانے لگے۔ اس میں عاجزی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت لغزشوں اور گناہوں سے خوف زدہ رہتا تھا اور احتیاط اور عاجزی کا دامن ہر وقت پکڑے رہتا۔

☆☆☆

شہر میں ایک ایسے شخص کا بڑا چرچا تھا جو حج کر کے واپس آیا تھا اور بہت عالم مشہور تھا۔ آپ کے مرید بھی اس کی شہرت سے خاصے متاثر تھے اور آپ سے دہلی زبان میں خواہش کرتے رہتے تھے کہ اس شخص سے ایک بار ملنا ضرور چاہیے۔

آپ نے عاجز آ کر پوچھا۔ ”تم لوگ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ وہ بہت عالم شخص ہے۔ اس کی طبیعت کا آس پاس کوئی جواب نہیں۔“

آپ نے پھر پوچھا۔ ”اس کے علاوہ اور کچھ؟“

اتنی جلدی تو جب نہیں فرماتے جس طرح آج اس شخص پر فرمائی ہے۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب تھا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، اس کا ایک خاص سبب تھا، یہ شخص پہلے ایک دوسرے صبر کے پاس گیا تھا۔ اس صبر نے اس سے کہہ دیا کہ چند گھنٹے انتظار کر، اس کے بعد تیرے سوالوں کا جواب دوں گا۔ یہ شخص جس کرب اور بے چینی کا شکار تھا، اس میں چند گھنٹے انتظار کا یا رانگیس پایا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ بھاگ کر میرے پاس آ گیا اور مجھ کو اس کی طرف فوراً ہی متوجہ ہو جانا پڑا۔“

ایک شخص نے دہلی آواز میں کہا۔ ”حضرت! اس طرح تو اس پہلے صبر کی مذمت ہو گئی جس کے پاس یہ اجنبی شخص آیا تھا اور اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ دوسروں سے افضل اور برتر ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ بات نہیں ہے بلکہ میں نے جو بات کہی، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو طمانیت اور آسودگی جہاں سے بھی ملے، حاصل کر لے۔ تم لوگ میری صحبت میں ہو اور یہیں رہو لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر تمہیں کوئی اور ٹیٹھے پانی کا چشمہ میسر آ جائے تو وہاں نہ جاؤ۔ تم کہیں بھی جا سکتے ہو۔“

ایک دن ایک مرید آپ کے لیے کھانا لایا۔ وہ کھانے کو اس طرح چھپا کر لایا تھا کہ دوسروں کو اس کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ کافی رات گئے جب لوگ چلے گئے تو یہ پیشوا رہ گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ”تیرا کوئی کام ہے مجھ سے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”نہیں تو، میں تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ آپ کے لیے جو کچھ لایا ہوں، لوگوں کے چلے جانے کے بعد آپ کی خدمت میں ادب سے پیش کروں۔“

آپ نے پوچھا۔ ”تو کیا لایا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”کچھ کھانا ہے جو میں آپ کو کھلا کروا نہیں جاؤں گا۔“

آپ نے ناگواری سے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا کہ تو کھانا چھپا کر کیوں لایا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بس یونہی، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس میں دوسرے بھی شریک ہوں۔“

آپ نے افسوس کیا۔ ”تو نے بہت برا کیا۔ تیرے خیالات قاسدانہ ہیں اور میں ایسا کھانا کسی حال میں نہیں کھاؤں گا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو۔“

اس شخص نے بڑی کوشش کی کہ آپ کھانا کھالیں لیکن آپ نے نہیں کھایا، کھانا واپس کر دیا۔

چند دنوں بعد ایک دوسرے شخص نے سب کے سامنے اعلان کیا۔ ”حضرت کے لیے آج میں کھانا لائوں گا۔“

آپ نے اس شخص کو منع فرمایا۔ ”تو یہ کیسا نہمہمل اور بے ہودہ اعلان کر رہا ہے۔“

اعلان کرنے والے نے کہا۔ ”حضرت! اس میں بے ہودگی کیسی؟ میں واقعی کھانا لائوں گا، میں جموٹا اعلان نہیں کر رہا ہوں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”جس طرح میں وہ کھانا نہیں کھاتا جو دوسروں سے چھپا کر لایا گیا ہو، اسی طرح میں وہ کھانا بھی نہیں کھا سکتا جس کا اس طرح اعلان کیا گیا ہو۔“

اس شخص نے بڑی مت ساجت کی لیکن آپ نہیں مانے اور وہ کھانا نہیں کھایا۔

☆☆☆

ایک ایسا شخص آپ کے پاس آیا جس کا زہد و تقویٰ بہت مشہور تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کسی وقت کی نماز قضا نہیں ہوتی۔ اس کی آمد کا ایسا شہرہ ہوا کہ آپ کے مریدوں میں بس یہی چرچا ہونے لگا۔ مریدوں کا خیال تھا کہ آپ اس سے بہت اچھی طرح پیش آئیں گے لیکن وہ شخص آیا اور آپ کے انتظار میں کچھ دیر بیٹھا رہا۔ کچھ لوگوں نے خبر دی اور کہا۔ ”حضرت! یہ پرہیزگار شخص آپ سے ملاقات کا متمنی ہے لیکن آپ اس سے معلوم نہیں مل کیوں نہیں رہے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں مل لوں گا، جلدی کس بات کی ہے؟“

کسی نے کہا۔ ”وہ شخص واپس جانا چاہتا ہے۔“

آپ اٹھ کر اس کے پاس چلے گئے۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی لیکن دوسروں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی کہ آپ اس عالم اور زاہد سے تپاک اور جوش سے نہیں مل رہے ہیں۔ گفتگو کا یہ عالم تھا کہ وہ شخص اگر کوئی بات کرتا تھا تو آپ اس کا مختصر جواب دے دیتے تھے، اپنی طرف سے کوئی بات بھی نہ کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ عالم چلا گیا۔

آپ نے فرمایا۔ ”افسوس کہ اگر اس شخص کے دل میں اپنے علم اور زہد و تقویٰ کا غرور نہ ہوتا تو میں اس سے اس طرح ملتا کہ اس

آپ نہایت مایوس اور افسردہ اپنے حجرے میں واپس پہنچے اور مریدوں سے کہا۔ "میں تم لوگوں کے کہنے پر اس شخص سے پاس چلا گیا تھا، ورنہ مجھ کو ان باتوں کا پہلے ہی سے علم تھا۔ میں تمہیں یہ باتیں پہلے ہی بتا سکتا تھا لیکن اس تجربے اور شاہدے سے پہلے تم لوگ شاید میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔"

مریدوں نے بالاتفاق عرض کیا۔ "ہمیں آپ کی ہر بات پر یقین ہے چنانچہ اگر آپ ہمیں یہ باتیں پہلے بتا دیتے تو ہم سب اس شخص کے پاس ہرگز نہ جاتے۔"

آپ کے مریدوں میں ایک ایسا بھی تھا جسے یہ زعم ہو گیا تھا کہ اس نے آپ سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور اتنا جانتا ہے کہ ابو العباس کے علاوہ کوئی اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے آپ کے پاس آنا بند کر دیا اور اس کا امیدوار ہوا کہ کوئی خود اس کے پاس پہنچے اور اسی ادب و احترام کا مظاہرہ کرے جس کا ابو العباس کی مجلسوں میں ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے بھی اسے نظر انداز کر دیا اور اس کا کبھی ذکر تک نہیں کرتے۔ ایک عرصے بعد وہ آپ کی خدمت میں آیا اور چند مسائل بھی اپنے ساتھ لایا۔ آپ نے ایک نظر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ "تو کہاں چلا گیا تھا؟ خیریت تو ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں موجود تو اسی شہر میں تھا لیکن میں نے ایک عرصے سے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اب مجھے کسی کی ضرورت ہی نہیں، میں خود مستغنی ہو چکا ہوں۔"

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! تو نے یہ کیسی بات کہی؟"

اس شخص نے پوچھا۔ "کیسی بات؟ کون سی بات؟ میں جناب کا مطلب نہیں سمجھا؟"

آپ نے جواب دیا۔ "جہاں تک استغنا کا سوال ہے، اس دنیا کا کوئی شخص بھی استغنا کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس کا تو کر رہا ہے۔" وہ شخص بہت شرمندہ ہوا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! کیا تو جانتا ہے کہ جب یہ زمین معرض وجود میں آئی تھی تو اس کا کیا حال تھا؟"

مرید نے جواب دیا۔ "نہیں حضرت! آپ ہی بتائیں گے تو بات معلوم ہو جائے گی۔"

آپ نے فرمایا۔ "وجود میں آتے ہی زمین کی پے چینی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بے چینی کو پہاڑوں کے بوجھ سے دبا دیا۔ بوجھ ہی حال انسانی نرس کا ہے، خدا نے جب نرس کو پیدا کیا تھا تو یہ بھی بہت بے چینی تھا۔ خدا نے اس کو بھی نرس کے پہاڑ سے دبا دیا۔"

آپ قاہرہ سے اسکندریہ جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ آپ نے ہجوم دیکھا۔ کوئی مونا تازہ شخص وعظ کرنے میں مشغول تھا اور سامعین دین و دنیا سے بیگانہ اس کا وعظ سننے میں مشغول تھے۔ آپ اس کا وعظ سننے لگے۔ آپ کے پاس جو شخص کھڑا تھا، واعظ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار واعظ کو دیکھتا اور زیر لب کچھ کہہ کر رہ جاتا۔

آخر آپ نے پوچھا۔ "اے شخص! تو کس کرب و اذیت میں مبتلا ہے کہ وعظ بھی غور سے نہیں سن رہا؟"

اس نے آپ کو غور سے دیکھا اور جواب دیا۔ "میرا خیال تھا کہ واعظ کی فریبی اور تردنازگی میری طرح دوسروں کو بھی حیرت میں ڈال دے گی لیکن اب معلوم ہوا کہ یہاں میرے سوا ایک بھی صاحب نظر نہیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں تیری بات نہیں سمجھا کہ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جناب! میں واعظ میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا، جو اس کے زہد اور تقویٰ کی گواہی دیتی ہو۔ مجھ کو تو یہ شخص بڑا جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔"

اس شخص نے یہ بات اتنی آہستگی سے کہی تھی کہ کسی اور کے سننے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ ابھی اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ واعظ نے دور ہی سے یہ آواز بلند کہا۔ "اے شخص! جو مجھے سرگوشی میں جھوٹا کہہ رہا ہے ذرا سامنے تو آتا کہ میں بھی اس سچے اور ایمان دار شخص کی شکل دیکھ لوں۔"

معرض اس لکار سے حیرت زدہ بھی ہوا اور خوفزدہ بھی۔ اس نے ایک بار پھر سرگوشی میں کہا۔ "حضرت! اس شخص کو میرے اعتراض اور شبہ کا کس طرح علم ہو گیا؟"

اور آپ کے بجائے اس سوال کا جواب بھی اس واعظ نے دیا۔ "اوچھوٹے سروا لے! تو نے میرے مٹاپے پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ میں کیسا اپنے رب کا عاشق ہوں کہ میرا مٹاپا میرے دعوے کی تکذیب کر رہا ہے حالانکہ میرے دل میں

مرید نے جواب دیا۔ "اور یہ کہ وہ حج کر کے آیا ہے اور وہاں سے متعلق بڑی اثر انگیز باتیں کرتا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تب پھر میں اس سے ضرورتوں گا۔ تم سب بھی میرے ساتھ ہی چلو۔"

لوگ ہنسی خوشی تیار ہو گئے اور کچھ دیر بعد آپ ان سب کے ساتھ اس شخص سے ملنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس عالم کو جب آپ کی تشریف آوری کا علم ہوا تو بہت خوش ہوا اور پھولانہ سمایا۔

آپ نے فرمایا۔ "اے شخص! تو بڑا خوش قسمت ہے کہ خانہ خدا اور دیار حبیب علیہ السلام پر حاضری دینے کی سعادت حاصل کی۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "بڑی دشوار گزار راہیں تھیں اور راستے میں بھی رہزنیوں کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔"

آپ نے فرمایا۔ "دیوار حبیب پہنچ کر شاید ہی کوئی شخص اپنے جذبات پر قابو رکھ پاتا ہو۔"

اس نے جواب دیا۔ "میں تو جناب مدینے میں خوب گھوما پھرا بڑا مزہ آیا اور ایک مدینے پر کیا موقوف، کسی بھی شہر میں جاییے دل خوش ہو جاتا ہے۔"

آپ نے مزید فرمایا۔ "حرم پاک میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے گویا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے ملے کر اس دور تک کا زمانہ فاصلہ اور اس کے نشیب و فراز آنکھوں میں پھر رہے ہیں اور اس کی عظمت اور تقدس کا موقع نظروں کے سامنے ہے۔"

جواب ملا۔ "بھائی! میں نے تو وہاں ایسا جہوم دیکھا کہ دم گھٹنے لگا، اور اس وقت بھی یہ حال ہے کہ جب ازدحام کے بارے میں سوچتا ہوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔"

آپ نے پوچھا۔ "جناب کاج کیسا رہا؟"

اس نے جواب دیا۔ "جناب! بڑا استاساں تھا، پانی کی بہتات تھی اور وہاں ایک ایک چیز کا نرخ مجھ سے معلوم کر لیجیے۔ ایک ایک چیز اور اس کا نرخ میرے حافظے میں محفوظ ہے۔"

آپ نے انہوں سے کہا۔ "اے شخص! تو نے میری ہر بات کا عجیب بے لگا جواب دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دیوار حبیب میں آدمی فوراً جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے اور تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایک مدینے پر ہی کیا موقوفہ، ہرگز نہ مگر لاکھوں روپیہ ہے۔ میں نے کہا حرم پاک میں داخل ہو کر اس کے زمانے، فاصلے سمٹ کر خیالوں میں قید ہو جاتے ہیں اور آدمی وہ حسب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے جو حرم پاک کی تعمیر اور اس کے نشیب و فراز سے متعلق ہے لیکن تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ حج کو حاج کے ہجوم سے وحشت ہونے لگی تھی اور اب سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تجھ سے پوچھا کہ حج کیسا تھا؟ تو نے اس کا یہ جواب دیا کہ بڑا استاساں تھا۔ پانی کی بہتات تھی اور تجھ کو وہاں کی ایک ایک چیز کے نرخ ابھی تک زبانی یاد ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تیرے حج میں وہ کون سا جذبہ شامل ہے جس کی میں تعریف کروں، وہ کون سا شوق تھا جس کا ہم سب احترام کریں؟"

اس شخص نے کہا۔ "حج میں جذبے یا شوق کا کیا کام؟ میرے لیے یہی کیا کام ہے کہ میں نے حج کر لیا جب کہ دوسرے بہت سے لوگ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی اور چہرے پر فخر سمجھتا ہوں۔"

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ "میرا خیال ہے بقیہ باتیں نماز کے بعد ہو جائیں گی، آؤ پہلے ہم سب نماز پڑھ لیں۔"

اس شخص نے فوراً جواب دیا۔ "بے شک، بے شک۔ پہلے نماز پڑھ لیں۔"

وہ شخص فوراً وضو کے لیے بھاگا۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ آپ نے دیکھا وضو میں وہ بار بار ہاتھ دھو رہا ہے پھر چہرہ دھویا تو تین کے بجائے چار مرتبہ دھویا اور جب ایک بار زیادہ کا خیال آیا تو دوبارہ دھونے لگا اور پانچ مرتبہ دھو گیا۔ پھر غلطی کا احساس ہوا تو تیسری بار چہرے پر پانی پھیرنے لگا اس طرح مسلسل دوسووں میں جتا رہا۔

آپ نے فرمایا۔ "مغرب کا وقت تنگ ہوتا ہے، خدا کے لیے وضو سے جلد از جلد فارغ ہو جاتا کہ نماز میں تاخیر نہ ہو۔"

یہ مشکل وضو کر کے آیا اور امام کی جگہ جا کھڑا ہوا۔ آپ کسی اعتراض کے بغیر اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پہلی رکعت میں ہی اس نے تین سجدے کیے۔ یہاں تک کہ نماز کے ختم ہوتے ہوئے اس نے کئی سجدے غلط کیے۔

آپ نے دوبارہ نماز ادا کی اور اپنے مریدوں سے فرمایا۔ "تم سب اس کے علم کی تعریفیں کیا کرتے تھے؟ اس علم کی جو سہو اور وسوسوں کا شکار ہے۔ جس شخص کو وضو اور نماز کے پانچ وقتی معمولات میں دوسووں نے تنگ کر رکھا ہو، میں اس کی طبیعت پر کبھی یقین نہیں کروں گا۔ اس کا ظم بھی اسی طرح سہو اور وسوسوں میں مبتلا ہوگا۔"

ناقابل معافی

ڈاکٹر شیر شاہ سید

مغربی معاشروں کے جدید ایجادات اور دریافتوں کا انداز تو انسان اپنا لیتا ہے لیکن ان کی ترقیوں کا راز جان کر بھی اس سے نظریں چرا لیتا ہے کیونکہ ... ان پر عمل کرنے کا مطلب خود کو نظم و ضبط اور قوانین کا پابند بنانا ہوتا ہے جبکہ ہمارے یہاں کیسا نظم و ضبط اور کیسے قوانین۔ یہاں تو حلو اکھانا اچھا لگتا ہے اور کڑوا ہادام تھوکتا پڑتا ہے۔

ایک مضبوط معاشرے کے منظم اصول اور اس کے اثرات و ثمرات کا احوال



متاثرین زلزلہ وہاں رہیں، کمپ میں ان کے کھانے پینے کا بھی انتظام تھا۔ بیس ہزار ٹینٹ ہم لوگ بانٹ چکے تھے اور اب ایک کمپ اسپتال کا بندوبست کرنا تھا۔ کمپ یونان کے کسی چھوٹے سے قصبے سے آرہا تھا۔ مجھے الفریڈ ویمن کا سی کا ای میل آیا پھر فون آیا کہ ایک نکلوس ریگلوو اسکیمو یونان سے آیا تھا۔ مجھے ای میل کے ذریعے پیغام ملا کہ نکلوس کو ... زبردستی سے لینا ہوگا۔ میں اس وقت مانسہرہ میں تھا جہاں ہم لوگوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا تھا اور جہاں سے مختلف کام کر رہے تھے۔ مانسہرہ میں ہم نے دو کمپ بنائے تھے تاکہ

جو عشق الہی موجزن ہے، اس نے تیری سرگوشی کو میرے دل تک پہنچا دیا۔“ آپ نے معافی چاہی۔“ اسے واعظ! جب تو اپنے رب کا اتنا بڑا عاشق ہا مراد ہے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا کیونکہ سب کچھ اپنے سینے میں چھپا کر لے جانا، یہ عاشقوں کی شان اور حوصلے کے خلاف ہے۔ اپنے علم اور بصیرت سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا۔“

واعظ نے دور ہی سے جواب دیا۔“ جناب! آپ تو یہ نہ کہیے۔ آپ کا جو مقام ہے اس سے میں واقف ہوں۔“ آپ نے فرمایا۔“ اسے شخص! میں نادم اور شرمندہ ہوں گو کہ تیرے مرتبے اور بزرگی کا ہر ایک کو علم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود دلوں پر تیری زبان کا زور نہیں چل رہا۔ اپنے وعظ میں اثر بھر دے تاکہ جو بھی تیرا وعظ سن کر اٹھے، اپنے آپ میں نہ رہے۔“

واعظ نے جواب دیا۔“ اے ابوالعاس! اگر یہ بات اپنے بس کی ہوتی تو آپ کی مجلس کے لوگ آپ کی صحبت سے ہرگز مستغنی نہ ہونے لگتے۔ جس دل میں جتنی صلاحیت ہوتی ہے میری باتوں کا اتنا ہی اثر قبول کر لیتا ہے اور کچھ بات تو یہ ہے کہ اثر پذیر کی تو فیق اللہ ہی کی طرف سے ہے۔“

آپ یہاں سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور وہاں کچھ دن قیام کر کے پھر واپس قاہرہ آگئے۔ ایک دن آپ بڑے جذبے اور جوش میں تھے، اپنے مریدوں سے پوچھا۔“ کیا تم میں کوئی ایسا ہے جو مجھے فقی (جہان مرد) اور فتوت (جو امر دی) کا مطلب سمجھا دے۔“

کئی نے لب کھولنا چاہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ ایک نے سب کی یہ کیفیت محسوس کر لی، بولا۔“ حضرت! ہم میں کئی ایسے ہیں جو آپ کے سوال کا جواب دے سکتے ہیں لیکن آپ کا رعب ان پر غالب ہے اور ان میں اتنی قوت بھی نہیں کہ آپ کے سامنے لب ہلا سکیں شاید اگر وہ ایسا کر سکتے تو یہی فقی اور فتوت کہلاتے۔“

آپ نے جواب دیا۔“ نہیں، یہ بات ہرگز نہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صاحب فتوت تھے، انہوں نے حسی جوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اے لوگو! تمہارے سامنے بھی پانچ بت ہیں۔ پانچ معنوی بت اگر تم ان جوں کو توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ تو فقی کہلاؤ۔“

کسی نے سوال کیا۔“ پانچ معنوی بت کون کون سے ہیں؟“ آپ نے جواب دیا۔“ پہلا بت نفس، دوسرا ہوا و ہوس، تیسرا شیطان، چوتھا شہوت اور پانچواں دنیا ہے۔“ لوگوں نے نعرہ خمیں و آفریں بلند کیا اور بڑی دیر تک بے حال رہے۔ آپ فتوت اور فقی پر بڑی دیر تک بولتے رہے۔

☆☆☆ آپ ایک عرصے تک اپنی تعلیمات اور تشریحات سے لوگوں کی نفسی بجاتے رہے۔ آپ زندگی کے ہر شعبے پر کھلی تنقید کر دیا کرتے تھے، چنانچہ کسی فقیر کو دیکھتے اور اس سے چند باتیں بھی کر چکے تو بڑے انوس سے فرماتے کہ صحیح معنوں میں فقیر وہ ہے جس کے دل کا حجاب دور ہو چکا ہو۔“

مختلف صوفیوں اور عالموں کے بارے میں سوالات لے کر لوگ حاضر یاں دیتے اور آپ ان سب کو اپنے مدلل اور ... دل نہیں جواب سے خاموش اور مطمئن کر دیتے۔

آپ آخری عمر میں زندگی سے بے زار ہو گئے تھے اور جب 686ھ میں آپ نے وصال فرمایا تو ہر طرف ایک کھرام مچ گیا۔ آپ کے عقیدت مند روتے روتے بے حال ہو گئے لیکن وہ آفتاب عظمت و بزرگی ایک بار جو فنا کی وادی میں اترا تو پھر بھی واپس نہ آیا۔ یوں تو سبھی کو مرنا ہے اور ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن ابوالعاس کی وفات آفتاب کے غروب ہو جانے کی طرح تھی۔ چاروں طرف غموں کی بدلیاں چھا گئیں اور لوگ اپنے دامنوں اور رداؤں میں منہ چھپا چھپا کر رو لیا کرتے تھے۔

کہانی کے قاری بھی مآخذ

سید ابوالحسن ندوی	ابن اثیر	منہاج سراج	علامہ عبدالوہاب	سی جعفر جریڈا طبری	لسعودی
-------------------	----------	------------	-----------------	--------------------	--------

اقوال زریں
 ☆ برے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے تنہائی بہتر ہے۔
 ☆ کم یونٹنٹ مندی ہے۔
 ☆ مصیبت کا شکوہ نہ کرو اس سے اللہ تعالیٰ ناراض اور دشمن خوش ہوتا ہے۔
 ☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت برتی ہے۔
 مرسلہ: محمد صفدر معاویہ، خانیوال

چھوٹے سے ناؤن میں زلزلہ زدگان کے لیے کچھ امداد جمع کی گئی ہے۔ کنگولس اس ناؤن میں میز کا انکیشن لڑنے والا تھا اور بہت زیادہ مقبول بھی تھا۔ اس نے امدادی ہم خود ہی تنظیم کی تھی جس کے بعد لوگوں نے اسے امداد دینا شروع کر دی۔ جب امداد جمع ہو گئی تو ناؤن ہال میں باضابطہ میٹنگ ہوئی اور کنگولس ریگلو اوسٹیو نے ڈنٹ واری لی کہ تمام رقم خود پاکستان کے شمالی علاقوں میں جا کر امدادی کام کرنے والوں کو دے گا۔ ناؤن ہال میں موجود لوگوں نے زبردست تالیاں بجا گئیں۔ کنگولس کی شان میں تقریریں کی گئیں جو اپنا وقت نکال کر اسلام آباد جانے کے لیے تیار تھا کہ امدادی رقم زلزلہ زدگان تک پہنچا دے۔

یہ ساری باتیں مجھے الفریڈو دین کا سی نے بتائیں۔ الفریڈو میرا پرانا دوست تھا۔ ہم دونوں لندن کے ایک کلیٹ میں ایک ساتھ مقیم رہے تھے۔ وہ ایک چب میں کام کرتا تھا اور میں چیزنگ کراس کے علاقے میں ایک پاکستانی ریسنورنٹ میں بھرتا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھ رہے تھے۔ وہ انگلش لٹریچر پڑھنے آیا تھا اور میں سوشیالوجی میں ماسٹر ز کر رہا تھا۔ ہم دونوں کی خوب بنتی تھی۔

یونانی لوگ بھی خوب مسالے دار کھانا کھاتے ہیں۔ تیز مرچیں، بہت سارا گوشت، ان کی اپنی ایک خاص قسم کی پیاز ملی ہوئی روٹی ہوتی ہے، اوپر سے شراب کے گلاس، نہیں بلکہ جار۔ الفریڈو کو میرے پکائے ہوئے چاول اور پاکستانی ہوٹلوں کا نان بہت پسند تھا۔ ہم دونوں کی خوب دوستی تھی۔ دونوں ساتھ گھومے، ساتھ ہی بہت سی شراب بھی پی اور بہت سی لڑکیوں دوستیاں بھی کیں۔ میرے عشق عام طور پر ناکام ہو جاتے تھے اور الفریڈو کی تلاش میں لڑکیاں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔ وہ

پیدا کی عاشق تھا اور کمال کارومان پرور۔
 پاکستان واپس آنے سے چھ ماہ پہلے میں الفریڈو کے ساتھ یونان بھی گیا، اس کے ماں باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی سے ان کے گاؤں جا کر ملا۔ وہ بڑے گرم جوش لوگ تھے، بہت پیار سے ملے اور ایسے ہی خاطر کی جیسے ایٹ آباد میں میرے گھر والے کرتے۔

الفریڈو نے تو مجھ سے اور اپنی بہن سے کہا بھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں، ڈیٹنگ کریں اور مجھ سے اس نے جس کر کہا کہ یونان والے مجھے داماد بنا لیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی اتنا ہی پاگل ہوں جتنا کہ یونانی پاگل ہیں۔ شاید اس کی بہن کو میں نہیں بھلا پاؤں اور باوجود اس کی خوب صورتی، گرم جوشی و چچی اور جاذب نظری کے میں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا کہ پاکستان واپس جانے کا پروگرام ختم کر دوں اور یونان کا داماد بن جاؤں۔

وہ ایک ہفتے کی دلچسپ ملاقات تھی۔ شاید ہلکا سا شعلہ دونوں طرف جلا، الفریڈو نے ہوا دینے کی کوشش بھی کی مگر یہ شعلہ آگ نہیں بن سکا۔ میں واپس لندن پھر لندن سے ایٹ آباد آ گیا۔ ایٹ آباد میں ہی میں ایک تنظیم میں شامل ہو گیا اور علاقے کی ترقیاتی سرگرمیوں کے کاموں میں لگ گیا۔

الفریڈو سے میری ملاقات، اپنا ٹیل اور کئی کئی فون پر ہوتی رہتی تھی۔ پھر اچانک یہ زلزلہ آ گیا۔ ہمارے علاقے میں ایسے ہنگامی حالات بھی نہیں آئے، میں نے زندگی میں ایسی افراتفری نہیں دیکھی، دیکھتے دیکھتے ایٹ آباد، مانسہرہ، بالا کوٹ، مظفر آباد، بشام میں دنیا بھر کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ پاکستانی اداروں کے علاوہ فرانس کے ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم کے ڈاکٹر، کینیڈا اور امریکا کے فوجیوں کا میڈیکل کیمپ، روس، یوکرین کے ڈاکٹر اور نرس، ترکی، ایران، سعودی عرب اور امارات کی ٹیم اور نہ جانے کون کون سی تنظیمیں آتی چلی گئیں۔

میں سب سے زیادہ کیوبا کی ٹیم سے متاثر ہوا۔ سیکڑوں کی تعداد میں یہ لوگ آگئے تھے اور انہوں نے کئی گروپوں کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کیا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نرس، سرجن، کارڈیالوجسٹ، آپریشن تھیمز، فیکیشن، ڈسپینسر، فارماسسٹ، پلاسٹر کرنے والے، صفائی کرنے والے وغیرہ وغیرہ۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ کہیں بھی رہنے کو تیار تھے، کسی بھی جگہ پر اپنے ٹینٹ لگا کر گرم ٹھنڈے پانی کی فکر سے بے نیاز۔ خدمت کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ہمارے پاکستانی ڈاکٹر اگر کچھ کر رہے تھے تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ یہ تو ہمارے اپنے لوگ تھے، ہم نہیں کرتے تو کون کرتا۔ کیوں باسے کیا تعلق تھا ہمارا، انہیں کیوں فکر تھی ہماری۔

ان ہنگامی حالات میں، میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت سے پاکستانی ڈاکٹر و دن بھی کام نہیں کر سکے کہ انتظامات اچھے نہیں ہیں، پانی گرم نہیں ہے، رات بڑی ٹھنڈی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور تو اور کچھ لوگ تو صرف تصویریں کھینچوانے آئے اور ٹیلی ویژن پر ماہر بن کر ایسی باتیں کرتے تھے کہ مجھے غصہ کم اور ہمتی زیادہ آتی اور اپنی قوم کے پڑھے لکھے لوگوں کی حرکتوں اور ذہنی افلاس کو دیکھ کر آنسوؤں ہوتا تھا۔

ہماری حکومتوں نے پچاس برسوں میں نہ پانی مہیا کیا، نہ سیوریج سسٹم اور نہ ہی پرائمری ہیلتھ کیئر۔ ہمارا علاقہ تو سیر و تفریح کی ایک ایسی جگہ تھی جسے ایک انخوا شدہ طوائف کی طرح لونا گیا ہو۔ عوام کی قسمت جیسی پہلے تھی اب بھی ویسی ہے۔ اب زلزلے کے بعد اربوں کی امداد آگئی تھی اور حکومت امداد کو اپنے طریقے سے خرچ کر رہی تھی، اسی طریقے سے جیسے حکومتیں کرتی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں پلاننگ کرنے والوں سے کہتا کہ کچھ نہ کریں صرف صاف پانی اور سیوریج کا نظام بنا دیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں تک پتلی پتلی سڑکیں پہنچا دیں، بسک ہیلتھ یونٹ کی بندشیں نہ بنائیں، پرائمری بلڈنگوں کو ہی مرمت کر کے وہاں ڈاکٹر اور نرسوں کا انتظام کر دیں۔ مگر یہ سارے کام تو بہت ہی چھوٹے کام تھے اور حکومتیں چھوٹے کام نہیں کرتی ہیں۔ ان کے بڑے کام ہوتے ہیں، میگا پروجیکٹ، موٹروے، اسٹیم بم، کالا باغ ڈیم وغیرہ وغیرہ۔

کنگولس انرپورٹ پر آسانی سے مل گیا، وہ چھوٹے قندکار، مونا سا گورا چنا آدمی تھا، بولتا بہت تھا اور اس کی انگلش بھی اچھی تھی۔ میں اسے انرپورٹ سے سیدھا مانسہرہ لے جانا چاہ رہا تھا مگر اس نے کہا کہ اسے میریٹ ہوئی ہے ہو کر جانا ہے۔ ہم لوگوں نے میریٹ میں چائے پی۔ کنگولس نے کاؤنٹر پر کچھ معلومات حاصل کیں اور پھر ہم لوگ مانسہرہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ رات تنظیم کے دفتر کے مہمان خانے میں گزری تھی۔ کنگولس نے بتایا کہ الفریڈو آج کل بڑا صحافی بن گیا ہے۔ اس نے اپنے شہر کے بہت سارے قصبے سنائے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح سے الفریڈو نے اسے کہا تھا کہ پاکستان کے لیے میسج جمع کرے اور اس طرح سے انکیشن سے پہلے ہی وہ توجہ کا مرکز بن گیا اور اب انکیشن میں اس کی کامیابی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے چھوٹے سے ساحلی شہر کے

لوگوں نے کئی طریقوں سے زلزلہ زدگان کے لیے چندہ جمع کیا۔ پورٹ کے ملازمین اور اسکول بچروں نے ایک دن کی تنخواہ دی، اسکول میں بچوں نے پیسے جمع کیے، شہر کے ہر دکاندار نے ایک ایک دن کی آمدنی کا تیس فیصد دیا اور اب اس کے پاس ستانوے ہزار یورو تھے جس کو اس نے یہاں خرچ کرنا تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے ناشتے کی میز پر ہی کر لیں۔

ایک چھوٹے سے یونانی شہر میں پاکستان کے زلزلہ زدگان کے لیے اتنی رقم بھی جمع ہونا بڑی بات تھی۔ اس نے الفریڈو کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ سیاست میں جانے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
- ☆ شہر اور علاقے کا نام۔
- ☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

راپڑ اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس
 03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ ہیلی کیسٹنز

سٹنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

63-C III سٹیشن ڈسٹریکٹ اتارنی من کوئی راولپنڈی

www.jdpgroup.com

35802552-35386783-35804200
 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

چھان بین

تنویر ریاض

جس طرح ایک دنیا انسان کے اندر اور دوسری باہر آباد ہوتی ہے اسی طرح سرحدوں کے اس طرف اور اس کی دوسری جانب زندگی کا رنگ ڈھنگ بھی نرالا ہوتا ہے۔ اس نے مغربی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس کی رنگینیوں میں گم ہو گئی... اس کے باوجود کوئی ایک رنگ بھی اس کی شناخت نہ بن سکا حتیٰ کہ عاشقوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو گئی مگر کوئی ایک نام بھی آخری نہ ہو سکا۔

جیون ساتھی کی تلاش اور چھان بین میں جیون تمام کرنے والی ایک دو شیرو کی سراغ رسانی

جب لیانا نے جیری کو اس کے پارمنٹ کی بلڈنگ کے باہر کھڑی ارغوانی رنگ کی وین میں سوار ہوتے دیکھا تو اسے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اس وین کی ڈرائیور والی سائڈ پر سفید رنگ سے میڈولارک نمری لکھا ہوا تھا۔ یہ واقعی غور طلب بات تھی کہ جیری اس وین میں کیوں سوار ہوا تھا، کیونکہ اس سے پہلے اس نے اسے ہمیشہ سفید رنگ کی سید ان کار چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیانا نے اس وین کو بھی اپنے ذہن میں موجود دوسرے سوالوں کی فہرست میں شامل



ضرورت نہیں ہے بلکہ نکولس کی مہمانداری بھی بند کر دی جائے۔ یہ رویہ بالکل بھی قابل قبول نہیں تھا۔
الفریڈو نے زیادہ بات نہیں کی مگر اس کے لہجے کا غصہ بتا رہا تھا کہ اسے بہت افسوس ہوا ہے۔ اسی وقت میں نے نکولس کو ٹیکسی کرا دی۔ اس نے میرے اس یکا یک فیصلے پر حیرت کا اظہار کیا مگر الفریڈو کے فون کے بعد وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ فوراً ہی اسلام آباد چلا جائے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ میریٹ ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

اسے میں نے ایک ہفتے بعد میریٹ ہوٹل میں ہی دیکھا۔ میں ڈبلیو ایچ اے کی ایک میٹنگ ختم کر کے باہر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ مجھے وہ نظر آیا ایک سٹی ٹائم کے ساتھ۔ ان کے ساتھ دو عجیب قسم کی عورتیں بھی تھیں۔ بڑے بے ڈھنگے طریقوں سے وہ سب ہنس رہے تھے، مجھے یقین تھا کہ ان سب نے چڑھائی ہوئی ہے۔

وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آیا، ہاتھ ملایا اور بولا کہ میں نے پیسے ان لوگوں کو دے دیے ہیں۔ مجھے رسید بھی مل گئی ہے اور آج رات میں واپس جا رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ کیا کہتا، گڈ لک بول کر آ گیا۔ میں اس ٹائم کو جانتا تھا، اس کے بہت سے قصے مشہور تھے۔

دو ماہ بعد الفریڈو کا فون آیا، اس نے معافی مانگی کہ اس نے نکولس کو پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ ٹریننگ لوگوں کی بات اور ہے، میرے یا تمہارے چاہنے اور نہ چاہنے سے لوگ اپنا جسم بیچنا بند نہیں کریں گے۔ یہ تو چلتا رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ اگر پاکستان جا کر وہ کسی طوائف کے ساتھ وقت گزارتا ہے تو کسی کو بھی تکلیف نہیں ہونی چاہیے لہذا میں نے تمہاری بات ہنسی میں اڑا دی تھی لیکن نکولس نے جو جعلی رسید کی بات کی وہ قابل برداشت نہیں تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔

اس نے مجھے ہنس کر بتایا کہ مقبول ہونے کے باوجود نکولس میٹر کا ایکشن ہار گیا ہے۔ الفریڈو نے ہی اس کے خلاف مہم چلائی تھی، لوگ ہر بات معاف کرنے کو تیار تھے لیکن یہ انہیں منظور نہیں ہوا کہ مانی بد عنوانی میں اس کا ساتھ دیں۔ لوگوں نے اس کے خلاف ووٹ ڈالا۔ وہ اپنے شہر کا میٹر کسی بد عنوان کو کیسے بناتے۔

مجھے نکولس کے ساتھ بیٹھا ہوا ناظم یاد آ گیا جس نے اسے جعلی رسید بھی دی، طوائفیں بھی میا کیں اور ایکشن بھی جیت گیا تھا۔

کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کی حیثیت بہت مضبوط ہے کیونکہ اس کا نام ایک ایماندار صحافی کی طرح جانا جاتا ہے۔ میں حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

اخبارات میں خبر تھی کہ مانسہرہ سے مظفر آباد کے راستوں پر ٹرک روک کر زبردستی امدادی سامان چھین لیا گیا ہے۔ ایک ناظم نے سامان اپنے گھر پر اتار لیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جب لاکھوں لوگ زلزلے کا شکار ہو گئے ہوں، زندہ جسم لمبوں کے گھپ اندھیروں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے ہوں، انسان، انسان کو لوٹے یہ تو بڑا اندھیرا ہے۔

شام کو عجیب بات ہوئی، میں نے نکولس کے لیے مری میٹر کی کچھ یونٹوں کا انتظام کر دیا تھا جنہیں اس نے اچھے یونٹوں کی طرح پانی سمجھ کر خوب پیا۔

شام کو اس نے فرمائش کر دی کہ کسی لڑکی کا بندوبست کیا جائے۔ میں سمجھا وہ مذاق کر رہا ہے لیکن جب میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تو اس نے کہا کہ لڑکی کا مطلب ہے کہ کسی طوائف کا انتظام ہو۔ مجھے سخت غصہ آیا اور میں نے سختی سے کہا کہ وہ ایسی فرمائش نہ کرے تو بہتر ہے۔ ساتھ ہی میں نے اسی وقت الفریڈو کو فون بھی کیا اور اسے نکولس کی فرمائش بتائی۔

الفریڈو نے فون بند کر کے مجھے خود ہی فون کیا اور دوسری طرف سے اس کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی اور اس نے ہنسنے ہوئے کہا کہ اس کا جواب تو بہت آسان ہے۔ اسے کہہ دو کہ تم طوائف کا بندوبست کر سکتے ہو۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ مجھے اس کے ہنسنے پر تھوڑی حیرت ہوئی۔

دوسرے دن نکولس نے کچھ اور ہی فرمائش کر ڈالی۔ اس نے کہا کہ دو دن اس نے کام دیکھ لیا ہے، دو دن میں وہ واپس جانا چاہتا ہے۔ جتنی رقم اس کے پاس ہے اس سے ہم لوگ مزید ٹینٹ خریدیں اور اس کا انتظام چلائیں۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ کسی بھی ٹینٹ بستی کے سامنے اس کی تصویر لے لی جائے۔ دوسری فرمائش یہ تھی کہ اسے ستانوے ہزار یورو وصول کرنے کی رسید دی جائے جبکہ وہ ہمیں چوالیس ہزار یورو دے گا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔

میں نے رات پھر الفریڈو کو فون کیا۔ میں نے طوائف کے سلسلے میں اس کے روٹے کی شکایت بھی کی اور نکولس کا نیا مطالبہ بھی بتایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے الفریڈو کی زبان کسی نے کاٹ دی ہے۔ تھوڑی دیر توقف کے بعد اس نے بڑے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا کہ نکولس کو جعلی رسید دینے کی

کر لیا جن کے جوابات ابھی ملنا باقی تھے۔ وہ ابھی تک جیمز کی بہت سی باتوں کو نہیں سمجھ پائی تھی مثلاً جب اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ اس کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیتا تھا۔ اس کے پارٹنر میں کافی کی میز پر مختلف نوعیت کے رسالوں کا ڈھیر بھی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ ان تین تصویروں کے بارے میں بھی جاننا چاہتی تھی جن میں وہ ایک چھوٹے سے طیارے کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اور جسے وہ اپنی ذاتی ملکیت بتاتا تھا جبکہ اس کے پارٹنر میں موجود فرنیچر کرائے کا تھا۔ اس کا اندازہ لینا تو اس وقت ہوا جب وہ اپنے چشمے کا کیس اٹھانے کے لیے فرش پر جھکی تو اس کی نظر کاؤچ کے نیچے لگے ہوئے کمپنی کے اسٹیکر پر پڑی اور اب یہ زسری وین کا معاملہ سامنے آ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا کاروبار ہو لیکن جیمز نے بھی اس کے بارے میں بتایا نہیں۔ جیمز سے اس کی ملاقات کو دو مہینے سے بھی کم کا عرصہ ہوا تھا لیکن اس دوران ایسی بہت سی باتیں سامنے آئیں جن کی چھان بین ضروری تھی۔

جونکی جیمز کی وین روانہ ہوئی، لینا نے بھی فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا پھر اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ ایک بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے اور اگر وہ اس کا تعاقب جاری رکھتی تو اسے اپنے کام پر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ ویسے بھی اسے اس تعاقب کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا۔ لہذا اس نے وین کا پیچھا کرنے کے بجائے اس کا لائسنس نمبر سینٹ پر رکھے ہوئے پیڈ پر لکھ لیا۔ وہ اس نمبر کے ذریعے وین کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی تھی لیکن فی الحال اسے یہ کاغذ اس فائل میں رکھنا تھا جو اس نے مسٹر جیمز جیمز جونیکز کے نام سے کھولی تھی۔

☆☆☆

آٹھ مہینے پہلے اس نے بوائے فرینڈ نمبر سولہ یعنی سام کی فائل بند کر دی تھی۔ وہ چھوٹا ہونے کے علاوہ بڑبولا بھی تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس کے مدد پر بڑے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر بے چینی محسوس کرنے لگی تھی۔ مثلاً اس کا یہ دعویٰ کہ وہ پیشہ ور کاررہیں ڈرائیور رہ چکا ہے، کسی طرح بھی ان حالات سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جو وہ دیکھ رہی تھی۔ اگر اس کا دعویٰ سچ ہوتا تو وہ ڈنر کے بعد کار چلاتے ہوئے ایک حادثے سے بال بال نہ بچتا۔ اگر عین وقت پر دوسری کار کا ڈرائیور ہوشیاری نہ دکھاتا تو دونوں کاروں کا ٹکرائنا یقینی تھا لیکن اس وقت تک اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ پہلی ملاقات میں قائم ہونے والے تاثر پر بھروسہ کر کے کیونکہ ماضی میں

بھی اس طرح کے تجربات ناکام ثابت ہوئے تھے۔ اگر اس میں لوگوں کو سمجھنے کی پرکھ ہوتی تو صرف چوبیس سال کی عمر میں وہ ستر حواں تعلق قائم نہ کر رہی ہوتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک اس نے جتنے لوگوں سے بھی دوستی کی، ان سب نے اس سے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپایا جس کی وجہ سے ہر تعلق ٹوٹتا چلا گیا۔ کبھی بھی وہ سوچتی کہ کاش اس کے پاس ایسا آلہ ہوتا جس کے ذریعے وہ لوگوں کے بھید جان سکتی۔ اس طرح کم از کم وہ ان بے نتیجہ تعلقات سے محفوظ رہ سکتی تھی۔

بوائے فرینڈ نمبر چودہ یعنی جیک کی مثال سامنے تھی۔ اس نے لینا سے بہت سی باتیں چھپا رکھی تھیں لیکن لینا نے باتوں باتوں میں بہت کچھ جان لیا۔ مثلاً اس کے ایک دوسری عورت سے بھی تعلقات تھے اور اس نے وقتی طور پر سینڈی سے ملنا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ حیران تھی کہ جیک ایک جانب تو اس سے تعلق قائم کیے ہوئے تھا اور دوسری جانب دوبارہ سینڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی وجہ اسے بعد میں کسی اور ذریعے سے معلوم ہوئی کہ اسے بلیاں پسند نہیں تھیں بلکہ وہ ان سے نفرت کرتا تھا جبکہ لینا کو اپنی پالتو بی "نے" سے بہت پیار تھا اور جتنی دیر وہ گھر پر رہتی ہے اس سے ایک منٹ کے لیے بھی الگ نہ ہوتی۔ یہ بات اگر وہ خود لینا سے کہہ دیتا تو شاید اسے زیادہ صدمہ نہ ہوتا لیکن افسوس وہیں وقت ہوا جب اس نے میگی کی پارٹی میں دوسرے لوگوں سے یہ بات کہی۔ لینا جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اس نے شخص اپنی حرکت پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ جواز تلاش کیا ہے۔

کچھ اسی طرح کا معاملہ بارہویں نمبر کے بوائے فرینڈ راجر کا تھا۔ جیک کے برعکس اس کا صرف ایک ہی راز تھا اور اسی لیے لینا کو اس کی فائل دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ وہ اسے یاد رکھ سکے۔ اس نے لینا سے یہ بات چھپائی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اس ایک خامی کے علاوہ ان کا تعلق ٹھیک ٹھاک انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اور اس وقت وہ سوچا کرتی تھی کہ شاید راجر سے ملنے کے بعد اس کی تلاش ختم ہو جی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کام کی زیادتی کا بہانہ کر کے وہ ملنے کا وعدہ پورا نہیں کر پاتا جس پر وہ خفا ہو جاتی۔ یہ بھید اس وقت کھلا جب راجر نے فون کر کے اسے مطلع کیا کہ وہ وعدے کے مطابق اس کے ساتھ ڈنر نہیں کر سکے گا کیونکہ اسے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ لینا کو اپنی شام ضائع ہونے کا بہت افسوس ہوا۔ وہ بوریٹ دور کرنے کی خاطر گھر سے نکلی اور بلا ارادہ ہی شاپنگ مال کی طرف چل دی۔

جہاں اس نے راجر کو اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا۔ اس کے بعد بھی اگر وہ سچ بیان کر دیتا تو وہ کاؤنٹی ریکارڈ آفس کا چکر لگانے سے بچ جاتی۔ جہاں اس نے راجر کی شادی کا سرٹیفکیٹ تلاش کر لیا۔ اسی طرح رجسٹرار کے دفتر سے بھی تصدیق ہو گئی کہ راجر جس مکان میں رہتا تھا، وہ راجر عین اور جین تھامس عین کی مشترکہ ملکیت ہے۔

ماضی کے انہی تجربات کی روشنی میں اس نے فیصلہ کیا کہ گھر واپس جانے سے پہلے وہ ایک چکر ساتویں اسٹریٹ پر واقع کپیولاگ کے دفتر کا بھی لگالے۔ جیمز کی کہنا تھا کہ وہ اسی سوٹ ویزر کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں اس وین کو تلاش کیا لیکن اس کی جگہ اسے جیمز کی سفید سیڈان کھڑی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ شاید وین کمپنی کی ہو پھر اسے خیال آیا کہ فون کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ دفتر میں ہے یا نہیں۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے سڑک کے آخری کونے پر واقع شاپنگ مال میں گئی جہاں سے اس نے بے فون کے ذریعے اس کا نمبر ملایا۔ اس عین کے ساتھ کہ وہ اس سے بات کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

☆☆☆

لینا جیمز سے بیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر اپنے پارٹنر میں پہنچی جو پام کے درختوں سے گھری ایک پرانی عمارت میں تھا۔ بیڑھوں کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک لمبے کے لیے اپنی پالتو بی نے کے پاس رکی جس نے ادھ کھلی آنکھوں سے اس کا استقبال کیا۔ پھر اس نے عقبی کمرے کا دروازہ کھولا جہاں لکھنے کی میز اور ایک فائل کینٹ رکھی ہوئی تھی۔ پہلے یہ میز بیٹنگ روم میں رکھی ہوئی تھی لیکن اکثر اس کے دوست کافی پینے یا اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے ساتھ چلے آتے تو اسے یہ پریشانی لاحق ہو جاتی کہ کہیں وہ ان فائلوں کو نہ بڑھائیں جس میں اس نے ان کے بارے میں تمام تفصیلات لکھ رکھی ہیں، ویسے تو وہ اپنی فائلیں تالے میں رکھتی تھی لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ میز پر کوئی کاغذ رکھا رہ جائے جس پر کسی بارے کے میں کوئی خاص بات درج ہو جیسا کہ کئی مہینے پہلے بوائے فرینڈ نمبر سولہ یعنی سام کی آمد کے موقع پر ہوا تھا۔

وہ ڈنر کے بعد اس سے معذرت کر کے ہاتھ روم تک گئی۔ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ سام اس کی میز کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے پھر اسے یاد آیا کہ اس نے ایک کاغذ پر یونائیٹڈ امریکن کافون نمبر درج کیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگلے روز صبح فون

کر کے وہ تصدیق کرے گی کہ آیا وہ واقعی بزنس فور پر میکسیکو جا رہا ہے۔ راجر والے تجربے کے بعد وہ کسی پر اتنی آسانی سے بھروسہ نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے بھی سام کاربن سہن اسے کھلتا تھا۔ اس کی تنخواہ میں ہزار ڈالرز سالانہ تھی لیکن وہ جیتی سوٹ پہنتا اور ریڈ روڈ جیسی مہنگی گاڑی اس کے استعمال میں تھی۔ وہ اس معمولی تنخواہ میں یہ سب کیسے انورڈ کر رہا تھا۔ کیا اس کا گزارہ ادھار پر تھا یا اس کا کوئی اور بھی ذریعہ آمدنی تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا بوائے فرینڈ کوئی غیر قانونی کام کرے۔

سام میکسیکو ضرور گیا لیکن کمپنی کے کام سے نہیں جیسا کہ اس نے لینا کو بتایا تھا بلکہ وہ منشیات کی تجارت کرتا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ کچھ کر رہی تھی اور سام کے ساتھ تعلق کے نتیجے میں وہ بھی صرف پولیس ہی نہیں بلکہ ایف بی آئی کی نظروں میں بھی مشتبہ قرار پائی۔ وہ خود ڈیپٹی سروس میں کام کرتی تھی اس لیے پولیس کو شبہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی... آؤکار بن سکتی ہے جو منشیات لے جانے اور اس کی سپلائی کا کام کرتا ہو۔ وقتی طور پر تو وہ پولیس اور ایف بی آئی کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اس کے ساتھ ہی سام اور اس کا مختصر تعلق بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

لینا نے میز کے اوپر نکلے ہوئے باکس میں سے ایک نیا فولڈر نکالا۔ اس پر ایک لیبل چسپاں کیا اور جیمز جیمز جونیکز نمبر سترہ کے الفاظ لکھ دیے۔ پھر اس نے رائٹنگ پیڈ سے ایک کاغذ پھاڑا اور اس پر وین سے متعلق وہ تمام تفصیلات لکھ دیں جو اس نے اپنی کار میں رکھے ہوئے پیڈ پر درج کی تھیں پھر اس نے جیمز کے دفتر جانے اور وہاں پارکنگ لاٹ میں وین کے بجائے اس کی سیڈان کار کی موجودگی کے بارے میں بھی لکھا۔ اس کے علاوہ اس نے جیمز سے متعلق وہ چھوٹی موٹی باتیں بھی لکھ دیں جو وہ اب تک نوٹ کرتی آئی تھی لیکن وہ اتنی اہم نہ تھیں کہ ان کی وجہ سے جیمز کی فائل کھولی جائے۔ آخری نکتہ جو اس نے تحریر کیا، وہ اس فون کال کے حوالے سے تھا جو اس نے دوپہر پونے تین بجے فون سے کی تھی اور اس کے جواب میں اسٹیبلشمنٹ کے لیے کہا تھا۔ "نہیں، جیمز جیمز جونیکز نام کا کوئی شخص یہاں کام نہیں کرتا۔"

لینا کو جیمز سے ملنے ہوئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ اس مختصر مدت کے دوران کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے۔ رات کو اسے جیمز کے ساتھ ڈنر کرنا تھا۔ جیمز نے بتایا تھا کہ اسے دیر تک دفتر میں کام کرنا ہوگا۔ اس لیے

بہتر ہوگا کہ وہ کسی ریسٹوران میں بیٹھیں۔ لینا نے آخری بار آئینہ دیکھ کر اپنے سر پر نظر ڈالی۔ سیاہ چست لباس میں وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی پھر وہ دل ہی دل میں ان سوالوں کو دہرانے لگی جو وہ ڈنر کے دوران اس سے کرنے والی تھی مثلاً یہ کہ ان دنوں وہ کس سوٹ ویئر منسوبے پر کام کر رہا ہے۔ اس کا جہاز کہاں کھڑا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جیسے ہی وہ ریسٹوران کی پارکنگ لاٹ میں پہنچی، اسے جیمری کی سیڈ ان نظر آگئی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے حلیے سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ اپنے کام سے سیدھا یہاں چلا آیا ہے۔ لینا کو دیکھ کر وہ اپنی کار سے باہر نکل آیا اور گرم جوش سے مصافحہ کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔“ وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

”اوہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہیں کم از کم اتنی فرصت تو مل گئی کہ میرے ساتھ ڈنر کرنے چلے آئے۔“ ایک لڑکی نے انہیں ان کی میز تک پہنچا دیا۔ لینا اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”آج کا دن کیسا گزرا؟“

”ہمیشہ کی طرح مصروف، سرکھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی اور تم کیا کرتی رہیں؟“

”میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے..... ویسے تمہاری کمپنی کبھی الگ کیا کرتی ہے؟“

وہ خود گلہا کی کے انداز میں اسے کمپنی کی مصنوعات وہاں... کام کرنے والوں کی تعداد اور... ہارڈویئر کے بارے میں بتانے لگا، ان میں سے کچھ نام اسے جانے پہچانے لگے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ ان کے بارے میں پہلے بھی ریڈیو پر سن چکی ہے۔ وہ اپنا ہوم ورک مکمل کر کے آیا تھا اور لینا دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی معترف ہو گئی۔ اس نے کپیوٹنگ کے بارے میں مزید کچھ سوالات کیے پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں کتنی بار اپنے جہاز کے ذریعے سفر کرنا ہوتا ہے؟“

”ہفتے میں ایک یا دو بار۔ جب کام سے تھوڑی فرصت مل جائے۔ تمہارے لیے کیا منگواؤں؟“

”ابھی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”کیا ذاتی جہاز رکھنا مہنگا شوق نہیں؟“

”ہاں۔ اس کے ایندھن، دیکھ بھال اور پارکنگ فیس پر ہی کافی خرچ ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے لیے بھنے ہوئے پارچے اور جپس منگواؤں۔“

لینا نے میز کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میرا خیال ہے

کہ یہی ٹھیک رہے گا۔ یہاں کی ہر چیز ہی اچھی ہوتی ہے، چونکہ جہاز رکھنا کافی مہنگا ہے اسی لیے تمہیں دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔“

جیمری کی بھوس تین گھنٹیں اور لینا کو یوں لگا شاید اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ جیمری جہاز کی ملکیت اور دیر تک کام کرنے کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کا مقصد اس کی دل آزاری نہیں تھا۔ اس لیے بات بناتے ہوئے بولی۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ تم کبھی مجھے اپنے ساتھ فلائنگ پر لے چلو؟“

”یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ یقیناً میں تمہارے ساتھ جانا پسند کروں گا۔ کیا تم نے یہاں کی سامن چھٹی بھی کھائی ہے؟“

”ہاں اچھی ہوتی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ تمہارا جہاز کہاں کھڑا ہوا ہے؟“

”مقامی ایئر پورٹ پر، میرے لیے وہ جگہ مناسب ہے۔“ اس نے مینیسوٹہ کیا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب جھکتے ہوئے بولا۔ ”اب تم مجھے اپنے دن کے بارے میں بتاؤ۔“

کوئی جواب دینے سے پہلے لینا نے بقیہ سوالات پوچھنے کا ارادہ منوی کر دیا اور فیصلہ کیا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کے تجربات نے اسے سکھایا تھا کہ پٹان بین میں بھی صبر کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اس ماہر آثار قدیمہ کی طرح جو مسلسل کھدائی کرتا ہے اور زمین کی تہیں صاف کر کے باقی کے نشانات تلاش کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ حال کی حقیقت جاننے کے لیے تحقیق کر رہی تھی۔ جب وہ کھانے کا آرڈر دے چکے تو وہ اسے اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں بتانے لگی کہ وہ کہاں کہاں گئی اور اس نے کیا چیزیں لوگوں کو پہنچائیں، وہ بڑے شوق سے سنتا رہا۔

جب بیرائل لے کر آیا تو وہ وہاں کا آخری گھونٹ لے رہی تھی۔ اس نے کن انہیوں سے جیمری کے چہرے کا جائزہ لیا اور فیصلہ کر لیا کہ کل اس کی چھٹی ہے۔ اس لیے وہ اس کا جہاز دیکھنے ضرور جائے گی۔

☆☆☆

رات کو سونے سے پہلے اس نے پڑھنے کے لیے ایک کتاب کھولی۔ وہ اکثر خاتون جاسوسوں کی کہانیاں پڑھا کرتی تھی اور ان کتابوں سے اسے بعض اوقات بڑے اچھے آئیڈیاز مل جاتے تھے مثلاً روپ بدلنے کے لیے وگ کتنی کارآمد ثابت ہوتی ہے اور کس طرح سرکاری فائلوں

سے کسی کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس نے جیمری کی کافی کی میز پر بھی اس طرح کے جاسوسی ناول دیکھے تھے۔ ممکن ہے کہ اسے بھی جاسوسی کا شوق ہو۔ ویسے وہ... مطالعے کا شوقین معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس لیے وہ اسے لائبریری میں دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ جب اسے یہ پرانی بات یاد آئی تو اس نے بستر پر پڑی فائل اٹھائی اور اس میں اس ملاقات کی تفصیل تلاش کرنے لگی۔

جیمری سے اس کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ لائبریری میں میکیکو کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی تھی۔ وہ اس شہر کے بارے میں جاننے کے لیے... بے چین تھی جہاں سام پلا گیا تھا۔ اس کی انگلیاں نقشے پر ان راستوں پر گردش کر رہی تھیں جن کا تذکرہ اخبارات میں سام کی گرفتاری کے بعد آیا تھا۔ اس نے وہ تمام تراشے کاٹ کر سام کی فائل میں لگا دیے تھے۔ جیمری اس وقت لائبریری کے اس حصے میں تھا جہاں جغرافیہ سے متعلق کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے پاس سے کئی مرتبہ گزر چکا تھا بلکہ ایک مرتبہ تو ان دونوں کا ٹکراؤ بھی ہو گیا۔ جیمری نے بڑی شائستگی سے اس سے معذرت کی اور بولا کہ کیا وہ میکیکو کے سفر کا ارادہ رکھتی ہے۔ رفتہ رفتہ تعلقات بڑھنے لگے اور چند دنوں بعد تو اس نے اسے اپنا دوست بنا لیا۔

لینا شروع شروع میں کافی محتاط تھی۔ اس نے جیمری کو اپنا فون نمبر دیا اور نہ ہی اپنے بارے میں کوئی تفصیل بتائی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے ایسے مقامات کا انتخاب کرتی جو نسبتاً محفوظ ہوں اور جہاں سے کسی خطرے کی صورت میں لکھنا آسان ہو۔ جیمری کے معاملے میں اس کی خاص طور پر یہ کوشش تھی کہ وہ پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کر لے۔ اس کے بعد ہی اسے پیش قدمی کا موقع دے گی۔ جیمری جیسے لوگ بہت آہستہ آہستہ کھلتے ہیں اور وہ مطمئن تھی کہ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

لینا نے بلیک ایوی ایشن کا بورڈ دیکھا اور اپنی گاڑی مقامی ایئر پورٹ کے توسیعی حصے میں واقع پارکنگ لاٹ میں کھڑی کر دی۔ اس نے اخبار میں فلائنگ کے تربیتی کورس کا اشتہار دیکھا تھا اور اگر کوئی اس سے یہاں آنے کی وجہ پوچھتا تو وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ بھی اس کورس میں شرکت کرنا چاہتی ہے۔ کار سے باہر آنے سے پہلے لینا نے اپنی وگ درست کی جس نے اس کے سنہری بالوں کو چھپا

لیا تھا۔ سینٹ سے بہتے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے اسے چھوٹے جہاز کھڑے ہوئے نظر آئے۔ سٹائٹ میں اس کی اونچی ایڑی کی کٹ کٹ واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ عام طور پر اونچی ایڑی کے جوڑے نہیں پہنتی تھی لیکن اس وقت اپنے پانچ فٹ تین انچ کے قد میں مزید تین انچ کا اضافہ کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اس روپ میں جیمری بھی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

رن وے بالکل خالی تھا اور چند ادھیڑ عمر کے افراد ادھر ادھر بچھ رہے تھے۔ وہ ان کھڑکیوں کی جانب بڑھی جہاں سے جہازوں کا نظارہ اچھی طرح کیا جاسکتا تھا۔ اس نے انہیں قطار در قطار دیکھنا شروع کیا۔ پہلے وہ ان جہازوں کو تلاش کرنے لگی جو سفید رنگ کے تھے اور ان پر نیلے رنگ کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں پھر اس نے ان جہازوں پر نگے نمبر پڑھنا شروع کیے۔ اسے جس نمبر کے جہاز کی تلاش تھی، وہ تیسری قطار میں نظر آ گیا۔

”کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا اور اس کی جیکٹ پر لگے ہوئے بیچ پر لکھا ہوا تھا ”بلیک فلائنگ سروس۔ ٹیلڈ۔“

”اوہ ہاں۔“ وہ تھوڑا سا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں تربیتی کورس میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں جانا چاہتی ہوں۔“

”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں تمہیں معلوماتی کتابچہ دیتا ہوں۔ اس میں تمہیں ساری تفصیل مل جائے گی۔ آؤ میرے ساتھ اس نے اپنے چھوٹے سے کمپن کی جانب اشارہ کیا۔

”ایک اور سوال؟“

”ہاں۔ ہاں۔ پوچھو۔“

”کیا یہ سب جہاز تربیتی مقاصد کے لیے ہیں یا ان میں کوئی ذاتی طیارہ بھی ہے؟“ اس نے رن وے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس میں دونوں طرح کے طیارے ہیں، زیادہ تر جہاز لوگوں کے ذاتی استعمال میں ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک تربیتی مقاصد کے لیے کرائے پر بھی دے دیے جاتے ہیں تاکہ ان کی دیکھ بھال کے اخراجات پورے ہو سکیں۔“

”اس جہاز کے بارے میں کیا کہو گے جس پر سفید اور نیلی دھاریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ میں اس... لیے پوچھ رہی ہوں کہ میرے ڈیڈی بھی اسی طرح کے جہاز میں بیٹھے

قلائق کے لیے لے جاتے تھے۔“

”شیرون تھارن کا ذاتی جہاز ہے جسے وہ خود ہی استعمال کرتی ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ اس جہاز کو کرائے پر نہیں دے گی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود ایک کمپنی کی مالک ہے لیکن تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کئی ایسے جہاز ہیں جو کرائے پر مل سکتے ہیں۔“

”کیا وہ کسی دوسرے شخص کو بھی اپنا جہاز اڑانے کی اجازت نہیں دیتی؟“ لینا نے پوچھا۔

”بھی کبھی خاندان کے لوگوں کو یہ موقع مل جاتا ہے۔“ لینا کو یقین تھا کہ اس کے پاس جہاز کا جو نمبر ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے یہ نمبر جیمز کے کمرے میں آویزاں تصویر سے ذہن نشین کیا تھا۔

جب لینا کیمین سے باہر آئی تو اس نے ایک عورت کو اس جانب آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے لمبے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا بند گلے کا سوئٹر، خاکی پتلون اور کیٹوس شووز پہن رکھے تھے۔ اسے دیکھ کر لینا کو جیمز کی یاد آگئی۔ لینا نے اپنے حواس پر قابو پایا اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے پرس میں چابیاں تلاش کر رہی ہو۔ جب وہ عورت اس کے قریب سے گزر گئی تو اس کے کانوں میں آواز آئی۔

”گڈ مارننگ۔ نیڈ!“

”تم کیسی ہوس تھارن؟“ نیڈ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

☆☆☆

اپنے پارٹمنٹ میں پہنچ کر لینا نے وگ اتاری اور اپنے بال سنوارنے لگی پھر اس نے فریج سے کوئلڈ ڈرنک نکالی اور اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگی۔ تازہ دم ہونے کے بعد وہ اپنی میز پر گئی تاکہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا، اس کا اندراج کر سکے۔ پہلی ہی نظر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے، وہ اپنی فائلوں کو ترتیب سے رکھنے کی عادی تھی۔ اس کے علاوہ وہ میز کی دراز کو ایک انچ کھلا چھوڑ دیتی تھی تاکہ اگر کسی نے اسے چھیڑا ہو تو پتا چل جائے۔ اس نے جلدی سے فائل کی سینٹ کھولا تاکہ دیکھ سکے کہ نمبر سترہ کی فائل اسی جگہ پر ہے جہاں وہ رکھ کر گئی تھی۔

فائل کے صفحات پلٹتے ہوئے اسے ایک معمولی سی شگ نظر آئی۔ وہ ایک نئی فائل تھی اور اس پر ایسے کسی نشان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ گزشتہ شب اس نے یہ فائل اپنے بستر پر رکھی ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس

کی ٹی کا پنچ اس پر پڑ گیا ہو۔ ٹی کا خیال آتے ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں چلی گئی۔ ورنہ فی تو اسے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آ جاتی۔ اس نے فے کو پکارا تو بستر کے نیچے سے اس کے ٹھکنے کی آواز آئی۔

لینا نے اسے پکارا تو اس نے بستر کے نیچے سے جھانکنا شروع کیا پھر آہستہ آہستہ اس کا دھڑکا ہوا سر باہر آنے لگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ فے کبھی اس طرح نہیں جھکتی تھی جب تک وہ خوفزدہ نہ ہو یا کوئی یہاں نہ آیا ہو لیکن ایسا کون ہے جو ان فائلوں تک پہنچنا چاہے گا؟ کوئی بھی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔

”یہ انتہائی نامعقول حرکت ہے۔“ وہ اسے گود میں اٹھاتے ہوئے بولی پھر کیمین میں آ کر اسے رات کی بیٹی ہوئی چھلی کھلائی اور سوچنے لگی کہ ابھی اسے مزید جاسوسی کہانیاں پڑھنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ وہ آئندہ کبھی فائل کیسٹ کو تالا لگا نہیں بھولے گی۔

اپنی میز پر واپس آ کر وہ ایک بار پھر جیمز کی فائل دیکھنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جیمز نے اس سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ طیارہ اس کی ملکیت نہیں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے جہاز کا نمبر پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔ اس نے اس نمبر کو دوبارہ چیک کرنے کا فیصلہ کیا لیکن کیمین لاگ میں کامیاب کرنے والی بات اسے کھٹک رہی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ اس فائل کے لیے کام کرتا ہو اور اپنی وین کے ذریعے ان کا سامان لے جاتا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دوسرے مقام پر کام کرتا ہو اور استقبالی کلرک اسے نہ جانتی ہو، یہ بات وہ آسانی سے یا

استقبالی کلرک کو دوبارہ فون کر کے معلوم کر سکتی تھی۔ فائل بند کر کے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے روز جیمز کی کاغذات کرے گی۔ اگر وہ اپنے ٹرک میں گئی تو پہچان لی جائے گی۔ وہ اس مقصد کے لیے اپنی سفید رنگ کی چھوٹی کار استعمال کر سکتی تھی جس پر کوئی بھی توجہ نہ دیتا۔ وہ اس کار میں بیٹھ کر اس کے پارٹمنٹ کے باہر بھی انتظار کر سکتی تھی اور ضرورت پڑنے پر وہاں سے کھسک بھی سکتی تھی۔ بہر حال اسے اگلے روز کچھ سوالات کے جوابات درکار تھے۔

☆☆☆

وہ ہیشائر اسٹریٹ سے ہوتی ہوئی ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اس نے جیمز کو اپنے پارٹمنٹ کے پارکنگ لاٹ میں اسی وین کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ اس وقت صبح کے سائے پانچ بج رہے تھے۔ وہ اسی لیے وقت سے پہلے آگئی تھی تاکہ اس کے ٹکٹے سے

پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اب اگر وہ اپنے منصوبے کے مطابق ویٹنگن جانے کے لیے بائیں جانب مڑی تو اسے جیمز کی سائے سے گزرنا پڑتا اور اگر وہ اپنی وین پارکنگ لاٹ سے نکال رہا ہو تو اس سے ملنے کا بھی امکان تھا۔

اس نے بائیں جانب مڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور انتظار میں رہی کہ دائیں جانب کا ٹریفک گزر جائے تو وہ ہیشائر اسٹریٹ پر سیدھی چلتی رہے گی۔ جیسے ہی آخری کار گزری، اس نے اپنا اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا۔ مین اسی وقت ایک کار اس کے عقب میں آگئی اور اس کا ڈرائیور زور زور سے ہارن بجانے لگا وہ بہت جلدی میں تھا اور اس سے ایک سینکڑہ بھی انتظار نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اپنی گاڑی آخری کار کے پیچھے لگائی۔ جب وہ چوراہا پار کر رہی تھی تو اس نے اسی گاڑی کے ہارن کی آواز دوبارہ سنی۔ اب وہ بے صبر ڈرائیور اس کے بائیں ہاتھ سے گزر رہا تھا۔ مین اسی وقت لینا کی نظر جیمز پر گئی جو اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد اس نے پورٹن لیا اور آہستہ آہستہ کار چلاتی ہوئی ہیشائر اسٹریٹ پر آگئی۔ اسے سڑک کے کنارے کچھ جھاڑیاں نظر آئیں۔ جہاں وہ آسانی سے اپنی کار کھڑی کر سکتی تھی اور وہاں اس کے دیکھنے کے لیے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ جیمز نے اسے دیکھ لیا ہوگا، اس نے اپنے آپ کو فائل کرنے کی کوشش کی کہ جیمز اس وقت اس کی آمد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، لہذا اس نے اسے نہیں دیکھا ہوگا۔

اس نے ایک بار پھر جیمز کے پارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ اسے وین کی اگلی نشست پر ایک لیپ ٹاپ اور ایک سوٹ کیس رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے جینز، شرٹ اور ٹینس شووز پہن رکھے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ کام پر نہیں بلکہ کیمین اور جا رہا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے خاصا محتاط نظر آ رہا تھا اور وین کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ پارکنگ لاٹ کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے اس انداز سے لینا کو شک گزرا کہ شاید وہ دیکھ لی گئی ہے۔

جیمز نے وین اسٹارٹ کی اور پارکنگ لاٹ سے باہر آ گیا۔ لینا نے بھی اپنی کار دائیں جانب موڑی اور کچھ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگی۔ جیمز کی وین اور اس کی گاڑی کے درمیان دو کاریں تھیں جو آگے چل کر دائیں جانب مڑ گئیں اور جب وہ ایک سکنل پر رکنے تو لینا کی کار جیمز کی وین کے بالکل پیچھے تھی۔ وہ تھوڑا سا پنجر سیٹ کی

کھجور

- ☆ جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔
- ☆ توانائی فوری طور پر بحال کرتی ہے۔
- ☆ کمزوری دور کرتی ہے۔
- ☆ رنگ نکھارتی ہے۔
- ☆ خون پیدا کرتی ہے۔ دانتوں اور مسوڑوں کو مضبوط کرتی ہے۔
- ☆ سردی کے لیے مفید ہے۔
- ☆ زخموں کے لیے مفید ہے۔
- ☆ بھنگ کو خارج کرتی ہے۔
- ☆ دل کے امراض کو رفع کرتی ہے۔
- ☆ معدے کے زخموں کے لیے مفید ہے۔
- ☆ قبض کا بہترین علاج ہے۔
- ☆ پیٹ کے کیڑے مارتی ہے۔
- ☆ کھجور کھانے والے کی نظر کمزور نہیں ہوتی اور سب سے بڑھ کر کھجور کھانا سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔
- ☆ مرسلہ۔ رانا شاہد سید اشرفیہ (پہالیہ)

جانب جھک گئی اور سر پر رکھی تو پی آگے کر لی۔ اسے امید تھی کہ اگر جیمز نے اپنی وین میں لگے بائیں جانب کے شیشے میں دیکھا تب بھی وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔

وہ جیمز کی وین کا پیچھا کرتے ہوئے ساتویں اسٹریٹ پر واقع کیمین لاگ کے دفتر تک جا پہنچی۔ جیمز نے اپنی وین پارکنگ لاٹ میں کھڑی کی اور بھی لینا کی نظر وین کی دائیں جانب لکھی ہوئی عبارت پر گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بھی میڈولارک نرسری کے الفاظ تحریر ہوں گے لیکن وہاں عبارت مختلف تھی۔ اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ جیمز جیمس تھارن سینئر اور اس کے نیچے چھوٹے حروف میں میڈولارک نرسری کے الفاظ درج تھے۔

اسے یاد آیا کہ نیڈ نے جہاز کی مالکن کا نام شیرون تھارن بتایا تھا جبکہ وین پر جیمز جیمس تھارن سینئر کا نام لکھا ہوا تھا اور وہ جس شخص سے ملاقاتیں کر رہی تھی اس کا نام جیمز جیمس جونیئر تھا۔ اگر اس کے نام میں تھارن کا اضافہ کر دیا جائے تو ان تینوں کے بیچ ایک تعلق جتنا نظر آتا ہے۔ یہ ایک پرانی وین تھی جو یقیناً ان کے باپ کی ملکیت رہی

ہوگی۔ شہزاد اس کی بہن ہوگی۔ ٹیڈ نے بتایا تھا کہ اس کی اپنی ایک بھینسی بھی ہے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اسے اپنے کام پر پہنچنا تھا۔ وہ گھر واپس آئی تو اسے یاد آیا کہ اب جبری سے اس کی ملاقات اگلے روز رات سے پہلے نہیں ہو سکتی کیونکہ انہوں نے پہلے سے فلم دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یونیفارم تبدیل کرنے کے دوران اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ وہ شام کو گھر واپس آنے کے بعد جبری کے لیے چاکلیٹ ایک تیار کرے گی اور اسی بھانے آج رات ہی اس سے ملنے چلی جائے گی اور اس طرح اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ ٹیلی فون کر کے اسے بتا دے کہ شام کو اس کے لیے چاکلیٹ ایک لے کر آئے گی۔

نمبر ڈائل کرنے کے بعد دوسری جانب سے ایک کھسی پٹی آواز سنائی دی۔ "یہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے براہ کرم صحیح نمبر ملائیں۔" لیڈا نے دو تین بار وہ نمبر ڈائل کیا لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا۔ یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ کچھ دیر پہلے تو اس نے جبری کو اس کے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت لیڈا کو کام پر جانے کی جلدی تھی۔ اس لیے وہ جبری کے اپارٹمنٹ پر نہیں رکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ سچ کے وقت میں اسے چیک کرے گی۔

☆☆☆

اس نے اپنا ٹرک پارکنگ لاٹ میں کھڑا کیا اور عمارت کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر داخل جبری کے اپارٹمنٹ تک پہنچ گئی۔ دروازے پر دستک دینے سے پہلے اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جس کا پردہ تھوڑا سا ہٹا ہوا تھا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اپارٹمنٹ بالکل خالی تھا اور وہاں کوئی سامان نظر نہیں آ رہا تھا، پھر اسے اپنے عتب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا ہوا تھا۔

"کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

"میں اس عمارت کا منیجر ہوں۔" وہ اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔

"میں جبری جیسے سے ملنے آئی تھی۔"

"وہ آج صبح یہاں سے چلے گئے، انہیں اپنی نئی ملازمت پر پہنچنے کی جلدی تھی، کیا تم یہ اپارٹمنٹ لینا چاہ رہی ہو؟"

"نہیں، کیا مجھے اس کا نیا پتا معلوم ہو سکتا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے چھ ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے نیا پتا جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"اوہ۔ میں سمجھ گئی۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی نیچے آ گئی۔

لیڈا اپنے ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اس جگہ کو دیکھتی رہی جہاں صبح کے وقت جبری کی وین کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے چھ گھنٹے پہلے جبری کو دیکھا تھا لیکن اب وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ملے گا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ سچ کا وقت گزر چکا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے کام پر روانہ ہو گئی۔

جب اس نے گزشتہ چند روز میں رونما ہونے والے واقعات کا جائزہ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ شاید پہلی بار ایسا ہوگا جب تعلق ختم ہو جانے کے باوجود بھی اس کی چھان بین جاری رہے گی۔ اگر واقعی وہ تعلق ختم ہو چکا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ یہ تحقیقات جاری رہنی چاہئیں۔ وہ ایک بار پھر انٹرویو کر لیا۔ اس وقت تک وہاں انتظار کرے گی جب تک شہزاد نہ آجائے۔ وہ اس سے اس کے جہاز اور جبری کے بارے میں بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

"یہ سولہ ماہ بھی ختم نہیں ہوئے، اس نے ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے بے آواز بند کہا۔" میں کسی نہ کسی طرح مسٹر جبری جیسے حقیقت معلوم کر کے ہی رہوں گی۔"

پارکنگ لاٹ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اس اپارٹمنٹ کی جانب دیکھا جہاں جبری رہا کرتا تھا۔ اسے اپنی گردن کے پچھلے حصے میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے کسی کی اصلیت جاننے کی خواہش اس کے دل میں جوش مار رہی ہو۔

☆☆☆

امر کی انٹرائن کے جب 747 میں دوسری قطار والی نشست پر بیٹھا جبری جیمسن تھارن جو نیئر اپنے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ لیڈا ڈون ووڈ کو سام کے منشیات کے کاروبار کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ لہذا کیس نمبر 248 سرکاری طور پر بند کیا جاتا ہے۔"

جبری نے فائل کو کمپیوٹر میں محفوظ کیا اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ اسے یہ سوچ کر ہی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ لیڈا کسی جرم میں شریک ہو سکتی ہے۔ وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ

چاہنے لگا تھا لیکن سام اور میکسیکو حکومت کے افسران کے درمیان رابطوں کا پتا چلانا بھی ضروری تھا۔ ایف بی آئی والے اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ سام اس چین کی آخری کڑی تھا۔ آج شام تک لیڈا کو سرکاری طور پر خط مل جائے گا جس میں اسے سرکاری طور پر اطلاع دی جائے گی کہ سام کے ساتھ اس کا کاروباری تعلق ثابت نہیں ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی ایک خط کے ذریعے اسے مطلع کر دے گا کہ اسے دوسرے شہر میں نئی ملازمت مل گئی ہے۔ امید ہے کہ اس طرح لیڈا مطمئن ہو جائے گی۔

اس کے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ لیڈا اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی۔ جس طرح وہ انٹرویو کر رہی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے ماننا پڑا کہ وہ اپنے کام میں بے حد مشاق ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کے گزشتہ تجربات ہوں۔ جبری گزشتہ دو برس سے ایف بی آئی ایجنٹ کے طور پر کام کر رہا تھا اور جب اس کے پاس لیڈا کی فائل آئی تو اس نے یہی مناسب جانا کہ لیڈا کی حقیقت جاننے اور سام سے اس کا کاروباری تعلق معلوم کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ خود سام کی جگہ لے لے اور لیڈا کا بوائے فرینڈ بن کر در پردہ اس کے بارے میں چھان بین کرے۔ اس بھانے سے لیڈا کے اپارٹمنٹ میں جانے کا طریقہ ملا۔ اس امید تھی کہ وہاں سے اسے کوئی نہ کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا جس سے ظاہر ہو سکے کہ لیڈا، سام کے ساتھ منشیات کے کاروبار میں شامل تھی پھر اس نے ایک دن لیڈا کی غیر موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی اور وہ تمام فائلیں دیکھ ڈالیں جو لیڈا نے اپنے سابق بوائے فرینڈز کے بارے میں بنا رکھی تھیں، سام کی فائل میں اس کی عادات و اطوار کے بارے میں تفصیلات، کچھ ہوائی جہاز کے ٹکٹوں کے نمبر اور اس کی گرفتاری کے بعد شائع ہونے والے مضامین کے تراشوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہ ملی۔ وہیں ایک فائل اس کے بارے میں بھی تھی جس سے وہ جان گیا کہ لیڈا اس کے بارے میں کچھ بھی چھان بین کر رہی ہے۔ واقعی وہ ہم جو فطرت رکھتی تھی۔

اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ لیڈا اس کی گرل فرینڈ نہیں بلکہ ایک مشتہ لڑکی تھی جس کے بارے میں چھان بین کرنے کے لیے اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ تحقیقات مکمل ہو چکی تھیں اور اب وہ اپنے ہیڈ کوارٹر واپس جا رہا تھا۔ البتہ صبح روانہ ہونے سے پہلے وہ اپنی بہن کے دفتر ضرور گیا تھا تاکہ بتا سکے کہ یہاں اس کا کام ختم ہو چکا

ہے اور وہ اپنی دوسری ذمہ داری سنبھالنے واپس جا رہا ہے۔ اس نے اپنی بہن کا شکر یہ ادا کیا کہ اس نے اسے اپنا طیارہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ شہزاد کو بھی حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ لہذا اس نے اسے ایک من گھڑت کہانی بنا کر مطمئن کر دیا۔ اس میں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ سچ جاننے کے بعد شہزاد کے دل میں لیڈا کے خلاف برائی بیٹھ جاتی اور وہ اس بات پر ناراض ہو سکتی تھی کہ لیڈا اس کی نوہ لینے کے لیے انٹرویو کر لیں گی جبکہ لیڈا نے اس پر درہہ کرتا مچھان بین کی تھی۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اسے بچھتاوا ہونے لگا۔ وہ بھی بس پردہ رہ کر لیڈا کے بارے میں چھان بین کر سکتا تھا۔ اس کا تعاقب کر کے معلوم کر سکتا تھا کہ وہ کن لوگوں سے ملتی ہے اور اس کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں گھر کی تلاشی لے کر سام اور اس کے روابط کے بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس طرح غائب ہو جانے پر وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی، یقیناً وہ اسے بھی دھوکے باز اور فریبی ہی سمجھے گی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ روانہ ہونے سے پہلے لیڈا سے مل لیتا اور اسے کوئی بھی کہانی بنا کر واقعی طور پر مطمئن کر لیتا۔ اس طرح کم از کم آئندہ ملنے کی گنجائش تو باقی رہتی۔ لیکن وہ اس طرح کیوں سوچ رہا تھا؟ کیا وہ لیڈا سے محبت کرنے لگا تھا؟ اسے لگا جیسے واقعی وہ اس کے دل میں جگہ بنا چکی ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ واپس جا کر لیڈا کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دے کیونکہ وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ لیڈا سب کچھ جاننے کے بعد اس سے نفرت کرنے لگتی اور وہ کبھی یہ گوارا نہ کرتا کہ لیڈا جیسی خوب صورت لڑکی اس سے نفرت کرے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ وہ اس طارے قلعے کو ایک خوب صورت خواب سمجھ کر بھلا دے۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر آنکھیں موند لیں اور اپنے منے کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اس کا کام ہی نہیں بلکہ محبوب مشغلہ بھی تھا۔ وہ ہر تحقیقات کو ایک چیخ سبھ کر قبول کرتا اور اسے مکمل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ اب وہ لیڈا کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا۔ جانتا تھا کہ چند روز بعد لیڈا کی میز پر ایک نئی فائل کا اضافہ ہو جائے گا اور وہ اپنے اشاروں میں بوائے فرینڈ کے بارے میں چھان بین کر رہی ہوگی۔



بے ثمر مسافت سلیم ساروقی

کہتے ہیں کہ صحبتوں سے شخصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ... جب شخصیت ہی پیاز کے چھلکوں کے مانند پرت پرت ڈھکی ہو تو کیسے کوئی تہ میں چھپی اصلیت کا اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ بھی اندر سے اتنا ہی گہرا تھا جیسے سمندر... اس کے احساسات میں جتنے موجزن جذبات میں تلاطم اور خیالات میں بہنور تھے اتنا ہی وہ سمندر کی سطح کے مانند پرسکون نظر آتا تھا... برسات کی بوندوں کی طرح کسی کی خاموش چاہت میں بھیگا ہوا کچی مٹی کے گھر میں رہ کر خوابوں کا تاج محل بنانے والا جب سمت بدل کر چلا تو قدموں کی لرزش میں منزل کے گم ہو جانے کا خدشہ نمایاں تھا۔ شو مٹی قسمت کہ ان بدلتی رتوں میں بھی کسی صحبتوں نے اپنا رنگ جمایا اور اسے کسی اور ہی منزل کا راہی بنا دیا۔ پھر تو شعور کی دنیا میں جو ناممکن تھا وہ سب کچھ بہ آسانی لاشعوری طور پر رقم ہوتا چلا گیا۔ اگر اس پرماں کی دعا کا انجل سایا نہ کرتا تو زمانے کی تہتی دھوپ اسے جلا کر خاک کر ڈالتی۔

جہی چاہوں، ادھوری رفتاروں اور نسل رفتاروں کی لہر ہوا سان

آہستہ آہستہ میری وحشت ختم ہو گئی اور میں ٹرین میں سفر کرنے لگا۔
میں انجینئر تھا اور امریکا کی ایک معروف انڈسٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ بی ای کی ڈگری ہونے کے باوجود مجھے یہاں نئے سرے سے انجینئرنگ کرنا پڑی تھی، کیونکہ ہمارے ملک کی پیچلرز ڈگری وہاں کے بیشتر اداروں میں قابل قبول نہیں تھی۔ اس وقت میرے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو میں اس صورت حال سے گھبرا کر وہاں سے لوٹ آتا یا پھر ان کے معیار کے مطابق وہاں کی کسی یونیورسٹی سے بی ای کرتا۔ واپس آنے کا تو میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے پاؤں بیٹنے کے بعد تو مجھے امریکا آنے کا موقع ملا تھا۔
ایاجی نے چلتے وقت اچھی خاصی رقم میرے حوالے کر دی تھی۔ وہ پاکستان ریلے میں اسٹیشن ماسٹر تھے اور دو سال بعد ریٹائر ہونے والے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے یہ رقم کہاں سے قرض لی تھی۔

ریل کے پیوں کی گزرگاہ سے مجھے عجیب سی وحشت، بے چینی اور اضطراب ہوتا ہے اور میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتا ہوں۔ مجھے یہ آواز بہت دور، ماشی کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے اپنی اس ذہنی کمزوری پر قابو پایا۔ بے چینی اور اضطراب کا احساس اب بھی ہوتا ہے لیکن صورت حال اتنی ہولناک نہیں ہوتی۔
میں گزشتہ سات برس سے امریکا میں تھا۔ وہاں تو ٹرین میں سفر کرنا ہر شخص کی مجبوری ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پایا تھا لیکن ٹرین کا سفر میرے لیے خوش گوار نہیں ہوتا تھا۔ سفر کے دوران خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں نے پہلے اخبار اور رسائل کا سہارا لیا پھر میں نے اپنے سیل فون میں ویڈیو فری لگا لیا اور خاصی تیز آواز میں گانے سننے لگا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ

”اجنبی ملک سے، اجنبی جگہ ہے۔“ اباجی نے کہا۔
 ”ایسے میں خدا نخواستہ تمہیں کوئی ضرورت پیش آگئی تو کس سے مانگو گے؟“
 ”لیکن اباجی، یہ رقم تو نورین کے لیے تھی۔ وہ.....“
 ”اللہ مالک ہے بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔ ”پھر جب تک نورین کی شادی ہوگی تم بھی انشاء اللہ وہاں سیٹ ہو چکے ہو گے۔ کیا تم اپنی بہن کی شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے؟“
 ”میں اسی لیے تو سات سمندر پار جا رہا ہوں اباجی۔“
 ”میں نے کہا۔“ تاکہ آپ لوگوں کی خدمت کر سکوں۔“ اپنی شادی کے ذکر پر نورین شرما گئی تھی۔ وہ میری لاڈلی بہن تھی۔ عمر میں پورے دس سال چھوٹی تھی۔
 اس دن میں دفتر سے واپس آ رہا تھا اور ہیڈ فون حسب معمول میرے کانوں میں ٹھسا ہوا تھا کہ اچانک سیل فون کی تیل بجتی تھی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں اباجی کا نام تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔
 ”السلام علیکم اباجی!“ میں نے ہیڈ فون کا بٹن آف کرنے کے بعد کہا۔ ”کیسے ہیں آپ؟“
 ”وعلیکم السلام بیٹا۔“ اباجی نے کہا لیکن ان کی آواز میں وہ والہانہ پن نہیں تھا جو میں سننے کا عادی تھا۔ میرا اسٹارپ بھی آچکا تھا میں نے ریٹیک کیس اٹھایا اور نورین سے باہر نکل آیا۔
 ”سب خیریت تو ہے اباجی؟“
 ”ہاں خیریت ہی ہے۔“ اباجی کا لہجہ کھوکھلا تھا۔
 ”بس تمہاری ماں کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔“
 ”کیا ہوا ہے ماں کو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔
 ”بیٹا اسے بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ بخار کی حالت میں بار بار تمہارا نام لے رہی تھی کہ صفدر کو بلا لو۔“ میں..... بے چین ہو گیا۔ میرا دل ان جانے دوسوں سے دھڑکنے لگا۔
 اباجی جیسے مجھ دار آدی سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ محض ماں کے بخار کی وجہ سے مجھے ٹیلی فون کر دیں گے۔
 ماں جی تو اس سے پہلے بھی کئی دفعہ بہت بیمار ہوئی تھیں لیکن مجھے اس کی اطلاع اس وقت ہوتی تھی جب وہ صحت یاب ہو جاتی تھیں۔
 ”اباجی!“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔
 ”آپ مجھ سے کچھ چھپائیے مت، مجھے بتائیے کہ ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری بات کرائیے ان سے۔“ میں

نے کہا۔
 ”بیٹا، وہ اس وقت تو راجا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی ہے، ابھی آئے گی تو بات بھی کرادوں گا۔“
 ”اباجی! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔ اچانک لائن کٹ گئی۔ میں نے اباجی کا نمبر کئی مرتبہ ملا یا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ نیٹ ورک کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں اسی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچا۔ چھوٹے سے دو کمروں کا وہ اپارٹمنٹ میں نے اپنے ایک پاکستانی دوست لطیف کے ساتھ مل کر لیا تھا۔ لطیف وہاں کی ایک آئل کمپنی میں سپروائزر تھا۔ مجھے وہ کچھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔
 ”کیا بات ہے صفدر؟“ اس نے پوچھا۔ ”تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“
 ”یار، ابھی کچھ دیر پہلے اباجی کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے کہ ماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں ان سے مزید تفصیل پوچھتا چاہتا تھا کہ لائن کٹ گئی۔ اب نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے۔“
 ”پریشان مت ہو یار۔“ لطیف نے کہا۔ ”ماں جی انشاء اللہ خیریت سے ہوں گی۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔
 ”نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے تو کیا ہوا۔ تو لینڈ لائن سے ٹیلی فون کر لے۔“
 ”ہاں یار پریشانی میں مجھے اس کا کوئی خیال ہی نہیں آیا۔“ میں نے کہا۔
 ”تو فکر مت کر۔ میں پرسوں پاکستان جا رہا ہوں، تیرے گھر جا کر سب کی خیریت معلوم کر لوں گا۔“
 میں تو گویا اس کی بات ہی نہیں سن رہا تھا۔ میں نے بریف کیس صوفے پر اچھالا اور ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکا لیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اباجی کے سیل فون پر کال کروں پھر مجھے نورین کا خیال آیا۔ نورین مجھے صحیح صورت حال بتا سکتی تھی۔
 میں نے نورین کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی کی آواز آئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب میری نورین سے بات ہو سکتی تھی۔ تین چار گھنٹیاں بچنے کے بعد نورین نے کال ریسیو کر لی۔ ”ہیلو۔“
 ”رینو! میں صفدر بول رہا ہوں۔“
 ”السلام علیکم بھیا۔“ اس نے کہا۔ ”بڑی عمر ہے آپ کی۔ میں ابھی آپ ہی کو یاد کر رہی تھی۔“
 ”رینو! ماں کی طبیعت کیسی ہے؟ ذرا ان سے بات کراؤ۔“ میں نے کہا۔

”بھیا..... وہ ماں کی طبیعت..... ٹھیک ہے..... وہ.....“
 ”مجھ سے جھوٹ مت بولورینو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ماں کی طبیعت کیسی ہے؟“
 نورین اچانک رونے لگی اور بولی۔ ”بھیا..... ماں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہیں لیکن ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
 ”ماں اسپتال میں ہیں؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔
 ”ان کے ساتھ کون ہے؟“
 ”میں، اباجی اور راجا بھائی ہیں۔“ اس نے بتایا۔
 راجا ہمارا بڑا دوست تھا اور وہ ہمارے گھر کا بہت خیال رکھتا تھا۔
 ”بھیا..... اباجی کو مت بتائیے گا کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔ وہ آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہ رہے تھے لیکن ماں بار بار آپ کا نام لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اپنے بیٹے کو فوراً یہاں بلا لیں۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ آپ امریکا میں ہیں تو اس نے کہا کہ ٹیلی فون پر بیٹے سے ان کی بات کروادیں۔ اباجی نے آپ کا نمبر ملا یا اور آپ سے بات کر رہی ہے تھے کہ ماں جی بے ہوش ہو گئیں۔“
 ”ماں اتنی بیمار ہیں اور اباجی اسے معمولی بخار کہہ کر مجھے بہلا رہے تھے؟ میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ لطیف ال وقت پاکستان جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ وہ بہت عرصے سے میری باتیں بھی سن رہا تھا۔
 ”کیا ہوا صفدر؟“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”سب خیریت تو ہے؟“
 ”ماں کو ہارٹ ایکٹ ہوا ہے۔“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”اللہ رحم کرے گا۔“ لطیف نے کہا۔ ”لیکن تو دل چھوٹا مت کر۔ تو نے تو عورتوں کی طرح آنسو بہانا شروع کر دیے۔“
 اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی میری آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”لطیف! میں بھی تیرے ساتھ ہی پاکستان چلوں گا۔“
 ”تو پہلے چھٹی تو لے لے۔“
 ”میں چھٹی لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تو اس فلائٹ میں ایک سیٹ مزید بیک کروالے جس سے تو جا رہا ہے۔“
 ”یار! میں کوشش کرتا ہوں۔“ لطیف نے کہا۔ ”اس فلائٹ میں اب شاید ہی سیٹ ملے۔ میں نے تو ایک بچنے

پہلے سے سیٹ کنفرم کروالی تھی۔“
 ”تو بات تو کر۔ اس فضائی کمپنی میں تیرا کوئی دوست بھی تو ہے۔ ورنہ میں کسی دوسری فلائٹ سے جاؤں گا۔“
 لطیف نے اسی وقت اپنے دوست سے بات کی اور تھوڑی بحث کے بعد بالآخر وہ سیٹ کنفرم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔
 ”یار! تو پہلے چھٹی تو لے لیتا۔“ لطیف نے کہا۔ ”اگر تجھے چھٹی نہ ملتی تو؟“
 ”تو پھر میں یہ ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔ ملازمت تو مجھے دوسری بھی مل جائے گی لیکن ماں نہیں ملے گی۔“ میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا۔ وہ نورین کا فون تھا۔
 ”ہاں نورین!“ میں نے کہا۔ ”کیسی ہیں ماں؟“
 ”ماں کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔“
 ”ماں جی سے بات کراؤ میری۔“ میں نے کہا اور دوسرے ہی لمحے اباجی کی آواز آئی۔
 ”ہاں صفدر بیٹا! اب تمہاری ماں کی طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔ یہ رینو تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گے۔“
 ”اباجی! ماں کو دل کا دورہ پڑا ہے اور آپ مجھ سے چھپا رہے ہیں؟“ میں نے شکایت کیا۔
 ”دل کا دورہ کہاں، انجانا کا معمولی سا ایک تھا بیٹا۔“ اباجی نے کہا۔
 ”میں پاکستان آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”تم پاکستان ضرور آؤ۔“ اباجی نے کہا۔ ”تمہیں دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے ہیں لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہاری ماں اب بالکل ٹھیک ہے۔“ پھر وہ مجھ سے میری خیریت پوچھتے رہے۔ میری جاب کے بارے میں بات کرتے رہے۔
 میری وہ رات بہت بے چینی اور اضطراب میں گزری۔ صبح آٹس پینچے ہی میں نے دو ماہ کی چھٹی کے لیے درخواست دے دی۔ گھنٹی کا جی ایم خاصا مقبول آدی تھا۔ وہ میرے کام سے خوش بھی تھا پھر میں نے گزشتہ پانچ برس میں کوئی چھٹی بھی نہیں لی تھی۔ اس نے میری چھٹی منظور کر لی۔ ماں کی حالت بہتر ہونے کی خبر سن کر مجھے بھی خاصا اطمینان ہو گیا تھا۔ میرے پاس ایک دن تھا۔ میں نے اباجی، ماں اور رینو کے لیے بہت سارے تحفے خریدے۔ راجا اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی اور خالہ، ثمرہ، اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے شوہر اور بچے کے لیے بھی بہت سے تحفے خریدے اور روانگی کو تیار ہو گیا۔

جہاز میں سوار ہونے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ فلائٹ براہ راست اسلام آباد کی نہیں ہے بلکہ کراچی جا رہی ہے۔ یہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم کراچی سے اسلام آباد کے لیے دوسری پرواز پکڑ سکتے تھے۔ لطیف کو کراچی میں کچھ کام تھا اسی لیے وہ اس فلائٹ میں آیا تھا۔

کراچی پہنچ کر معلوم ہوا کہ اسلام آباد قومی ائر لائن کے پائلٹس نے ہڑتال کر رکھی تھی اس لیے اس دن کوئی بھی پرواز نہیں تھی۔ اس دن کیا دوسرے دن بھی کسی پرواز کا ملنا مشکل تھا۔

لاؤنج میں اسلام آباد اور لاہور کے بہت سے مسافر حیران و پریشان بیٹھے تھے۔

”یار صفر!“ لطیف نے کہا۔ ”اس فلائٹ کے چکر کو چھوڑ، ہم لوگ ٹرین کے ذریعے پنڈی چلتے ہیں۔ اس طرح کم سے کم کل تک پنڈی پہنچ جائیں گے۔ پائلٹ تو اپنی ہڑتال نہ جانے کب تک جاری رکھیں۔“

”یار! جیسا میں پاکستان کو چھوڑ کر گیا تھا اب بھی یہاں کے حالات ویسے ہیں بلکہ مجھے تو پہلے سے بھی بدتر لگ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بدتر؟“ لطیف نے کہا۔ ”بدترین خبریں تو کچھ ہی قسم کی سننے کو ملتی ہیں۔“ لطیف نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی والے سے اسٹیشن چلنے کی بات کی تو اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے ہمیں موٹی آسامی سمجھ کر ڈالرز میں کرایہ مانگا۔ ”اوبھائی تو ہوش میں تو ہے؟“ لطیف نے کہا۔ ”تو پاکستان میں ہے یا امریکا میں؟“

”ناراض کیوں ہوتے ہو بادشاہو؟“ ڈرائیور نے کہا۔ ”آپ۔۔۔ کرایہ پاکستانی کرنسی ہی میں دے دینا۔“ پھر اس نے ہمارے سامان پر نظر ڈالی۔ ”آپ کے پاس تو بہت سامان ہے۔“

”تو پھر؟“ لطیف نے آنکھیں نکالیں۔

”کچھ نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا اور اتر کر ہمارا سامان ڈکی اور گاڑی کی چھت پر بٹے ہوئے اسٹینڈ میں رکھنے لگا۔

اس وقت ٹریفک پولیس کا ایک اہل کار وہاں پہنچ گیا۔ ڈرائیور کے چہرے پر بارہ بیٹھے گئے۔

”میٹر ڈاؤن کر لو۔“ اس نے ڈرائیور سے کہا اور اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”مرا اگر یہ آپ

سے زیادہ کرایہ مانگے تو آپ اس کی شکایت کر سکتے ہیں۔ کل سے اس کا داخلہ رپورٹ کی حدود میں بند ہو جائے گا۔“

ٹیکسی اتر پورٹ سے باہر نکلی تو ڈرائیور نے کہا۔ ”میرا میٹر خراب ہے جناب عالی! آپ جو مناسب سمجھو دے دینا۔“ میں نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس سے پوچھا۔ ”اس وقت لاہور کے لیے ہمیں کوئی گاڑی ملے گی؟“

”ایک گھنٹے بعد کراچی ایکسپریس جائے گی۔“ ڈرائیور نے کہا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ لاہور سے کوچ کے ذریعے جہلم جاؤں گا۔ جہلم سے چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہمارا گاؤں تھا۔ لطیف کا گاؤں مخالف سمت میں تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو مجھے ایک وقفہ بھر وہی مناظر یاد آئے جو میں بچپن سے جوانی تک دیکھتا آیا تھا۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر چہل پہل کم ہوتی تھی لیکن بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر تو نفسانسی کا عالم ہوتا تھا۔ مسافروں کی بیچ و بیک بچوں کا رونا، مردوں کی گھبراہٹ اور قلیوں کی بھاگ دوڑ۔ ابھی گاڑی آنے میں آدھا گھنٹا باقی تھا لیکن اسٹیشن پر ایسا ریش تھا جیسے وہاں کوئی جلسہ ہو رہا ہو۔

اجانک گاڑی کی آمد کا اعلان ہوا پھر مجھے ٹرین کے پہلوں کی مخصوص گزراہٹ سنائی دی تو مجھے یہ ایک دم وحشت اور گھبراہٹ طاری ہوئی۔ وہی کیفیت جو پاکستان چھوڑنے سے قبل تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں تاکہ وہ آواز میرے کانوں میں نہ پڑے۔ میرا سانس پھولنے لگا اور وحشت کے باعث پورا جسم سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ میں وہاں سے بھاگنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ لطیف کی آواز آئی۔ ”صفر! کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے وحشت زدہ انداز میں گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی گھبرا گیا۔

”تم شیک تو ہو صفر؟“ وہ گھبرا کر بولا۔

”یار! مجھے..... کچھ عجیب سی وحشت ہو رہی ہے۔ میں.....“

لطیف نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ہاتھ سے میرے چہرے کا پینا صاف کیا پھر نزدیک سے اسٹال سے کولڈ ڈرنک لاکر مجھے دی اور بولا۔ ”یہ پی لو اور تسلی رکھو یار۔ اماں جی بالکل خیریت سے ہوں گی۔“ وہ بے چارہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید مجھے اماں کی وجہ سے پریشانی ہے۔

”ہاں یار۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

اس نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا یا اور بولا۔

”پریشان مت ہو یار! اللہ سب خیر کرے گا۔“

مجھے اس گزراہٹ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سوچا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس میں ہینڈ فری لگا کر ہینڈ فون کانوں میں لگا کر فون والیوم میں گانا چلا دیا۔

لطیف بہت غور سے میری حالت کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرین کی گزراہٹ ختم ہو چکی تھی، اب بھی میرے کانوں میں ہینڈ فون لگا ہوا تھا اس لیے مجھے باہر کی کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

اسی وقت قلی آ گیا اور لطیف سے کچھ کہنے لگا پھر اس نے ہمارے سوٹ کیس اور بڑے بڑے دو بیگ اٹھالیے۔ چھوٹے بیگ اور بریف کیس ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ میں نے بہت مشکل سے اپنا بیگ اور بریف کیس اٹھایا ہوا تھا۔ لطیف نے وہ بھی میرے ہاتھ سے لے لیا اور کچھ بولا جو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن میں اس کی تھلید میں قلی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لطیف نے زائد رقم دے کر اے سی کلاس میں دو سیٹیں حاصل کی تھیں۔ ہم سیٹوں پر اطمینان سے بیٹھے گئے۔ میری حالت بھی اب کافی بہتر تھی۔ ابھی گاڑی کھڑی تھی اس لیے میں نے کانوں سے ہینڈ فون نکال لیے۔

”یار! تجھے کیا ہو گیا تھا؟“ لطیف نے کہا۔

”اسل میں مجھے ٹرین کی گزراہٹ سے عجیب سی وحشت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

لطیف نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”ٹرین کی آواز سے وحشت.....؟ لیکن یار! تیری تو زندگی اس آواز کو سننے ہوئے گزری ہے۔ تیرے ابا جی اسٹیشن ماسٹر تھے نا؟“

”ہاں یار۔“ میں نے کہا۔ ٹرین نے ہارن بجایا تو میں نے لطیف سے کہا۔ ”یار! میں بہت ٹھکن محسوس کر رہا ہوں۔ کچھ دیر آرام کروں گا۔“ یہ کہہ کر اوپر والی برتھ پر چڑھ گیا اور ہینڈ فون دوبارہ کانوں میں ٹھونس لیے کیونکہ گاڑی نے ریگنٹا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ماضی کی فلم چلنے لگی اور میں آنکھیں بند کر کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان مناظر میں کھو گیا۔

☆☆☆

ابا جی اسٹیشن ماسٹر تھے اس لیے مختلف شہروں میں ان کے تارالے ہوتے رہتے تھے۔ گاؤں میں ہماری تقریباً پچیس ایکڑ زمین اور ایک مکان تھا۔ وہ مکان اکثر بندی

رہتا تھا۔ ابا جی کبھی چھٹی پر گاؤں آتے تو ہمارا مکان کچھ دن کے لیے آباد ہو جاتا تھا۔ ابا جی انتہائی اصول پرست اور دیانت دار انسان تھے۔ میں نے انہیں کبھی کوئی نماز یا روزہ قضا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اماں بھی ان ہی کے رنگ میں رنگ گئی تھیں۔ یوں ہمارے گھرانے کو خاصا دین دار... کہا جاسکتا ہے۔ جب تک میں اسکول میں تھا، بیچ وقت نماز کا یاد ہی تھا۔ نورین نے تو بہت چھوٹی عمر میں نماز پڑھنا سیکھ لی تھی اور اماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی نماز کی پابندی کرتی تھی۔ اس ماحول میں بھلا اوپر کی آمدنی کا کیا سوال تھا۔ ابا زیادہ تر بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر ہی رہے لیکن وہ ملازمت بھی عبادت سمجھ کر کرتے تھے ورنہ میں جانتا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر کے اختیارات کیا ہوتے ہیں اور وہ چاہے تو اس کی اوپر کی آمدنی بہت ہو سکتی ہے۔

ابا جی کی قلیل تنخواہ میں بھی اماں گزارہ کر لیتی تھیں۔ ابا جی نے زمین ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ یہاں سے بھی سال کے سال کچھ رقم اور اناج وغیرہ آ جاتا تھا۔ قلیل آمدنی کے باوجود ابا جی نے کبھی مجھے کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ میرے پاس اچھے سے اچھا لباس تھا، قیمتی گھڑی تھی اور بہترین سائیکل تھی۔ اس دور میں سائیکل رکھنا بھی بہت بڑی بات تھی۔ جس کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی، اسے تو لوگ رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا شمار اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا۔

ہر باپ کی طرح ابا جی کی بھی یہ خواہش تھی کہ میں بہترین تعلیم حاصل کروں۔ میں نے میٹرک فرسٹ ڈیویژن میں پاس کیا تو ابا جی اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے اسٹیشن پر ڈھیروں مشائی تقسیم کی۔ ہم لوگ ان دنوں لاہور میں تھے۔ ابا جی مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے، جبکہ مجھے آرمی میں جانے کا شوق تھا۔

میں نے ابا جی کی خواہش پر انٹرمیڈیٹ میں بھی پری انجینئرنگ کے مضامین رکھے تھے اور میرے نمبرز بھی بہت اچھے آئے تھے لیکن میں نے انجینئرنگ کانج میں داخلہ لینے کے بجائے آرمی میں درخواست دے دی۔ اب یہ میری بد قسمتی ہی تھی کہ آرمی میں میرا انتخاب نہ ہو سکا۔ مجھے آج تک اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مجھے کس بنیاد پر مسترد کیا گیا۔ میں پڑھنے میں ذہین تھا، میری انگلش بھی بہت اچھی تھی۔ اس زمانے میں آج کی طرح انگلش لیگنوج سینئر تو ہوتے نہیں تھے۔ میں نے انگلش میں اپنے طور پر محنت کی تھی۔ اپنے انگلش کے بچر سے روزانہ ان کے گھر پر پڑھنے جایا کرتا تھا۔

کوئی بھی نہیں جاتا۔ مختلف ویران جگہوں پر بوگیوں کے ناکارہ ڈبے کھڑے ہوتے تھے۔ میں چونکہ ایس ایم کا بیٹا تھا اس لیے اگر کوئی مجھے اس طرف جاتے دیکھ بھی لیتا تو... باز نہیں نہ کرتا۔ دو چار دفعہ بوگیوں کے ناکارہ ڈبے استعمال کرنے کے بعد تو میں بے خوفی سے یہ کام کرنے لگا۔

اب اکثر انو بھی وہیں آجاتا تھا۔ بھی اس کے دوست بھی ہوتے تھے۔ ہم لوگ وہاں بیٹھ کر تاش کھیلتے، سگریٹ پیتے اور ایک دوسرے کو لڑکیوں کے قصے سننا شروع کر دیتے۔ جی ہاں، انو کی صحبت میں رہ کر میں سگریٹ بھی پینے لگا تھا اور کبھی کبھی شراب بھی پی لیتا تھا۔ اب میں اس کے ساتھ مختلف وارداتوں میں بھی حصہ لینے لگا تھا۔ میں فطرتاً نڈرتا اور انو کے ساتھ رہ کر میں لڑائی بھڑائی کے فن میں بھی طاق ہو گیا تھا۔

لاہور ہی میں میری ایک خالہ بھی رہتی تھیں۔ برسوں پہلے کسی بات پر اماں کے تعلق ان سے خراب ہو چکے تھے اس لیے امی ان سے ملتی نہیں تھیں۔ میں بچپن میں ایک دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کا بہت بڑا گھر تھا۔ خالو خاصے دولت مند آدمی تھے۔ وہ بزنس کرتے تھے اور اس وقت ان کی آمدنی میرے اندازے کے مطابق لاکھوں میں تھی۔ ان کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ اب تو مجھے ان کے نام یاد تھے نہ چہرے۔

ایک دن میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ باہی بہت افسردہ اور پریشان گھر میں داخل ہوئے۔ اماں بھی انہیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں اور بولیں۔ "کیا ہوا، خیریت تو ہے؟" "خیریت نہیں ہے نسیم۔" باہی نے افسردگی سے کہا۔ "تم پنڈی چلنے کی تیاری کرو۔"

"یا اللہ خیر۔" اماں گھبرا کر بولیں۔ "بھائی جان کے یہاں تو سب خیریت ہے؟" پنڈی میں میرے ماموں ٹار رہتے تھے۔ وہ امی اور خالہ سے بڑے تھے۔ اکثر ہمارے گھر آتے رہتے تھے، مجھ سے تو خاص طور پر بہت محبت کرتے تھے۔

"بھائی ٹار....." باہی کہتے کہتے رک گئے۔ "کیا ہوا بھائی جان کو؟" اماں رو ہانسی ہو گئیں۔ "بھائی ٹار....." اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" باہی نے جھپکتے ہوئے کہا۔

"ہائے میرا ویر۔" اماں نے کہا اور چکر کر گرنے ہی والی تھیں کہ میں نے لپک کر انہیں تھام لیا اور اٹھا کر چار پائی پر لٹا دیا۔ خود میرا دل بھی غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ نورین بھی غم

کپڑا اتار کر دیکھ لیں۔ اس میں اب بھی میل کی گولیاں ہوں گی۔"

"اپنے سر سے کپڑا اتارو۔" انو نے حکمانہ لہجے میں کہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سادہ لباس پولیس آفیسر ہے۔ "غلطی ہو گئی انو بھائی۔" اس نے کہا۔ "مجھے معاف کر دیں۔"

"معافی ان صاحب سے مانگو۔" انو نے حکم دیا۔ "اور ہمارے لیے گرما گرم چائے اور سو سے لے کر آؤ۔" کن میلیا میری طرف گھوما اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "مجھے معاف کر دیں۔" پھر وہ تیزی سے چلا گیا۔

انو نے مجھ سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آئیں۔" وہ مجھے ایک طرف لے گیا جہاں پانی کا ٹنکا لگا ہوا تھا۔ اس نے میرا منہ دھلویا، میرے کپڑے صاف کیے اور مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہاں اس کے چار پانچ دوست پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ وہ کبھی اپنے حلیوں سے آوارہ اور کلمے لگ رہے تھے۔ انو البتہ خاصے معقول لباس میں تھا۔

اس نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ "یہ مراد ہے، یہ عقل ہے، یہ اشراف ہے لیکن ہم اسے شرف کہتے ہیں اور یہ خالد ہے۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "میرا نام انور ہے لیکن لوگ مجھے انو کہتے ہیں، آپ کا کیا نام ہے؟" "سنسور۔" میں نے جواب دیا۔ یہ انو سے میری پہلی ملاقات تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لاہور کا بہت خطرناک غنڈا ہے۔ اس نے بے شمار لوگوں کو لوٹا تھا، ان پر تشدد کیا تھا اس پر کئی لڑکیوں کے اغوا اور زیادتی کا بھی الزام تھا لیکن اب تک کوئی بھی الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا اس لیے وہ آزادانہ شہر میں دن دناتا پھرتا تھا۔

بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنی گرل فرینڈز سے ملوایا۔ ان میں سے ایک لڑکی فوزیہ مجھے بہت اچھی لگی۔ وہ جلد ہی مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کا تعلق اوسط درجے کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ وہ گھر سے ملازمت کرنے نکلتی تھی تاکہ اپنے بوڑھے والد کا ہاتھ بٹا سکے لیکن نہ جانے کیسے انو کے ہتھے چڑھ گئی۔ انو اس سے چھوٹے موٹے کام لیتا تھا اور اسے خاصا معقول معاوضہ دیتا تھا پھر فوزیہ کے بعد شہناز، سہلی اور عذرا میری زندگی میں آئیں۔ ان لڑکیوں کا انو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ میری دوست تھیں اور میری مردانہ وجاہت پر مرستی تھیں۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پہنچنے کو کہتا پھر خود بھی اسٹیشن پہنچ جاتا۔ لاہور اسٹیشن پر بہت سی ایسی جگہیں ہیں جہاں

ساتھ ہی میل کی ایک چھوٹی سی گولی بھی نکال لی اور بولا۔ "دیکھیے بابو صاحب! آپ کے کان میں کتنا میل تھا۔ آپ کو کم سے کم پختے دس دن میں ایک دفعہ کان ضرور صاف کروانا چاہئیں۔"

"کیوں کرتے ہو تم۔" میں پھر کر بولا۔ "تم نے یہ میل میرے کانوں سے کیا ہے؟" "وہ ڈھنائی سے بولا۔

"جبوٹ مت بولو۔" میں چیخ کر بولا۔ "میں نے کل ہی ایک ای این ٹی سرجن سے اپنے کانوں کی صفائی کروائی ہے۔" میں نے بھی ڈھنائی سے جبوٹ بولا۔ "کیا تم اس ڈاکٹر سے بھی زیادہ ماہر ہو؟"

"کان صاف کروانے کے بعد آپ بہانے بنا رہے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "پیسے تو تمہیں دینا ہی پڑیں گے۔" "میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔ تم بے وقوف بناتے ہو لوگوں کو۔"

"سیدھی طرح سے پیسے نکال۔" وہ اپنی اصلیت پر آگیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس کے منہ پر چٹاخ سے ایک ٹھنڈی سی لڑکی کر دیا۔ وہ بھی مجھ سے لپٹ پڑا۔ "میل لڑکاؤ کی کراچا نکا دو تمہیں کن میلیے اور پھر یہاں پہنچتے تھے اور سب کے سب ایک دم مجھ سے لپٹ گئے۔"

وہیں پارک کے ایک گوشے میں میری عمر کے کچھ لڑکے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے پتا دیکھ کر وہ دوڑنے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک لڑکا ڈپٹ کر بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ چھوڑو اسے، ایک آدمی کول کر اسے آدمی مار رہے ہو؟" اس لڑکے کی آواز سن کر ان لوگوں نے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میرے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے، کلائیوں اور چہرے پر خراشیں تھیں اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔

اس نے ایک نظر میرا جائزہ لیا پھر درشت لہجے میں بولا۔ "کیوں مار رہے تھے اسے؟" "انو بھائی! اس نے کان صاف کروائے اور پیسے بھی نہیں دے رہا ہے۔" وہ کن میلیا بولا جس نے میرے کان صاف کیے تھے۔

"یہ جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔" میں نے کہا۔ "اس نے میرے کانوں سے نہیں بلکہ اپنے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے میل نکالا تھا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو اس کا

وہ ہمیشہ مجھ سے انگلیں میں بات کرتے تھے اور کہتے تھے کہ تم دوسروں سے بھی انگریزی میں بات کیا کرو۔ یہ مت سوچو کہ تم غلط بول رہے ہو یا سچ، بس بولتے رہو۔ تمہاری انگریزی رواں ہوگی تو سچ انگریزی بھی بولنے لگو گے۔"

میں کالج میں اپنے دوستوں سے بھی انگلیں میں بات کرتا تھا۔ وہ لوگ پہلے تو میرا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ بھی انگریزی میں بات کرنے لگے۔

فوج میں نہ جانے کا مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میرا دل ہر کام سے اجاٹ ہو گیا۔ میں سارا سارا دن آوارہ گھومتا رہتا۔ لاہور کا اسٹیشن کافی بڑا ہے۔ میں اسٹیشن پر چلا جاتا اور مختلف پلیٹ فارمز پر گھومتا رہتا۔ وہاں جتنے انسان والے تھے سبھی مجھے پہچانتے تھے۔ میں رات گئے گھر میں داخل ہوتا اور دو۔ تک فلمی میگزین پڑھتا رہتا یا پھر ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتا اور چار چار بجے تک ٹی وی دیکھتا رہتا پھر میں دوسرے دن بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں اٹھتا تھا۔ اٹھنے کے بعد میرا پھر وہی معمول ہوتا۔ میں منہ دھو کر ناشا کرتا، بہترین کپڑے پہنتا اور آوارہ گردی کے لیے نکل جاتا۔ کبھی مال روڈ، کبھی انارکلی اور کبھی یوں ہی کسی پارک میں جا بیٹھتا اور لوگوں کو دیکھتا رہتا۔ پارک میں بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے۔ میرے لیے سب سے دلچسپ وہ ماشے تھے جو ایک اسٹینڈ پر مختلف تیلوں کی شیشیاں سجائے انہیں کھاتے پھرتے تھے۔ بہت سے لوگ ان سے مالش بھی کرواتے تھے۔ پھر وہ کن میلیے تھے جو سر پر کپڑا اس انداز میں باندھتے تھے کہ ٹوٹی کا گمان ہوتا تھا۔ ان کے پاس میلا سا ایک تھیلا بھی ہوتا تھا جس میں روٹی، تیل اور چھوٹی موٹی شیشیوں میں خود ساختہ دوا بھی ہوتی تھیں وہ نہ صرف کانوں سے میل نکالتے تھے بلکہ اس شخص کو میل کی چھوٹی سی گولی دکھا کر کہتے تھے کہ آپ کے کان سے یہ میل نکلا ہے۔ میں حیران ہوتا تھا کہ کسی آدمی کے کان میں اتنا میل کیسے ہو سکتا ہے؟

ایک دن میرے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ میں کان صاف کروانے بیٹھ گیا۔ کن میلیے نے بہت مہارت سے سلائی میرے کان میں ڈالی اور اسے اندر دور تک لے گیا۔ مجھے بہت اچھا لگا لیکن میری نظر اس کے ہاتھوں پر تھی۔۔۔ بدظاہر میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن آنکھیں بہت خفیف سی کھول کر اس کے ہاتھوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

اس نے مختلف قسم کی سلائیاں میرے کانوں میں ڈال کر گھما گھما کر پھر اس نے بہت چابک دستی سے سر پر بندھے ہوئے کپڑے سے ایک سلائی نکالی لیکن اس کے

سے نڈھال تھی۔

ہم لوگ اسی دن پنڈی پہنچ گئے۔ ماموں سفر آخرت کے لیے تیار تھے۔ شام تک میں اپنے محبت کرنے والے ماموں کو منوں مٹی تے دبا کر واپس آ گیا۔ ماموں کی چیزیں دیکھ کر مجھے مزید اذیت ہو رہی تھی۔ وہاں خالہ زینت بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کی دونوں بیٹیاں بھی۔ خاندان کے کچھ بزرگوں نے اماں اور خالہ زینت کی صلح کروادی پھر تو وہ دونوں ایک دوسرے سے گلے لگ کر یوں بلک بلک کر روئیں کہ وہاں موجود ہر آدمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بھائی کی جدائی کا غم تھا یا بہن سے برسوں نہ ملنے کا صدمہ..... دونوں رو رو کر نڈھال ہو گئیں تو پھر ماما نے ان دونوں کو سنبھالا۔

زینت خالہ کی دونوں بیٹیاں بھی وہاں موجود تھیں لیکن میں نے ابھی تک کسی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس وقت نہ جانے کس کے گھر سے کھانا آ گیا۔ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن دوسروں کے اصرار پر مجھے دسترخوان پر بیٹھنا پڑا۔ ابھی میں نے پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ میرے منہ میں آگ سی لگ گئی۔ قور سے میں اتنی مرجھیں تھیں کہ میرے حلق سے لے کر کانوں تک میں آگ لگ گئی۔ میں نے گھبرا کر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اسی وقت ایک خوب صورت ہاتھ میری طرف بڑھا۔ اس میں پانی کا گلاس تھا۔ میں نے گلاس لے کر پانی دینے والی کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بلا کی حسین اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔ اسے دیکھ کر میں پانی پینا بھول گیا۔ وہ ایک عجیب شان بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ میں چند لمحوں تک گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا پھر ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا پھر مجھے میں دوسرا لقمہ لینے کی جرات نہ رہی اور میں نے کھانے سے ہاتھ ہٹا لیا۔

شام تک ماموں جان کے تمام دوست احباب اور ان کی فیملیز چلی گئیں۔ اماں نے مجھے بلایا۔ وہ اس وقت بھی زینت خالہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ "صفر! اماں نے کہا۔ تم نے انہیں پہچانا؟" انہوں نے خالہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے خالہ زینت کو برسوں پہلے دیکھا تھا لیکن نہ پہچاننے کا کیا سوال تھا۔ میں نے کہا۔ "اماں! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ خالہ زینت ہیں۔"

"ارے، یہ صفر ہے؟" خالہ نے کہا۔ "ماشاء اللہ یہ تو اپنے ابائی سے بھی لمبا ہو گیا۔"

"اور بیٹھم بھی۔" میرے پیچھے سے کسی لڑکی کی

آواز آئی لیکن وہاں خاندان کی کئی لڑکیاں تھیں اس لیے مجھے علم نہ ہو سکا کہ یہ جملہ کس کا تھا۔

"شرہ!" خالہ نے کسی کو آواز دی۔ "ادھر آؤ۔" وہی شعلہ جوالا چمکتی ہوئی وہاں آ گئی۔ "یہ تیری نسیبہ خالہ کا بیٹا صفر ہے۔" خالہ نے کہا۔ "اور یہ میری بڑی بیٹی شرہ ہے۔" شرہ نے بے نیازی سے مجھے دیکھا پھر نرمی انداز میں سلام کر کے امی ہی کے پاس بیٹھ گئی۔

"نورین سے تو تم مل ہی چکی ہو۔" خالہ نے کہا۔ "امی، میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔" اچانک خوب صورت سی ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔ اس کے چہرے اور سراپا دونوں میں شرہ کی شہادت تھی لیکن حسن، دلکشی اور بانگن میں شرہ اس سے کہیں آگے تھی۔

"میں خود اپنا تعارف کروادیتی ہوں۔" اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ "صفر بھائی! میں آپ کی کزن یعنی خالہ زاورہ شاہن ہیں۔" اس کے انداز میں پچکانا پن تھا۔ یہ شرہ سے میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ملاقات نے ہی مجھے گویا گھائل کر دیا تھا۔

ہم لوگ ماموں جان کے سوئم کے بعد واپس آ گئے البتہ اماں وہیں رگ گئی تھیں۔ لاہور آنے کے بعد میری نظروں میں وہی منظر گھومتا رہتا کہ شرہ مجھے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے پانی کا گلاس پیش کر رہی تھیں۔ چند دن بعد اماں بھی لوٹ آئیں اور نورین بھی۔ چند ہی دنوں میں وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ میں نے کچھ دن تو ماموں جان کی موت کا سوگ منایا پھر میرے وہی معمولات شروع ہو گئے۔

ایک دن رات گئے میں گھر میں داخل ہوا تو ابائی کے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے میں اپنا نام سن کر چونک گیا۔ ابائی کہہ رہے تھے۔ "تم کس منہ سے صفر کا رشتہ لے کر زینت کے یہاں جاؤ گی۔ صاحب زادے سوائے آوارہ گردی کے اور کرتے بھی کیا ہیں؟ یوں بھی بھائی مشتاق کا رو باری آدمی ہیں۔ وہ بھلا یہ گھانے کا سودا کیوں کرنے لگے؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میرا صفر تو لاکھوں میں ایک ہے۔ شہزادہ لگتا ہے بالکل۔"

"کوئی بھی ذی ہوش شخص کسی کنگال شہزادے کو اپنی بیٹی نہیں دیتا۔ شرہ تو پھر خوب صورت ہے۔ دولت مند باپ کی بیٹی ہے اور ایف ایس سی کر رہی ہے۔ ہاں اگر صاحبزادے میرے مشورے پر عمل کرتے اور انجینئرنگ

ہے شہر مسافت

پڑھ رہے ہوتے تو اس صورت میں شاید یہ رشتہ لے جانے پر میں بھی اعتراض نہ کرتا اور میں ممکن ہے کہ صفر کے تابناک مستقبل کو دیکھ کر بھائی مشتاق بھی انکار نہ کرتے۔"

میں یوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آ گیا۔ وہ رات میں نے گویا انگاروں پر گزار دی۔ ابائی واقعی سچ کہہ رہے تھے۔ میں آخر تھا بھی کیا؟ ایک آوارہ اور لنگھا جو سرگرم پینا پیتا تھا اور لڑکیوں کی عزت بھی پامال کرتا تھا۔ ابائی کو یہ سب معلوم نہیں تھا۔ ان کے علم میں تو یہ بھی نہیں تھا کہ میں جرائم کی راہ پر بھی چل پڑا ہوں اور اپنے ساتھ ہر وقت پستول بھی رکھتا ہوں۔

میں رات بھر سرگرم پھونکنگ رہا اور شرہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اذان فجر بلند ہوئی تو میں نے برسوں بعد نماز فجر ادا کی اور اللہ تعالیٰ سے رورو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں ہر برا کام چھوڑ دوں گا۔ میں اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دوں گا اور خود کو شرہ کے قابل بناؤں گا۔ صبح کی نماز کے بعد ابائی واپس آئے تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس دن میں نے ابائی کے ساتھ ہی ناشتا کیا اور ان سے کہا۔ "ابائی! کیا اب بھی میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو سکتا ہے؟"

ابائی نے سچ کہا۔ مجھے دیکھا پھر رونے لگا۔ "بیٹا! ایک سال تو تم نے آوارہ گردی میں ضائع کر دیا ورنہ تمہارے نمبر تو ایف ایس سی میں اتنے اچھے تھے کہ تمہیں انجینئرنگ میں داخلہ بہت آسانی سے مل جاتا۔"

"ابائی! اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جائے تو کیا اس پر تعلیم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"لیکن بیٹا! تم تو بیمار نہیں تھے۔ میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ پھر یونیورسٹی میں اگر گنجائش بھی ہو تو وہ میڈیکل سرٹیفکیٹ مانگیں گے۔ تمہیں میڈیکل سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟"

"ابائی! میرے ایک دوست کے بھائی ڈاکٹر ہیں، میں ان سے میڈیکل سرٹیفکیٹ لے لوں گا۔" میں نے کہا حالانکہ میرا ایسا کوئی دوست نہیں تھا جس کے بھائی ڈاکٹر ہوں لیکن میں سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتا تھا۔

"ویسے تمہیں بروقت خیال آیا ہے۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ شروع ہونے ہی والے ہوں گے۔"

میں اسی دن یونیورسٹی چلا گیا اور جا کر پرنسپل صاحب سے ملا۔ وہاں میرے اعتماد سے زیادہ میری انگریزی بولنے کی صلاحیت کام آئی۔ میں نے بہت اچھے نمبروں سے

ایف ایس سی پاس کیا تھا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے بھی یہی کہا کہ میں گزشتہ سال صین اس وقت بیمار پڑ گیا تھا جب داخلے ہو رہے تھے۔

پرنسپل صاحب نے کہا۔ "آپ جیسے بہترین طالب علم کو یونیورسٹی میں داخلہ دے کر مجھے خوشی ہوگی۔ آپ اپنی بیماری کا میڈیکل سرٹیفکیٹ تو لایا ہی سکتے ہیں؟"

"شیور سر۔" میں نے کہا۔ "میں کل ہی آپ کو سرٹیفکیٹ لا دوں گا۔"

"کل نہیں آپ سات تاریخ کو اپنے کاغذات مجھے لا کر دے دیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کا ایڈمیشن ہو جائے۔"

میں نے اس روز انہوں سے کہا۔ اس نے مجھے شہر کے ایک معروف ڈاکٹر کا میڈیکل سرٹیفکیٹ لادیا اور بولا۔ "تو پانچ مہینے تک بیمار رہا ہے۔ تیرے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور چکر بھی آتے تھے لیکن اب علاج کے بعد تو بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔"

یوں میرا داخلہ انجینئرنگ میں ہو گیا۔ یہ گویا ایک معجزہ تھا ورنہ انجینئرنگ اور میڈیکل میں تو اچھے سے اچھے طالب علم کو ایڈمیشن نہیں ملتا۔ یہ شاید میری اس دعا کا اثر تھا یا ابائی کی دیانت داری کا.....

میں دوبارہ پھر اسی شدت سے پڑھنے لگا۔ میں نے سب آوارہ لڑکوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ میں نے کسی بھی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ بس ایک انو سے میری دوستی تھی۔ وہ بھی میری مجبوری تھی۔ میں اس سے دوستی ختم کرتا تو وہ میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہاں، اس نے مجھ پر اتنا کرم ضرور کیا کہ وہ میری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ اسٹیشن کی ٹا کارہ بوگیوں والا ٹھکانا اب ختم ہو گیا تھا۔

میں اب اکثر خالہ زینت کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ ان کا محل نما گھراب پہلے سے زیادہ آراستہ تھا۔ خالو مشتاق کے پاس جدید ماڈل کی ہینڈ اٹھی تھی۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس سائیکل تھی۔ مجھے وہاں سائیکل پر جاتے ہوئے شرم آتی تھی اس لیے میں بسوں میں دھکے کھاتا ہوا وہاں جاتا تھا اور کچھ فاصلے پر اتر کر چکیسی لے لیتا تھا تاکہ وہاں رہنے والوں کو میری کم مائیگی کا احساس نہ ہو۔

میں جب بھی خالہ کے گھر جاتا، شرہ بہت کم میرے سامنے آتی تھی۔ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ بے نیازی سے سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی۔ اس کے

”شرہ! میں تمہیں امتحان میں کامیابی کی مبارک باد دینے آیا ہوں اور تم اندر جا رہی ہو۔“

”جی بہت شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ پھر اندر جانے کے ارادے سے ہٹتی۔

”ایک منٹ۔“ میں نے کہا۔ ”اپنا حنفہ تو لیتی جاؤ۔“ میں نے خوب صورت پیکنگ میں لپٹا ہوا گھڑی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔

”سوری صفر بھائی۔“ اس نے کہا۔ ”میں..... یہ گفٹ.....“ اسی وقت خالہ جان آئیں، وہ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔

میں نے خالہ جان کو ستانے کے لیے کہا۔ ”بھئی یہ تمہاری کامیابی کا انعام ہے۔ تم اسے لینے سے انکار کر رہی ہو۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے گھڑی کا ڈبا میرے ہاتھوں سے لے لیا۔

”ایک منٹ۔“ میں نے پھر کہا اور اپنا لایا ہوا مٹھائی کا ڈبا کھول کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”خوشی کے موقع پر تو منہ میٹھا کرتے ہی ہیں نا!“ اس نے پھر خالہ کی طرف دیکھا اور مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”اوہو، مٹھائیاں کھلائی جا رہی ہیں؟“ رمشانے کہا۔

”میں بھی تو امتحان میں پاس ہوئی ہوں، میرا گفٹ کہاں ہے؟“ اس نے مٹھائی کھاتے ہوئے کہا۔

”تم نے کوئی پوزیشن نہیں لی ہے۔“ خالہ جان نے اسے گھورا۔

”اچھا تو حنفہ لینے کے لیے پوزیشن لینے پڑتی ہے۔“ اس نے مصومیت سے پوچھا۔ ”ٹھیک ہے، اب میں بھی آپ کو پوزیشن لے کر دکھاؤں گی۔“ وہ یہ کہہ کر پھر پچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”عجب اول جلول لڑکی ہے۔“ خالہ جان نے کہا۔

”شرہ والی تو کوئی بات بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ جتنی بردبار ہے۔ یہ اتنی ہی شوخ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔“

”خالہ جان! رمشا ابھی بیٹی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بڑی ہوگی تو یہ بھی شرہ کی طرح بردبار ہو جائے گی۔“ میں پھر وہاں زیادہ دیر تک نہیں بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ اب میں سارا دن بھی یہاں بیٹھا رہوں تو شرہ میرے سامنے نہیں آئے گی۔

میں نے اس دن ایک کام اور کیا تھا۔ گھڑی کے ساتھ ایک کاغذ پر ایک شعر بھی لکھ دیا تھا۔ ”مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں..... تب خاک کے پردے سے

”اب آپ اسے وعدے سے پھریں مت۔“

نورین نے کہا۔ ”ہاں اگر آپ کو شرہ باجی پسند نہیں ہیں تو آپ اماں سے انکار کر دیں۔“

”اماں کی پسند ہے وہ۔ میں بھلا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”خیر تو ایسی کوئی خاص نہیں ہے لیکن آئس کریم تو مجھے کھلانی ہی پڑے گی۔“ اس دن کے بعد تو میں شرہ کے عشق میں مزید ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔

میں اب لاشعوری طور پر خالہ جان کے گھر بھی چلا جاتا تھا لیکن شرہ کا رویہ عجیب تھا۔ وہ بھی سامنے آ جاتی تو بہت شائستہ انداز میں سلام کر لیتی ورنہ میرے سامنے نہ آتی۔ چاہے میں گھنٹوں وہاں بیٹھا رہوں۔ مجھے اس کا یہ رویہ عجب سا لگتا تھا۔ مجھے تو اپنی مردانہ وجاہت پر بہت ناز تھا۔ کوئی بھی لڑکی مجھ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی پھر شرہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ کیا اسے بھی علم ہو گیا تھا کہ خالہ جان اس کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں؟ کیا وہ مجھ سے شرماتی ہے یا پھر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟ اس کے برعکس رمشا ہمیشہ میرے ارد گرد منڈلاتی رہتی۔ میں اس سے شرہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ ٹال جاتی۔ مجھے تو پتہ تھا کہ شرہ کو کوئی اور پسند ہے تو وہی رنگ میری پسند بھی بن جاتا۔ کمریوں سے مجھے شدید چڑھتی تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ قیصر اور کرپے شرہ کی پسندیدہ ڈش ہے تو میں قیصر اور کرپے بہت رغبت سے کھانے لگا۔ رمشا نے ایک دن باتوں ہی باتوں میں بتایا کہ شرہ باجی کو سفید کاشن کا کلف دارشلوار سوٹ پسند ہے تو میں ان کے یہاں سفید براق کاشن کی کلف دارشلوار قیصر پہن کر جانے لگا۔

میں جتنا اس کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا، وہ اتنا ہی مجھ سے کتراتے ہوئے۔ شرہ نے بی بی ایس ہی کیا تو واقعی اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ میں یہ خبر سنتے ہی بازار کی طرف بھاگا اور اپنے جیب خرچ سے بچائے ہوئے پیسوں سے شرہ کے لیے انتہائی خوب صورت اور قیمتی گھڑی خریدی اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

اس دن میری قسمت اچھی تھی کہ شرہ سامنے ہی برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں مجھے سلام کیا اور اندر کی طرف جانے لگی تو میں نے پہلی دفعہ اسے آواز دے کر روک لیا۔ اس نے رک کر بیزارگی سے میری طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ”جی، کیسے؟“

خبر ہے۔ آپ آئس کریم کھلانے کا وعدہ کریں تو بتاؤں گی۔“

”مجھے آئس کریم کھانا ہے تو ویسے ہی کھالے۔“

بھانے بازیاں کیوں کر رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرے پاس واقعی ایک خبر ہے۔ آپ نہیں گے تو اچھل پڑیں گے۔“ اس نے کہا۔

”چل پھر تیری آئس کریم پکی۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اگر وہ خبر تیری دوسری باتوں کی طرح فضول ہوئی تو آئس کریم نہیں ملے گی۔“

”اماں اور خالہ آپ کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“ نورین مسکرا کر بولی۔

”میری شادی کی بات؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں، وہ دونوں تو بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھیں لیکن میں اس وقت برآمدے میں تھی اس لیے ان کی باتیں سن لیں۔“

”ارے تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ اماں کو تو کب سے میری شادی کی فکر ہے۔“ میں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

”نئی بات یہ ہے کہ وہ دونوں آپ کی اور شرہ باجی کی شادی کی بات کر رہی تھیں۔“

میرا دل بے اختیار زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے خود پر قابو پا کر پوچھا۔ ”میری اور شرہ کی شادی؟“

”دیکھا، کیسے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں۔“

”پوری بات بتا۔“ میں نے اس سے کہا۔

”پوری بات تو بتادی۔“ اس نے مصومیت سے کہا۔

”مجھے تفصیل سے بتا، وہ کیا باتیں کر رہی تھیں؟“

”وہ.....“ نورین سوچتے ہوئے بولی۔ ”اماں نے خالہ جان سے کہا کہ باجی، آپ کو یاد ہے میں نے شرہ کو کچھن ہی میں صفر کے لیے مانگ لیا تھا۔ خالہ جان نے کہا ہاں مجھے یاد ہے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ شرہ کی شادی صفر سے کر دوں لیکن صفر اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جائے۔ ملک صاحب کو بھی تو راضی کرنا ہوگا۔“ وہ خالو مشتاق کو ملک صاحب کہتی تھیں۔

”صفر پٹنا انجینئر بن جائے گا تو وہ بھی انکار نہیں کریں گے۔ صفر کو نا پسند تو وہ نہیں کرتے۔“

نورین کی باتیں سن کر میرا دل گویا بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ منزل خود ہی میرے نزدیک آ رہی تھی۔

میں نے رینو کو چرانے کے لیے کہا۔ ”یہ کوئی خاص خبر نہیں ہے اور شرہ جیسی تو نہ جانے کتنی لڑکیاں یونیورسٹی میں میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔“

برعکس رمشا بہت باتونی اور شوخ لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ بے تکلف ہو گئی تھی۔ میں بھی اسے بچی سمجھ کر ہی بات کرتا تھا۔ وہ اس وقت آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔

میں اس دن یونیورسٹی سے واپس آیا ہی تھا کہ خالہ زینت آئیں۔ حسب معمول رمشان کے ساتھ تھی، شرہ نہیں آئی تھی۔ اماں نے بہت دلہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا پھر شکایتا بولیں۔ ”باجی! کیا شرہ آدم بیزار ہو گئی ہے یا تم نے اسے پردہ کرانا شروع کر دیا ہے؟“

”ارے نسیر! اس لڑکی پر تو پڑھائی کا بھوت سوار ہے۔ وہ کالج میں اول پوزیشن لینے کی تیاری کر رہی ہے۔“

میں خالہ زینت سے مل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ رمشا میرے پیچھے پیچھے ہی آ گئی۔ اس نے چمک کر کہا۔ ”ہیلو کزن! کیسے ہیں آپ؟“

”رمشا! میں تم سے پورے گیارہ سال بڑا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم تو مجھ سے یوں بات کرتی ہو جیسے میرے برابر کی ہو۔“ میں نے کہا۔

رمشانے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

”آپ مجھ سے گیارہ سال بڑے ہیں تو کیا ہوا؟ اور اگر آپ کو مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو میں بھی آئندہ بات نہیں کروں گی۔“

”اوہو، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔

”میں آپ سے گیارہ سال چھوٹی ہوں تو کیا ہوا۔ کیا میں بزرگوں کی طرح آپ کا احترام کروں؟“

اسی وقت نورین اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ گئی اور بولی۔ ”تم یہاں کھسی بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں تلاش کر رہی ہوں۔“ پھر وہ مجھ سے بولی۔ ”بھیا! ذرا خالہ جان کے ڈرائیور کو بھی چائے وغیرہ دے آئیں۔“ میں خالہ کے ڈرائیور کو چائے دینے گیا تو گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہ گاڑی تو نہیں تھی جو خالو مشتاق کے استعمال میں رہتی تھی۔ خالہ جان تھوڑی دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اماں سے بولیں۔ ”نسیر! ابھی تم بھی ہماری طرف آ جاؤ۔ میرا بھانجا تو اکثر وہاں آتا رہتا ہے۔“

”میں بھی آؤں گی باجی۔“ اماں نے کہا۔ ”بس گھر کے بکھیڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔“ میرا دل چاہا کہ دوں کہ آپ کی طرح ہمارے گھر میں تو کون نہیں ہیں لیکن میں یہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد اماں گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ نورین ہنستی ہوئی میرے کمرے میں آئی اور بولی۔ ”بھیا! آپ کے لیے ایک اچھی

انسان نکلے ہیں۔“ میں نے ہمت کر کے یہ شعر شمرہ کو دے تو دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہوگا؟ اس پر کچھ اثر ہوگا بھی یا نہیں۔ رمشا نے بتایا تھا کہ شمرہ باجی شاعری کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ اگر اسے شعر و شاعری کا شوق تھا تو یقیناً یہ شعر بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا اور میرا شکوہ بھی۔

میں ان دنوں انجینئرنگ کے فائنل ایئر میں تھا اور شمرہ ماسٹر۔۔۔۔۔ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنے بیروں پر کھڑا ہونے کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ میں پہلے سے بھی زیادہ محنت سے پڑھنے لگا۔ میرے امتحانات ختم ہوئے تو مختلف کہنیوں سے ملازمت کی پیشکش ہونے لگی۔ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ اباجی نے بھی یہی کہا تھا۔ ”بیٹا! جلدی مت کرنا۔ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ اپنے اساتذہ سے مشورہ بھی ضرور کرنا۔“

☆☆☆

ان ہی دنوں میرے دل پر گویا بجلی گر پڑی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ خبر سن کر میں زندہ کیسے رہا۔ میرے دل کی حرکت بند کیوں نہ ہوگئی۔ ابھی میں نے ملازمت کی بھی نہیں تھی کہ اماں سے میری خبر ہو سکا۔ وہ شمرہ کا رشتہ لے کر خالہ جان کے یہاں پہنچ گیا۔

انہوں نے رشتے کی بات کی تو مشتاق خالو نے انتہائی رعونت سے انکار کر دیا اور بولے۔ ”معاف کرنا لیسہ اتم میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔ میری بیٹیاں پیش و آرام اور ناز و نعم کی عادی ہیں۔ تمہارا بیٹا ان کے اخراجات کہاں سے پورے کرے گا؟“

”میرا بیٹا اب ماشاء اللہ انجینئر ہو جائے گا۔“ اماں نے فخر سے کہا۔

”تب بھی کتنا کمالے گا؟“ خالو مشتاق نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اس کی تنخواہ سے میری بیٹی کے دو جوڑے بھی نہیں آئیں گے۔ انسان کو رشتہ ہمیشہ اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی کرنا چاہیے۔ آپ بھی کسی کلرک یا اسٹیشن ماسٹر کی بیٹی کا رشتہ دیکھیں۔“

اماں اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ اسی وقت وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ خالہ جان انہیں روکتی ہی رہ گئیں لیکن اب رکنے کا کیا جواز تھا؟

یہ سب تفصیل مجھے نورین نے بتائی تھی۔ وہ اماں کے ساتھ گئی تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی

دھڑکن رک گئی ہو اور ذہن مفلوج ہو گیا ہو لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے زندگی کا احساس ہوا تو مشتاق خالو کی باتیں یاد کر کے میرا خون کھولنے لگا۔ انکار کرنے کے اور بھی بہت سے مہذب طریقے ہوتے ہیں۔ انہیں اماں کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

میں اسی وقت گھر سے نکل گیا اور اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ ایک دفعہ پھر میں اسی دورا رہے پر آن کھڑا ہوا تھا جہاں سے شمرہ کی ایک طرف محبت کھینچ کر لے گئی تھی۔ یہ میری ایک طرف محبت ہی تو تھی ورنہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک میں اسے اپنے عشق میں گرفتار کر چکا ہوتا پھر اس کا دولت مند باپ میری ماں کی بے عزتی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لڑکی تن کر اپنے باپ کے سامنے کھڑی ہو جاتی لیکن شمرہ نے تو بھی مجھ سے کھل کر بات بھی نہیں کی تھی۔ کھل کر بات کرنا تو دور کی بات ہے، اس نے تو اس پورے عرصے میں مجھ سے صرف چند جملے ہی بولے ہوں گے۔

میں جتنا شمرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، میرا خون کھول رہا تھا۔ میرے تصور میں اماں کا بے بس چہرہ تھا۔ جب مشتاق خالو نے انہیں دھتکارا ہوگا تو ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

میں شام تک اسٹیشن پر بیٹھ ہی غیر اذہنی طور پر بھٹکتا رہا اور وہاں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ ان میں کئی لڑکیاں بے انتہا خوب صورت تھیں لیکن ان میں شمرہ جیسی کوئی نہیں تھی۔

رات کو میں تھکا ہارا گھر آ رہا تھا کہ انو مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک ہوٹل میں چلا گیا اور بولا۔ ”کیا بات ہے صفر۔۔۔۔۔ تو کچھ پریشان ہے؟“

میں اپنے دل کا حال کہہ کر اپنی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا۔ انو نے پوچھا تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

”یار! اس گھبے کی یہ مجال۔“ خالو مشتاق گھٹے گھٹے انو بھی انہیں جانتا تھا۔ ان کا گاڑیوں کا ایک شوروم بھی تھا۔ انو ان سے بھٹا لیا کرتا تھا لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ انو میرا دوست ہے ورنہ وہ بہت پہلے میرا داخلہ اپنے گھر میں بند کر چکے ہوتے۔

”یار! تم کبھی کیا کہتے ہیں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”یار! اس حرام زادے نے دولت کے نشے میں ڈوب کر اماں کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تو ان کی یہ بے عزتی برداشت کر لے گا؟“

”وہ تو مجھے برداشت کرنا پڑے گی۔“ میں نے

بے شمار مسالفت

کہا۔ ”اور میں کبھی کیا سکتا ہوں۔ کیا میں اس مشتاق کو گولی مار دوں؟“

”اسے مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔“ انو نے کہا۔ ”ورنہ اسے تو میں کھل ہی گولی مار دوں گا۔ میرے ذہن میں کچھ اور ہے، میں اس کے ساتھ ایسا کروں گا کہ وہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔“

”کیا کرے گا تو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں اس کی بیٹی کو اٹھالوں گا۔ کیا نام بتایا تو نے شمرہ؟“

”تو ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ میں نے بھڑک کر کہا۔

”یار! پوری بات سنے بغیر سچ میں مت بول۔“ انو نے کہا۔ ”کوئی بھی لڑکی ایک دورات گھر سے باہر رہے تو پھر اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ تو فکر مت کر اس کی عزت پر آج بھی نہیں آئے گی۔ میں اسے صرف دو دن تک رکھنے کے بعد دوبارہ گھر چھوڑ دوں گا پھر وہ گنہگار اس کی شادی تجھ سے کرنے پر راضی ہوگا۔۔۔۔۔ میں اس کے جاننے والوں میں یہ مشہور کر دوں گا کہ سیٹھ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”لیکن یار! میرا دل نہیں مانتا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ تو یہ بے عزتی برداشت ہی نہیں کر سکتی گی۔“

”اس میں شمرہ کی بے عزتی کہاں ہوگی۔“ انو نے کہا۔ ”وہ تو بہت آرام سے بڑی حفاظت میں رہے گی۔“

”انو! یہ کام بہت خطرناک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خطرناک ہے یا؟“ انو نے منہ بنا کر کہا۔ ”تو

کیا مجھے جانتا نہیں ہے۔ کیا میں نے اس سے پہلے یہ کام نہیں کیے اور اب تو میں نے پورا ایک گینگ بنا لیا ہے۔ اب اس شہر پر میرے بھائی کا راج ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”کوئی لوکا پٹھا دولت کے نشے میں چور ہو کر میری ماں کی بے عزتی کر دے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تجھے دوست کہا ہے تو میری ماں میری ماں بھی تو ہوگی۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ میں خود انتقام کی آگ میں سلاگ ہوا تھا اس لیے مجھے اس کی ہر بات سچ لگ رہی تھی۔

”اب تو مجھے اس کے اسکول کا پتا بتا۔“ اس نے کہا۔

”میں اسے راتے ہی سے اغوا کر لوں گا۔“

”یار! وہ اسکول میں نہیں کالج میں پڑھتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ بس میں یا پیدل نہیں جاتی ہے بلکہ ان

کا ڈرائیور ہوتا ہے، وہ گاڑی میں جاتی ہے۔“

”تو ڈرائیور کہاں کا رہتا ہوگا۔ میں گاڑی روک کر

سرعام اسے اٹھالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کا جھکا بھی کر دوں گا تاکہ اس سیٹھ کے دل پر دہشت طاری ہو جائے۔“

”نہیں یار۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرائیور ہی تو گھر جا کر اس کے اغوا کی خبر دے گا۔“

”چل، تو کہتا ہے تو ڈرائیور کو بخش دیتا ہوں۔“ میں نے اسے شمرہ کے کالج کا پتا بتا دیا۔ خالو مشتاق کے گھر کا ایڈریس سمجھایا اور اسے بتایا کہ ان کے پاس کس میک اور ماڈل کی اور کس رنگ کی گاڑیاں ہیں۔

”بس تو اب بے فکر ہو جا۔“ انو نے کہا۔ ”کل کا سورج اس سیٹھ کے لیے بدنامی اور رسوائی لے کر آئے گا۔“

”لیکن یار! ایک بات کا خیال رکھنا۔“ میں نے کہا۔ ”شمرہ کو تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی عزت پر ڈرا بھی آج نہیں آئی چاہیے۔“

”تو فکر مت کر یار۔“ انو نے ہنس کر کہا۔ ”وہ آخر بھابی ہے میری۔ بھابی تو بہن کی طرح ہوتی ہے۔ میں اسے بہت باعزت طریقے سے لے جاؤں گا اور انتہائی باعزت طریقے سے چھوڑ بھی دوں گا۔“

انو سے مل کر میرا دل کچھ ہلکا ہوا تھا اور میرے دل میں ایک مرتبہ پھر شمرہ کی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ اس کی محبت تو میرے دل پر نقش تھی لیکن اسے وقتی طور پر مایوسی کے اندھیروں نے نگل لیا تھا۔ اب انو نے امید کی کرن دکھائی تو مجھے شمرہ کا حصول اس مرتبہ ممکن نظر آنے لگا۔ بھلا ایسی لڑکی سے کون شادی کرتا جو گھر سے دو راتیں باہر گزار کر آتی۔ وہ بھی اغوا ہو کر۔ ایسے میں جب میں اس کے لیے رشتہ بھیجتا تو اس کا مفروضہ باپ اسے ہی قبول کرنے میں عاقبت سمجھتا۔ شمرہ کی نظروں میں میری عزت بڑھ جاتی کہ میں سب کچھ جانتے بوجھتے اسے اپنا رہا ہوں۔ میں مطمئن ہو کر گھر آ گیا لیکن اس رات۔۔۔۔۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس رات مجھے بے چینی اور اضطراب تو تھا لیکن مایوسی اور بے چاری نہیں تھی۔

میں رات کو دیر تک جاگتا رہا اس لیے دن چڑھے تک سوتا رہا۔ اچانک اباجی کی گھبراہٹی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔

”تم ابھی نورین کو لے کر فوراً باجی کے گھر چلی جاؤ۔ نہ جانے بے چاری کی کیا حالت ہوگی۔“

میں آنکھیں ملتا ہوا کمرے سے باہر آیا اور اباجی سے

موٹاپا کریں کم... Young!!

رہیں Slim اور فٹ اور

طیبی عرق اوبیسول

موٹاپے میں کمی کی قدرتی دوا
100 فیصد قدرتی جزی بوٹیوں سے تیار شدہ

- جسم سے زائد چربی خارج کرتا ہے • ہاضمہ درست اور جگر کو قوی کرتا ہے
- اجابت صاف لاتا ہے • آنٹوں کی سوزش دور کرتا ہے
- ہاتھ اور پاؤں کی سوجن میں فائدہ مند

طیبی
دواخانہ (پراشویٹ) لمیٹڈ
کراچی۔ پاکستان www.teyyebi.com.pk

1815

پوچھا۔ ”کیا ہوا باجی! آپ اسے پریشان کیوں ہیں؟“
ان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا۔
”صفر بیٹا! آج صبح کچھ لوگوں نے رمشا کو اغوا کر لیا ہے۔“
”رمشا کو اغوا کر لیا ہے؟“ میرے ذہن میں گویا کسی
نے ہتھوڑا رسید کر دیا۔ ”رمشا کو کون اغوا کر سکتا ہے باجی؟“
”یہاں تو اب اغوا اور ڈکیتی کی وارداتیں معمول کی
بات بن کر رہ گئی ہیں بیٹا۔“
”آپ کو کس نے بتایا؟“ میں نے پوچھا۔
”مجھے باجی نے خود ٹیلی فون کیا تھا۔“ باجی نے کہا۔
”وہ بے چاری تو صبح طرح بات بھی نہیں کر پار ہی تھی۔ ان
کا ڈرائیور رمشا کو اسکول لے کر جا رہا تھا۔ آج شہرہ کی
طبیعت خراب تھی اس لیے وہ کالج نہیں گئی تھی ورنہ دونوں
یہیں ساتھ جاتی ہیں۔“
”اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت تھی۔“ اماں نے
کہا۔ ”ورنہ اغوا کرنے والے تو دونوں لڑکیوں کو لے
جاتے۔“ نورین بڑی طرح رو رہی تھی۔ اس دوران میں رمشا
سے اس کی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بھی تو اس کی ہم عمر۔
میرا سر بڑی طرح چکرا رہا تھا۔ یہ انونے کیا غضب
کر دیا۔ اس نے رمشا کو اغوا کیوں کیا پھر مجھے خود ہی خیال
آیا کہ اس میں انوکا بھی کیا قصور؟ وہ نہ شہرہ کو پہچانتا تھا نہ
رمشا کو۔ رمشا اسکول کے لیے لگی ہوئی تو وہ یہی سمجھا ہوگا کہ
یہ شہرہ ہے۔ اس نے اسی کو اغوا کر لیا۔
”صفر بیٹا!“ باجی نے کہا۔ ”تم بھی خالہ کے پاس
چلے جاؤ۔ انہیں اس وقت تسلی کی ضرورت ہے بیٹا۔ میرا
اسے ایس ایم آجائے تو میں بھی آتا ہوں۔“
عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ انوکا غلط جہی کی
وجہ سے میرا مقصد بھی پورا نہیں ہوا اور وہ مصوم بچی بھی
اذیت سے گزر رہی ہوگی۔ میں نے سوچا کہ میں فوراً انوکے
ملوں لیکن فی الحال اس سے ملاقات ممکن نہیں تھی۔ وہ نہ
جانے اس وقت کہاں ہوگا؟ اس وقت سیل فون اتنے عام
نہیں ہوئے تھے۔ ہاں پاکستان میں دولت مند لوگوں نے
سیل فون خرید لیے تھے جنہیں وہ ہاتھوں میں لے کر چلتے
تھے۔ گویا اس کی نمائش کر رہے ہوں۔ میرا اس وقت خالہ
جان کے گھر جانا ضروری تھا۔
میں اماں اور نورین (رینو) کو لے کر خالہ جان کے
گھر روانہ ہو گیا۔ وہاں عجیب کھرام بچا ہوا تھا۔ ہم سے پہلے
وہاں خالو مشتاق کے بھائی اور ان کے بیٹے موجود تھے۔
خالو مشتاق بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں

نے بہت سرد انداز میں سلام کا جواب دیا۔
میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ واقعہ کہاں پیش آیا
خالو..... ڈرائیور کیا کہتا ہے؟“
”پولیس تفتیش کر رہی ہے۔“ خالو نے سرد لہجے میں
جواب دیا۔ ”وہ آج شام تک اغوا کرنے والوں کو ڈھونڈ
نکلے گی۔“
”میرا ایک دوست ایس پی کرانمر ہے۔“ مشتاق
خالو کا ایک بھتیجا بولا۔ میں اسے پہلے بھی کئی تقریبات میں
دیکھ چکا تھا لیکن اس سے میرا تعارف نہیں تھا۔ میں نے بھی
اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ یوں
بھی عمر میں مجھ سے کافی بڑا اور کئی بچوں کا باپ تھا۔ اس کے
چہرے پر بھی وہی رعوت تھی جو عموماً دولت مند لوگوں کے
چہروں پر نمایاں ہوتی ہے۔
اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی تو وہاں موجود ہر
مفصص چونک کر ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگا۔ خالو مشتاق نے
آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور بولے۔ ”ہیلو..... کون..... تم
ذلیل آدمی..... کیا سنوں؟ ہاں بولو..... اچھا پھر..... کیا
کہا..... مجھیں لاکھ روپے..... ورنہ کیا کرو گے؟ کہاں
پہنچاؤں..... ہیلو..... ہیلو!“ انہوں نے ریسیور شیخ دیا۔ شاید
دوسری طرف سے لاکھ کاٹ دی گئی تھی۔
”کیا ہوا بچا جان؟“ ان کے منہ سے پوچھا۔
”اسی ذلیل آدمی کا ٹیلی فون تھا جس نے رمشا کو اغوا
کیا ہے۔“ انہوں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
میں چونک اٹھا۔ یہ تو ہمارے پلان میں شامل نہیں
تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“
”کہہ رہا تھا کہ کل تک مجھیں لاکھ روپے کا انتظام کر لو
ورنہ تمہاری بیٹی تمہیں زندہ نہیں ملے گی۔“ خالو مشتاق کا بھتیجا
اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔
”کسے ٹیلی فون کر رہے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔
”میں ایس پی رضا کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ ساجد
نے کہا۔ ”اسے ساری صورت حال بتاتا ہوں۔“
”اس نے دمکلی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی تو
رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“
”ارے یہ اچھے اس قسم کی دھمکیاں تو دیتے ہی ہیں۔“
ساجد نے کہا۔ ”میں رضا کو ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔“
”ابھی ڈرائیور بھاگ جائیں۔“ میں نے اچانک کہا۔
”کیوں؟“ ساجد نے میری طرف گھوم کر پوچھا۔
مجھے ایسا لگا جیسے اسے مجھ پر شہرہ ہو گیا ہو۔

”وہ لوگ پھر کب ٹیلی فون کریں گے؟“
 ”تمہیں کیسے معلوم کہ وہ پھر ٹیلی فون کریں گے؟“
 ساجد نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
 ”یہ تو سامنے کی بات ہے ساجد صاحب۔“ میں نے
 کہا۔ ”ابھی انہوں نے صرف رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ نہیں بتایا
 کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ یہ بات تو کوئی کم محفل آدمی
 بھی بتا سکتا ہے۔“ ساجد نے مشتاق خالو کی طرف دیکھا۔
 ”ہاں، صفدر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی
 صرف یہی بتایا ہے کہ رمشا ان کے قبضے میں ہے اور پچیس
 لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ رقم کی وصولی کے لیے وہ بعد میں ٹیلی
 فون کریں گے۔“
 ”تو کیا اس وقت تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے
 رہیں؟“ ساجد نے کہا۔ وہ کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھا رہا تھا۔
 ”تو پھر کیا کریں گے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
 مجھے تو اس سے پہلے بھی چڑھی۔ ”نکل جائیں رمشا کی تلاش
 میں اور لے آئیں اسے۔“
 ”میں نے رضا کو ٹیلی فون کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
 ”تمہیں جلدی کیا تھی؟“ خالو مشتاق نے اسے
 جھڑک دیا۔۔۔ ”رضا بھی کیا کر لے گا؟ کیا تم پولیس کی
 کارکردگی سے واقف نہیں ہو۔ ان لوگوں کا دوسرا ٹیلی فون
 آنے دو پھر کچھ سوچیں گے۔“ اسی وقت ڈرائنگ روم میں
 ایک باوردی ایس پی داخل ہوا۔ اس نے کمرے میں موجود
 ہر شخص کا جائزہ اس انداز سے لیا جیسے انہوں نے ان ہی لوگوں
 میں سے کوئی ہو۔ وہاں موجود ہر شخص اس کے احترام میں نہ
 جانے کیوں کھڑا ہو گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ پولیس کا
 ایک افسر تھا، کوئی صدر مملکت یا وزیر اعظم نہیں تھا کہ لوگ
 اس کے احترام میں کھڑے ہو جاتے۔ خالو مشتاق البتہ پہلے
 ہی کھڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ ایس پی ہے
 جس پر ساجد اچھل رہا ہے۔
 ”کچھ معلوم ہوا؟“ اس نے ساجد سے پوچھا۔
 ”معلوم کرنا تو آپ کا کام ہے ایس پی صاحب۔“
 میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے گھوم کر ناگواری سے مجھے
 دیکھا۔ وہ چہرے سے ہرگز ایس پی نہیں لگ رہا تھا۔ اگر اس
 کے جسم پر وردی نہ ہوتی تو میں یہ سمجھتا کہ وہ پولیس کا کوئی
 معمولی حوالدار یا اے ایس آئی ہے۔ اس کے چہرے پر وہ
 وقار نہیں تھا جو افسروں کے چہروں پر ہوتا ہے، چہرے پر
 یوں بھی خباثت برس رہی تھی۔
 اس نے تلخ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کی

تعریف؟“
 ”میں مشتاق ملک صاحب کا بھانجا ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”ساجد! تم نے رضا کو یہاں کیوں بلایا ہے؟“ خالو
 مشتاق نے کہا۔ ”وہ بھی وردی میں۔ انہوں نے والے۔۔۔
 گھر کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انہیں معلوم
 ہو گیا کہ ہم نے پولیس سے رابطہ کر لیا ہے تو وہ رمشا کو کوئی
 نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“
 ”تو کیا آپ انہیں پچیس لاکھ روپے دے دیں
 گے؟“ ساجد نے بھی تلخ انداز میں کہا۔
 ”پچیس لاکھ؟“ رضائے پوچھا۔
 ”ہاں، انہوں نے والوں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے
 فون کر کے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔“ ساجد نے کہا۔
 ”انہوں نے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اس بارے میں پولیس کو
 اطلاع نہ دی جائے ورنہ رمشا ہمیں زندہ نہیں ملے گی۔“
 ”یہ تو کسی پیشہ ور گینگ کا کام ہے۔“ رضائے
 رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”ایسے لوگوں کی ہسٹری پولیس کے
 پاس بھی ہوتی ہے۔ میں ابھی آفس جا کر معلوم کرتا ہوں کہ
 اس قسم کی وارداتوں میں کون سے گروہ ملوث ہیں۔ آپ فکر
 مت کریں مشتاق صاحب، میں ان لوگوں تک جلد ہی پہنچ
 جاؤں گا۔“ وہ اپنی چھتری ہاتھ پر تھام کر بیٹھا رہا۔
 مجھے اب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ تمہیں وہ لوگ انہیں تک پہنچ
 ہی نہ جائیں۔ اس کا بھی تو پولیس ریکارڈ ہوگا پھر میں نے یہ
 سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ انہو تو آج تک بھی گرفتار ہی نہیں
 ہوا، ابھی جیل نہیں گیا۔ اس کا ریکارڈ پولیس کے پاس کب
 ہوگا؟ پولیس والوں نے ایک ظلم یہ کیا تھا کہ ڈرائیور کو اپنی
 تحویل میں لے لیا تھا۔ ورنہ میں اس سے کچھ معلومات
 حاصل کرتا کہ انہوں نے والے کتنے آدمی تھے؟ ان کے
 حلیے کیسے تھے؟ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کارروائی میں
 انہی موجود تھا یا نہیں؟ خالو مشتاق تو کچھ بتانے کے موڈ میں
 نہیں تھے۔
 میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر انہوں کی تلاش میں نکل کھڑا
 ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ اس کے
 تو کئی ٹھکانے تھے۔ میں اس کے ایک ٹھکانے کی طرف
 جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اگر اس نے
 کبھی اس واردات میں حصہ لیا ہے تو وہ اس وقت اپنے کسی
 بھی ٹھکانے پر نہیں ہوگا۔ وہ کسی ایسی جگہ ہوگا جہاں اس نے
 رمشا کو رکھا ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی میں نے اپنا ارادہ ملتوی
 کر دیا اور ایک ریستوران میں جا بیٹھا۔

میں نے وہاں بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا ہی تھا کہ
 میری نظر ایک آدمی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہا
 تھا۔ اس نے شلوار ٹیٹس اور پٹاوری چپل پہن رکھی تھی اور
 چہرے ہی سے اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ
 اس کی طرف دیکھا اور ہر مرتبہ اسے گھورتے ہوئے پایا۔
 مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں بھی جوابی طور پر اسے گھورنے لگا۔
 وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔
 میں نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ مارا لیکن عرصہ ہوا میں
 پستول رکھنا چھوڑ چکا تھا، اس لیے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔
 اس کرخت چہرے والے نے کرسی چینی اور میرے سامنے
 بیٹھ گیا پھر وہ انتہائی بے لگنی سے بولا۔ ”کیا حال ہے؟“
 ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
 ”ارے یار، ایسی کبھی کیا بے مروتی۔“ اس نے مکروہ
 انداز میں کہا۔ ”تم انو بھائی کے دوست ہونا؟“
 ”کون انو بھائی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تم انو بھائی کو نہیں جانتے؟“ اس نے حیرت سے
 کہا۔ ”تمہاری یادداشت تو بہت کمزور ہے۔“
 ”مطلب کی بات کرو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔
 ”یار! ایک دفعہ انو بھائی تم سے ملنے یونیورسٹی گئے
 تھے انہیں گے زمانے میں۔“ اس نے گویا مجھے یاد دلانے
 کی کوشش کی۔ ”میں بھی اس دن ان کے ساتھ تھا۔“
 مجھے یاد آ گیا کہ یونیورسٹی یونین کے الیکشن کے موقع
 پر انو میرے پاس آیا تھا۔ میں نے خود تو الیکشن میں حصہ نہیں
 لیا تھا لیکن میں اپنے ایک دوست کے مختل کو سپورٹ کر رہا
 تھا۔ انو اسی سلسلے میں میرے پاس آیا تھا کہ مجھے اس کی مدد
 کی ضرورت تو نہیں ہے؟
 اچانک پولیس کا ایک اے ایس آئی وہاں آ گیا اور
 بولا۔ ”بالے چل، ڈرائیور کے ساتھ تھانے چل۔“
 ”کیوں جناب، اب میں نے کیا کر دیا ہے؟“
 ”یہ تو تھانے چل کر ہی معلوم ہوگا۔“ اے ایس آئی
 نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔
 ”تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔“
 ”مجھے۔۔۔؟“ میں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
 ”مجھے کیوں؟“
 ”یہ کیوں اور کیسے تھانے جا کر کرنا۔“ اس نے کہا۔
 ”تم ہوش میں تو ہو۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔
 ”مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہو؟“
 ”آپ بالے کے ساتھ بیٹھے تھے اس لیے۔۔۔“

”کون بالہ؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے بالے کی
 طرف اشارہ کر دیا۔
 ”یہ۔۔۔۔۔ یہ تو ہمیں بیٹھا تھا۔ یہ کوئی فائیو اسٹار ہوٹل
 نہیں ہے آفسیئر کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھ کر ان کے
 ساتھ بیٹھیں۔“ اسی وقت ایک اور صاحب بھی آ کر وہاں
 بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ صاحب بھی تو یہاں بیٹھے ہیں۔
 انہیں بھی تھانے لے چلو۔“
 ”تم ان صاحب کو جانتے ہو۔“ اس نے بالے سے پوچھا۔
 بالے نے ان کے خوف سے یا پھر واقعی سچ بولنے
 ہوئے کہا۔ ”نہیں صاحب! میں انہیں نہیں جانتا۔ میں تو
 یہاں چائے پینے آیا تھا۔“
 ”معاف کرنا جناب۔“ اے ایس آئی نے کہا۔
 ”میں نے فضول میں آپ کو پریشان کیا۔“
 ”ویسے معاملہ کیا ہے آفسیئر؟“ میں نے بھی مسکرا کر
 پوچھا۔ ”یہ بھی مجھے کرمٹل تو نہیں دکھائی دے رہا۔“
 ”جناب! اس کی مسکین شکل پر مت جائیں۔“ اے
 ایس آئی نے کہا حالانکہ بالے کی شکل پر مسکینیت کے بجائے
 خباثت تھی۔ ”یہ بہت اونچی چیز ہے۔ پولیس کو شہ ہے کہ اس
 کے ساتھیوں نے سیٹھ مشتاق کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔“ میں
 بری طرح جھٹکا اٹھا۔
 ”سیٹھ مشتاق کی بیٹی؟“ میں نے کہا۔ ”ان لوگوں
 نے اغوا کیا ہے اسے؟“
 ”پولیس کو یہی شہ ہے جناب۔“ اس نے کہا۔
 ایسے موقع پر پولیس والے اتنی بات نہیں کرتے لیکن
 وہ اے ایس آئی یا تو ضرورت سے زیادہ باتوں کا پھر وہ
 مجھ سے بدگلامی کرنے کے بعد اپنی خفت مٹا رہا تھا۔
 بالے نے جاتے جاتے مجھے اشارے سے بتایا کہ
 میں اس کے بارے میں انوکو بتا دوں۔ میں اس کے
 اشارے سے بہر حال یہی سمجھا تھا۔ اب مجھے ایک نئے
 خدشے نے گھیر لیا تھا۔ اگر پولیس انوکو کے ساتھیوں تک پہنچ
 گئی تو انوکو بھی گرفتار ہو سکتا تھا۔ وہ گرفتار ہوتا تو میں بھی
 گرفتار ہو جاتا۔ وہ بھلا اپنی زبان بند کیوں رکھتا۔
 میں جانے اس ریستوران میں کتنی دیر تک بیٹھا رہا
 اور اس دوران میں چار کپ چائے پی گیا پھر وہاں سے اٹھ
 کر میں لاہور کے ریڈیو اسٹیشن پر آ گیا۔ اسٹیشن وہ واحد
 جگہ تھی جہاں پہنچ کر مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔ لوگوں کی بھاگ
 دوڑ اور قلیوں کی چیخ پکار میں وقتی طور پر میں سب کچھ بھول
 جاتا تھا۔

ہور ہاتھ۔ آخر مجھے انوکھی باتوں میں آنے کی کیا ضرورت تھی اس وقت تو جذبات میں آکر میں نے ہائی بھر لی تھی۔ اب مجھے یہ خوف تھا کہ اگر انوکھے ساتھی بکڑے گئے تو میرا مستقبل تو برباد ہو جائے گا۔ اباجی اور اماں سے بھی میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤں گا۔ اپنی پیاری بہن رینو کا چہرہ دیکھنے کو ترس جاؤں گا۔ ظاہر ہے اس واقعے کے بعد میں کس منہ سے اباجی کا سامنا کر سکتا تھا؟

میرا سر درد سے پھٹنے لگا تو میں نے اٹھ کر ایک کپ چائے بنا کر اور ڈسپرین کی دو گولیاں چائے کے ساتھ گھالیں۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے ایک کتاب اٹھالی لیکن مجھے کسی طرح چین ہی نہیں مل رہا تھا۔ آخر میں نے دوبارہ خالہ جان کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہاں اب بھی وہی سوگ کا ماحول تھا اور رو رو کر خالہ جان اور شہرہ کی آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ میں نے ایک نظر شہرہ پر ڈالی۔ وہ اس عالم میں مجھے پہلے سے بھی زیادہ حسین لگی لیکن اب میں اس کے بارے میں مزید نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ اب میری پہنچ سے مزید دور ہو گئی تھی۔ اس نے حسب عادت مجھے سلام کیا لیکن اٹھ کر جانے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اماں اور رینو کے علاوہ اور کئی خواتین آہٹ کر میرے کے درمیان میں معذرت نہیں۔ میں خود کو لعنت ملامت کرتا ہوا وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ خالو مشتاق نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر کچھ سوچنے لگے۔

”مشتاق!“ ان کے بڑے بھائی اشتیاق نے کمرے کی گھبر خا موٹی کو توڑا۔ ”ان لوگوں کی طرف سے ابھی تک فون نہیں آیا؟“ خالو مشتاق جواب میں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی گئی۔ انہوں نے لپک کر ریسپونڈ کیا۔

”ہیلو..... ہاں میں ہی بول رہا ہوں۔ رمشا تو خیریت سے ہے؟ پولیس کو..... نہیں میں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی..... میں جھوٹ..... وہ ایس بی رضا میرے بھتیجے کا دوست ہے اس لیے..... نہیں میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہاں..... کیا..... فوری طور پر رقم کہاں سے لاؤں؟ میں کہہ تو رہا ہوں کہ پولیس اس معاملے میں انوکھی نہیں ہے۔ اچھا..... بولو..... چلو مجھے یہ بھی منظور ہے۔ میں کل صبح تک رقم کا بندوبست کر لوں گا..... رمشا سے میری بات تو کرو اور..... اچھا..... میں..... ہیلو..... ہیلو..... انہوں نے ریسپونڈ کر ڈیل پر شیخ دیا اور ساجد کو گھورتے ہوئے بولے۔

”میں کوشش کروں گا کہ وہ لوگ آج ہی رمشا کو چھوڑ دیں۔ اب میں چلتا ہوں۔ ایک پولیس والا بھاگتا ہوا اس طرف آ رہا ہے۔“

اس وقت تک وہ پولیس والا ہم تک پہنچ چکا تھا۔ وہ تھکمانہ لہجے میں بولا۔ ”تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”میں اکثر یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میرے دوست امجد علی گروہری ہیں۔“

”تم جانتے نہیں کہ اسٹیشن کے اس علاقے میں آنا منع ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں ایس ایم صاحب کا بیٹا ہوں۔ ان ہی کی اجازت سے یہاں بیٹھ کر پڑھتا لکھتا ہوں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”تم ایس ایم صاحب کے بیٹے ہو؟“ سپاہی کالچہ نرم پڑ گیا۔ ”دھیان رکھنا، یہاں کوئی اجنبی نہ آنے پائے۔ یہاں پرانی بوگیوں میں سے اکثر لوگ مختلف چیزیں نکال کر لے جاتے ہیں۔“

”ریلوے کے ملازمین ہی ایسا کرتے ہیں۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”کوئی باہر کا آدمی تو اس طرف نہیں آتا ہے۔“ پولیس والے کے جانے کے بعد انوکھی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”مگر اسٹیشن پر کوشش کروں گا کہ رمشا آج ہی گھر پہنچ جائے۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں بھی ٹھٹھا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اماں اور رینو ابھی تک خالہ جان کے گھر سے واپس نہیں آئی تھیں۔ دروازے پر تالا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اباجی بھی خالہ جان کے گھر گئے ہیں یا پھر اپنے دفتر میں ہوں گے۔ میرے پاس بھی گھر کی ایک چابی تھی۔ میں اکثر راتوں کو دیر سے آتا تو خاموشی سے دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو جاتا تھا۔

میں گھر میں چلا گیا۔ وہاں ویرانی اور سنانے کا راج تھا۔ گھر میں ویسے بھی خاموشی ہی رہتی تھی۔ اماں اپنے کام میں مصروف رہتی تھیں اور رینو اپنی پڑھائی میں لیکن اس دن مجھے احساس ہوا کہ انسانوں کی محض موجودگی سے بھی گھر کے ماحول بدل جاتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ مجھے اباجی کی غیر موجودگی کے سلسلے میں بھی ہو چکا تھا۔ وہ جب تک اپنے کمرے میں موجود رہتے تھے گھر میں عجیب سی رونق کا احساس ہوتا تھا، تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر اپنے کیے پر بچھتاوے کا احساس

کر کے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ میں اپنے ساتھیوں سے نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے بتاؤ تم لوگوں نے رمشا کو کہاں رکھا ہے؟“

”یار صفدر! اسنے جذباتی مت بنو۔“ انو نے کہا۔ ”میں خود ہی اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔ تم جذبات میں آ کر بنا بنا یا کھیل بگاڑ دو گے۔“

”کھیل.....!“ میں نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”یہ کھیل ہے؟ ایک بات اور سن لو۔ پولیس کا ایس بی رضا تمام مجرموں کا ریکارڈ چھان رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے خلاف وہ کچھ ثابت نہیں کر سکے گا لیکن اگر تمہارے ساتھیوں کا ریکارڈ اس کے پاس ہو تو وہ ان تک ضرور پہنچ جائے گا۔“

انو نے چونک کر مجھے دیکھا پھر تشویش سے بولا۔ ”یار! یہ تو بہت بری خبر سنا ہے تم نے۔ ان لوگوں کا ریکارڈ تو پولیس کے پاس موجود ہے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ تیل چاٹ چکے ہیں۔ اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے جلد ہی کرنا ہوگا۔“

”بس تم اتنا کرو کہ رمشا کو اس کے گھر پہنچا دو، اسی میں بہتری ہے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ انو نے کہا۔ ”اس وقت تو وہ بچھیں لاکھ روپے کے لالچ میں اندھے ہو رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ رمشا کے گروہری باپ سے انہیں اتنا پیسہ ضرور ملے گا۔“

”لیکن اگر وہ بکڑے گئے تو؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”پھر تو اللہ ہی حافظ ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ میں بھی بکڑا جاؤں گا اور تم بھی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ”پولیس کو آخر میرے بارے میں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پولیس تشدد کے آگے میں کب تک ٹھہر سکوں گا۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”اب اس کا ایک ہی حل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ رمشا کہاں ہے؟ میں خود ان لوگوں کو ٹھکانے لگا دوں گا ورنہ نہ صرف شہر میں بلکہ پورے خاندان میں میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ میری برسوں کی محنت اکارت چلی جائے گی۔ مجھے تو پھر کہیں ملازمت بھی نہیں ملے گی۔ اباجی اور ماں تو شاید اس صدمے سے مر ہی جائیں یا پھر وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”صفدر! مجھ پر بھروسہ کرو۔“ انو نے مجھے تسلی دی۔

میں ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر چکر لگا آیا۔ پلیٹ فارم نمبر سات پر زیادہ رش نہیں تھا۔ وہاں سے اس وقت نہ کوئی ٹرین جانے والی تھی نہ آنے والی تھی۔ میں پلیٹ فارم کی ایک بیچ پر بیٹھ گیا اور جب سے سگریٹ نکال لیا۔ میں سگریٹ نوشی ترک کر چکا تھا لیکن اس وقت میں نے ریلوے کے ایک اسٹال سے خاص طور پر سگریٹ کا پیکٹ خرید لیا تھا۔

میں نے سگریٹ کا کش لگایا ہی تھا کہ ایک بڑی بڑی موچھوں والا آدمی آکر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس کے سر پر بگڑی تھی اور شلوار قمیص کے ساتھ ملتان کی کھسے پہن رکھے تھے۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سگریٹ پھونکنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ آدمی میری طرف کھسکتا ہوا بولا۔ ”کام ہو گیا ہے صفدر۔“

میں اس کی آواز سن کر یوں اچھلا جیسے میرا پاؤں جلنے ہوئے انگارے پر پڑ گیا ہو۔ وہ انوکھا، صرف موچھوں اور بگڑی سے اس کی تو پوری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

میرے اچھلنے پر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ ”یہ حلیہ میں نے صرف تمہاری وجہ سے بنایا ہے تاکہ اگر کوئی مجھے تمہارے ساتھ دیکھے تو تم پر کسی قسم کا شبہ نہ کرے۔“

”لیکن یار! تم نے تو غلط لڑکی کو اٹھالیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شہرہ تو بڑی ہے اس سے۔“

”ہاں یار، مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک تیرا کمان سے نکل چکا تھا۔“

”اور یہ تاوان کا چکر کیوں چلا دیا تم نے؟“ میں نے کہا۔ ”اس لڑکی کو خاموشی سے واپس کر دو۔“

”صفدر!“ انو ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے ایک گینگ بنا لیا ہے۔ اس میں شہر کے بہت سے خطرناک بد معاش بھی ہیں۔ وہ ویسے تو مجھے اپنا لیڈر تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض اوقات بہت سرکش بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کیس کے بعد میں ان سب سے چھٹکارا حاصل کر لوں گا۔ ان میں سے دو آدمیوں کا خیال ہے کہ جب ہم نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا خطرہ مول لے ہی لیا ہے تو پھر اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”یار! وہ میری نہیں مانتے۔ میں اس موقع پر ان سے بگاڑ بھی نہیں سکتا۔“ انو نے کہا۔

”دیکھو انو!“ میں نے کہا۔ ”میں نے تم پر اعتبار

ریسور اٹھایا اور بولے۔ ”ہیلو ہاں میں سن رہا ہوں..... اچھا..... پھر..... لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد تم لوگ مجھ سے دھوکا نہیں کرو گے۔ اچھا..... لیکن مجھے ایک دن کی مہلت اور دے دو..... میں نے بیچیں لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اتنی ہی رقم مزید جمع کرنے میں مجھے کچھ تو وقت ملے گا..... کیا..... ہاں، وہ تو ابھی دے سکتا ہوں..... کہاں..... ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا پھر اباجی سے بولے۔ ”میں نے کہا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ انہوں نے اب صرف بیچیں لاکھ پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ مجھے رقم کا بریف کیس لے کر مال روڈ پر جانا ہوگا۔ وہیں ان کا کوئی آدمی مجھ سے بریف کیس لے لے گا۔“

شاید انہوں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مزید رقم کا مطالبہ نہ کریں۔

”لیکن بھائی مشتاق۔“ اباجی نے کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رقم لینے کے بعد وہ رمشا کو بہ حفاظت ہمارے حوالے کر دیں گے؟“

”میں نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا۔“ خالو مشتاق نے کہا۔ ”انہوں نے کہا کہ ضمانت ہماری زبان ہے۔ آپ کو اس پر اتنا متہم کرتا ہوگا۔“

”رم انہوں نے کب مانگی ہے؟“ اباجی نے پوچھا۔

”وہ کل گیارہ بجے مجھے بتائیں گے کہ مجھے کس وقت گھر سے نکلنا ہوگا اور مال روڈ پر کس طرف پیدل چلنا ہوگا۔ انہوں نے انتہائی سختی سے کہا ہے کہ اگر پولیس کا پانچواں مشتبہ شخص میرے آس پاس بھی ہوا تو وہ مجھ سے رقم لے لیے بغیر لوٹ جائیں گے۔“

”اس کے لیے مال روڈ کا علاقہ تو مناسب نہیں ہے۔“ اباجی نے کہا۔ ”وہ صرف دھوکا دے رہے ہیں۔ کل وہ کسی ایسے مقام کا تعین کریں گے جہاں عام لوگوں کا گزرنہ ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رقم ملنے ہی آدھے گھنٹے کے بعد رمشا گھر پہنچ جائے گی۔“

خالو مشتاق کے بڑی منظور صاحب نے کہا۔ ”اب ان کی طرف سے کوئی ٹیلی فون نہیں آئے گا۔ آپ صبح سے یہاں بیٹھے ہیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔“

”آرام کیسے کروں منظور صاحب۔“ خالو مشتاق کے لہجے میں عجیب سا کرب تھا۔ ”میری بیٹی نہ جانے کس حال میں ہوگی۔ میں کیسے آرام کر سکتا ہوں۔ آپ بھی تو کوئی کھنٹوں سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ جا کر آرام کریں۔“

ان کا کیا حال ہوگا۔ میں نے دل سے دعا کی۔ ”یا اللہ! میرے اس گناہ کو معاف فرما دے اور میری عزت رکھ لے۔ میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ رمشا کو بھی اپنی حفاظت اور پناہ میں رکھنا میرے مالک۔“ دعا مانگتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”یا اللہ! تو ہم سب پر رحم فرما۔“ میں نے بلند آواز میں کہا۔

اسی وقت مجھے خالو مشتاق کی آواز سنائی دی۔

”صنذر! تم رور رہے ہو؟“

”مجھے رمشا کی طرف سے بہت پریشانی ہے خالو۔“

میں نے کہا۔ ”وہ مصوم بیٹی ہے نہ جانے اس کا کیا حال ہوگا۔“

”چلو، اندر چلو۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔ میں نادمان کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ وہ تو شکر ہے کہ دعا کے ابتدائی جملے میں نے بلند آواز میں نہیں کہے تھے ورنہ خالو مشتاق مجھے ابھی پولیس کے حوالے کر دیتے۔ اندر اب صرف خالو مشتاق کے ایک بڑی اور اباجی بیٹھے تھے۔ باقی لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ خالو شاید انہی لوگوں کو رخصت کرنے باہر آئے تھے۔ وہ مجھے لان میں روتا دیکھ کر میری طرف آئے۔ مجھے سمجھا۔ ”میرے بیٹے، ایک مرتبہ پھر جان لیوا سناٹا طاری ہو گیا۔ صرف دیوار گیر گھڑی کی تک تک سنائی دے رہی تھی۔“

”میں نے بیچیں لاکھ کا بندوبست تو کر لیا ہے لیکن اب ان بدبختوں نے پچاس لاکھ کا مطالبہ کر دیا ہے۔ صرف اس لیے کہ میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ کل تک اتنی بڑی رقم میں کہاں سے لاؤں گا؟“ پچاس لاکھ اس دور میں آج کے کم سے کم پانچ کروڑ کے برابر تھے۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بھی انہیں رقم نہیں دیں گے۔ میں ابھی مارکیٹ جا کر نوٹوں کے سائز کے کاغذ کٹوا لیتا ہوں۔ ہم ان کاغذوں کی گڈیاں نوٹوں کی طرح بنائیں گے بس ان کے اوپر اور نیچے ہزار روپے کا صرف ایک نوٹ ہوگا۔“

”وہ لوگ پروٹیشنل ہیں بیٹا۔“ خالو مشتاق نے نرم لہجے میں کہا تو اباجی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”پہلے وہ اپنی تسلی کریں گے۔“

”اسی وارداتوں میں انہوں نے والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ نوٹ گنتے بیٹھے جائیں۔“

اسی وقت فون کی کھنٹی بجنے لگی۔ خالو مشتاق نے

خالو مشتاق نے کہا۔

”میں بات کو بڑھا رہا ہوں۔“ وہ گرج کر بولے۔

”تم نے دس آدمیوں کے سامنے میرے بیٹے کی تبدیلی کر دی۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے، تین بچوں کا باپ ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

ساجد نے ٹیلی فون پر کسی کے نمبر ڈائل کئے اور بولا۔

”ہیلو رضا! میں ساجد بول رہا ہوں۔ یا، چچا جان نہیں چاہتے کہ پولیس اس کیس میں مداخلت کرے۔ سارا سیٹ اب ختم کر دو، ریکارڈنگ روک دو اور ان کے ٹیلی فون سے آبزرویشن ہٹا دو..... یا جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو..... ہاں، جب انہیں احساس نہیں ہے تو میں کیوں سرکھاؤں۔ تم بھی صبح سے مصروف ہو گھر جا کر آرام کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ ”میں نے رضا سے کہہ دیا ہے کہ وہ مزید کوئی کارروائی نہ کرے۔ اب آپ جایں اور آرام کریں۔“

”اب چلو یہاں سے۔“ اشتیاق صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

”پلیز ایسے موقع پر آپس میں تو تعلقات خراب مت کریں۔“ میں نے کہا۔ ”ساجد صاحب نے تو اپنے طور پر بالکل درست فیصلہ کیا تھا لیکن.....“

”میں نے تمہاری رائے نہیں مانگی ہے۔“ خالو مشتاق نے انتہائی حقارت سے کہا۔ اباجی بھی وہاں موجود تھے، انہوں نے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

ان کے بھائی اپنے بیٹے کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ اباجی نے مجھے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ چند منٹ بعد اباجی بھی باہر آ گئے اور مجھے لان کے ایک سنان گوشے میں لے گئے۔ میں حیران تھا کہ اباجی مجھ سے کیا بات کرنے والے ہیں۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”صنذر! تجھے اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو نے دیکھا بھائی مشتاق نے تجھے کس طرح ذلیل کر دیا۔“

”وہ تو اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہیں اباجی۔ انہوں نے تو اپنے بھائی اور تجھے کو بھی ناراض کر دیا۔ میں نے تو ان کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔ آپ فکر مت کریں۔ میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

وہ واہیں اندر چلے گئے۔ میں ایک بار پھر خود کو ملامت کرنے لگا۔ میرے باپ کو میری عزت کا اتنا خیال تھا کہ وہ مشتاق کی درشت کلامی بھی برداشت نہیں کر سکے۔ کل جب انہیں یہ علم ہوگا کہ ان کا بیٹا اس انوکھا کا ڈسے دار ہے تو

”تم سے کس نے کہا تھا کہ پولیس کو اس معاملے میں انوکھو کرو۔ اب وہ لوگ پچاس لاکھ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میں پچاس لاکھ بھی دے دوں گا لیکن اب وہ ہمیں دوسرا موقع نہیں دیں گے۔ اب پولیس نے مداخلت کی تو وہ رمشا کو قتل کر کے اس کی لاش ہمارے گھر کے سامنے پھینک دیں گے۔“

”لیکن چچا جان میں نے تو.....“

”رہنے دو۔“ انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ ”تم نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے ایس بی رضا کو اس کیس میں انوکھو کر لیا۔ اب اگر رمشا کو کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”یہ کیسی باتیں کر رہے ہو مشتاق۔“ ان کے بھائی نے سٹج لہجے میں کہا۔ ”ساجد تمہارا دشمن نہیں ہے، یہ اسے رمشا سے کوئی دشمنی ہے۔ اس نے تو تمہاری بھلائی۔ نہ لیے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

”یہ بھلائی ہو رہی ہے میرے ساتھ؟“ خالو مشتاق نے درشت لہجے میں کہا۔ ”رمشا کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ وہ نکلا ایس بی تو بہت وعدے کر کے گیا تھا کہ وہ شام تک ان لوگوں تک پہنچ جائے گا پھر اب کیا ہوگا؟“

”وہ تو اپنی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت بھی آپ کا ٹیلی فون آبزرویشن پر ہے اور یہاں سے ہونے والی تمام گفتگو ایس بی آفس میں ریکارڈ ہو رہی ہے۔“ ساجد نے کہا۔ ”رمشا بہت ذہین پولیس افسر ہے اور.....“

”تم نے کس کی اجازت سے میرا ٹیلی فون آبزرویشن پر لگوا دیا ہے؟“ خالو مشتاق گرج کر بولے۔ ”تم کیا چاہتے ہو کہ وہ لوگ رمشا کو قتل کر دیں؟“

”تم اس وقت پاگل ہو چکے ہو۔“ ان کے بھائی نے کہا۔ ”تمہارے ساتھ تو بھلائی کرتا ہی نہیں چاہیے۔“ پھر وہ بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ ”رمشا کو ابھی اور اسی وقت منع کرو کہ وہ کوئی بھی کارروائی نہ کرے۔ اس سے کہو کہ وہ مشتاق کے فون کو آبزرویشن سے ہٹا دے۔“

”ڈیڈی! اس سے تو رمشا کی جان مزید خطرے میں پڑ جائے گی۔“ ساجد نے کہا۔

”تو رمشا کا باپ نہیں ہے۔“ اس کے باپ نے گرج کر کہا۔ ”کیا تو چاہتا ہے کہ مشتاق تجھے دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اس دور میں تو کسی کے ساتھ بھی ہمدردی نہیں کرنی چاہیے۔ ابھی رضا کو ٹیلی فون کر اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔“

”بھائی جان! آپ فضول میں بات بڑھا رہے ہیں۔“

نہ ان پر کوئی شبہ کرے گا نہ مجھ پر۔" وہ بہ مشکل تمام ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہوئے۔

مجھے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے عجیب سی گھبراہٹ اور اضطراب کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

میں اسٹیشن پر اتر کر اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اباجی اپنے دفتر کی طرف بڑھ گئے۔ میں دیوانہ وار گھر کی طرف بھاگا اور بکس میں رکھا ہوا اپنا پستول نکال لیا۔ میں نے پستول رکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن اسے خارج نہیں کیا تھا۔ میں نے پستول کا میگزین چیک کیا پھر ایک فالتو میگزین بھی جیب میں ڈال لیا اور دوبارہ اسٹیشن کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے یقین تھا کہ رمشا وہیں کہیں ہوگی۔ یہ بات مجھے اسی دن سمجھ لینی چاہیے تھی جب انوبدلے ہوئے روپ میں مجھے ملا تھا۔

میں پلیٹ فارم پر داخل ہوا تو مجھے کہیں سے لگا تار دو فائر ہونے کی آواز سنائی دی پھر دو فائر مزید ہوئے۔ میں نے چونک کر آوازی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

میں نے سوچا کہ میں کسی پل پر چڑھ کر پلیٹ فارم نمبر پانچ کا جائزہ لے سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر میں پل پر چڑھ گیا۔ اچانک پل پر مخالف سمت سے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دیوانہ وار بھاگ رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو آدمی بھی تھے۔ وہ دونوں اس لڑکی کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ اسے پکڑنے ہی والے تھے کہ اس نے اچانک پل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اسی وقت مجھے ٹرین کی گزراہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں... آدمی واپس بھاگے اور کسی پلیٹ فارم پر اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں بھی دیوانہ وار اس پلیٹ فارم کی طرف بھاگا جہاں اس لڑکی نے چھلانگ لگائی تھی۔ جب وہ پل کا جنگلا پکڑ کر اس پر چڑھ رہی تھی تو نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ رمشا ہے۔ نیچے پہنچ کر میرے اندیشوں کی مزید تصدیق ہو گئی۔ وہ رمشا ہی تھی۔ ٹرین کے بھاری پھیوں نے اسے بری طرح چل دیا تھا لیکن اس کا مصوم چہرہ اب بھی محفوظ تھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور صدمے سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے زوردار چکر آیا اور میں دھڑام سے پلیٹ فارم کے پختہ فرش پر گر پڑا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ریلوے کے ایک وینٹک روم میں تھا۔ اباجی اور خالو مشتاق بھی وہیں بیٹھے تھے۔ خالو مشتاق بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ان کی

میں جٹلا کرنے کے لیے ٹیلی فون کیا تھا تاکہ ہم صبح تک جاگتے رہیں اور کچھ بھی سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہیں۔

"خالو ایک بات بتائیے، جب آپ کی ان لوگوں سے بات ہوئی تو کیا آپ نے پس منظر میں کسی ٹرین کی آواز بھی سنی تھی؟" میں نے پوچھا۔

خالو مشتاق چند لمحے سوچے رہے پھر بولے۔ "ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جب میری ان سے بات ہوئی تو میں نے پس منظر میں ٹرین کا ہارن یا کوئی گزراہٹ سنی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اسٹیشن کے نزدیکی علاقے سے ٹیلی فون کر رہے ہیں۔"

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" خالو مشتاق نے کہا۔ "وہ کہیں سے بھی ٹیلی فون کر رہے ہوں، مجھے خیریت سے میری پتلا ل جائے۔"

☆ ☆ ☆
صبح دس بجے ٹیلی فون کی گھنٹی بھرنی۔ اس وقت خالو مشتاق وہیں تھے۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا اور بولے۔ "ہیلو..... ہاں، میں بول رہا ہوں..... اچھا کہاں..... پلیٹ فارم نمبر پانچ پر..... ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں..... لیکن تم لوگ بھی اپنی زبان کا پاس رکھنا۔ میری بیٹی مجھے مل جاتی چاہیے۔" انہوں نے سنبھلے منتظر کر دیا اور مجھ سے بولے۔ "ان لوگوں نے اب مجھے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر بلایا ہے۔ پلیٹ فارم نمبر پانچ کی اسٹال کے سامنے والی بیچ پر۔" وہ بیگ اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

اباجی بولے۔ "پلیٹ فارم نمبر پانچ پر؟ میں ابھی وہاں کے اسٹال کو ٹیلی فون پر بتا دیتا ہوں کہ وہ پلیٹ فارم نمبر پانچ کو گھیر لیں۔ سب قلیوں کو وہاں لگا دیں۔ قلیوں پر کون شبہ کرے گا۔"

"بھائی جی۔" خالو مشتاق نے کہا۔ "میں اس وقت کسی بھی طرح کا خطرہ مول لینے کی حالت میں نہیں ہوں۔ پچیس لاکھ تو میں پھر دو تین مہینے میں کمالوں گا لیکن مجھے میری بیٹی نہیں ملے گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" اباجی نے کہا۔ "خالو، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نہیں بیٹا، ان لوگوں نے سختی سے منع کیا ہے کہ کوئی مشتبا آدمی وہاں نظر نہ آئے۔"

"میں پلیٹ فارم نمبر پانچ کی طرف نہیں جاؤں گا بلکہ دور رہ کر دیکھوں گا۔ اباجی کی تو ڈیوٹی بھی وہیں ہوتی ہے۔"

"نہیں، اس وقت کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" پھر انہوں نے ملازم کو بلا کر کافی بنانے کو کہا اور خود ہاتھ روم میں چلے گئے۔

☆ ☆ ☆
اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خالو مشتاق کو بہ اصرار میں نے سونے کے لیے بیڈ روم میں بھیج دیا تھا اور میں خود ٹیلی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔ "ہیلو۔" میں نے کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے مجھے انوکھی آواز سنائی دی۔

"تمہیں کس سے بات کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟" دوسری طرف سے انو نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں صفدر بول رہا ہوں، مشتاق صاحب کا بھانجا۔" میں نے کہا۔ "مشتاق صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔" مجھے اس کے عقب میں ٹرین کی گزراہٹ سنائی دی تو میں چونک اٹھا۔ کیا انوکھے اسٹیشن سے فون کر رہا تھا؟

"مجھے بات تو مشتاق صاحب ہی سے کرنا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔ اب انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بھی پریشان مت ہوں۔ صبح رمشا گھر پہنچ جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ٹیلی فون اس وقت بھی آرزو رویشن پر ہے لیکن تم لوگ میری گردن کو بھی نہیں پہنچ سکو گے۔"

"تمہیں جو کچھ کہنا ہے مجھ سے کہو۔" میں نے کہا۔ "نہیں، میں صبح دس بجے پھر ٹیلی فون کروں گا۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" خالو مشتاق کی آوازیں کر میں چونک اٹھا۔ وہ شاید ٹیلی فون کی گھنٹی کی آوازیں کر اٹھ گئے تھے۔ ان حالات میں گہری نیند کب آتی ہے۔

"اس نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ وہ لوگ صبح دس بجے پھر ٹیلی فون کریں گے۔"

خالو مشتاق اپنا سر پکڑ کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئے اور بولے۔ "یہ لوگ بھی لوگوں کو نفسیاتی طور پر اتنا مفلوج کر دیتے ہیں کہ انسان کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ ان لوگوں نے اس وقت صرف ہمیں ذہنی اضطراب

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں صبح پھر حاضر ہوجاؤں گا۔" وہ جھکے جھکے سے نظر آ رہے تھے۔ خالو مشتاق نے انہیں باہر تک رخصت کرنا چاہا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور پھر پوچھل قدموں سے باہر نکل گئے۔

"اباجی! میں نے کہا۔" آپ بھی گھر جا کر آرام کریں میں یہاں موجود ہوں۔"

"گھر جانے کی کیا ضرورت ہے بیٹا۔" خالو مشتاق نے کہا۔ "بھائی جی ہمیں آرام کر سکتے ہیں۔" انہوں نے اصرار کر کے اباجی کو ایک بیڈ روم میں بھیج دیا پھر خود وہ اس کمرے میں چلے گئے جہاں خالو جان اور اماں وغیرہ بیٹھی تھیں۔

"کچھ معلوم ہوا؟" خالو جان نے پوچھا۔ "میں تو پردے کی وجہ سے وہاں آ بھی نہیں سکتی تھی اور کوئی بھی مجھے کچھ بتانے یہاں نہیں آیا۔"

خالو مشتاق نے انہیں مختصر آبتایا کہ انوکھندگان سے کیا بات ہوئی ہے پھر وہ اماں سے بولے۔ "سیرا میں اس دن کے روپے کی وجہ سے تم سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ شاید مجھے تمہارا دل دکھانے کی سزا ملی ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی جان۔" اماں نے کہا۔ "آپ بڑے ہیں۔ میں نے تو آپ کی بات کا برا نہیں مانا۔ مجھے وقتی طور پر تو افسوس ہوا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ آپ کی بات ٹھیک ہی ہے۔"

"صفدر بیٹا۔" خالو مشتاق نے کہا۔ "اب تم بھی سو جاؤ۔"

"میں آپ کے ساتھ ہی بیٹھوں گا خالو جان۔" میں نے کہا۔ "آپ جاہیں تو سو جا سکیں۔ ان بد بختوں کا ٹیلی فون تو کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔"

"یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ وہ ٹیلی فون کہاں سے کرتے ہیں۔"

"یہ تو رضائے معلوم کر لیا ہوگا لیکن اس قسم کے لوگ کبھی ایک جگہ سے ٹیلی فون نہیں کرتے۔ وہ جگہ بدل بدل کر بات کرتے ہیں تاکہ پولیس ان کا سراغ نہ لگا سکے۔" یہ کہتے ہوئے اچانک میری نظر ٹرہ کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پھر نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں اور خالو مشتاق ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں نے خالو مشتاق سے کہا۔ "آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوجائیں اور کچھ کھالیں۔ میں کھانا منگواتا ہوں۔"

حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میرا احساس جرم اور احساس ندامت مجھے مارے ڈال رہا تھا۔ میں خالو مشتاق سے لپٹ کر اس بری طرح رویا کہ بندھا ہوا گیا۔ یہ درمشا کی موت سے زیادہ بچھتاوے کے آنسو تھے۔

پولیس نے درمشا کی لاش وہاں سے اٹھالی تھی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا تھا پھر مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا۔ اسٹیشن کے دور افتادہ گوشے میں آخری پلیٹ فارم پر پولیس کو تین لاشیں مزید ملی تھیں۔ انہیں گولی مار کے قتل کیا گیا تھا۔ ان لاشوں میں سے ایک لاش انوکھی بھی تھی۔ پھر ساری صورت حال میری سمجھ میں آ گئی۔

انہوں نے ان لوگوں پر زور دیا ہوگا کہ وہ درمشا کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیں۔ ان لوگوں کا آپس میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ وہ دونوں آدمی انوکھی گولیوں سے ہلاک ہوئے ہوں گے پھر ان کے کسی آدمی نے انوکھی گولیاں مار دی ہوں گی۔ ان کے آپس کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر درمشا وہاں سے بھاگ نکلی ہوگی۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا ہوگا۔ وہ اس سونے کی چڑیا کو کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ پچیس لاکھ روپے کا چیک ان کے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر درمشا نے ہل کے جھنگلے پر چڑھ کر چھلانگ کیوں لگادی؟ وہ بد ہوش لوگ اسے چکرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو تب بھی وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ ہل پر لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے درمشا کو نہیں لے جاسکتے تھے پھر میں بھی اس ہل پر موجود تھا۔ اس نے آخر ایسا کیوں کیا؟

جب انو اور دوسرے لوگوں کی لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ دونوں اس ریوالور سے ہلاک ہوئے تھے جو انوکھی کے ہاتھ میں تھا۔ انوکھی پر جس ریوالور سے گولیاں چلائی گئی تھیں، پولیس کو وہ ریوالور نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انوکھی پر فائر ان دونوں ہی نے کیے تھے جو درمشا کا تعاقب کر رہے تھے۔

☆☆☆

درمشا کی موت کے بعد میں بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ احساس مجھے مارے ڈال رہا تھا کہ ایک معصوم لڑکی میری خواہشات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ مجھے ہر لمحہ درمشا کی کئی پھٹی لاش کا خیال رہتا تھا۔ میں نے اسٹیشن کی طرف جانا چھوڑ دیا تھا کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ ہمارا گھر اسٹیشن کے نزدیک تھا اس لیے رات دن وہاں

ٹرینوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔ درمشا کے تعاقب میں جو آدمی تھے، وہ میرے لیے اچھی تھے لیکن ان کے چہرے میرے ذہن پر نقش ہو چکے تھے۔ وہ نہ صرف درمشا کے قاتل تھے بلکہ انوکھی کے قاتل بھی تھے۔ میں ان سے درمشا کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

میں انوکھی کے ساتھ رہ کے اس کے کئی ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ ایک دن میں انوکھی کے ایک ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ بہ ظاہر چھوٹا سا جائے کا ایک ہوٹل تھا۔ اس کا مالک دلاور تھا۔ اس نے ہوٹل کے عقیبے حصے میں ایک ہال بنا رکھا تھا جہاں لوگ کیرم اور تاش وغیرہ کھیلتے تھے۔ اس ہال کی دائیں جانب دو کمرے تھے جہاں انوکھی اور اس کے ساتھی بیٹھے تھے۔ وہ لوگ عموماً اس جگہ کسی واردات کی منصوبہ بندی کرتے تھے اور وہیں لوٹے ہوئے مال کا بنوارا بھی ہوتا تھا۔ زیورات اور قیمتی اشیاء دلاور خرید لیتا تھا اور اس کے بدلے میں نقد رقم ادا کر دیتا تھا۔ انوکھی کے دو تین ٹھکانے اور بھی تھے لیکن میں نے سب سے پہلے اس ٹھکانے کا انتخاب کیا تھا۔

کاؤنٹر پر اس وقت دلاور کے بجائے ایک نو عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ میں اس لڑکے کو بھی پہچانتا تھا۔ دلاور کی عدم موجودگی میں وہی کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ لڑکے نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا، میں بے نیازی سے ہوٹل کے عقیبے حصے کی طرف بڑھ گیا۔

ہال میں اس وقت کچھ لوگ کیرم کھیل رہے تھے اور ایک طرف تاش کی بازی چلی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہاں کیرم پر بھی جو ہوتا ہے اور تاش پر بھی لیکن نقد رقم کبھی سامنے نہیں ہوتی تھی۔

وہاں اس وقت مجھے کوئی شاسا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ میں مایوس ہو کر باہر آ گیا اور ایک طرف بیٹھ کر انوکھی کے کسی آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے کیے بعد دیگرے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔

میں مایوس ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ہوٹل کے دروازے پر ایک موٹر سائیکل آ کر رکی۔ اس کی عقیبے سیٹ پر ساجد بیٹھا تھا۔ لوگ اسے جھکتے تھے۔ وہ اس گینگ کا آدمی تھا جو انوکھی اور ڈیکٹی کی وارداتیں کرتا تھا۔ انوکھی میں اسی گینگ میں شامل ہو گیا تھا۔ میں نے جو کو ایک دوسرے انوکھی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ انتہائی اوباش لڑکا تھا اور بات بات پر پستول نکال لیتا تھا۔ جو موٹر سائیکل سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ موٹر سائیکل والا اسے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ ممکن

ہے وہ بھی اسی گینگ کا آدمی ہو لیکن میرے لیے اچھی تھا۔ مجھے اب بے تابی سے سب کا انتظار تھا۔ وہ ضرور ان بد معاشوں کو جانتا ہوگا جو انوکھی اور درمشا کی موت کے ذمے دار تھے۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن پستول موجود نہیں تھا۔ میں تو بلا ارادہ اس طرف آ گیا تھا۔

مجھے آدھ گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ پھر مجھے جو باہر آتا دکھائی دیا۔ باہر آ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں کچھ فاصلے سے ہو کے پیچھے چلنے لگا۔ اس کا رخ پرانے لاہور کی طرف تھا۔ میں بہت محتاط انداز میں اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بھائی گیٹ سے وہ اندر میز می میز گلیوں میں داخل ہو گیا۔ دو تین گلیاں طے کرنے کے بعد جو ایک پرانے اور بوسیدہ سے مکان کے سامنے رکا۔ مکان کا دروازہ مقفل تھا۔ سب نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا اور اس پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے سبکی کرخت آواز سنائی دی۔

”سب، دروازہ کھول یارا“ میں نے آواز بدل کر کہا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ سب سوچ ہوگا، اس کے باوجود میں نے یہ خطرہ مول لیا تھا۔ دروازے کے قریب قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر سب نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اس وقت خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سب اس وقت بنیان اور دھوتی میں تھا اور شاید سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بھنا کر مجھے دیکھا اور بولا۔

”کون ہے اوئے تو؟“ اچانک اس کی آنکھوں میں شاسائی کی چمک نمودار ہوئی اور وہ حیرت سے بولا۔

”اوئے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”مجھے تجھ سے کچھ پوچھنا ہے سب“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا پستل چار پائی پر تکیے کے ساتھ پڑا تھا۔

وہ اچانک چلتا اور لپک کر پستل اٹھاتا چاہا لیکن میں نے اسے موقع نہ دیا اور اس کی پشت پر لات رسید کر دی۔ وہ لڑھک کر فرسٹ پر گر گیا۔ میں نے چھٹ کر اس کا پستل اٹھا لیا اور اس کا رخ سب کی طرف کر دیا پھر میں درشت لہجے میں بولا۔

”اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا سب جو رنہ میں کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

”جو وہیں ساکت ہو گیا اور بولا۔“ تو آخر چاہتا کیا ہے؟“

”میں جو کچھ پوچھوں سچ بتانا۔“ میں نے کہا۔ ”انوکھی“

”کوکس نے قتل کیا ہے؟“

”اوئے، تو کیا دلاور کے گینگ میں شامل ہو گیا ہے؟“ میں نے آگے بڑھ کر اس کے گھٹنے پر زور دیا لات ماری اور بولا۔ ”تجھ سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، وہ بتا۔“ پھر میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”ہاں، میں دلاور کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ بس اب کوئی سوال مت کرنا۔ بتانا تو کوکس نے قتل کیا ہے؟“

اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ کسی نے پشت سے مجھ پر ڈنڈے سے وار کیا تھا۔ وہ ڈنڈا میرے بجائے سب کے سینے پر پڑا اور حملہ آور اپنی ہی جھونک میں سب پر گر پڑا۔ پستل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گیا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا اب سنبھل گیا تھا اور دوبارہ ڈنڈا سنبھال رہا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کے سینے پر لات رسید کر دی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے جبک کر اسے دبوچ لیا۔ وہ شخص میرے لیے اچھی تھا۔ میں نے اس کے بڑے بڑے بال منگھی میں جکڑ کر اس کا سر فرش پر دے مارا۔

اچانک پشت سے مجھے سب کی فراہٹ سنائی دی۔ ”بس کراوئے بہرہ ورنہ میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سب مجھ پر ہنس رہے تھے اور کھڑے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ پستل شخص دھمکانے کو نہیں نکالتا بلکہ قاتل بھی کر دیتا ہے۔ میں خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

اس نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب بتا، تجھے دلاور نے میرے پیچھے کیوں بھیجا ہے؟“

”مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟“ میں نے بے ساختہ اس کی پشت پر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ بہت پرانی چال تھی لیکن وہ دھوکا کھا گیا اور اچانک پلٹ کر دیکھا۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا رنہ میں اسے ہکڑنے کی کوشش کرتا۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میں ایک ہی جست میں کھلے ہوئے دروازے سے باہر آ گیا اور اندھا دھند وہاں سے بھاگ نکلا۔

کچھ دور جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ میں بھاگنے کے بجائے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ان میز می می گلیوں سے باہر نکل آیا۔ میں نے وہاں سے رکشا پکڑا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں اب دلاور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ایک دوسرے انوکھی سے دلاور کا نام سنا تھا لیکن کبھی اسے

دیکھا نہیں تھا۔ بھوکے لہجے سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ دلاور سے خوف زدہ ہے۔ شاید وہ اتنا ہی بڑا بد معاش تھا۔

ہاسٹل پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا رزلٹ آچکا ہے اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ عام حالات میں مجھے یہ خبر سن کر بہت خوشی ہوتی لیکن اس وقت مجھے اس خبر سے ذرہ برابر خوشی نہیں ہوئی۔ میرا دوست وحید بھی پاس ہو گیا تھا۔ وہ اب ہاسٹل چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اب میرا بھی ہاسٹل میں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں گھر آ گیا۔ اباجی اس وقت آفس میں تھے۔ اماں اور رینو گھر میں موجود تھیں۔ جب اماں کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے تو خوشی کے مارے وہ زار و قطار رونے لگیں، پھر اسی وقت وضو کر کے شکرانے کے نفل ادا کرنے کھڑی ہو گئیں۔ اباجی گھر لوٹے تو وہ بھی یہ خبر سن کر خوش ہو گئے۔

ہمارا گھر ریلوے لائن کے بالکل نزدیک ہی تھا۔ اچانک ٹرین کی گز گز اہٹ شروع ہو گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ ہو گیا۔ اباجی مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کیے اور گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگا، پھر میں شاید چیخنے لگا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

مجھے اسپتال میں ہوش آیا۔ اباجی، اماں اور رینو وہاں موجود تھے۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اماں نے کہا۔ ”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ وہ میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”اب کسی طبیعت ہے پتر؟“ اباجی نے پوچھا۔

”مجھے کیا ہوا تھا اباجی؟“ میں نے پوچھا۔

”تو کسی چیز سے ڈر گیا تھا بیٹا؟“ اماں نے کہا۔ ”میں آج ہی شاہ جی سے تیرے لیے تعویذ لے کر آؤں گی۔ تجھے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“

مجھے سب یاد آ گیا کہ میں ٹرین کی آواز سن کر وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے تو خود اپنی ہی نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش نے ایک مضمون لڑی کو نگل لیا تھا۔ میں گھرواپس آیا تو پھر وہی مسئلہ تھا۔ ظاہر ہے گھر تو ریلوے لائن کے نزدیک ہی تھا۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ کانون میں روٹی ٹھونس کر سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو اباجی آفس جا چکے تھے۔ میں ناشتا کر کے گھر سے نکل گیا۔ میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دی

تھی لیکن اب کئی دنوں سے پینے لگا تھا۔ میں سگریٹ ہمیشہ اسٹیشن کے ایک مخصوص اسٹال سے لیتا تھا کیونکہ وہاں ادھار سگریٹ، بان وغیرہ مل جاتا تھا۔

میں سگریٹ سلگا کر مڑا ہی تھا کہ میری نظر ایک شامسا چہرے پر پڑی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے اسے اکثر انوکھے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس سمت سے آ رہا تھا جہاں ریلوے کی پرانی بوگیاں کھڑی تھیں۔ میں انوکھے ساتھ اکثر ان ہی بوگیوں میں سے ایک بوگی میں جا بیٹھتا تھا۔ وہ آدی تیزی سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے آواز دی۔ ”سنو!“

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور رک گیا۔ ”جی فرمائیے؟“ اس نے پوچھا۔ شاید وہ مجھے پہچانا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا۔

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”یار! مجھے پہچانا؟“

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات تھے۔ واقعی وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔

”تم انوکھے دوست ہوتا؟“ میں نے اچانک کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر اچانک اس کی آنکھوں میں شامسا کی جھلک دکھائی دی۔ ”ہاں..... میں انوکھا دوست ہوں۔“ اس نے چونک کر کہا۔ ”اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے تمہیں انوکھے ساتھ دیکھا ہے۔“

”کیوں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں یہاں اپنے ایک دوست کو ریسو کرنے آیا تھا۔ وہ کراچی سے آنے والا ہے لیکن ابھی تک آیا نہیں ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے مجھ سے نظریں نہیں ملتا رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس وقت کوئی ٹرین کراچی سے نہیں آتی ہے۔ میری تو عمر اس پلیٹ فارم پہ گزری تھی لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آؤ یار، چائے پیتے ہیں۔“ میں نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے پلیٹ فارم سے باہر ایک ہوٹل پر لے گیا۔ میں نے چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوا لیے۔

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، پھر میں نے اچانک پوچھا۔ ”تم بھوکے جا رہے ہو؟“

”اچھی طرح جانتا ہوں۔“ اس کے چہرے پر نظرت کے آثار دکھائی دیے۔ ”انوکھی موت میں اس کا ہی ہاتھ ہے۔“

”یار! میں نے تو سنا ہے کہ انوکھی اور نے مارا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اس کا قاتل ایک مرتبہ مل جائے تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا۔“

”انوکھے عابد نے مارا ہے۔“ اس نے نفرت سے کہا۔

”میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔ وہ اس دن کے بعد سے نظر نہیں آیا ہے۔ عابد، بھوکا آدی ہے۔ بھوکے ساتھ شامل ضرور تھا لیکن اس کی بھی انوکھے سے بنی نہیں۔“

”معاف کرنا یار! میں نے کہا۔“ میں نے اب تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔“

”تو میں نے کب پوچھا ہے۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میرا نام اکل ہے۔“

”میں صفر ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اکل! تم عابد کا حلیہ بتا سکتے ہو، ممکن ہے میں نے بھی اسے دیکھا ہو؟“

”وہ گھٹے ہوئے جسم اور درمیانے قد کا گورا چٹا آدی ہے۔“

مجھے ایک دم یاد آ گیا کہ رمشا کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ میں نے اکل سے پوچھا۔ ”یار، کچھ اندازہ ہے کہ یہ عابد اس وقت کہاں ہوگا؟“

”اندازہ ہوتا تو میں وہاں جا کر اس کا کام تمام کر دیتا۔“

میں اس کے ساتھ مزید کچھ دیر بیٹھا، پھر اس سے آئندہ ملاقات کا وعدہ کر کے اٹھ گیا۔

دوسرے دن میرا ہاسٹل والا دوست وحید واپس اپنے گاؤں جا رہا تھا۔ میں نے وہ رات ہاسٹل میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور ایک پی سی او سے اباجی کو فون کر دیا کہ میں آج رات اپنے دوست کے ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں رات گئے تک ماضی کی باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو کر لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچا تو رینو نے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ مجھے دیا اور بولی۔ ”بھیا! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا ہے۔“

لفافے پر کراچی کی ایک ملٹی پکسل مینی کاپٹا چھپا ہوا تھا۔ اس میں میرا اپائنٹمنٹ لیٹر تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ امتحانات کے بعد میں نے اور وحید نے اس مینی میں ملازمت کی درخواست بھیج دی تھی۔ بڑے بڑے ادارے مختلف تعلیمی اداروں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہونے والوں کو اپنے طور پر بھی پیشکش کرتے ہیں۔

”کس کا خط ہے بھیا؟“ رینو نے پوچھا۔

”مجھے کراچی کی ایک فرم میں جاب مل گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ اب تو سب کچھ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا کراچی جانے کا

کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ رینو نے دروازے کی طرف بڑھنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے بھوکا منہس چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مجھے دکھایا ہوا اندر آیا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ میں دباؤ کر بولا۔

اس نے ایک دم اپنا ہاسٹل نکال لیا۔

یہ صورت حال دیکھ کر رینو نے فلک شگاف چیخ ماری۔

اچانک گھٹے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا بھی وہی تھا جو رمشا کے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی گنو تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بے اختیار جیب پر ہاتھ مارا لیکن میرا ہاسٹل موجود نہیں تھا۔

”آواز نکالی تو ابھی چھلنی کر دوں گا۔“ عابد نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”تجھے میری تلاش تھی نا۔ اب میں تیری بہن کو لے جاؤں گا، پھر میرے ساتھ ساتھ اسے بھی تلاش کرتے رہنا۔“

رینو ایک مرتبہ پھر وحشت زدہ ہو کر چیخ ماری کمرے سے باہر نکل آئیں۔ گھر میں سب بد معاش دیکھ کر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ ”اگر تو نے میری بہن کی طرف میلی نظر سے دیکھا بھی تو میں تیرے گلے کر دوں گا۔“

”اچھا! عابد نے کہا۔“ چل پھر کر دے گلے! وہ رینو کی طرف بڑھا تو میں بھی گن کی پروا کیے بغیر اس پر چھینا۔

اچانک میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سر پر گرنے والی ضرب اتنی ہی شدید تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے سے رقص کرنے لگے اور میں دھڑام سے زمین پہ جا گر۔

میں پوری طرح بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ مجھے رینو کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس کی چیخیں معدوم ہو گئیں۔

میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا تا کہ اپنا ہاسٹل لے لوں۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں ہاسٹل اٹھانے کے لیے جھکا تو مجھے چکر سا آیا لیکن میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے سر پر ہاتھ لگا لیا تو مجھے علم ہوا کہ میرے سر سے خون بہ رہا ہے۔

میں نے اماں کو اٹھا کر بیڈ پر ڈالا اور خود دیوانہ وار

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارڈ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

وہ پولیس کا ایک اے ایس آئی تھا۔ ابا جی کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ایس ایم صاحب! آپ کی بیٹی کا بیان بھی لیتا پڑے گا۔“

”ضرور بیان لو لیکن اسے ذرا سنبھلنے دو۔ ابھی تو اس کے لیے بات کرنا بھی مشکل ہے۔“

”بیان میں نہیں لوں گا بلکہ متعلقہ تھانے کا کوئی افسر لے گا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

”رینو بیٹا! سب کچھ سچ سچ پولیس کو بتادینا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“ ابا جی نے کہا۔ ”گھبرانا مت۔“

اکمل کو پولیس نے ہتھکڑی ڈال دی تھی اور اب اسے وہاں سے لے جا رہے تھے۔

”صنذر! تم گھر سے مت نکلنا، میں ابھی آتا ہوں۔“ ابا جی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

”یہ کون لوگ تھے بیٹا؟“ اماں نے پوچھا۔ ”کیا پولیس نے انہیں گرفتار کر لیا؟“

اماں کو معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے گھر میں داخل ہونے والے تینوں بد معاش مرچکے ہیں۔

آدمی گھٹے بعد خالو مشتاق اور خالہ زینت بھی وہاں پہنچ گئے۔ اماں جی نے انہیں ٹیلی فون کر کے بلا یا تھا۔

انہوں نے ہم سے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ چلو۔ میں نے سرور بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ تم لوگ آؤ اور ابھی رینو بیٹا کا بیان لینے آئے، اسے میرے پاس بھیج دیں۔“

وہ اصرار کر کے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

پولیس کے اعلیٰ افسروں سے ان کے تعلقات تھے اس لیے ہمیں بالکل پریشانی نہیں ہوئی۔ اکمل نے بیان دیا تھا کہ مرنے والوں سے اس کی دشمنی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے اسٹیشن آیا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ اس کی نظر ان تینوں بد معاشوں پہ پڑی۔ وہ ایک لڑکی کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ وہ پوری طرح سچ تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھ پر قاز کر دیا۔ اپنے دفاع کے لیے مجھے بھی قازنگ کرنا پڑی اور وہ تینوں مارے گئے۔ قازنگ کی آواز سن کر وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ رینو کا بھائی اس سے پہلے ان سے التجا کر رہا تھا کہ میری بہن کو چھوڑ دو۔

اس کے بیان کی تائید محلے والوں نے بھی کی۔ یوں کسی جھگڑے میں پڑے بغیر ہماری جان چھوٹ گئی۔ جو، عابد اور ان کے ساتھی کی موت کے بعد مجھے کسی حد تک سکون مل گیا تھا اور میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میں کراچی چلا

گھر سے باہر نکلا۔

رینو کی مزاحمت کے باعث وہ لوگ زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ عابد نے رینو کو کندھے پر اٹھالیا تھا۔ جو اور دوسرا بد معاش آگے آگے گن لیے چل رہے تھے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ”میری بہن کو چھوڑ دے کیئے!“

اچانک بھونے پھل کی نال میری طرف کی اور قاز کر دیا۔

میں نے گولی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ میرے بجائے گولی بھوکولی تھی اور وہ اوندھے منہ گر پڑا تھا۔ فوراً ہی دوسرا قاز ہوا اور عابد کا ساتھی کرب ناک انداز میں چیخا ہوا زمین پر گر گیا۔

عابد نے گھبرا کر رینو کو نیچے پھینک دیا اور بوکھلا کر مجھ پر قاز کرنا چاہا لیکن اس کے قاز کرنے سے پہلے ہی ایک اور قاز ہوا۔ گولی اس کے سینے میں بیوست ہوئی اور وہ چیخا ہوا زمین پر گر گیا۔

پھر ایک دیوار کی اوٹ سے اکمل نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کی نال سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ اس دوران میں رینو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

وہاں ارد گرد لوگوں کا مجمع لگتا جا رہا تھا۔ اکمل دوڑ کر میرے نزدیک آیا اور یوں۔ ”صنذر! تم بہن کو لے کر گھر جاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہمیں بھی شے میں گرفتار کر لے۔“

وہ تینوں میرے سامنے مردہ پڑے تھے۔ میرے سینے میں ٹھنڈی پڑ گئی۔ آخر اکمل نے انو اور رشا کے قاتلوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔

پھر وہاں پولیس اور ریلوے کا دوسرا عملہ ایک ساتھ پہنچا۔ میں رینو کو لے کر گھر میں چلا آیا تھا اور میں نے اپنا ہاسٹل بیڈ کے گلے کے نیچے چھپا دیا تھا۔

ریلوے کے عملے کے ساتھ ابا بھی تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ بد معاشوں نے رینو کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ حواس باختہ سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک اماں بھی ہوش میں آچکی تھیں۔ وہ بھی بری طرح کبھی ہوئی تھیں۔ پھر وہ بری طرح روتی ہوئی رینو سے لپٹ گئیں اور اس کی پریشانی جوتے ہوئے بولیں۔ ”تو شیک تو ہے بیٹی؟“

”یہ بالکل شیک ہے اماں!“ میں نے جواب دیا۔

دروازے پر ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ مجھ سے پہلے ہی ابا جی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

جیسا تھا اس نے کہا۔ ”اس لڑکی کا خیال رکھنا، اسے تکلیف مت ہونے دینا۔ یہ میرے دوست کی امانت ہے۔“

”کون سا دوست؟“ یہ سوال شاید ڈرائیور نے کیا تھا۔ ”وہ صفر.....؟“

”ہاں صفر۔“ پہلے آدمی نے جواب دیا۔

”یار انو اوہ تجھے کب کا چھوڑ گیا ہے۔ تیری ابھی تک دوستی ہے اس سے؟“

”وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا ہے بلکہ میں نے ہی اسے چھوڑ دیا۔“

”بات تو ایک ہی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”وہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، بالکل گڑیا کی طرح ہے۔“

”اکو.....!“ انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی زیادتی مت کرنا۔“

”ارے استاد! تم تو فضول میں گرم ہو رہے ہو۔ میں تو لڑکی کے حسن کی تعریف کر رہا تھا۔“

”انہو بھائی! یہ تو ممکن ملاتی ہے۔“ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔

مجھے ان لوگوں کی باتوں سے کھن آ رہی تھی اور میں شدید خوف زدہ تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ”تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”تم پریشان مت ہو۔“ یہ آواز انہو کی تھی۔

”تمہارے باپ سے ہمیں کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔ وہ سیدھی طرح قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کام ہوتے ہی تمہیں واپس گھر چھوڑ دیں گے۔ تمہیں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔“

پھر وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”بس اب رونا بند کر دو۔“

گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی پھر وہ رک گئی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ وہ لاہور کا کوئی مضافاتی علاقہ تھا۔ وہاں دور تک کھیت تھے۔ ان ہی کھیتوں کے سرے پر ایک کچا مکان تھا۔ وہ لوگ مجھے اٹنی مکان میں لے گئے۔ میں خوف سے لرز رہی تھی کہ نہ جانے وہ لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ خاص طور پر اکتو تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے وہ مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔

اس کے مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں بنگ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا اور بولا۔ ”تم گھبراؤ مت، میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ منگواتا ہوں۔“

وہ سارا دن روتے ہوئے گزر گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا

”ہاں غلام حسین۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرائیونگ روم کھول دو۔ میں کچھ دیر یہاں آرام کروں گا۔“

اس نے ویٹنگ روم کھولا تو میں نے سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔“

میں نے ویٹنگ روم میں بیٹھ کر مشا کا بیگ کھول لیا۔ اس میں اس کی کتابیں، کاہیاں اور دوسری چیزیں تھیں۔ میں نے اس کی ایک کتاب نکالی تو اس پر خوش خط انگریزی میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ ”رمشا مشتاق.....“ اس میں سے اچانک کچھ کاغذ نکل کر باہر گر پڑے۔ میں نے جبک کر وہ کاغذ اٹھا لیے۔

میں نے یونہی ان کاغذات کی تہیں کھولیں تو مجھے رمشا کی تحریر نظر آئی۔ اس نے انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔ ہیڈنگ پر میری نظر پڑی۔ ”پولیس کے لیے۔“

اس کے نیچے لکھا تھا۔ ”مجھے امید تو نہیں ہے کہ میری یہ تحریر پولیس تک پہنچے گی لیکن میں پھر بھی لکھ رہی ہوں۔ شاید پہنچ ہی جائے۔ میں صبح اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ اس دن میرا نیٹ تھا اور میں نے بہت اچھی طرح نیٹ کی تیاری کی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے دہرا رہی تھی کہ اچانک گاڑی رک گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سڑک پر ایک دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ چوہتر ماڈل لکروا تھی۔ وہ اس انداز میں کھڑی تھی کہ میں اس کا نمبر نہ دیکھ سکی۔ اس گاڑی کے ساتھ تین آدمی کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور گاڑی کا شیشہ ہٹا کر بولا۔

”یار، یہ گاڑی تو سائڈ میں لگاؤ۔ راستہ بند ہو گیا ہے۔“

اچانک سائڈ میں سے دو آدمی نکلے۔ ان کے ہاتھوں میں گھونٹیں۔ ان میں سے ایک میری طرف آیا۔ دوسرا ڈرائیور کی طرف چلا گیا پھر اس نے ڈرائیور کے سر پر گن کا بیٹ مار کے بے ہوش کر دیا اور جبک کر مجھ سے بولا۔ ”اگر تو نے آواز نکالی تو تجھے بھی گولی مار کر ڈھیر کر دوں گا۔ دروازہ کھول اور خاموشی سے بیٹھے آ جا۔“

میں اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ فوراً دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ باہر کھڑے ہوئے آدمی نے مجھے بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر اس پرانی کروا میں بٹھا دیا جو وہاں کھڑی تھی پھر دوسرا آدمی میرے ساتھ پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے میرے دوپٹے سے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور گاڑی تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ جو آدمی پنجر سیٹ پر

☆☆☆

برات کا استقبال کرنے والوں میں خالو مشتاق کے ساتھ میں اور اباجی بھی موجود تھے۔

جہانگیر خاصا وجیبہ اور دراز قد نوجوان تھا۔ شرہ کی طرح اس کا رنگ بھی سرخ و سفید اور بال سیاہ تھے پھر شرہ میری آنکھوں کے سامنے جہانگیر کی بی ایم ڈ بلیو کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گئی۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح ہال میں واپس آ گیا۔ میں نے شرہ کو اپنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا لیکن میرے ہاتھ کیا آیا؟ محرومیاں اور ناکامیاں! میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں میں نے جلدی سے صاف کر لیا۔

اچانک جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں...۔ بے اختیار اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ اسٹیشن کا وہی ماحول تھا، وہی گہما گہمی تھی لیکن اتنے عرصے میں بہت سے چہرے بدل گئے تھے۔ ہاں اسٹال والے سب میرے شناسا تھے۔ ہر شخص مجھ سے بہت تپاک سے ملا۔

میں پلیٹ فارم پر ٹھلٹا ہوا بے اختیار اس طرف جانکلا جہاں ریلوے کی ناکارہ بوگیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ میرے قدم خود بہ خود اس بوگی کی طرف اٹھ گئے جو دوسری ناکارہ بوگیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہی بوگی جو مجھے میرا گھر لے آئی تھی۔ میں غیر ارادی طور پر دروازہ کھول کر اس بوگی میں داخل ہو گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اپنا لائٹ روشن کیا اور اس سیٹ کی طرف چل دیا جہاں میں اکثر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کئی خوب صورت لڑکیاں اس سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ انہو بھی اکثر میرے ساتھ اسی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ میں آگے بڑھا ہی تھا کہ مجھے سیٹ کے نیچے کی طرف کوئی بیٹ سی نظر آئی۔ میں نے جبک کر بیٹ پکڑی اور اسے باہر گھسیٹ لیا۔ وہ کوئی اسکول بیگ تھا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ رمشا کا اسکول بیگ تھا۔ وہ بیگ تین مہینے تک اسی طرح وہاں پڑا رہا تھا۔ لگتا تھا اس دوران میں کوئی اس بوگی میں آیا ہی نہیں ورنہ وہ قیمتی بیگ وہاں نہ ہوتا۔ میں نے غیر شعوری طور پر وہ بیگ اٹھایا اور اسے کندھے سے لٹکا کر باہر نکل آیا۔

وہاں سے میں سیدھا ویٹنگ روم میں پہنچا۔ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم کا بھرا ہوا جیسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں اکثر اسے پانچ دس روپے دے دیا کرتا تھا۔ اس نے مجھے ادب سے سلام کیا اور بولا۔ ”صفر باجو! ویٹنگ روم کھول دوں کیا؟“

جاؤں۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اباجی بھی اب ریٹائر ہونے والے تھے۔ گھر کی ذمے داریاں اب مجھے ہی اٹھانا تھیں۔

اباجی نے فی الحال دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے لی تھی۔ ایک دن اباجی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اماں کو بتایا۔ ”بھائی مشتاق نے فوراً ہم لوگوں کو بلایا ہے۔“

”خیریت تو ہے؟“ اماں گھبرا گئیں۔

”ہاں خیریت ہے۔“ اباجی نے جواب دیا۔ ”وہ شرہ کی شادی اپنے ایک دوست کے بیٹے سے کر رہے ہیں۔ وہ معروف ارب پتی صنعت کار شہر یار کا بیٹا ہے۔“

”اللہ مبارک کرے۔“ اماں نے کہا۔ ”ہم سب شادی میں جائیں گے۔“

”اماں، میں تو ملازمت کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تو اتنی دور کیوں جا رہا ہے؟“ اماں نے پوچھا۔

”یہاں تیرے لیے کوئی ملازمت نہیں ہے کیا؟“

”نہیں اماں!“ میں نے کہا۔ ”تمام بڑی بڑی فرمز کراچی اور لاہور میں ہیں۔ مجھے دوبارہ ایسا موقع اتنی جلدی نہیں ملے گا۔“

”تم کراچی ضرور جاؤ بیٹا!“ اباجی نے کہا۔ ”لیکن شرہ کی شادی کے بعد۔ ورنہ زینت بہن اور بھائی مشتاق یہی سمجھیں گے کہ تم اس شادی سے خوش نہیں ہو۔“

ان کی بات معقول تھی اس لیے میں نے کراچی جانے کا پروگرام کچھ دن کے لیے ملتوی کر دیا۔

شرہ کی شادی کے بارے میں سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اچانک میرے ذہن کی اسکرین پر رمشا نمودار ہوئی۔ ”صفر بھائی! اپنی خواہش کے لیے آپ نے میری جان لے لی لیکن میری قربانی بھی آپ کے کام نہ آ سکی۔“ وہ روتے روتے پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے لیکن اس کے نتیجے میں میرے ذہن میں گونجتے رہے۔ پھر انو، اکبر، عابد، سجو اور ان کے دوسرا بھی میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ”ہم بھی تمہاری خواہش کی سمیٹ چڑھ گئے۔ تم نے اپنی محبت پانے کے لیے ہماری جان لے لی لیکن حاصل کیا ہوا؟“ انہوں نے کہا۔

”میں نے کسی کی جان نہیں لی..... کسی کی جان نہیں لی.....“ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا، اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

لاٹج مت کرو۔ پچاس لاکھ اکٹھے کرنے میں اس کا باپ ایک اور دن لگا دے گا۔ یہاں ہر طرف خطرہ ہے۔ اس دوران میں یہاں پولیس بھی پہنچ سکتی ہے۔“ کافی بحث کے بعد وہ لوگ بچھیں لاکھ پر راضی ہوئے۔ انہوں نے میری رہائی کے لیے بچھیں لاکھ روپے مانگے تھے۔ صبح وہ لوگ مجھے ڈیڈ کے حوالے کرنے والے تھے۔

انہوں نے یوگی میں آکر میرے ہاتھ کھولے اور مجھے کھانے کو دیا اور خود باہر چلے گئے۔

صبح ہوتے ہی میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے جلدی جلدی یہ سارے واقعات لکھ دیے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں انہوں کو بھی سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ لوگ شاید مجھے گولی مار دیں گے۔ میں اب بے آبرو ہو کر مزید جینا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس سے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ شاید رمشا کو مزید کچھ لکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے وہ کاغذ بیگ کی ایک کتاب میں رکھ کر بیگ کو سیٹ کے نیچے دھکیل دیا ہوگا۔ مجھے خیال نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے انہوں کو بھی سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اسی بات پر ان سے ان لوگوں کا جھگڑا ہوا ہوگا اور بات فائرنگ تک پہنچ گئی ہوگی۔ رمشا کے ہاتھ تو کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پیر بھی کھول لیے ہوں گے اور یوگی سے نکل کر بھاگی ہوگی تاکہ وہ اسے گولی مار دیں۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ لوگ گولی مارنے کے بجائے اسے زندہ بچڑنا چاہتے تھے تو اس نے ریلوے کے پل پر چڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔

”صاحب چائے۔“

یہ سن کر میں بری طری اچھل پڑا۔ وہ دیننگ روم کا بیرا تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”صاحب! آپ رو رہے ہیں؟“ خط پڑھتے ہوئے بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے تھے۔

اچانک مجھے کسی ٹرین کا ہارن سنائی دیا اور اس کے پیروں کی گڑگڑاہٹ کانوں تک پہنچی تو میں وحشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا۔ بیرا حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا دامنی توازن بگڑ چکا ہے۔

میں یوں وہاں سے بھاگا تھا جیسے فرشتہ اچھل میرے پیچھے لگا ہو۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اس سے انارکلی جانے کو کہا۔ میں فوری طور پر ان آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا اور نہ انارکلی میں اس وقت کیا ہوتا۔ رمشا کا بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔

”کون ہے؟“ میں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔
”ڈرومٹ۔“ مجھے اکو کی آواز سنائی دی۔ اس کی زبان بری طرح لڑکھرائی تھی۔ وہ اندھیرے میں ٹٹول کر میرے بالکل نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔ ”رمشا! یہی نام ہے نا تمہارا؟ تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم کتنی حسین ہو۔ اتنی حسین کہ تمہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ تم میلی نہ ہو جاؤ۔“ وہ لڑکھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یہ تم کیسی بے ہودہ باتیں کر رہے ہو؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”انہو بھائی کہاں ہیں؟“
”بھاڑ میں گئے انہو بھائی۔“ وہ بھڑک کر بولا اور میرے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھ گیا۔ ”تم بس یہاں آج رات کی مہمان ہو۔ کل تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔“

”سچ کہہ رہے ہو تم؟“
”ہاں، اکو بھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے ورنہ میں اسے اتنی آسانی سے اپنے نزدیک نہیں آنے دیتی پھر..... پھر اس نے..... میری عزت..... مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔

اس کے بعد دوسرا آدمی آگیا اور بولا۔ ”واہ اکو! اکیلے ہی اکیلے۔ ارے ہمارے بدن میں کیا کانٹے ہیں۔ لیکن تم نے بہت قلم کیا، انہو بھائی کو معلوم ہوگا تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

”اس انو سے میں خود نمٹ لوں گا۔ میں خود بھی اس سے الگ ہونے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”ارے یار تو پھر ہم کیوں پیاسے رہیں۔“ اس نے کہا پھر اس نے اکو کے ساتھ مل کر میرے ساتھ..... میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مرجاؤں، رورو کر میری آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ میں تو اب کسی قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ ان لوگوں نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔

ان دونوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر تم نے انہو بھائی کو کچھ بتایا تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھے پانی پلایا اور یوگی سے باہر نکل گئے پھر وہاں انہو بھائی بھی آگئے۔ وہ لوگ یوگی کے باہر تھے اور کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

انہو بھائی نے کہا۔ ”بچھیں لاکھ کافی ہیں۔ اب زیادہ

فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ لوگ بہت جگت میں وہاں سے بھاگے لیکن میں اپنا بیگ اٹھانا نہیں بھولی۔ اس مرتبہ پھر انہوں نے میری آنکھوں پر پتی باندھ دی اور سفر شروع ہو گیا۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح کچھ اور ڈاکو بھی وہاں چھپے ہوئے تھے۔ پولیس والے انہی لوگوں کے لیے آئے تھے۔ جب پولیس اور ان ڈاکوؤں کا مقابلہ ہو رہا تھا تو وہ لوگ وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں میں ان کا ایک آدمی شامل تھا۔ اسی خوف سے وہ فرار ہو گئے تھے۔

اس مرتبہ وہ مجھے کسی ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ میری آنکھوں پر پتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے مجھے برقع پہنا کر اوپر سے نقاب بھی ڈال دیا تاکہ کسی کو میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پتی نظر نہ آسکے۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور میں اندھوں کی طرح ان کے ساتھ چل دی۔ دس منٹ تک چلنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹرین میں سوار ہونے کو کہا۔ لگتا تھا اب وہ ٹرین کے ذریعے مجھے کہیں لے جا رہے ہیں۔

یوگی میں پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں سے پتی کھول دی۔ میں اس انتظار میں تھی کہ ٹرین چلے تو مجھے معلوم ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں لیکن میں انو سے کہہ کر انہیں کھلوا سکتی تھی۔ ان سب لوگوں میں وہی مجھے سب سے زیادہ شریف اور ہمدرد لگتا تھا۔

وہ یوگی تھی کہ چلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بہت دیر بعد میں مجھے احساس ہو گیا کہ یہ یوگی بھی نہیں چلے گی۔ مجھے ٹرین کے انجن کا ہارن اور چلنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن وہ دوسری ٹرینیں ہوتی تھیں۔

جب ایک دن اسی طرح گزر گیا تو انو نے مجھے بتایا کہ یہ یوگی کبھی نہیں چلے گی کیونکہ یہ بالکل الگ تھلک کھڑی ہے۔

”انہو بھائی!“ میرے منہ سے بے اختیار اس کے لیے بھائی کا لفظ نکل گیا۔ ”آپ مجھے گھر کب پہنچائیں گے؟“

”تم پریشان مت ہو گڑیا، ہم آج ہی تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔“ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ یوگی میں تھوڑی دیر بعد کچھ اندھیرا چھا گیا۔ اچانک مجھے یوگی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اگر ان لوگوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہ باندھے ہوتے تو میں کب کی وہاں سے نکل کر بھاگ چکی ہوتی۔ کوئی بہت آہستہ سے اندر آ گیا۔

کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں۔ وہ لوگ بار بار کسی صفدر کا نام لے رہے تھے۔ یہ نام تو میرے دل کی دھڑکن تھا۔ مجھے اس پر صفدر بھائی یاد آتے تھے۔ وہ کتنے ڈشنگ اور پنڈم ہیں۔ میں عمر میں ان سے اتنی چھوٹی تھی کہ اپنے دل کی بات کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ کہنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو وہ سمجھتے ہی نہیں تھے، عجیب بدصورت تھے۔ شاید انہیں کبھی کسی لڑکی سے محبت ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ میں ان سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کروں لیکن ہر بار میری زبان گنگ ہو جاتی اور میں ان سے کچھ بھی نہ کہہ پاتی۔ میں نے اکثر یہ بھی سوچا کہ میں رینو سے اپنے جذبات کا اظہار کروں لیکن اس کے سامنے بھی صفدر بھائی کا نام لیجے ہوئے میری زبان گنگ ہو جاتی۔

پھر میں نے یہ محسوس کیا کہ صفدر بھائی مجھ میں کم اور باجی میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ باجی شاید انہیں ناپسند کرتی تھیں یا ممکن ہے وہ بھی انہیں پسند کرتی ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ باجی اپنے دل کی بات نہ بھی مجھے بتائیں گی نہ صفدر بھائی کو بتائیں گی۔ کاش اس وقت صفدر بھائی یہاں آجائیں تو وہ ان بدمحاشوں کو سیدھا کر دیں۔ روتے دھوتے پورا دن گزر گیا۔ میں نے کچھ کھایا پینا بھی نہیں حالانکہ اس انو نے بہت کوشش کی کہ میں کچھ کھا لوں، کم سے کم رو دھاتی ہوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔

رات کو بہت مشکل سے میں نے ڈنل روٹی کے دو سلائس اور دو دوہ کا ایک گلاس پیا۔ ویسے مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی اور بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میرے بیگ میں لٹچ باکس بھی تو ہوگا۔ میرا بیگ ابھی تک میرے پاس تھا۔ میں نے جلدی سے بیگ کھولا اور لٹچ باکس نکال لیا۔ اس میں سینڈویچز، فرنیچ فرائز اور مایونیز تھا۔ میں نے خوب ڈنٹ کر سینڈویچز کھائے اور تب جا کر میری جان میں جان آئی۔ لیکن یہ میں کیا لکھ گئی۔ صفدر بھائی کو معلوم ہوگا تو کتنی شرمندگی ہوگی اور شرمہ باجی تو مجھے تھپڑ مار دیں گی۔ مار دیں..... کم سے کم میں نے اپنی محبت کا اظہار تو کر دیا اور اگر یہ تحریر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو..... تو بھی کیا ہے جب صفدر بھائی کو معلوم ہوگا، باجی کو معلوم ہوگا، ماما اور پاپا کو معلوم ہوگا تو پولیس والوں سے کیا شرمانا لیکن اس کا فائدہ کیا ہے؟ پاپا تو خالہ نسیم کو اتنا بے عزت کر چکے ہیں۔ اب تو شاید صفدر بھائی بھی ہمارے گھر بھی نہ آئیں لیکن انہیں معلوم تو ہو جائے گا کہ اس گھر میں کوئی تو ایسا ہے جو ان کے لیے جان تک دے سکتا ہے۔ رات کو اچانک

میں نے اتار کئی سے پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں اس بیگ کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا ورنہ وہاں سے سیدھا ماڈل ٹاؤن ہی جاتا۔ وہاں ایک جگہ مجھے کچھ انگارے نظر آئے۔ سردی بہت شدید تھی۔ شاید وہاں چوکیدار نے الاؤ روشن کیا تھا جو اب تقریباً بجھ چکا تھا۔ میں نے پہلے بیگ سے ایک کاپی نکال کر راکھ کے اس ڈھیر میں پھینکی۔ راکھ کے نیچے اب بھی چنگاریاں تھیں۔ تھوڑی دیر میں کاپی سلگنے لگی۔ میں نے دوسری کاپی نکال کر اس سے لکھے کا کام لیا اور اس سے آگ کو جھل کر مزید آگ بھڑکا دی پھر میں ایک کے بعد دوسری کاپی اور کتاب اس الاؤ میں ڈالتا رہا اور خود اس پتھر پر بیٹھ گیا جو شاید چوکیدار نے اپنے لیے رکھا تھا۔

اب آگ خوب بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے ایک ساتھ اس میں بچی ہوئی کتابیں اور کاپیاں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب جل کر خاکستر ہو گئیں۔ اب مسئلہ اس بیگ کا تھا۔ وہ خالص چمڑے کا بیگ تھا اور جلنے میں کافی وقت لیتا۔ میں نے وہ بیگ بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جمونک دیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بھی آگ پکڑ لی۔ جلد ہی وہ بیگ ناقابل شناخت ہو گیا۔ اب یہ تو معلوم ہو سکتا تھا کہ اس الاؤ میں بیگ جل رہا ہے لیکن اب وہ ناقابل شناخت ہو چکا تھا۔ وہ صفحات انبنت اب تک میری جیب میں تھے جو رمشا نے آخری وقت میں لکھے تھے۔ میں نے وہ صفحات احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیے اور وہاں سے اٹھ گیا۔

رات خاصی ہو چکی تھی لیکن مجھے وہاں سے ماڈل ٹاؤن کے لیے ٹیکسی مل گئی۔ وہ شادی کا گھر تھا۔ ابھی تک وہاں سب جاگ رہے تھے۔ شمرہ کی چچا زاد، رینو، اماں اور خالہ جان بھی وہاں موجود تھے۔ اباجی، خالو مشتاق اور ان کے کوئی اور رشتے دار ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔

”صفر بیٹا! خالو مشتاق نے کہا۔“ کہاں چلے گئے تھے؟ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”میں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔“ مجھے اچانک رمشا کا کٹنا پھنا جسم اور اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا آخری خط یاد آ گیا۔ میرا دل بھرا آیا اور میں خود پر ضبط نہ کر سکا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ارے، ارے..... کیا ہوا صفر بیٹا؟“ خالو نے پوچھا۔

”خالو، میرا وہ دوست ایک حادثے میں مر گیا۔“

میں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا۔ خالو نے بے اختیار مجھے سینے سے لگا لیا اور دلا سادینے لگے۔

”صفر کرو بیٹا۔ رونے کے بجائے اپنے اس دوست کے لیے دعا کرو۔“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ میری وہ دوست رمشا تھی۔ وہ پاگل لڑکی مجھے اتنا چاہتی تھی۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا تو شاید میں اسے پیار سے سمجھتا لیکن اب تو وہ بگھنے بگھانے کی حدود سے بہت دور جا چکی تھی۔

☆☆☆

اس کے بعد کئی شادیوں میں، خاندان کی دوسری تقریبات میں شمرہ سے میرا سامنا ہوا۔ وہ شادی کے بعد کچھ اور نکھر گئی تھی۔ وہ اپنی قیمتی بی ایم ڈیبلو سے اترتی تو وہاں موجود تمام خواتین کا حسن ماند پڑ جاتا۔ وہ کسی مہارانی کی طرح نئے نئے قدم رکھتی ہوئی اندر داخل ہوتی اور خالہ جان یا اماں کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ مجھے پہلے کی طرح سلام بھی کرتی تھی لیکن اب فرق یہ پڑا تھا کہ وہ وہاں سے بھارتی نہیں تھی بلکہ مجھ سے اچھی خاصی باتیں بھی کر لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید احساس کمتری ہوتا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ اب میں بھی خالو مشتاق اور شمرہ کو ان کے ہم پلہ ہو کر دکھاؤں گا مگر جائز طریقے سے۔

اس دوران میں شمرہ ایک بچے کی ماں بن چکی تھی۔ میں اس دن آفس سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی گئی۔ میں نے ٹیلی فون میٹھ کر گھورا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کاشمی صاحب کا ٹیلی فون ہوگا اور وہ مجھے فوری طور پر بلا رہے ہوں گے۔ کاشمی صاحب میرے پاس تھے اور اکثر ضروری پروڈیکٹس پر بات چیت کرنے کے لیے انہیں یہی وقت ملتا تھا۔ میں نے بریف کیس رکھ کر ریسپورڈ اٹھالیا اور آہستہ سے بولا۔ ”ہیلو۔“

”السلام علیکم! دوسری طرف سے کہا گیا۔ وہ آواز سن کر میرے چہرہ طبع روشن ہو گئے۔ میں اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ شمرہ کی مترنم آواز تھی۔

”شمرہ تم.....؟“ میں نے کہا۔ ”خیریت تو ہے، اس وقت کیسے فون کیا؟“

”کیوں صفر بھائی! کیا میں آپ کو فون نہیں کر سکتی؟“ اس کے منہ سے بھائی کا لفظ سن کر مجھے شاک سا لگا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”ہاں کر تو سکتی ہو لیکن کرتی نہیں ہو اس لیے کہہ رہا ہوں۔“

”وہ اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو میرے بیٹے دانیال کا حقیق ہے اور آپ کو ضرور آتا ہے۔“

”ماشاء اللہ! دانیال بیٹا ایک سال کا ہو گیا؟ بہت

مبارک ہو۔“

”خیر مبارک لیکن آپ آرہے ہیں نا؟“

”لیکن تمہیں میرا ٹیلی فون نمبر کہاں سے ملا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کا نمبر کیا خفیہ ہے؟“ وہ مسکرائی۔ ”ارے بھئی خالہ نسیم سے ملا ہے اور کہاں سے ملے گا۔ آپ آئیے گا ضرور، خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں بہت دیر تک ریسپور ہاتھ میں پکڑے اسے گھورتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ماؤتھ ہیں سے اس کی سانسوں کی خوشبو آرہی ہے۔ یقیناً اماں نے اس سے کہا ہوگا کہ تم خود فون کر لو۔ ہمارے کہنے سے تو وہ شاید نہ آئے۔

شمرہ کے بیٹے دانیال کے حقیقے میں اتنا اہتمام تھا کہ کسی شادی یا ویسے کی تقریب میں بھی کیا ہوگا۔ خالہ کا پورا گھر اتنا بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اس تقریب میں شمرہ کے شوہر جہانگیر سے بھی تفصیلی ملاقات ہوئی۔ وہ خاصا عدیم الغرمت شخص تھا اور دن رات جیسا کمانے اور کاروبار کو وسعت دینے میں مصروف رہتا تھا۔ شمرہ کی شادی کے بعد میں آج اسے دیکھ رہا تھا ورنہ خاندان میں کئی تقاریب ہوئی تھیں جن میں صرف شمرہ ہی شریک ہوتی تھی، وہ یا تو ملک سے باہر ہوتا تھا یا پھر شہر سے باہر۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے بیٹے کے حقیقے کے سواں پر اپنی تمام کاروباری مصروفیات ترک کر دی تھیں۔

اس سے بات کر کے مجھے مزید احساس کمتری ہوا۔ اگر اس کی روزانہ کی آمدنی کا اوسط نکالا جائے تو وہ بھی میری ایک مہینے کی تنخواہ کے برابر تھا۔ میں جس فرم میں کام کرتا تھا، اس کے چیئر مین سے بھی وہ واقف تھا۔ وہ ان کے بارے میں پوچھتا رہا اور میں جھوٹی بچی باتیں بتاتا رہا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی اس ٹی بی بیٹھل کمپنی کے سی ای او سے میری دو چار ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں۔ میں اس کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بھی جہانگیر کی طرح ایک کروڑ پتی شخص ہے اور بس۔

پھر جہانگیر مجھے اپنے غیر ملکی دوروں اور بزنس کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ میرے پاس اتنی دولت تو نہیں تھی لیکن معلومات اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ پھر مجھ میں دوسروں کی باتیں سننے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بولتا رہا اور میں دل ہی دل میں مرعوب ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے شمرہ کے لیے وہ کتنا وقت نکال پاتا ہوگا۔

میں نے ہاتوں ہاتوں میں اس سے پوچھ بھی لیا۔ ”جہانگیر صاحب! آپ اتنی بڑی لائف میں سے گھر والوں کے لیے وقت کیسے نکال پاتے ہیں؟“ میری بات پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

اس تقریب کے بعد میرا احساس محرومی مزید بڑھ گیا۔ انتہائی محکمے ترین علاقے میں جہانگیر کا وسیع و عریض بنگلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ دو ایکڑ سے زیادہ ہی ہوگا۔ وسیع و عریض لان اتنا بڑا تھا کہ وہاں دو ہزار سے زیادہ کرسیاں آسکتی تھیں۔ اس کا کارپوریٹ بھی اتنا بڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کسی پارکنگ لائٹ کا گمان ہوتا تھا۔ مہمانوں کی روانگی کے بعد شمرہ نے ضد کر کے ہم لوگوں کو روک لیا۔ یوں بھی رات کافی ہو چکی تھی اور واپس جانے میں خاصی وقت ہوتی۔ اس رات مجھے اس کا محل نما گھر اندر سے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں اوپر پینچو آراستہ بیڈروم تھے۔ مہمانوں کے لیے علیحدہ سے انٹیکسی تھی لیکن وہاں جہانگیر کے کاروباری اور غیر ملکی مہمان ٹھہرتے تھے۔

دس پندرہ روز کے علاوہ وسیع و عریض اور جدید ترین اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا۔ جہانگیر کا بیڈروم بھی شاندار تھا۔ اس کے علاوہ اس محل میں ایک اسٹڈی روم بھی تھا۔ ہر موضوع کا پورٹن ملتا تھا۔ اتنے کتابوں میں مارکیننگ، اکاؤنٹس، سیالیا، تاریخ، اردو اور انگریزی ادب پر ایسی کتابیں تھیں کہ انہیں دیکھ کر مجھے رشک کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

میں نے شمرہ سے پوچھا۔ ”کیا جہانگیر صاحب کو مطالعے کا بہت شوق ہے؟“ شمرہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

”جہاں تک مجھے علم ہے، مطالعے کا شوق تمہیں تھا۔ خاص طور پر اردو ادب سے لگاؤ تھا تمہیں؟“ میں نے کہا۔

”وہ تو اب بھی ہے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے تو لکھنے کا شوق بھی تھا لیکن زندگی نے مہلت ہی نہیں دی کہ میں اپنے لیے بھی کچھ وقت پس انداز کر سکوں۔“

میں نے سوچا کہ جہانگیر اتنی دولت کما کر کیا کرے گا؟ جہاں تک مجھے علم ہے شادی کے بعد اس نے صرف پہلے پندرہ دن شمرہ کے ساتھ ہی سون منایا تھا اور شمرہ کو سویٹزر لینڈ، اٹلی، لندن اور نہ جانے کہاں کہاں کی سیر کروائی تھی۔ اس کے بعد شاید کئی دن اس کی شمرہ سے ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی مصروفیات تو کچھ ایسی ہی تھیں۔

میں نے کراچی آ کر نہ صرف امریکا کی کئی کمپنیوں

میں ملازمت کے لیے درخواست بھی بھیجی بلکہ مختلف یونیورسٹیوں سے بھی رابطہ کر لیا۔ ان دنوں کمپیوٹر پاکستان میں آچکا تھا لیکن ابھی وہ صرف دفاتر اور دولت مند گھرانوں تک ہی پہنچا تھا۔

میں نے کمپیوٹر کے ذریعے ہی امریکا اور یورپ کی دوسری کمپنیوں کو ملازمت کے سلسلے میں ای میل کی تھی۔ اس بھاگ دوڑ میں ایک سال گزر گیا۔ میں ہر مہینے پابندی سے اماں اور اباجی سے ملنے بھی جاتا تھا۔ ریٹونے ایف اے کر لیا تھا اور اب وہ بی اے میں پڑھ رہی تھی۔۔۔ اباجی مجھے دیکھ کر اتنے خوش ہوتے تھے کہ میں اس خوشی کو صرف محسوس کر سکتا تھا، بیان نہیں۔ اماں ہر دفعہ یہی کہتی تھیں کہ میں تیرے لیے چاندی دہن لاؤں گی لیکن ابھی تک انہیں اپنی وہ چاندی ہو کہیں ملی نہیں تھی۔ میرا تو شادی کا... فی الحال کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔

آخر ایک دن میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے امریکا کی ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ وہاں میری تنخواہ اور دیگر مراعات اتنی تھیں کہ میرے پاؤں زمین پر نہیں تک رہے تھے۔ کمپنی کی طرف سے بنگلا تھا، کارکنی اور طبی سہولیات تھیں۔ جتنا میں یہاں رہ کر سال بھر میں کماتا، وہاں صرف ایک مہینے میں کمالیتا۔ اب مسئلہ صرف اماں اور اباجی کو برداشت کرنے کا تھا۔

میں نے اپنی موجودہ ملازمت چھوڑ دی تھی۔ میں اپنا سب سامان سمیٹ کر لاہور روانہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

”دیکھو بیٹا! تم کراچی گئے تو میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم سے دور ہو لیکن اپنے ملک میں تو ہو۔“ اباجی نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد میں اباجی کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے انہیں بتایا تھا کہ میں امریکا جانا چاہتا ہوں۔

”یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے پتر؟“ انہوں نے کہا۔ ”کیا تم نے انجینئرنگ کی ڈگری اس لیے لی تھی کہ وہ غیروں کے کام آئے؟“

میں اباجی کو کیسے سمجھاتا کہ میں شرہ کی ضد پر زیادہ سے زیادہ دولت کماتا چاہتا ہوں۔ اباجی کی بات درست تھی۔ مجھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے مجھے میری اوقات سے بڑھ کر دیا تھا۔

”اباجی!“ میں نے کہا۔ ”میں صرف دو سال وہاں

لگاؤں گا اور کچھ پیسے کم کر اپنے ملک لوٹ آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے بیٹا!“ اباجی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تو نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہم تجھے کیسے روک سکتے ہیں؟“ ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ ”جا اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔“

”صاف تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟“

اماں نے کہا۔

”آپ لوگ تو عیش کریں گے عیش!“ میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

”نہیں چاہئیں ہمیں عیش!“ اماں نے کہا۔

”اسے مت روکو نسیر!“ اباجی نے کہا۔ ”اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھلا اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں۔ جاؤ بیٹا، خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔“

☆ ☆ ☆

امریکا پہنچ کر شروع شروع میں تو مجھے خاصی تکلیف ہوئی۔ پھر میں نے بھی خود کو اس اجنبی ماحول میں ڈھال لیا۔ وہیں میری ملاقات لطیف سے ہوئی۔ اس کا اعلق بھی پاکستان میں جہلم سے تھا۔ جلد ہی ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی۔ لطیف کسی آئل فیلڈ پر کام کر رہا تھا۔ میرے پاس خاصا بڑا اپارٹمنٹ تھا اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔

☆ ☆ ☆

چانک مجھے کسی نے چھینوڑا تو میں چونک اٹھا۔ لطیف مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے ہیڈ فون کانوں سے نکالتے ہوئے کہا۔

”اب اترو، ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔“ میں جلدی سے نیچے اترا یا پھر ہم کوچ کے ذریعے اپنے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ اباجی گاؤں منتقل ہو چکے تھے۔ گاؤں کی حالت بھی بدل چکی تھی۔ وہاں پختہ سڑک بن گئی تھی اور اس سڑک پر تانوں کے ساتھ ساتھ رکشا بھی چلنے لگے تھے۔ میں نے بھی رکشا ہی لیا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اماں تو جہلم کے اسپتال میں ہوں گی یا ممکن ہے گھر چلی گئی ہوں۔

میں نے سیل فون نکال کر رینوکا نمبر ملا یا تو اس نے فوراً ہی کال ریسیور کر لی۔ ”السلام علیکم بیٹا!“

”علیکم السلام۔“ میں نے کہا۔ ”رینو! اب اماں کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے بیٹا۔ ابھی ڈاکٹر انہیں دو تین روز مزید

اسپتال میں رکھیں گے۔“

”تم اس وقت اسپتال میں ہو؟“

”جی ہمایا۔“ اس نے جواب دیا۔

”اچھا اماں سے میری بات کرواؤ۔“

”اماں... تو اس وقت سو رہی ہیں بیٹا۔“ اس نے کہا۔

”اچھا میں تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں جہلم پہنچ گیا ہوں۔ میں اسے سر پر اتار دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ سارا سامان گھر میں چھوڑ کر اسی رکشے میں واپس جہلم چلا جاؤں گا۔ گھر کی چابی راجا کے گھر والوں کے پاس تو ہوگی۔ چابی نہ بھی ہوتی تو میں سامان راجا کے گھر رکھ دوں گا۔

میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچا تو مجھے گھر کی حالت دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ اباجی نے اسے شاید نئے سرے سے بنوایا تھا یا پھر اس میں کچھ ردوبدل کروایا تھا۔ راجا کے گھر میں صرف خالہ امینہ تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میرا سامان رکھ لیں، میں ابھی جہلم واپس جا رہا ہوں۔ میں سامان وہاں رکھ کر اسی جگہ سے جہلم کے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچا۔

رینو اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ خاصی بڑی ہو گئی تھی اور اب دلہنی تھی رینو کی جبکہ ایک خوب صورت دو شیڑہ کٹری تھی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔

”تم رو کیوں رہی ہو رینو؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”اماں تو ٹھیک ہیں؟“

”ہاں بیٹا! اماں بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

”اب آنسو بہانا چھوڑ مونی۔“ میں نے نس کر کہا۔

اسی وقت اباجی بھی آگئے۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور خاصے بوڑھے بوڑھے لگ رہے تھے۔ میں والہانہ انداز میں ان سے لپٹ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اباجی میری پشت سہلاتے رہے۔

”اب آپ کیوں رو رہے ہیں مونے آلو؟“ رینو نے منہ بنا کر کہا تو بے اختیار مجھے ہسی آگئی پھر راجا مجھ سے گلے ملا۔

میں نے کہا۔ ”راجا! تیرا شکر یہ میں کس منہ سے ادا کروں۔ تو نے میرے ماں باپ کی بہت خدمت کی ہے۔“

”صاف! اگر تو ایسی باتیں کرے گا تو میں تیرے گھر آنا چھوڑ دوں گا۔“

دوران کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجئے

جاسوسی ڈائجسٹ، سائنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کمینٹیڈ سٹریٹ یا ایئر پورٹ لینڈنگ کے لیے 3,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے چیک پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجتا شروع کر دیں گے۔

یہ سب کی طرف سے اپنے پیسوں کے لیے بہترین انتخابی ہو سکتا ہے بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا پی ایس ایم کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شرعہ اس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 111، سٹیشن ویٹس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگ روڈ، کراچی

فون: 35895313، فیکس: 35802551

”ارے نہیں، تو میرا بچپن کا یاد ہے۔“
 میں نے ابا سے کہا۔ ”ابا! آپ اب گھر چلے جائیں۔ میں اماں کے پاس رہوں گا۔“
 ”تو بہت لمبا سفر کر کے آیا ہے بیٹا۔“ ابا جی نے کہا۔
 ”گھر جا کر آرام کر۔“

میں نے ابا کی بات ماننے سے انکار کر دیا پھر میں ڈاکٹر سے ملا اور اس سے اماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اماں کو دل کا دورہ تو نہیں پڑا تھا لیکن انجائنا کا ایک ٹیکہ ہوا تھا۔ ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا اس لیے انہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑا۔ اب وہ خیریت سے ہیں اور آج شام تک انہیں ڈسچارج بھی کر دیں گے۔
 مجھے دیکھ کر تو اماں اتنی خوش ہوئیں کہ گویا دوبارہ جی اٹھیں۔ انہوں نے عادت کے مطابق میری پیشانی پر بوسہ دیا پھر پہلے کی طرح مجھے ڈھیروں دعا میں دے ڈالیں۔
 ڈاکٹروں نے شام تک انہیں ڈسچارج کر دیا۔ وہ دن ہمارے لیے گویا عید کا دن تھا۔ اماں کی طبیعت بھی حیرت انگیز طور پر سنبھل گئی تھی۔ میں نے سب لوگوں کو اپنے لائے ہوئے تحفے ہانٹے اور لمبی تان کر سونگیا۔

دوسرے دن اماں کی حالت مزید سنبھل گئی اور انہوں نے چنانا پھرنا شروع کر دیا۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے پراٹھے بنانے جا رہی تھیں، میں نے اور رینو نے ان کی خوشامد کر کے انہیں روکا۔
 مجھے اچانک ان تحفوں کا خیال آیا جو میں شمرہ، جہانگیر اور دانیال کے لیے لایا تھا۔ میں اسی دن اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ میں نے اماں کو اسپتال سے گھر لاتے وقت جہلم کے ایک ریٹ اے کار والے سے ایک مینیجے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لے لی تھی۔

شمرہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہانگیر بھی اس وقت گھر میں موجود تھا لیکن صرف آدھے گھنٹے کے لیے۔ اسے ایک ضروری مینٹنگ میں جانا تھا اس لیے معذرت کر کے چلا گیا۔ میں نے شمرہ کو اپنے لائے ہوئے تحفے دیے تو اس نے ہنس کر کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت تھی صدف بھائی؟“

”میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ضرورت کی ہر چیز موجود ہے بلکہ اس سے کہیں قیمتی چیزیں ہیں لیکن گفٹ کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔“ پھر میں نے دانیال کو چاکلیٹ کا بکس اور بہت سارے کھلونے دیے، کچھ نئے گیٹز کی سی ڈیز تھیں۔ وہ انہیں لے کر بہت خوش ہوا۔ وہ بہت پیارا بچہ

تھا۔ اس میں شمرہ اور جہانگیر دونوں کی شہادت تھی اور وہ دونوں ہی خوب صورت تھے۔
 اچانک ڈرائنگ روم میں ایک عورت داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ تین، ساڑھے تین سال کی ایک بچی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اچانک رمشایا آگئی۔ وہی ناک نقشہ، وہی بال، وہی آنکھیں۔

میں نے شمرہ سے پوچھا۔ ”شمرہ..... یہ..... یہ.....؟“
 ”یہ رمشا ہے۔“ شمرہ نے مجھے حیران کر دیا۔ ابھی توڑی دیر پہلے اسے دیکھ کر مجھے رمشایا آئی تھی۔ یہ شمرہ کی چھوٹی بیٹی تھی۔

”ادھو، مجھے اس کے بارے میں تو معلوم ہی نہ تھا۔“
 میں نے کہا۔ ”سوری گڑیا میں تمہارے لیے کوئی گفٹ نہ لاسکا لیکن میں تمہیں سیمیں سے بہت اچھے اچھے کھلونے لادوں گا۔“

”انگل! آپ بھی کھلونوں سے کھیلتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”بیٹا! انگل اتنے بڑے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بڑے کیا کھلونوں سے کھیلتے ہیں؟“
 ”مما! انگل کو کچھ چائے وغیرہ تو پلا لیں۔“ دانیال نے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

”ہاں بیٹا! میں نے رحیم سے کہہ دیا ہے۔ وہ چائے لارہی ہوگی۔“ پھر وہ مجھ سے بولی۔ ”ٹیک بات بتائیں صدف بھائی۔ آج کل ہر آدمی پیسے کے پیچھے کیوں بھاگ رہا ہے؟“
 ”اس لیے کہ پیسہ ہی اس دور کی سب سے بڑی قوت ہے۔“ میں نے کہا۔

”گویا آپ بھی لوگوں کے اس قبیل میں شامل ہو گئے ہیں جن کے لیے پیسہ ہشتادوں باتوں سے زیادہ اہم ہے؟“
 ”نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف اتنا کہنا چاہتا تھا کہ جس سے زندگی میں آسانی پیدا ہو سکے۔ مجھے پیسے کی ضرورت تھی، ہوس نہیں۔“ میں نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ حالانکہ اسی پیسے کی ہوس نے تو مجھے کئی سال تک پاکستان نہیں آنے دیا۔

”تم ساڈھے شمرہ، بیسی زندگی گزر رہی ہے؟“
 ”کیسی گزر سکتی ہے؟“ شمرہ نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ”جہانگیر نے مجھے دنیا کا ہر میٹ، ہر آرام مہیا کیا ہے پھر ان کا سب سے بڑا احسان تو میرے یہ دو ننھے کھلونے ہیں۔“
 میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔ شمرہ کے چہرے پر عجیب سی افسردگی تھی۔ شاید وہ اپنے شوہر سے خوش نہیں تھی یا شاید کوئی اور بات ہو۔

اماں کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ میں انہیں اور رینو کو لے کر لاہور چلا آیا تاکہ میرے ساتھ ساتھ اماں اور رینو کی ملاقات بھی ان سے ہو جائے۔ خالد جان اور خالو مشتاق دونوں پہلے کے مقابلے میں خاصے بوڑھے اور کمزور لگ رہے تھے لیکن اب بھی وہ بزنس میں مصروف تھے۔ ہم لوگ کچھ دن وہیں ٹھہرے، میں نے اماں، خالد اور رینو کو خوب سیر کرائی۔ ابا جی وہیں جہلم میں تھے۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے۔ چار دن بعد جب ہم واپس گاؤں پہنچے تو اماں کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دن پہلے بہت بیمار تھیں۔ میں کچھ دن گاؤں میں رہا پھر میرا رخ ایک دن لاہوری طور پر شمرہ کے محل کی طرف ہو گیا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا پھر ایک کمرے سے دانیال بھاگتا ہوا آیا اور میری ناک سے لپٹ گیا۔ ”انگل! آپ تو اس دن کے بعد آئے ہی نہیں۔“

”بیٹا وقت ہی نہیں ملا۔“
 ”یہی بات پاپا کہتے ہیں تو ماما کی اور ان کی خوب لڑائی ہوتی ہے۔“ دانیال نے کہا۔

”تمہارے ماما اور پاپا کہاں ہیں؟“
 ”ماما، پاپا اپنے دوست کی شادی میں کراچی گئے ہیں۔“
 ”اور تم لوگوں کو کیا چھوڑ گئے؟“
 ”ہم لوگ اگلے کب ہیں۔“ رمشا نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آگئی تھی۔ ”آیا اماں ہیں، رحیم ہے، گل چاچا اور خان بابا ہیں۔“

”یار! ہم ذرا تمہاری مٹی کی لاجپوری دیکھ لیں؟“
 میں نے کہا۔

”دیکھ لیں انگل۔“ اس نے کہا۔
 میں اسٹری روم کی طرف بڑھا تو اس نے کہا۔ ”ماما کی لاجپوری تو ادھر ہے۔“ اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

”چلو، پھر ادھر ہی چلتے ہیں۔“ وہ مجھے چھوٹے سے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس میں ایک طرف آرام دہ کاؤچ بڑا تھا۔ ایک صوف سیٹ بھی تھا اور ایک رائیٹ چیر تھی۔ کرسی کے سامنے کونے میں ایک رائیٹنگ ٹیبل تھی اور اس کے اوپر دیوار میں کچھ ریک لگے تھے۔ اس میں میر تقی میر سے لے کر فیض، فراق، ناصر کاظمی، منیر نیازی اور احمد فراز کے دیوان اور کلیات موجود تھے۔

دانیال نے کہا۔ ”انگل! اوپر والی کینٹ میں میری بال پڑی ہے۔“ ماما نے مجھ سے چھین کر وہاں ڈال دی تھی۔ پلیز مجھے وہ بال اتار دیں۔“

”لیکن ایک شرط پر، تم لوگ ماما کو نہیں بتاؤ گے کہ وہ بال میں نے اتار کر دی ہے۔“

”نہیں کہوں گا، پراس۔“ اس نے کہا۔
 میں رائیٹنگ ٹیبل پر احتیاط سے چڑھا اور چھت سے لگے ہوئے اس دیوار گیر کینٹ تک پہنچ گیا۔ اس میں میگنٹک دروازے لگے تھے۔ میں نے دروازہ کھینچ کر کھولا تو حیران رہ گیا۔

اس میں شمرہ کی بہت سی ڈائریاں پڑی تھیں۔ مجھے وہ ڈبا بھی نظر آیا جو میں نے میٹرک پاس ہونے پر شمرہ کو دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک گیند بھی پڑی تھی۔ میں نے گیند اتار کر دانیال کو دی اور اس سے کہا۔ ”جاؤ بیٹا کھیلو لیکن لان میں ہی کھیلنا۔ کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنا نہیں چاہیے ورنہ تمہاری ماما مجھے بھی ڈائیں گی۔“ وہ اپنی گیند لے کر خوشی خوشی باہر چلا گیا۔

میں نے بے اختیار وہ ڈائریاں اور گھڑی کا ڈبا نکال لیا۔ وہ بہت سی ڈائریاں تھیں۔ میں نے نو سال پہلے کی ڈائری نکالی اور اس کے بعد دو تین ڈائریاں نکالنے کے بعد موجودہ سال کی ایک ڈائری بھی نکال لی۔

کسی کی ڈائری پڑھنا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ میں تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر رمشا کی جان بچانے کے لیے بیٹھا تھا۔ پہلے میں نے گھڑی کا وہ ڈبا کھولا۔ اس میں وہ گھڑی اسی حالت میں رکھی تھی لیکن اس میں سے وہ شعر غائب تھا جو میں نے شمرہ کو لکھ کر دیا تھا۔

پھر میں نے نو سال پرانی ڈائری کھولی تو اس میں سے وہی پرچہ نکل کر باہر گر پڑا جس پر میں نے شعر لکھا تھا۔
 ست پہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں۔ تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں!

اسی کے نیچے اس نے لکھا تھا۔ ”میں نے تمہیں پہل کب جانا تھا صدف! میں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہاری پوجا کرتی تھی۔“

میرا دل بے اختیار زور سے دھڑکنے لگا پھر میں نے ڈائری کھولی، صفحات پلٹتے ہوئے میں نے ان پر سرسری نظر ڈالی۔ روزمرہ کی باتیں تھیں۔

ایک صفحے پر لکھا تھا۔ ”جہانگیر کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ صدف کو اجڑا ہوا دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو داتا ہے لیکن پاپا کو تو بیٹی سے زیادہ پیسا عزیز تھا۔“
 میرے ہاتھ بڑے قابو ہو رہے تھے۔ سر میں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ پیریم کوالٹی، ہارٹ کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ری شی
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ام ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ایچ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ری شی
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے نہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

دھماکے سے ہونے لگے۔ ٹرہہ وہ مفروضہ ہی ٹرہہ مجھے اتنا چاہتی تھی۔

گزشتہ سال کی ڈائری میں پہلے ہی صلے پر لکھا تھا۔
"آج جہا نکیر کی شرافت کا بول کھل گیا۔ وہ پیرا کمانے کا تو جنونی ہے ہی، عورتوں کا بھی دیوانہ ہے۔ راتوں کو وہ کاروباری سینکڑوں میں نہیں بلکہ اپنی عمدہ باؤں سے ملنے جاتا تھا پھر اس نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ دل چاہتا ہے کہ ابھی اور اسی وقت اسے چھوڑ کر پہلی جاؤں لیکن میرے بچوں نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔"

موجودہ سال کی ڈائری میں لکھا تھا۔ "اب جہا نکیر کے ساتھ زندگی ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ اسے نہ جانے کہاں سے علم ہو گیا ہے کہ خالہ نسیم صندور کا رشتہ لے کر آئی تھی۔ میں اس سے لڑتی ہوں تو وہ مجھے صندور کا طعنہ دیتا ہے۔ مہذب نقاب میں چھپا ہوا حیوان! اسے تو اپنے بچوں کا بھی خیال نہیں ہے۔ کاش... کاش میں اس وقت خود میں اتنی جرات پیدا کر سکتی جب صندور کا رشتہ میرے لیے آیا تھا۔ پاپا مجھے بے شرم اور بے حیاء تو کہتے ہیں لیکن اب..."

اب تو جہا نکیر مجھے شراب پہننے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ ایک اور صفحے پر لکھا تھا۔ "آج جہا نکیر نے مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ڈانس نہ کرنے پر پھر بھی محفل میں قائل کر دیا پھر گھر آ کر اس نے لڑ بھئی شراب کی بوتل میرے حلق میں اندھیل دی۔ درندہ کنس کا۔ میں اب اس کے ساتھ ایک ہل بھی نہیں رہوں گی۔"

اس کے بعد ڈائری کے صفحات سادہ تھے۔ میرا سر بری طرح پکرا رہا تھا۔ میں نے سب ڈائریاں سمیٹیں۔ گھڑی کا ڈایا اور تمام ڈائریاں اسی طرح اوپر چڑھا کر کینٹ میں رکھیں۔ میز کا وہ حصہ صاف کیا جہاں میرے چڑھنے سے جوتوں کے نشانات بن گئے تھے اور پوجھل قدموں سے باہر آ گیا۔

اسی وقت مجھے دانیال نظر آیا۔ وہ مجھ سے بولا۔
"انکل! آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"بیٹا! میں گھر جا رہا ہوں۔ آپ ذرا مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں۔"

اس نے مستعدی سے کہا۔ "ابھی لاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر بھاگ گیا۔

میں نے وہ گیند اٹھائی اور اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹرہہ کی نظر اس گیند پر پڑے اور وہ سمجھ جائے کہ اس کے کینٹ کو کسی نے ہاتھ لگا یا ہے۔

دانیال پانی لے کر آیا تو میں نے پانی پیا اور اس سے بولا۔ "دانیال بیٹا اب میں اس وقت آؤں گا جب تمہاری ماما اور پاپا آ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر میں پوجھل قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ گیا پھر نہ جانے کس طرح میں گاڑی ڈرائیو کر کے گاؤں پہنچا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میرا پورا وجود بری طرح جھلنے لگا تھا۔ مجھے شدید بخار ہو گیا تھا۔

اماں ساری رات میرے سر ہانے بیٹھی رہیں اور ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔ صبح تک میری طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اس دن ہم سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے کہ چائیک خالہ زینت گھر میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہو بائی؟" اماں نے پوچھا کہ پوچھا۔

"نسیسا! جہا نکیر نے ٹرہہ کو طلاق دے دی اور بچے بھی اس کے حوالے کر دیے۔"

میں سکتے میں رہ گیا۔ امی اور زینت بھی یہ خبر سن کر بری طرح رونے لگیں۔

"نسیسا! میری ٹرہہ کا کیا ہوگا؟ کیا تم..."

اماں نے میری طرف دیکھا، پھر ان کے چہرے پر ناگواری کی چٹھنیں نمودار ہوئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اماں جواب میں کیا کہنے والی ہیں۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "خالہ امی! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں..."

خالہ نسیسا نے روتے ہوئے مجھے گلے لگایا اور بولیں۔ "بیٹا! تو نے ثابت کر دیا کہ انسان دولت سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔"

"اب بس کریں بائی؟" اماں نے کہا۔ "اس موقع پر اپنے ہی تو کام آتے ہیں۔"

پھر ٹرہہ سے میری شادی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دو پیارے پیارے بچے بھی گئے تھے۔ میرے آنگن میں ہر طرف بہاریں رقص کرتی تھیں لیکن یہ سچ تھا اب بھی میری جان نہیں چھوڑتا کہ اس میں بے چارہ رہا تھا کیا قصور تھا؟ وہ کس گنہ کی پاداش میں ماری گئی؟ میری جلد باز اور کھلندری طبیعت نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی سکت تک چھین لی تھی۔ کاش میں اچھی صحبت اختیار کرتا تو میرے دوست بھی مجھے کوئی نیک مشورہ دیتے۔ یا مجھے ایسا کوئی گناہ تھا قدم اٹھانے سے روک دیتے۔ میری غلط صحبت ہی رہا مشکل کی قائل بن گئی۔